جاسوسی ڈائجسٹ

چینی نکتہ چینی

قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
تلخیاں الجھنیں شکایتیں اور حکایتیں

مدیر اعلیٰ

07

سونا چاندی

احمد اقبال

پرتجسس اور تیز رفتار کہانیاں پسند
کرنے والوں کے لیے توشۂ خاص

14

خونی تصویر

تنویر ریاض

تھیٹر کی دنیا سے تعلق رکھنے والی
ایک ڈراما ساز اداکارہ کی فنکاری

53

خونِ ناحق

بابر نعیم

واردات کا راز فاش کر
دینے والے موسم کی کارگزاری

65

دوسری وصیت

جمال دستی

67

مسیحا

محی الدین نواب

78

خود کردہ

سکندر علیم

سراغ رسی سے آراستہ ایک
مختصر دلچسپ تحریر

145

جلد 45 • شمارہ 06 • جون 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم...

جون کے تپتے موسم کا خوشگوار شمارہ پیشِ خدمت ہے... سیکا کے تیسرے اور آخری حصے کے ساتھ۔ اگلے ماہ سے انگارے شائع کی جائے گی۔ اس دور کی مواصلاتی ترقی نے پوری دنیا کو یوں سمیٹ دیا ہے کہ دور افتادہ علاقوں میں رونما ہونے والا کوئی بھی اہم واقعہ پل بھر میں ہر ملک اور شہر میں جان لیا جاتا ہے۔ جب مختلف سمتوں سے آنے والی بہت سی منفی اطلاعات اور خبروں میں جابجا پاکستانی شہریوں کے نام آتے ہیں تو دل بہت اداس ہو جاتا ہے۔ ان اطلاعات کا مرکز و محور ہمارے اپنے شہر ہوں تو اداسی کچھ زیادہ ہی گہری ہو جاتی ہے۔ اس ماحول میں اچھی خبریں بہت حوصلہ دیتی ہیں۔ برسوں بعد لاہور میں کرکٹ کا میلہ سجا اور مہمانوں کی جان توڑ کوششوں کے باوجود میزبانوں نے اپنے نام کا مان رکھ لیا لیکن زمبابوے والے ہار کر بھی جیتے ہیں کیونکہ انہوں نے برسوں سے ویران پڑے پاکستانی میدانوں کو اپنے دلکش کھیل سے آباد کیا ہے۔ خطرات اور حاسدوں کے منفی پروپیگنڈے کے باوجود زمبابوے نے دلیری کا مظاہرہ کر کے عالمی کرکٹ کو مرخرو کر دیا ہے۔ اس کے لیے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں آئی سی سی کے دیگر رکن ممالک بھی پاکستان کو اپنی میزبانی کے مواقع فراہم کریں گے۔ سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر حملے نے ہمارے ملک کے دامن پر جو بدنما داغ لگایا تھا وہ مدھم ہو چلا ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ آنے والے دنوں اور سالوں میں ہم خوف و دہشت کی فضا سے آزاد ہو کر اپنے معمولات بحال کر سکیں گے۔ آیئے اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں جہاں کچھ پرانے اور نئے تعلق بحال ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

ساہیوال سے اعجاز احمد راحیل کی گیلی گیلی تحریر ”سابہ رواں کا دیدہ زیب شمارہ مئی کی ایک اداس سی شام کو ملا۔ بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ محفل میں حاضری دوں۔ زندگی کی الجھنوں میں ایسا الجھا ہوں کہ وقت ہی نہیں نکال پایا۔ اس دفعہ جاسوسی ہاتھ آیا تو سوچا پرانی یادیں تازہ کر لی جائیں۔ وہ یادیں بھی کیا عجب شے ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ہنسی کے ساتھ ہوتی ہیں، کبھی تنہا نہیں ہونے دیتیں۔ شاید وہ مجھے دن بھی لوٹ آئیں جو کھو چکا ہوں۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح فکر کے دروا کر گیا۔ یہ حقیقت ہے جب تک ہم ایک دوسرے کا درد محسوس نہیں کریں گے، دوسروں کے حقوق کا خیال نہیں کریں گے، تب تک معاشرے میں امن و امان کے خواب دیکھنا بھی عبث ہے۔ سب سے پہلے اپنے پیارے بھائی سید شکیل حسین کاظمی کا تبصرہ بصد شوق ملاحظہ کیا۔ ایک ایک لفظ مبنی بر حقیقت ہے۔ تبصرہ کافی جاندار تھا۔ جھنگ سے بھائی مرتضیٰ احتشام کا تبصرہ بھی بھرپور تھا۔ اپنے سابقہ شہر پاک پتن شریف سے جو بے علی چشتی کا انداز بیاں اچھا لگا۔ بھرپور تنقید جو بے جی رائے اور بیکار رائے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر جاسوسی سے آوارہ گرد نکال دی جائے تو باقی کیا رہ جائے گا؟ افتخار رضوان بھائی! آپ کا تبصرہ پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ اللہ پاک مرحومین کو جنت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ محمد وقاص خالد، جام پور سے عثمان، ور محمد صفدر معاویہ کے اختصاریے بھی عمدہ تھے۔ چشمہ بیراج سے ساگر تنویر صاحب کے خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ انجمنِ ذوق ساحل کی شمولیت بہت بھلی لگی۔ نو جوانوں سے محمد انعام صاحب حوصلہ کریں اور محفل میں آتے رہا کریں۔ دوریش احمد خان اور سید اکبر شاہ بھی تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ سب سے پہلے مجتبیٰ صاحب کی آوارہ گرد پڑھی۔ تحریر جنسی سے بھرپور ہو۔ دوا آغاز سے اب تک ہمیں اپنے سحر میں جکڑے ہوئے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں مجتبیٰ صاحب مستند اور منجھے ہوئے لکھاری ہیں۔ ان کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ میڈم اور شفیق شاہ کا دلدوز ماضی پڑھا، واقعی وقت اور حالات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ ماضی سے جڑے واقعات سے پردہ اٹھنے کرل کا شف زبیر صاحب کی حصار دوم ایک بے حد پسند آئی۔ ماضی سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہوتا ہے۔ میر اور آتش کی تلاش و جستجو قابلِ ستائش تھی۔ سلیم انور کی ثبوت، مجرم چاہے کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، کوئی نہ کوئی غلطی کر جاتا ہے۔ ہارورے اسٹارک کو بھی اس کی غلطی لے ڈوبی۔ پہلا رنگ منزہ ک مجرم دولت کی ہوس میں مبتلا انسان رشتوں کی اہمیت نہیں جان سکتے۔ وہ اپنے پرائے کی پہچان بھی بھول جاتے ہیں۔ مریم کے خون کی تیز مچی ہوں، عقل کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ انسان اپنی ذہانت کے بل بوتے پر بہت کچھ کر سکتا ہے۔ احمد زاہد بھائی نے اپنا حق لینے میں کامیاب رہا، وندگی کا کردار اچھا لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زندہ دل نوجوان بہت بڑے ہوتے ہیں، اکثر کر سپنا اپنا پورا نہیں ہو سکتا۔ ادھوری خواہش واقعی اس دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو کسی کو خوش دیکھ سکتے ہوں۔ آخر کار اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ بابر نعیم کا فیصلہ جیت رہی۔ انسان اگر اپنی ذہانت سے کام لے تو بڑے سے بڑا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ امجد رئیس کی مقدر کا چکر بہت عمدہ رہی، یہ حقیقت ہے تقدیر کے کام تدبیر سے نہیں نکلتے۔ انسان کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے تو خود اس میں گرتا ہے، یہی سوئیٹی کوری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ منظر امام کی لاجواب تحریر آنکھیں بہت عمدہ تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں مرد محبت میں قربانی دے سکتے ہیں۔ آخر ان کی قربانی رائیگاں بھی جاتی ہے۔ ذیشان خوش قسمت تھا جو اس کو مثل کے لیے میسر ہوئے۔ ضرورت زندگی بہت اچھی لگی۔ انسان کو مشکل حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے۔ نیمی کی ذہانت قابلِ رشک ہے۔ معصوم کی قسمت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ ننھا مجرم ہو کر بھی بچ گئی۔ مختصر زبردست اسٹوری ثابت ہوئی۔ عقل خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کو استعمال کر کے انسان بڑے سے بڑا معما حل کر سکتا ہے۔“

کراچی سے امین شمشاد کے ارادے ”جاسوسی ڈائجسٹ 4 مئی کو خریدا۔ اداریے میں مدیر اعلیٰ نے ہمیں دل کو لگیں۔ خدارا ہمارے (لیڈر) بڑے کچھ سوچیں اور سمجھیں یہ دشمن دولت تو یہیں پر ہی رہ جائے گی۔ لیکن افسوس...... جھنگ سٹی سے محمد مرتضیٰ احتشام کا خط زبردست رہا۔ کراچی سے پرنی زبے خان بھی بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ ہری پور ہزارہ سے عمران محبوب عباسی بھی دلچسپ خبریں لے کر آئے اور چھا گئے۔ نادر سیال خیر سے آپ 22

میں لگے مبارک۔ خدا آپ کو قید سے رہائی دے، آمین۔ کبیر شاہ! خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے، آمین۔ کاشف عبید سترہویں سالگرہ مبارک ہو۔ آصف محمد (صاحب) ہاہا چلیں کوئی بات نہیں، آخر سارا پڑھتا اس کا بھی حق ہے۔ ثواب کمانے دیں۔ جویریہ علی چشتی صاحبہ! آمین! ایک دن کراچی ضرور امن کا گہوارہ بنے گا اور ساتھ میں پاکستان بھی۔ اب کچھ کہانیوں پر بات ہو جائے۔ سب سے پہلے منظر امام کی آنکھیں پڑھی۔ کہانی زبردست رہی، آپ مزاحیہ کہانیاں لکھا کریں، قارئین بھی آپ کی مزاحیہ کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، سلیم انور کی ثبوت بھی اچھی رہی۔ سفاک مجرم، سلیم فاروقی کا سرورق بہت اچھے موڑ پر ختم ہوا۔ بابا سائیں جیسے لوگ ہی اس دھرتی پر بوجھ ہوتے ہیں۔ دلاور کا کردار شاندار، جاندار رہا۔ سرورق کی دوسری کہانی تیز سی چال بھی زبردست رہی۔ راحیل کے ساتھ بہت برا ہوا۔ ماجی کا کردار بھرپور انداز میں کہانی کو مزیدار بناتا رہا۔ باقی کہانیاں بھی اپنی جگہ پر ٹھیک رہیں۔''

ساگر کوکر، چشمہ بیراج سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ''جاسوسی کے ٹائٹل کی ایک بات سمجھ نہیں آتی۔ ہمیشہ پھول چہروں کے ساتھ اسلحہ کیوں دکھایا جاتا ہے۔ (واقعی قابلِ غور سوال ہے) حسابِ دوراں بہت دلچسپ رہی۔ ایک ہی نشست میں ختم کی۔ ثبوت میں مجرم زیادہ بولنے کی وجہ سے پکڑا گیا۔ بھی تو کہتے ہیں ایک چپ سو سکھ۔ ادھوری خوشی میں اشین سے بڑی بیوی کی کامیابی ہضم نہ ہو گی۔ فیصلہ واہ! عورت بھی ذہین ہوتی ہے۔ سیکا زبردست اسٹوری ہے، پسند آرہی ہے۔ مقدر کا چکر مقدر کی بات ہے۔ ہیرا پھیری، لالچ بری بلا ہے۔ آنکھیں، دل والے بڑا حوصلے رکھتے ہیں۔ ذیشان نے اپنی آنکھیں دے کر محبت حاصل کرلی۔ کوئی جان دے کر بھی نہیں کرسکتا۔ قسمت کی بات ہے مزہ آگیا۔ ضرورت، زندگی، زندگی وہ جو کسی کے کام آئے۔ جینے کا سامان خود کرنا پڑتا ہے۔ معلوم گواہ، گندے ذہن والوں کی کہانی تھی۔ سفاک مجرم بالکل پسند نہیں آئی۔ سرورق پر آج کا مرکہانی، حیرانی ہوئی۔ تیز سی چال جو محنت کرتا ہے وہ کامیابی حاصل کرتا ہے۔ احمر نے کامیابی بھی حاصل کی اور زیبا بھی بونس میں مل گئی۔''

کراچی سے ادریس احمد خان کی ستائش ''جاسوسی بروقت مل گیا اور ہمیشہ کی طرح مسلسل پڑھ کر ختم کیا۔ سرورق کو سراہتے ہوئے اداریے سے مستفید ہوئے اور سرِ فہرست محمد مرتضیٰ احتشام کو مبارک باد! سب سے پہلے کاشف زبیر کی حسابِ دوراں پڑھی، اچھی کہانی تھی۔ آشی اور سمیر نے دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنایا جو عزم اور ہمت سے ہی ممکن ہو سکا۔ ثبوت میں چھوٹی سی غلطی کی چابی کے تجزیے تک پہنچانے میں اہم ثابت ہوئی۔ ادھوری خواہش بھی اچھی تھی۔ فیصلہ میں مجرم نے جو فیصلہ کیا، وہی بہتر فیصلہ تھا۔ مقدر کا چکر نے بھی دلچسپی کا عنصر باقی رکھا۔ ہیرا پھیری میں ہیرا پھیری مہنگی پڑ گئی۔ منظر امام کی کہانی آنکھیں نے بہت اچھا تاثر دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد بھی دلچسپی سے پڑھی جارہی ہے۔ ضرورت زندگی میں انسکو جیمی نے اپنی قوتِ فیصلہ سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور مجرموں کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ اپنے بچوں کی خوراک کا بھی خیال رکھا۔ سکی اور جیمس کی جان و عزت محفوظ رہی جبکہ شاہ رخ اور سیک نے نیاں تو برمیا قدان کے ارادے خاک میں مل گئے۔ معلوم گواہ بھی بہتر تاثر کے ساتھ نمایاں رہی۔ سلیم فاروقی کی سفاک مجرم میں باپ نے سفاکی کی حد کردی۔ پیسے اور مرتبے اور جھوٹی عزت کے لیے اولاد کو بھی مار ڈالنے کی کوشش کی۔ ایسے بے ضمیر انسان کا خاتمہ ہی ضروری ہے۔ سرورق کی دوسری کہانی تیز سی چال بھی بہت اچھی تھی۔ احمر کو اس کی محبت بھی مل گئی اور اس کی محنت کا صلہ بھی مل گیا۔ اس نے محنت کی، نتیجے میں منزل اس کے پاس آگئی۔ دولت بھی ملی جو اس کی محنت کا ثمر تھا۔ اللہ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ کہانیاں بھی اچھی لگیں۔''

خوشاب سے محمد یوسف سانول کے مشورے ''کافی عرصے سے جاسوسی کا قاری ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں، خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ جاسوسی کا معیار آئے دن گرتا ہی جارہا ہے۔ قارئین کرام کی بار بار گزارش پر اس بار جاسوسی کا معیار کافی ابھارا۔ ٹائٹل بھی خوب صورت تھا۔ اداریہ اچھے الفاظ سے مزین تھا۔ جھنگ والا صاحب کی کرسی سے محمد مرتضیٰ احتشام فل ایکشن میں تھے اور سب کو محفل کی سیر کرا رہے تھے۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب کافی اچھا تبصرہ تھا۔ سب سے پہلے بھٹی صاحب کی آوارہ گرد پڑھی۔ یقین کریں کہانی کو پڑھتے ہوئے میرے آنسو جاری ہو گئے۔ بہت کم کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو دل میں اتر جاتی ہیں۔ بہت اچھے موضوع پر ڈاکٹر بھٹی صاحب نے لکھا۔ اس کے بعد حسابِ دوراں پڑھی۔ کاشف زبیر صاحب ایک بار پھر جرمنی، جاپان اور امریکا کے گندے ذہن کے گندے لوگوں کے منہ سے شرافت کا نقاب کھینچ رہے تھے۔ امریکی اس دھرتی پر بوجھ ہیں، خدا کرے یہ بوجھ ہم پر سے اتر جائے جنھوں نے ہمیشہ امتِ مسلمہ کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ سرورق کے رنگ اس بار اچھے تھے۔ مریم کے خان کی تیز سی چال آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی تحریر تھی کیونکہ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو احمر کی طرح ٹیڑھی انگلی کرنی پڑتی ہے۔ بہت اچھی تحریر۔ اس کے بعد سفاک مجرم، سلیم فاروقی صاحب کہانی پر گرفت مضبوط نہیں رکھ سکے۔ شاید سوتے میں اٹھ کر لکھ دی کہانی۔ اس کے بعد مسیحا، نواب صاحب ایک بات ہضم نہیں ہوئی کہ فرشتے کیوں آئے ہیں ملک بوستان کو ٹھیک کرنے۔ یہ بات ماورائے عقل اور ماورائے شریعت ہے۔ اگر روحانی، روحانی زمینی مخلوق ہوتے تو بہت اچھا ہوتا ویسے آپ کی بات ہے اس حصے میں نواب صاحب نے سلطانہ یاقوت اور اس کی بیٹی کی انٹری کر کے کہانی کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے۔ بہرحال نواب صاحب کو پھر کیا کہیں؟ شارٹ کہانیاں مجموعی طور پر اچھی تھیں، سب سے اچھی کہانی یاریم کی فیصلہ تھی۔ ایک مشورہ ہے کہ اگر جاسوسی میں مسلمان حکمرانوں کے عروج وزوال کی داستانیں شائع کریں تو امید ہے جاسوسی کی رونق میں اضافہ ہوگا۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی رائے ''مئی کا شمارہ 4 تاریخ کو اپنے شہر خانیوال سے خریدا۔ اپنی محفل میں آئے تو بھائی محمد مرتضیٰ احتشام بہت عمدہ تبصرے کے ساتھ حاضرِ محفل تھے۔ کراچی سے پری زے خان بھی عمدہ تبصرہ لے کر حاضر ہوگئیں۔ معراج محبوب عباسی کچھ نئی نیوز میں اچھا تبصرہ کر گئے۔ رومی انصاری بھی مختصر تبصرے کے ساتھ موجودِ محفل تھے۔ سجاد خان اگر ہماری پولیس کا محکمہ ٹھیک ہو جائے تو سارا پاکستان سدھر جائے گا۔ نادر سیال صاحب آپ کس قید میں ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام بے گناہ اسیران کو باعزت رہائی نصیب فرمائے۔ شکیل حسین کاظمی نے عوام کی آرا کو ادارے تک پہنچایا۔ جاسوسی ایک معیاری رسالہ ہے، کبھی کبھی ایسی کہانیاں آجاتی ہیں جن کو ڈائجسٹ کی زینت بنانا پڑتا ہے لیکن وہ قارئین کو پسند نہیں آتیں تو قارئین کو حق حاصل ہے کہ،

تنقید کریں لیکن تنقید برائے اصلاح ہو تنقید برائے تنقید نہیں، امید ہے کہ ادارہ جاسوسی قارئین کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے اچھی کہانیاں پڑھنے کو مہیا کرے گا۔ (جیسا آپ نے درست فرمایا کہ کبھی کبھی ایسی بھی کہانیاں آجاتی ہیں۔ اس بات کو سمجھیں کہ مصنف کی ہر کہانی شاہکار نہیں ہوتی۔ کبھی بہت اچھی اور کبھی بکی) سید اکبر شاہ بھائی میں معذرت خواہ ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ کاشف عبید کاوش کو امتحان سے خلاصی کی مبارک۔ سب سے پہلے سلیم فاروقی کی سفاک مجرم پڑھی، یہ ہمارے معاشرے کی المناک حقیقت ہے جہاں سردار جمال جیسے کردار کسی نہ کسی روپ میں نظر آجائیں گے، بیٹا باپ کا تو باپ بیٹے کا خون کر رہا ہے، بھائی بھائی کا قتل کر رہا ہے۔ صرف زر زن زمین کے لیے۔ دوسرے رنگ میں مریم کے خان تیزی کی چال لے کر آئے، بہت ہی عمدہ کہانی تھی۔ جب گھی سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی پڑتی ہے۔ آج کے دور میں حق نہیں ملتا اپنا حق چھیننا پڑتا ہے۔ آوارہ گرد میں شکیل شاہ کا ماضی جاننے کا موقع ملا۔ شکیل کے دشمنوں کو ان کا انجام پسند آیا اور شکیل شاہ کو موت کی نیند سلا دیا اور زبیر ہوا تو کو ختم ہونے والا دکھ دے دیا۔ سیما کافی نشیب و فراز میں چل رہی ہے۔ حسنہ، مسعود عزیز کی تحریر ... ہیرے نگوڑے کی مدد سے چور کو بھی پکڑ لیا اور اپنا پیسہ بھی برآمد کروا لیا، باقی تمام کہانیاں اور تحریریں بھی بہت عمدہ تھیں۔''

ڈیرہ مراد جمالی سے زبیر حسین شیخ کی جسارت ''عرصہ طویل سے جاسوسی ڈائجسٹ کا خاموش قاری ہوں (گویا ہونا چاہیے تھا) جاسوسی تین سال سے باقاعدہ پڑھتا ہوں لیکن خطوط کی محفل میں پہلی بار لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جاسوسی حسب معمول 4 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل کی حسینہ کافی پرکشش کسی سوچوں میں گم تھی۔ میں تبصرے کافی شوق سے پڑھتا ہوں۔ اس بار سید شکیل کاظمی کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ محمد وقاص خالد کا بھی تبصرہ بھی اچھا تھا۔ احسان سحر بھی کافی اچھا تبصرہ لکھتے ہیں۔ آج کل طاہر چودھری تبصرہ نہیں لکھ رہے۔ کہانیوں میں سیما پڑھی، اچھی بھی تھی اور حقیقت سے کوسوں دور۔ ابتدائی صفحات پر کاشف زبیر صاحب نے اچھا لکھا۔ آوارہ گرد بھی اچھی جا رہی ہے۔ سرورق کے رنگ بھی اچھے تھے۔ سلیم فاروقی کا رنگ اور احمد رئیس کی تحریر مقدر کا چکر اچھی تحریریں تھیں۔ بقیہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے امید ہے ضرور شائع ہوگا۔''

رمشا عرفان چک گلوسن سے لکھتی ہیں ''اس دفعہ جاسوسی 10 تاریخ کو مل گیا۔ سرورق اچھا رہا۔ جویریہ بھی شاید آپ کو آوارہ گرد سے الرجی ہے ہمیں نہیں۔ معراج محبوب کی تحریریں اچھی لگیں اور اکبر شاہ کا خط اچھا رہا، شکر ہے خدا کا اپنے آپ کو ولن کہا ہے ہیرو نہیں۔ الماس سعید اس دفعہ غیر حاضر تھے۔ آوارہ گرد نے اس دفعہ اچھی سسپنس میں ڈال دیا۔ ابھی تو شکیل شاہ کے گھر والوں کو بھی ڈھونڈنا ہے، ویلڈر سیما کا بھی کچھ کریں۔ سفاک مجرم میں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی ایک باپ ایسا کر سکتا ہے۔ تیزی کی چال میں چیونٹی کے بھی پر نکل آئے کے مصداق ہوا۔ شکر ہے عامر کو عقل آئی۔ عقل مند ہماری طرح کا عقل مند نکلا۔''

گوجر خان راولپنڈی سے عرفان راجہ کی بے چینی ''موسم گرما، دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آئے تو وہاں کے لوگ جھوم اٹھتے ہیں، جبکہ ہمارے یہاں موسم گرما کی نوید آنے کی دیر ہے، بجلی نوید کے غائب ہو جاتی ہے اور لوڈشیڈنگ کا جن عوام کو خوف و دہشت، غصہ و پریشانی، بے سکونی، دماغی و اعصابی بے آرامی وغیرہ کے تحائف دیتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ لوڈشیڈنگ کا مسئلہ اپنے حل کی طرف کیوں نہیں جاتا؟ میری ناقص عقل کے مطابق ہمارے حکمران اور دیگر امرا و یو پی ایس، جنریٹرز اور دیگر پاور سسٹم کے تحت لوڈشیڈنگ کے عذاب سے مستثنیٰ ہیں۔ اس لیے عوام کے دکھ درد کا مداوا نہیں کر سکتے۔ (اور یہ بات عوام کی سمجھ میں نہیں آتی) مئی کا شمارہ سامنے ہے۔ سرورق جاسوسی کے روایتی انداز میں تھا، بہرحال آنکھوں کو بھلا لگا۔ چنگی نکھ چنگی میں آپ کی باتیں پڑھیں جو امیدوں کے چراغ روشن کرنے کی سعی میں نظر آئیں۔ مرتضیٰ احتشام کو مبارک۔ شکیل کاظمی کے الفاظ میں اپنی آواز بھی محسوس کی۔ پری زاد خان کی آمد بھی خوب رہی۔ معراج محبوب عباسی کا خبرنامہ بھی اچھا رہا۔ عبدالجبار رومی بھی اپنی محفل جمانے میں کامیاب رہے۔ افتخار حسین اعوان کے دکھ بھرے الفاظ پڑھ کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دے۔ عبد...... باقی خطوط بھی عمدہ تھے۔ آوارہ گرد کی یہ قسط اس مرتبہ ماضی در ماضی کا مجموعہ تھی۔ اس قسط میں کہانی اپنے اندر کافی دلچسپی سموئے ہوئے تھی۔ رنگوں میں مریم کے خان کی کہانی تیزی کی چال بہت ہی شاہکار تحریر ثابت ہوئی۔ جدت بھرا موضوع اور کاشف زبیر اسٹائل کہانی ... مزہ آ گیا۔ احمر کامیاب ہوا اور راحیل اپنی بدنیت سوچ کے باعث مزہ کا شکار بنا۔ سلیم فاروقی کی سفاک مجرم کوئی خاص تاثر نہیں دے سکی۔ کامی کے والد کا کردار حقیقت سے کافی پرے محسوس ہوا۔ نواب صاحب کی سیما..... معذرت کے ساتھ تو بالکل فضول کہانی ہے جسے پڑھ کر وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہوا۔ اولین صفحات کا تحفہ کاشف زبیر نے دیا۔ حصار دوراں بہت ہی عمدہ انداز میں لکھی گئی یادگار تحریر تھی۔ منظر امام کی آنکھیں بہت ہی پسند آئیں۔ ارے نہیں جناب، ان کی کہانی آنکھیں۔ ذیشان کا کردار غم زدہ کرنے والا تھا۔ کچھ لوگ محبت میں اس حد تک بھی چلے جاتے ہیں، یقین نہیں آتا۔''

محمد مرتضیٰ احتشام کی جھنگ سٹی سے خوشی و سرشاری ''ٹائٹل حسینہ نے بڑے خوب صورت انداز میں بالوں کو جوڑا ہوا تھا۔ کانوں میں جگمگاتی زنی نے مزید حسن کی تمکنت کو چار چاند لگائے لیکن چہرے پر اداسی دیکھ کر احساس ہوا کہ شاید ان سے کوئی ان کا اپنا بچھڑ گیا ہے اور وہ اب بھی انتظار میں ہیں کہ وہ واپس آ جائے شاید۔ اداریہ پڑھا۔ اتنی زیادہ جانوں کے ضیاع پر بہت دکھ محسوس ہوا۔ کاش حکمران عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سنجیدگی سے کام کرنا شروع کر دیں۔ اس کے بعد اپنی چیت پلی اور پیاری سی محفل کا رخ کیا۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کراچی سے پری زاد خان کا دلچسپ تبصرہ پڑھا ان کو شاید موٹے نقوش والے انسان پسند نہیں ہیں۔ معراج محبوب عباسی صاحب شاید نیوز چینل جوائن کر لیا ہے آپ نے۔ عبدالجبار رومی انصاری! لگتا ہے آپ نے تبصرہ دل سے نہیں لکھا مجھ کو کچھ پھیکا پن محسوس ہوا۔ آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان نے کب کے دل میں چھپائے دکھ درد بیان کیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی نانی جان، خالہ جان اور امی جان پر رحمتوں کی برسات کرے اور ان سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ جویریہ علی چشتی رائے آپ کو خوش آمدید۔ لیکن حیرت اس بات پر زیادہ ہوئی کہ آپ کو آوارہ گرد کہانی اچھی نہیں لگی۔ محمد وقاص خالد کی پروقار آمد کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ جاسوسی

ہوئے جب سی کے شمارے پر نظر پڑی تو تمام مزہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ گلے شکوے دھرے رہ گئے اور بے خودی کے عالم میں جا کر ڈائجسٹ خرید لیا۔ ٹائٹل پر صدا ایگی دیتے انکل کے خون آلود ہاتھ اور چہرے کے علاوہ جو خاتون موجود تھیں ان کے دانت بھی سرخی مائل تھے۔ شاید کسی خون آشام قبیلے سے تعلق رہا ہوگا محترمہ کا۔ گلی محلے میں بیماری کا موسم تھا۔ بر موسم اکل والے جا رہے تھے۔ ہمارے خود ساختہ بھانجے سید اکبر شاہ! باتیں تو خوب بگھار لیتے ہو آپ۔ اب یہ تو آپ کا ایگو اور زلت ہی بتائے گا کہ کتنے پانی میں ہو آپ۔ فسادِ جس کی رپورٹ کے مطابق انکل سیانے اور اردو دان عربی کی پہاڑیوں میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ڈی پی کا رستہ بھول گئے ہیں۔ جن کو ملیں فوراً یہاں حاضر کریں۔ اسلام آباد سے وڈے شاہ جی کا جلالی انداز متوقع تھا۔ افتخار حسین کی داستان بہت المناک تھی۔ پروردگار ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ جاسوسی ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور تبصرہ نگار مرزا انجم جمال بھی ہمیں طویل بیماری کے بعد محض 35 سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔ ان کی یادیں، خوش مزاجی اور ہمت و بہادری ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں زندہ رہیں گی۔ (اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے) اس بار جاسوسی کے دونوں ایڈیٹر ہمارے پسندیدہ مصنفین موجود تھے۔ ابتدائی صفحات پر ہمارے ہر دلعزیز کاشف زبیر ایک بار پھر چھا گئے۔ امریکی سلامتی اور بربریت کی ایک چھوٹی سی جھلک بہت زبردست تحریر تھی۔ زیرِ آب مناظر بہت خوب صورتی سے بیان کیے گئے۔ آوارہ گرد میں شکیل شاہ کے ماضی کی بھیانک واردات بہت لرزہ خیز تھی۔ مسیحا کی شان میں ہم کچھ لکھنے بیٹھے تو سنسر کی قینچی حلال میں آ جائے گی۔ سلاک مجرم تو کہ سلیم فاروقی کے مخصوص اندازِ تحریر میں تھی لیکن سابقہ تحاریر سے قدرے کمتر تھی۔ نیز کی چال میں اہم کی شرافت، ذہانت اور خلوصِ نیت نے اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ مریم کے خان کا اندازِ بیان اور معلومات بہت پسند آئیں۔ ان کی طرف سے ایک بار اسٹوری کا مدت سے انتظار ہے۔ لیکن یہ منظر امام کو کیا ہوا؟ مکمل بار ان کی تحریر متاثر کرنے میں ناکام رہی ہے۔"

ضلع دیر سے اعظم خان کے گرما گرم جذبات "1983ء میں جب میں جماعت نہم کا طالب علم تھا۔ ڈائجسٹ کی دنیا کا ساتھی بنا۔ سفر تا حال جاری ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والے تقریباً تمام ڈائجسٹ پڑھے لیکن سوئی صرف جاسوسی اور سسپنس پر اٹکی۔ صرف ایک دفعہ آپ کو خط لکھا تھا۔ خاموش قاری تھا۔ لیکن پچھلے کچھ عرصے سے آنے والی تبدیلیوں نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ محترم لگتا ہے کہ ادارے کے پاس اچھے مصنفین کا قحط آ گیا ہے۔ کیونکہ کچھ عرصے سے عجیب و غریب کہانیاں آنے لگی ہیں۔ جن کا وقت کے ساتھ کوئی تال میل نہیں ہوتا۔ ہم 21 ویں صدی میں زندگی گزار رہے ہیں لیکن کہانیاں 18 ویں صدی کی پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ جہاں گرج چمک کے ساتھ دو افراد بھسم یا غائب ہو جاتے ہیں۔ جی ہاں آپ خوب سمجھیں، بات علاء الدین نواب صاحب کی نئی کہانی مسیحا کی ہو رہی ہے۔ جو کہ بالکل 3 ڈائمنشنل ناول، انسانی ذہن، سوچ اور فکر سے ماورا کوئی چیز ہے۔ نواب صاحب کی ہر کہانی ان خطوط پر چلتی ہے۔ (اس ماہ مسیحا کی آخری قسط ہے) مصنفین کو چاہیے کہ وقت، حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر کہانی لکھیں۔"

واہ کینٹ سے بلقیس خان کے انداز و اطوار "ذاکر جی کافی عرصے بعد نیا سویرا بندہ سرورق پر لائے ہیں جو خوفناک خون چہرے کے باوجود باغی حسینہ پر سبقت لے گیا۔ اداریہ قدرتی آفات اور گھمنڈی حکمرانوں پر نوحہ کناں تھا۔ محفل میں حاضر ہوئے تو محمد مرتضیٰ احتشام جامع تبصرے کے ساتھ سر فہرست تھے۔ پری زے خان، جویریہ علی سوچتی ہوں کہ دنیا میں آپ جیسے غمگسار نہ ہوتے تو زندگی کس قدر دشوار ہوتی۔ جانے والوں کو کون لا سکا ہے اور دکھ تو دکھ ہوتے ہیں اپنی جگہ بدلتے نہیں مگر ہمدردی کے دو چار بول زخموں کو ناسور نہیں ہونے دیتے۔ پری زے اور جویریہ علی اللہ آپ کو خوش رکھے۔ میں محمد مرتضیٰ، نادر سیال، منظور معاویہ، سراج محبوب اور سید اکبر کی تعزیت سے مشکور ہوں اور ان احباب کی بھی شکر گزار ہوں جن کے جذبات کسی وجہ سے مجھ تک رسائی نہ پا سکے۔ افتخار اعوان، اللہ پاک آپ کے پیاروں کی مغفرت کرے۔ ذاکر جی! جوان بیٹوں کا لاشہ اٹھانے والوں پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا اندازہ ہے مجھے۔ خدا ہمارے بھائی کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ ایک موہوم سی امید تھی۔ ما ایمان بھیم سے دکھ پر اظہارِ دل دینی تھی مگر وہ تو پتھر ہو چکی یا پھر ہمیں چھوڑ چکی ہیں۔ سائرہ تو کر گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب رہتے ہیں اور پھر جب آتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ محفل ان کی مرضی کے مطابق چلے۔ اب تبصرہ خطوط پر ہو یا کہانیوں پر بات تو ایک ہی ہے۔ یہاں میں آپ سے گزارش کروں گی کہ قیدی بھائیوں کا خیال رکھیں جن کو آزادی کی ہزاروں نعمتوں میں سے کوئی نعمت حاصل نہیں ہے اور جن کو اس کڑے وقت میں جاسوسی 500 سے اوپر کا پڑ رہا ہے۔ اس سے زیادہ محبت کیا ہوگی؟ سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ شکیل شاہ نے اسی طرح سادگی پر جس طرح للکار سے عمران نے کیا تھا۔ حصار دوماں، جنگِ عظیم کے تناظر میں لکھی گئی کاشف زبیر کی ہر لمحہ چونکا دینے والی دلچسپ تحریر رہی۔ اور یہ بھی طے ہے کہ اگر اس جنگ میں اتحادی غالب نہ آتے تو دنیا میں کسی کی بھی جان و مال اور عزت محفوظ نہ ہوتی۔ جاپانی جرمنوں سے زیادہ سفاک تھے۔ مسیحا میں رحمانی اور ربانی کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر اتنی تباہیوں کی تاب ہم نہیں رکھتے۔ ضرورتِ زندگی کے بھی ہی سے ثابت کیا کہ یہ خاکی اپنی فطرت میں نوری ہے یعنی خیر کی طرف مائل ہے۔ منظر امام کی آنکھیں نے خوش امیدی سے ہمکنار کیا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو شیطان کی طرح ایثار کریں۔ ادھوری خوشی، نامعلوم تولی، ہیرا پھیری، ثبوت خوب جبکہ مقدر کا چکر اور حلقہ خوب تر تھیں۔"

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی تاخیر "آپ کی غیر حاضری پر کافی تشویش تھی کہ ہر ماہ پابندی سے خط لکھنے والے کہاں مصروف ہیں۔ خوش قسمتی سے اس ماہ آپ کے دو خطوط موصول ہوئے۔ پہلا خط 9 دسمبر 2014ء کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا خط 7 فروری 2015ء کو لکھا گیا تھا۔ اب ہمیں نہیں معلوم ان خطوط کو تاخیر دینے والے عوامل میں کون کون شامل ہیں۔ آتے رہیے، آپ کے خط کا انتظار رہتا ہے۔"

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی تبصرہ نگاری "جاسوسی کا پیارا سا میگزین 4 تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ سرورق انتہائی سحر خیز تھا۔ سرِ ورق گون گی کر یہ شخصیت اہلِ وضع قطع سے ہی دولت کی ہوس میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔ جبکہ معصوم دوشیزہ ظلم کی تصویر بنی سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور مجھے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے۔ گرمی کا موسم تو جیسے تیسے گزر رہا ہے۔ ساتھ ہی مکافاتِ عمل بھی جاری ہے۔ اس پر کسی کا بھی بس نہیں ہے۔ قدرتی طور پر یہ حادثاتی طور

پر جو ہوتا ہے، وہ ہو کے رہتا ہے۔ پچھلے دنوں غیر ملکی سفیروں کے ساتھ آرمی ہیلی کاپٹر کو گلگت میں حادثہ پیش آ گیا جس سے ملک میں سوگواریت چھا گئی اور قومی پرچم سرنگوں ہو گیا۔ یہ آرمی ہیلی کاپٹر تھا، اس سانحے کی جلد ہی تحقیقات بھی ہو جائیں گی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عام جگہ پر جو حادثات ہوتے ہیں ان کے سدباب کے لیے کیا کیا جاتا ہے۔ آیا ان پر بھی عملی طور پر کوئی حکمت عملی اپنائی جاتی ہے یا محض کاغذی کارروائی کر کے آئندہ کے لیے بس بلند و بانگ دعوے ہی کیے جاتے ہیں۔ سامنے عزیزان من کی محفل چار چاند لگائے ہوئے تھی۔ جھنگ سٹی سے محمد مرتضیٰ احتشام پرہم نظر آئے۔ لیکن تبصرہ ہنستا مسکراتا گلابی گلابی سا تھا۔ پری زے خان کا تیر ان کی انکشاف بھی اچھا لگا۔ محبوب عباسی کی دلچسپ خبریں تبصرے کو جاندار بنا گئیں۔ افکار حسین وہ زلزلہ عظیم سانحہ تھا جس میں پوری قوم زلزلہ زدگان کے غم میں شریک تھی اور ہیں احمد خان، سجاد خان، ضیا ہبہ زہرہ کی فرمائش کے ساتھ تبصرے زبردست تھے۔ جب آزمائشیں آتی ہیں تو اس کے در پے وہی سرخرو ہوتے ہیں جو اس کی آزمائش پر صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں۔ ایمانی انداز آوارہ گرد کہانی کے آغاز سے انجام تک نظر آیا۔ امریکی جھوٹ بولتے ہیں، وہ ایک سے بے وفائی اور دھوکا ان کا وتیرہ ہے، انہوں نے جرمنوں کا روپ دھار کر دھوکے سے جاپانیوں سے یورینیم حاصل کی اور ایٹمی طاقت بن بیٹھے۔ حصار دوراں میں کیا کیا ہوتا گیا، جو پانی پیپا ہوئے، مگر وقت کے ساتھ قابل فخر قوم بن کے ابھرے۔ عالمی منظر نامے پر کاشف زبیر نے زبردست روشنی ڈالی ہے۔ محی الدین نواب کی عجیب و غریب کہانی مسیحا طلسماتی اثر لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ کہانی پڑھتے ہوئے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے طلسم ہوشربا یا الف لیلیٰ کی داستان چل رہی ہو۔ سرورق کی پہلی تحریر میں دولت کی ہوس میں اندھے باپ سائیں کی سفاکی ظاہر ہوئی تو دل اور روح حیرت زدہ ہو گئے۔ رشتوں ناتوں سے قطع نظر جب ظلم حد سے بڑھتا ہے تو اس کا انجام بھی ایسے ہی ہوا کرتا ہے۔ سلیم فاروقی کی سندھ دھرتی سے جڑی تحریر اچھی رہی۔ احمر سفنانہ کے ساتھ مل کر جو چال چلی، وہ کامیاب رہی اور اپنے بچاتے ہوئے سوفٹ ویئر کو حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا۔"

جانِ جاناں کی پہلی شمولیت چارسدہ سے "آج پہلی بار محفل کو شرف باریابی بخش رہے ہیں۔ جاسوسی سے تعلق 12 سال پرانا ہے لیکن لکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا ہے۔ (اتنے سال کس سوچ میں گزار دیے؟) شمارہ حسب معمول 5 تاریخ کو ملا، سرورق پر نظر دوڑائی تو وہی یکسانیت اور جمود جو ہم پاکستانیوں کا خاصہ ہے، یہاں بھی نظر آئی۔ کیا مرد حضرات صرف کرخت اور صنف نازک شوخ گل ہوتی ہیں؟ بہرحال مزید اپنا دل جلانے کے بجائے فہرست پر نظریں دوڑائیں۔ ہمیں ہمیشہ سے کاشف زبیر کا نام پڑھ کر دلی مسرت ہوتی ہے ان کی کہانیاں انتہائی جاندار اور شاندار ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے انہی کی کہانی یعنی حصار دوراں پڑھ کر بے اختیار دل چاہا کہ ان کے ہاتھ چوم لیں۔ انتہائی بہترین پلاٹ، جاندار کردار اور بہترین منظر کشی کی گئی تھی۔ حصار دوراں کے بعد اپنی فیورٹ اسٹوری آوارہ گرد پڑھی۔ کہانی بہت بہترین اور بہت تیز جاری ہے ایکشن اور سسپنس کا حسین امتزاج ہے۔ شبری کے بعد بیگم صاحبہ اور اس کے بعد شفیق شاہ کی کہانی نے متاثر کیا۔ سرورق کی کہانیوں میں مریم کے خان کی تیز سی چال، انتہائی خوب صورت کہانی تھی۔ احمر کا کردار پڑھ کر ذہن میں یہی آیا کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ ہمارے ملک میں باصلاحیت نوجوانوں کی کمی نہیں بس ان کو موقع ملنے کی دیر ہے۔ زیبا کو انسانی ہمدردی کا صلہ خوب ملا۔ دوسری کہانی، سفاک مجرم انتہائی فضول کہانی تھی۔ باقی قسط وار کہانیوں میں مسیحا کو پچھلی قسط میں ہی درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ انتہائی معذرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے چونکہ نواب صاحب کی اکثر کہانیوں میں نفسیاتی الجھنیں ہوتی ہیں تو ہمیں خود بھی یہ صاحب نفسیاتی مریض نظر آتے ہیں۔ میرا جاسوسی سے دلی تعلق ہے اس لیے ہم اسے ایک مثالی شمارہ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

سہیل اختر اعوان، لاہور۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور ہزارہ۔ بارث کھر جلی پور جھونی۔ شیر دل خوکر، عمرانس خوکر، میانوالی۔ محمد خاور، گجرات۔ رانا زاہد حسین، پنچوں کی ملیاں، شیخوپورہ۔ شازیہ ایمان، ہری پور۔ انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ ظفر اقبال، مقامیال۔

انگارے کے مصنف کا نام بوجھنے کے سلسلے میں قارئین کی بڑی تعداد نے دلچسپی لی۔ بیشتر قارئین نے مختلف نام تحریر کیے۔ ذیل میں ان قارئین کے اسمائے گرامی ہیں جنہوں نے صحیح نام تجویز کیا۔

شبیر محمد، پشاور۔ محمد نسیم، کوٹ رادھا کشن۔ سلیمان شاہ، ایبٹ آباد۔ سائیں داد، عمرکوٹ۔ یوسف پریرا، کراچی۔ سعید بلوچ، کراچی۔ شہزادی، لاہور کینٹ۔ انبرٹ ڈی سوزا، راولپنڈی۔ نعمان انصاری، شورکوٹ۔ زینت سمون، لاڑکانہ۔ ناہید بٹ، ملتان۔ رضوان قریشی، حیدرآباد۔ محمد علی، مظفرآباد۔ مراد شاہ، کنڈیارو۔ سید یاسر، لاہور۔ فاروق انجم ساحلی، لاہور۔ انور علی، کوئٹہ۔ شائستہ علی، کراچی۔ طور خان، کراچی۔ شاہ زیب خان، کوئٹہ۔ عبدالمجید، لاہور۔ نعمان انصاری، سکھر۔ عبیداللہ، نواب شاہ۔ عبدالرؤف، لاڑکانہ۔ شہنشاہ حسین، کراچی۔ سائیں داد، لاڑکانہ۔ مدد علی، کوٹری۔ کرن سہیل، حیدرآباد۔ رؤف آفندی، حیدرآباد۔ اصغر شنوبری، کراچی۔ ذیشان حیدر، لاہور۔ نوشاب، نواب شاہ۔ کاشف علی، رحیم یار خان۔ شہزاد خان، صادق آباد۔ صنم بی بی، بہاولپور۔ دل مراد، احمد پور شرقیہ۔

قرعہ اندازی کے ذریعے مندرجہ ذیل دس قارئین کو جولائی 15 کا شمارہ بطور انعام رجسٹرڈ ڈاک سے روانہ کیا جائے گا۔

1 سید اکبر شاہ، مانسہرہ۔ 2 کاشف عبید کاوش، بگرام۔ 3 طاہرہ گلزار، پشاور۔ 4 رجب علی، مورو۔ 5 یاسمین شاہ، لاہور۔ 6 مرحا گل، ڈی آئی خان۔ 7 زرنم ناز، کراچی۔ 8 گل ریز خان، گجرانوالہ۔ 9 محمد عاصم، سیالکوٹ۔ 10 شاہد علی خان، حیدرآباد۔

انعام یافتہ قارئین اپنے پوسٹل ایڈریس سے دفتر کو فوری آگاہ کریں تاکہ ان کا انعامی شمارہ بروقت ارسال کیا جا سکے۔

سوناچاندی

احمد اقبال

انسان جب کسی شعلہ بردوش... سہمیں بدن حسینہ کے اشاروں پر ناچنے لگتا ہے تو کوئی بھی کام اسے مشکل نہیں لگتا... بزدل کے لیے تو صائمہ کُل کائنات تھی... مستند تھا صائمہ کا فرمایا ہوا... وہ ہر حیثیت سے اور ہر میدان میں اپنی خود اعتمادی، ایک دل آویز تمکنت... جراتِ فکر و اظہار اور بے خوفی کا لوہا منوا چکی تھی... اس کے باوجود کچھ ایسے کام تھے جو صرف بزدل کے لیے مخصوص تھے... ڈاکوئوں اور قانون کے رکھوالوں سے اس کے خاص تعلقات تھے... وہ جو جرم کرتے تھے اور بزدل ہردل پکارتے تھے... بزلہ سنجی اور حاضر جوابی کے نادر نمونے کے ہمراہ احمد اقبال کی ہنستی مسکراتی... اتھلاتی تحریر...

پرتجسس اور تیز رفتار کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے توشۂ خاص...

نام کا شخصیت پر اثر ہوتا ہے، سیانے کہتے ہیں۔ میں نے روزنامہ ”حقیقت ساز“ کے دفتر میں مدیرِ محترم مرزا تنگ چنگیزی عرف توپ صاحب کو ایک جنگِ عظیم لڑتے دیکھا تو میں بزدلوں کی طرح میز کے نیچے گھس گیا۔

توپ صاحب کا حریف اپنی جسامت میں روایتی سائز کے پٹھان کا خلاصہ لگتا تھا۔ تاہم اس کی مونچھیں ایکسٹرا لارج تھیں اور وہ پگڑی کو ہر دم سنبھالتا تھا جو اس کے دائیں بائیں مینڈک کی طرح پھدکنے سے پھسل کر آنکھوں پر آجاتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں مچھر مار دوا سے بھری اسپرے گن تھی۔ وہ جب اس کا رخ توپ صاحب کی طرف کر کے فائر کرتا تو ان کی ولدیت بھی بدل دیتا تھا۔ اس نے توپ صاحب کو ان گنت گندے، گندے اور زیادہ ناپاک اور حرام جانوروں کی اولاد کہا۔ یہ سب وہ سنتے تو یقیناً لرزتے۔

توپ صاحب کے ہاتھ میں چھت کے جالے صاف کرنے والا برش تھا جس سے وہ حملہ آور کو آٹھ فٹ دور رکھنے

میں خاصے کامیاب تھے۔ دشمن کی طرح وہ بھی اپنی پھندنے والی ترکی ٹوپی کو گرنے سے بچانے کے لیے کوشاں تھے اور حریف کے زبانی حملوں کا بھی دندان شکن جواب دے رہے تھے۔

دشمن نے غوطہ مار کے برش کے دائرے سے خود کو بچایا اور عین سامنے سے فائر کیا۔ دھویں جیسی پھوار توپ صاحب کی شیروانی پر پڑی مگر اثرات ناک تک پہنچے تو انہوں نے ٹوپی سنبھال کے چھینک ماری۔ ”ابے نطفۂ ناتحقیق... کیمیائی جنگ پر پابندی ہے۔ جنیوا کنونشن پڑھ لے جاہل۔“ اور اس کے ساتھ ہی برش کا وار کیا۔ اس کے سخت بال اس کی ناک میں گھس گئے۔

وہ بھی چھینک مار کے اُچھلا اور چند فٹ پیچھے ہٹ کے چلایا۔ ”مچھر کا بچہ، ابھی تم چت سے گرے گا۔“ اور اسپرے گن سے فائر کیا۔ اس کی پگڑی پھر آنکھوں پر آ گئی۔

توپ صاحب نے لمبے ڈنڈے والے برش کو شمشیر بے نیام کی طرح لہرایا۔ ”نامعقول خرذات، ہم بتاتے ہیں تجھے کہ خاندانی اشراف کیسے آبرو پر جان نچھاور کرتے ہیں۔“

برش پگڑی پر لگا تو وہ اس کی ناک پر لٹک گئی۔ پٹھان نے بڑی عجلت اور مہارت سے اس کو اونچا کر کے کانوں پہ جمایا۔ ”ہم سات نسل سے بدلہ لیتا ہے گیدڑ کا بچہ۔“ اور مسلسل اسپرے سے بڑا قاتلانہ حملہ کیا۔

”گیدڑ؟ ابے ہم پہ بزدلی کا الزام۔“ توپ صاحب چھینکتے، کھانستے کونے میں پناہ گزیں ہوئے۔ ”ایک چنگیزی خون کے وارث پر تہمت... ہم ابھی تیرا قلع قمع کرتے ہیں اولادِ بے نکاح...“

اس معرکہ آرائی کے اسباب اس کے گرتے پرخون کی گل کاری سے عیاں تھے۔ حسبِ معمول توپ صاحب نے بارہ مسالے والے پان کی گلوری کو منہ کے مکسچر میں گھومنے کے بعد کھڑکی سے سڑک پر اُگلا ہوگا۔ ایسا وہ بڑی مہارت سے دن میں دس بار کرتے تھے اور اس رنگین پھوار کے پانچویں منزل سے نیچے پہنچنے میں جتنی دیر لگتی تھی، اس سے پہلے وہ سر واپس اندر کر کے کھڑکی بند کرنے میں مہارت حاصل کر چکے تھے۔ پھر بھی سال میں ایک دو بار کسی کی عقابی نظر سطحِ زمین سے دیکھ لیتی تھی کہ پانچ منزلوں کی پچیس کھڑکیوں میں سے یہ ژالہ باری کہاں سے نازل ہوئی ہے۔ توپ صاحب اسے اپنی خشک و بے رنگ زندگی کی واحد تفریح قرار دیتے تھے جو متاثرین کا لباس یا حلیہ بگاڑ دیتی تھی۔ یقیناً آج بھی ایسا ہی ہوا تھا اور میں توپ صاحب کی ادارتی میز کے نیچے سے اقوامِ متحدہ جیسا خاموش تماشائی بن کے دیکھنے کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔

مجھے اس منظر کو دیکھتے ہوئے وہ نظم یاد آئی جو میں نے بچپن میں پڑھی تھی۔ ایک تھا تیتر ایک بٹیر... لڑنے میں تھے دونوں شیر... لڑتے لڑتے ہو گئی گم... ایک کی چونچ اور ایک کی دُم... بہت جلد اسپرے گن میں مچھر مار تیل ختم ہو گیا اور توپ صاحب کے قدیم برش کا سر اس کے تن سے جدا ہو گیا۔ دشمن نے اسپرے گن کھینچ کے ماری جس کو توپ صاحب نے صرف بانس رہ جانے والے برش سے یوں روکا جیسے ٹینس میں بیک ہینڈ سرو روکتا ہے۔

”ابھی ہم آتا ہے اصلی بندوق لے کر... کالا کتا کا بچہ...“ وہ پسپا ہو کے دوڑا اور زینے میں غائب ہو گیا۔ ”تھری ناٹ تھری لائے گا۔“

”ہاں، ہاں... ہم منتظر ہیں... تو لے آ بجلیوں کی توپ پسرِ ابلیس ملعون۔“ توپ صاحب نے خونی ڈنڈا دیوار کے سہارے کھڑا کیا اور کرسیٔ ادارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ ”میاں بزدل! نکل آؤ تم بھی مورچے سے۔“

میں ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”توپ صاحب! پٹھان زبان کے پکے ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تھری ناٹ تھری کی رائفل کے ساتھ پھر نمودار ہو اور دعا ہے آپ کو مرحوم و مغفور کر دے، میرا حساب بے باق کر دیں۔ وہ ضرور آئے گا۔“

پھولی ہوئی سانس بحال کرتے ہوئے انہوں نے بارہ مسالوں والی پٹاری کھول کے تازہ گلوری بنانی شروع کی اور مسکرائے۔ ”بخدا اپنے ایمان سے کہو تم نے دیکھا، کیا دادِ شجاعت دی ہم نے۔ آباؤ اجداد کی ارواح بھی خوش ہوں گی۔“

”فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سارے واجبات ادا کر دیے تو آپ کے لیے سنگِ مرمر کا کتبہ لگواؤں گا جس پر لکھا ہوگا... حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے بلکہ پوری قبر سنگِ مرمر کی بنوا دوں گا۔“

”اپنے برخوردار میاں بدیع الزماں ولد نواز تالہ موسوی...“ انہوں نے وہ لہجہ اختیار کیا جو وہ کسی اہم خطاب کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ”تم پر ابھی ہمارے خاندانی جوہر کھلے نہیں۔ اس نام نہاد پور نیل دشمن کی آمد سے قبل ہم اپنے آباؤ اجداد کی مخروط کار شمشیرِ آبدار نے آ گئیں گے۔ اور بس اس کے بعد تم دیکھنا اس کے جہانِ فانی سے کوچ کا منظر۔“

”لاحول ولاقوۃ... خودکار تلوار... آپ کے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔“

انہوں نے قابلِ رحم نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”خودکار پستول ہو سکتا ہے تو خودکار تلوار کیوں نہیں ہو سکتی صاحب زادے۔“

”یہ مجھے آپ سمجھادیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بزدل ہی نہیں جاہل بھی ہوں میں۔“

انہوں نے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا۔ ”جدِ امجد ہمارے... کیا نام تھا ان کا... ہاں آقائے غضب علی... طوفان تخلص فرماتے تھے۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ایک بدبخت کافر نے آپ کو قبل از وقت جنت الفردوس میں پہنچانے کا سوچا ہی تھا کہ شاہ جنات کو علم ہو گیا۔ اس نے خودکار شمشیر آبدار ارسال کی۔ خیال دل میں آتا تھا تو تلوار دستِ مبارک میں از خود حرکت کرتی تھی۔ وہ نابکار جیسے ہی سامنے آیا۔ شمشیر آپ کے دستِ مبارک میں لہرائی اور اس کا سر آپ کے قدموں میں آ گرا۔ گو قدرے زنگ لگ گیا ہے اسے لیکن وہ ہے آٹومیٹک... مکمل خودکار۔“

میں نے ہاتھ جوڑے۔ ”خدا کے لیے بس کریں۔ یہ ہے میرا حساب۔“

انہوں نے بڑی شفقت سے کاغذ پر نظر ڈالی۔ ”تمہاری جگہ ہم ہوتے تو صبر اختیار فرماتے۔ یومِ حشر تک۔ جب سَو گنا ملیں گے۔“

”دو لاکھ چالیس ہزار سات سو چھیاسی۔“ میں نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

توپ صاحب پھرتی سے اٹھے۔ کھڑکی کھول کر مرغے کی طرح گردن گھمائی اور دائیں بائیں دیکھ کے پیک کا تازہ ملغوبا اگل دیا۔ بڑی پھرتی سے کھڑکی بند کر کے انہوں نے پھر حساب ملاحظہ کیا۔ ”دو لاکھ چالیس ہزار بھی ملیں گے۔ فی الحال سات سو چھیاسی لو۔ مبارک عدد ہے مگر آج کا قطعہ پہلے...“

تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب اخبار میں اشاعت کے لیے میں توپ صاحب کا قطعہ تاریخ وفات ان کے حوالے کرنے والا تھا، صائمہ نے ایسے قدم رنجہ فرمایا جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ حسبِ معمول میں اس کے نظارۂ جمال میں گم ہو گیا۔ یہ حسنِ پریشان کی سحر آفریں تصویر تھی۔ نکھرے آسمان جیسے نیلگوں رنگ کی قمیص کے ساتھ اس کا زرد بسنتی دوپٹا کاندھے پر جھول رہا تھا اور ساون کی گھٹا جیسے بالوں کے آوارہ بالوں میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ حسبِ عادت اس نے توپ صاحب کو مؤدبانہ سلام کیا۔

پھر وہ کرسی کھینچ کے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ ”تمہارا فون کیوں بند ہے؟“

میں نے فون نکالا۔ ”لاہور کی میٹرو بس بند ہو سکتی ہے مگر تمہارے لیے میرا فون بند نہیں ہو سکتا، آزمائش شرط ہے۔“

اس نے میرا نمبر ملایا۔ صائمہ کے لیے مخصوص رنگ ٹون میں فون گانے لگا۔ ”جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔“

وہ خفگی سے بولی۔ ”یہ ابھی آن کیا ہے تم نے اور اس منحوس رنگ ٹون کو ابھی تک بدلا نہیں تم نے...“

”بدل دوں گا۔ بعد از نکاح فنیش کا گانا ہو گا۔ گائے جا گیت ملن کے۔“

توپ صاحب کا رویہ صائمہ کے لیے قطعی مختلف کسی شفیق بزرگ جیسا ہوتا تھا۔ ”نورِ چشم، پریشانی تمہارے چہرے سے ہویدا ہے۔“

”جی، وہ ایک مسئلہ ہے۔ آپ کے بزدل صاحب کو ان کے مرقد پر دیکھنا، فون کرتی رہی پھر سوچا آپ سے معلوم کروں۔“

میں نے آہ بھری۔ ”خود غرض حسینہ! مجھ بدبخت ہجراں نصیب کی یاد تمہیں اسی وقت آتی ہے جب کوئی مسئلہ درپیش ہو؟“

”اچھا اب اٹھو اور چلو میرے ساتھ۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”ایک فاقہ زدہ شخص بوجہ نقاہت اٹھنے سے بھی قاصر ہے۔ کانپتی ٹانگوں سے پانچ زینے اترنا اقدامِ خودکشی کہلائے گا۔“

وہ مسکرائی۔ ”کھانا میں نے بھی نہیں کھایا ہے۔ ساتھ کھائیں گے۔“

”گویا چائے تم نوش نہیں فرماؤ گی؟“ توپ صاحب نے کہا۔ ”فی امان اللہ۔“

صائمہ کی ڈبیا کار میں سرنگوں بیٹھنے کے باوجود میری کھوپڑی اس کی چھت کو بجاتی رہی۔ ”کیا تم یہ انکشاف فرما سکتی ہو کہ لنچ ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں کریں گے۔“

اس نے نظر سڑک پر رکھی۔ ”ابھی تو ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“

میں نے دہل کے کہا۔ ”تم گائنی وارڈ میں ہو۔ میں وہاں لیٹ کر کیا کروں گا۔“

”تمہیں میڈم نے طلب کیا ہے۔ اپنے آفس میں۔“

کالوں پر اتر آئے۔

میرا ہاتھ رک گیا۔ ''نوشی! آپ کی بیٹی؟''

صائمہ نے کہا۔ ''نوشابہ نام ہے اس کا، گورنمنٹ کالج میں انگلش کی ٹیچر تھی۔''

سوگوار خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں میڈم نے پانی پی کے ٹشو پیپر سے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''اس کی شادی طے ہو چکی تھی۔ اسی کا کلاس فیلو تھا بڑا اچھا لڑکا ہے اور بہت شریف لوگ ہیں۔ دیر اس سے ہوئی کہ لڑکا جاب ملنے سے پہلے شادی کے حق میں نہیں تھا۔ باپ اس کا بزنس مین ہے۔ خوش حال خاندان ہے لیکن وہی مردوں کی انا۔ بیوی کمائے اور میں نکما بیٹھوں... اب بتاؤ یہ بات پھیلی تو کیا ہوگا؟''

''کیا پولیس کو بتادیا ہے آپ نے۔''

میڈم نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیسے بتاتی اور مجھے معلوم ہے وہ بھی کہتے کہ خاموشی سے انتظار کریں۔ ڈاکو اس کے بدلے رقم کا مطالبہ کریں گے۔ عموماً وہ چوبیس گھنٹے میں فون کردیتے ہیں۔''

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ ''لیکن ڈکیتی کی جگہ کوئی ثبوت شہادت بن سکتی ہے۔''

''کوئی چیز نہیں چھیڑی میں نے ابھی تک۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ کس سے کہوں... پھر مجھے تمہارا خیال آیا اور میں نے سوچا صائمہ سے مدد لوں... تم نے کھانا کیوں روک دیا؟''

میری بھوک مر چکی تھی۔ صائمہ نے بھی ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ کھانا جوں کا توں رکھا رہا۔ ''کتنے گھنٹے ہوگئے اس بات کو؟''

''وہ صبح پانچ بجے آئے تھے۔ نقد تو صرف پچاس ہزار کے قریب تھے۔ میرا زیور تھا اور نوشی کا۔ وہ سب دے دیا میں نے۔ جاتے وقت ایک نے کچھ سنگھا دیا مجھے... ناک پر رومال رکھ دیا۔ میں بے ہوش ہوگئی۔ آٹھ بجے ہوش آیا۔ بڑی مشکل سے واش روم گئی اور منہ دھویا۔ پھر کافی بنائی اپنے لیے۔ گھر میں کام کرنے والی خادمہ ذرا دیر سے آئی۔ ساڑھے آٹھ بجے... تو میں نے اسے واپس کردیا۔''

''یہ آپ کو کب پتا چلا کہ نوشی گھر میں نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہوش میں آتے ہی... سوا آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تو وہ کالج چلی جاتی ہے۔ وہ کمرے میں نہیں تھی، ناشتا وہ اپنے لیے خود بنا لیتی ہے۔ ایک ابلا ہوا انڈا، بلیک ٹی، براؤن بریڈ کا ایک سلائس... میں اٹھتی ہوں تو کچن میں گندے برتن ہوتے ہیں اور پلیٹ میں انڈے کے چھلکے... وہ نہیں تھے پھر میں نے کمرے میں دیکھا اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسے ڈاکو لے گئے ہیں۔''

''کیسے اندازہ ہوا؟''

''اس کی الماری کھلی پڑی تھی۔ زیور غائب تھے۔ میں تو پاگل ہوگئی۔ دس بجے میں نے صائمہ کو بلایا۔ یہ لیبر روم میں تھی۔ گیارہ بجے آئی۔ اس نے بھی کہا کہ جلدی مت کریں۔ پولیس آئی تو بات اخبار والوں تک پہنچے گی۔ اس نے تمہارے حوالے سے کہا کہ ایسا ہوتا ہے... اغوا کرنے والے رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو بہت بڑی ہوتی ہے۔ لیکن سودا ہو جاتا ہے ایک چوتھائی پر... ضروری ہوا اور تم نے کہا تو سی پی ایل سی سے مدد لیں گے۔'' وہ خاموش ہوگئی اور آنسو صاف کرتی رہی۔ ''ابھی تک تو کال آئی نہیں، دس گھنٹے ہوگئے۔''

''آپ نے بہت دیر کی مجھ سے رابطہ کرنے میں، خیر میں کرتا ہوں کچھ۔ آپ فون کو چارج اور آن رکھیں۔''

''بزدل، بدنامی ہوئی تو... یہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔ میں جیتے جی مرجاؤں گی۔ تمہارے ڈاکوؤں سے اچھے مراسم ہیں۔''

میں نے ضبط سے کام لیا۔ ''دیکھیے، ڈاکو صرف ڈاکو ہوتے ہیں اور میں کسی کو شرافت کی تلقین نہیں کرسکتا کہ یہ کام چھوڑے اور نوکری یا کاروبار کرلے۔ میں نے صرف ان کی وکالت کی اور عدالت سے ان کی سزا کم کرادی یا انہیں بری کرادیا۔ اگر پولیس نے زبردستی کسی کو مجرم بنادیا تھا، لین دین کے جھگڑے میں یا کسی کے کہنے پر... ان کے جرم کو بڑھا دیا تھا جھوٹی گواہی سے۔''

''مگر صائمہ نے بتایا تھا کہ تمہاری عزت کرتے ہیں۔'' میڈم نے کہا۔

''ڈاکو عزت کریں تو کیا یہ فخر کی بات ہے۔ بات یہ ہے میڈم کہ بد اچھا بدنام برا... یہ مشہور ہوگیا کہ میں ڈاکوؤں کا وکیل ہوں جو مجرم تھے وہ بھی میرے مؤکل بن گئے۔ ان کے ساتھی آگئے کہ انہیں بچاؤ... ورنہ نہیں بچیں گے۔ میں کیا کرتا انکار کیسے کرتا؟''

''وہ فیس بھی تگڑی دیتے ہوں گے؟''

''دیتے ہیں۔ لاکھوں دیتے ہیں کہ رشوت پہنچاؤ آگے... ساتھ لے جاتے ہیں کہ جج سے بات کرو، اسے دھمکی دو ہماری طرف سے، پولیس سے کہو گواہ پیش نہ کرے، سرکاری وکیل کو خرید و۔ میں تو بڑی مشکل میں ہوں میڈم۔

پولیس بھی ایسا ہی سمجھتی ہے کہ میں ایک حصے دار ہوں۔ انکار کروں تو وہ صائمہ کو اٹھالیں گے جیسے آپ کی نوشی کو اٹھایا۔ اور پھر اس ملک میں صحافی کو ملتا کیا ہے۔ ایک تیسرے درجے کے اخبار میں... جو چیتھڑے کہلاتے ہیں۔ زرد صحافت کرتے ہیں۔ نام ہی اخبار کا "حقیقت ساز" ہے۔ کیا مشکلہ خیز بات ہے مگر سچ ہے اس ملک میں حقیقت بنائی جاتی ہے جھوٹ سے۔"

"مگر تمہاری صحافت بھی چلتی ہے۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "چلتی ہے؟ کیا چلتی ہے؟ ہفتے میں ایک کالم لکھتا ہوں وہ چلتا ہے۔ قطعہ پڑھ کے لوگ صرف محظوظ ہوتے ہیں۔ صائمہ سے پوچھو معاوضہ کیا ملتا ہے؟"

صائمہ نے نظر جھکالی۔ "کچھ نہیں۔"

"اب ایسا ہی ہے میڈم، صحافی بھوکے مر رہے ہیں، سوائے چند ایک بلیک میلرز کے۔ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ قتل ہو رہے ہیں آئے دن۔ یہ طویل بحث ہے... آپ اسے چھوڑیں..." کھانے سے ہاتھ رک چکا تھا تو میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔

"میرا خیال ہے اب ہم چلیں۔" میں نے کہا۔ انشاءاللہ... سب ٹھیک ہو جائے گا میڈم۔"

میڈم نے بل ادا کیا اور ہم کار پارکنگ کی طرف گئے۔ انہوں نے کہا۔ "کیا تم مصروف ہو آج شام؟"

"شام تو ہو چکی ہے۔ کوئی خاص مصروفیت بھی نہیں ہے میری۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"میں چاہتی تھی تم میرے ساتھ چلو۔ میں اب آفس نہیں جاؤں گی۔"

"آج آپ کو آفس آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔ "گھر پر کون ہے اس وقت؟"

"کوئی نہیں، میں چاہتی تھی کہ صائمہ میرے ساتھ رہے۔" انہوں نے تذبذب سے کہا۔

میں اس تذبذب کا مطلب سمجھ گیا۔ "کوئی حرج ہے اگر میں بھی ساتھ چل کے دیکھ لوں۔ ویسے یہ کام پولیس کا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ... مجھے کچھ نظر آ جائے۔"

انہوں نے مجھے شکر گزاری اور اطمینان کے ساتھ دیکھا۔ "میں بھی چاہتی تھی۔ ویسے تو ڈرنے کی بات کوئی نہیں لیکن آج مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ میں اکیلی ہوں۔ تم جب اور جہاں کہو گے شوفر چھوڑ آئے گا۔ صائمہ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گی ابھی۔"

صائمہ نے پیچھے والی سیٹ پر آہستہ سے میرے ہاتھ پر اپنا چھوٹا سا نرم اور ٹھنڈا ہاتھ رکھا۔ اظہارِ ممنونیت کا یہ پیار بھرا انداز تقاضا کرتا تھا کہ میں اپنی بانہیں اس کے شانے کے گرد ڈال کے اسے مزید قریب کروں اور چوم لوں۔ لیکن میڈم کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا۔ پی سی صائمہ کے اسپتال اور میڈم کی رہائش گاہ سے مساوی فاصلے پر کہیں درمیان میں تھا۔ یہ پانچ سو گز کا چھوٹا لیکن پھر بھی بہت بڑا گھر تھا۔ اس علاقے میں جہاں بیشتر بنگلے ہزار اور دو ہزار گز کے تھے۔

"میڈم! ابھی پھر لڑکی پیدا کیا خانہ خراب کا بچی نے۔" اس نے دروازہ کھول کے ناراضی سے مطلع کیا۔

میڈم نے خفگی سے کہا۔ "نور خان! اب اسے فارغ کرو۔ تیسری کر لو۔"

پلاٹ چھوٹا تھا لیکن سامنے کا حصہ مختصر لان اور خاصے خوب صورت باغ کے لیے کافی تھا۔ گاڑی پورچ میں رکی تو میں اور صائمہ، میڈم کے پیچھے پیچھے لاؤنج میں پہنچے۔ اندر نیم تاریک ماحول میں سوگواری کی فضا غالب تھی۔ میڈم نے لائٹس آن کر کے کہا۔ "میں چائے بناتی ہوں تمہارے لیے یا کافی لو گے؟"

میں نے کہا۔ "اگر مشکل نہ ہو تو کافی۔"

"نہیں، مشکل کیسی۔ میں خود ہی بناؤں گی تم بیٹھو۔"

"بڑا مال بنالیا تمہاری میڈم نے، کیا بنگلا ہے اور یہ ڈیکوریشن، یا شوہر چھوڑ گیا تھا؟"

"اس وقت یہ میری طرح او ایم او تھیں۔ شوہر بھی شاید کسی کمپنی میں منیجر یا انجینئر تھا۔ یہ لوگ گلشن کے سی ٹائپ میں تھے۔" صائمہ نے کہا۔

"کوئی رقم ملی تھی انشورنس وغیرہ کی...؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ جب بھی پہلے میڈیکل سیلز مین تھا۔ پھر اپنی دواؤں کی دکان کھول لی تھی۔ لہٰذا امن تشفی رہی۔ مرکاری اسپتال کے ایم ایس کو تم کیا سمجھتے ہو؟"

"وہی جو تم سمجھتی ہو۔ غریبوں کے لیے ملنے والی دوائیں اور ترقیاتی فنڈ کھانے والے۔ میڈیکل اکوپمنٹ اور ایکسرے وغیرہ کی خرید میں کمیشن پر عیش کرنے والے۔ انہیں باہر بھیج دیا جاتا ہے ہر ٹیسٹ کے لیے۔ سی ٹی اسکین کیسے کرا سکتا ہے اپنے خرچ سے کوئی؟"

"ان کا کمیشن اس میں بھی پکا۔ بلکہ زیادہ تر پرائیویٹ لیب ان کے کسی عزیز کی ہوتی ہیں جہاں یہ غریبوں کو بھیج دیتے ہیں۔ قیامت آخر کیوں نہیں آتی؟" میں نے ایک دم آواز بلند کر کے میز پر مکا مارا۔

صائمہ اچھل پڑی۔ لیکن اس کے بولنے سے پہلے

میڈم نے ڈرے ڈرے سے ساتھ قدم رنجہ فرمایا۔ ”قیامت میرے لیے تو آ گئی بیٹا۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے میرے ابتدائی مکالمے نہیں سنے تھے۔ ”میں سمجھتا ہوں آپ کے دکھ کو، لیکن میرا خیال ہے کہ جرم کی ایسی سنگین واردات سے پولیس کو بے خبر رکھنا غلطی ہوگی۔“

”تم چاہتے ہو میں ایف آئی آر درج کراؤں؟“ وہ پریشانی سے بولی۔ ”بات پھیل جائے گی۔“

”دیکھیے، خدانخواستہ، خدانخواستہ آج رات تک کسی نے تاوان کے لیے فون نہ کیا تو کل تاریخ بدل جائے گی۔ ایک دن کی تاخیر کا بھی نقصان ہو سکتا ہے۔ اس معاملے میں پہلے میں پولیس سے مشورہ کرلوں۔ کچھ قابلِ اعتماد دوست ہیں میرے۔“

”ظالم خان میرا مطلب ہے ڈی ایس پی رحم دل خان ان کے بچپن کا دوست ہے اور یہ اس کے سامنے بھی ہیں۔“

”اچھا، اچھا لیکن وہ پوچھے گا کہ اتنی دیر کیوں کی؟“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”یہ ناممکن نہیں ہے کہ... واردات آج کی بنا دی جائے۔ ابھی تو گھر کے لوگوں کو بھی پتا نہیں نہ چوکیدار کو نہ ماسی کو... ابھی ہفتہ دس دن تو سب کو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کالج کے طلبا کا گروپ لے کر سوات گئی ہے یا کاغان... لیکن مجھے پوری امید ہے کہ اس سے پہلے نوشی واپس آجائے گی۔“

”اگر ایک کروڑ مانگ لیے انہوں نے... پھر؟“

”میں دس لاکھ میں سودا کرا دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”دس لاکھ؟“ میڈم نے چیخ ماری۔ ”کہاں سے لاؤں گی میں دس لاکھ بھی... زیور گیا، بینک میں مشکل سے ایک لاکھ ہوں گے۔ دیکھو کسی طرح بھی اپنے ڈاکو دوستوں کو قائل کرو، ایک غریب بیوہ کو معاف کر دیں۔“

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”غریب؟ آپ اتنے بڑے اسپتال کی ایم ایس ہیں۔ کوئی مانے گا میری بات اور میں صاف بتا دوں، کاروبار میں دوستی یا رشتے داری کا لحاظ نہ بزنس مین کرتا ہے اور نہ ڈاکو۔ ویسے وہ ایک کروڑ مانگتے تو آپ روپیہ کے ایک چوتھائی پر انہیں راضی کر سکتی تھیں۔ میں دس فیصد کی گارنٹی دے رہا ہوں۔ یہ محض میرے لحاظ کی وجہ سے ہوگا۔ بلا معاوضہ وہ مجھے نہ چھوڑیں۔“

”دس لاکھ۔“ انہوں نے دل پر یوں ہاتھ رکھا جیسے ہارٹ اٹیک ہو چکا۔

مجھے بڑھیا پر غصہ آنے لگا۔ ”میڈم! وہ آپ کی اکلوتی بچی ہے۔ اگر اتنی محبت ہے اس سے تو دس لاکھ کیا ہیں، یہ مکان ہی ایک کروڑ کا ہوگا۔“

صائمہ نے کہا۔ ”دس لاکھ تو گاڑی کے بھی بن جائیں گے میڈم! کسی چھوٹے گھر میں رہ سکتی ہیں آپ...؟“

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”اچھا، کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”لیکن یہ تو اس صورت میں ہے کہ ڈاکو واقعی اسے تاوان لے کر واپس کر دیں۔ وہ ایک جوان لڑکی ہے۔ خوب صورت بھی ہوگی اگر آپ کے جیسے ہوگی۔ آپ جانتی ہیں اس ملک میں جنسی جرائم کا حال... یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ دس دس لاکھ میں فروخت ہوتی رہے۔“

”خدا کے لیے ایسا مت کہو۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں معافی چاہتا ہوں لیکن حقیقت سے نظر چرا کے شترمرغ کی طرح ریت میں سر چھپانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ خود کو ذہنی طور پر بدترین صورتِ حال کے لیے تیار رکھیں اور اللہ سے خیروعافیت مانگیں۔ کیا اب میں آپ کا اور نوشی کا کمرا دیکھ سکتا ہوں، جہاں ڈاکو لوٹ مار کرتے رہے؟“

اس نے آنسو پونچھ کے اقرار میں سر ہلایا اور کھڑی ہو گئی۔ میڈم کے بیڈ روم میں سب الٹا پلٹا پڑا تھا۔ الماری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے کپڑے نکال کے باہر پھینک دیے گئے تھے۔ زیورات کے لال نیلے مخمل والے ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ میں کون سا شرلاک ہومز تھا کہ بال کی کھال سے سراغ نکالتا۔ فنگر پرنٹ اور جرم کے دوسرے آثار دیکھ سکتا۔ پھر میں نوشی کے کمرے میں گیا۔ صائمہ کسی معاون جیسی فرماں برداری سے میرے ساتھ رہی لیکن صاف نظر آتا تھا کہ وہ میری لیاقت، ذہانت اور شرافت کے ساتھ مجھ پر اپنی محبت کے کنٹرول اور میری اصلی تے وچی عاشقانہ اطاعت پر بھی نازاں ہے کہ دیکھو کیسے سوا چھ فٹ کے بندے کو نکیل ڈال رکھی ہے اور حکم کا غلام بنا رکھا ہے۔

نوشی کے بیڈ روم کا نقشہ زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن یہاں کپڑے اور زیورات کے خالی باکس بیڈ پر پڑے تھے اور کھلی الماری میں جو کپڑے موجود تھے وہ نوشی کی عمر کے مطابق زیادہ فیشن ایبل اور ماڈرن تھے۔ سرسری جائزے کے دوران میں نے کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے سے گریز کیا۔

”اب میں چلتا ہوں۔ اپنا فون ہاتھ میں رکھیں۔ گھر کا فون نمبر مجھے بتا دیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں رات کو پھر آؤں۔ دیکھتا ہوں ظالم خان سنتا ہے تو کیا کہتا ہے۔ اپنے

شوفر سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔ یہاں ٹیکسی تو ملے گی نہیں۔'' میں نے کہا۔

صائمہ نے کہا۔ ''میں ہوں یہاں، کوئی پیش رفت ہوئی تو بتا دوں گی۔''

☆☆☆

''ظالم خان! آج میں اتنا غم زدہ ہوں کہ دو نہیں چار سموسے کھاؤں گا۔''

''پہلے اپنے گھر میز پر سے ہٹاؤ سالے، صحافی کی دم۔'' اس نے میز پر ڈنڈا بجایا۔

''کتنا دردناک واقعہ ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ ساری خدائی ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف۔ لیکن میں اپنی فطری شرافت اور بزدل ہونے کی وجہ سے اپنے قدم شریف ہٹا لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر مجھ سے تم دکھی ہونے کا سبب پوچھو۔''

''سبب معلوم ہے مجھے، کسی غریب بڈھے، بزدل صحافی کے بجائے اس ڈاکٹر نے کسی دولت مند بڈھے سے شادی کرلی ہوگی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔'' ظالم خان نے کہا۔

''اس اشتعال انگیز بیان پر میں عموماً قتل کر دیتا ہوں۔ لیکن خیال ہے بیوی کے بیوہ ہونے کا، معاملہ ہے ایک ڈکیتی کا۔''

''دیکھ بھائی! میں صاف بتا دوں۔ میں اپنی عزت داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ تو چاہے تو چھوڑ اس پھٹیچر اخبار کو اور خود بھی شامل ہو جا ڈاکوؤں کے گروہ میں۔'' اس نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا جب ایک ماتحت چائے اور سموسے رکھنے کے لیے آیا۔

''ڈاکوؤں کا سب سے بڑا گروہ تو خود پولیس ہے لیکن اس وقت میں ضرورت مند ہوں اس لیے سچ نہیں بولتا۔ معاملہ ضرور ڈاکوؤں کا ہے مگر واردات ڈکیتی کی نہیں، اغوا کی ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''کیا وہ ڈاکٹر صاحب کو اٹھا لے گئے؟ چل مبارک ہو۔ مل جائے گی تجھے بھی کوئی اندھی بہری۔''

میں نے میز پر ہاتھ مارا۔ ''درمیان میں مداخلت کی ضرورت نہیں۔ معاملہ ہے ایک پیچر کا جو بیٹی ہے اسپتال کی ایم ایس کی۔ جو باس ہے صائمہ کی، جو میری آقا و مالک ہے۔''

اس نے توجہ سے میری بات سنی۔ ''سترہ اٹھارہ گھنٹے ہو گئے اور اماں بیٹھی ہے چپ۔''

''یار بڑھیا حبطی سے زیادہ لالچی لگتی ہے مجھے۔ ایک کروڑ کے مکان میں رہتی ہے اور مال بھی بہت بنایا ہوگا وزارت صحت کے بجٹ میں سے۔ مگر بیٹی کے لیے دس لاکھ کی بات پر بھی واویلا کرتی ہے فرعی کا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی تک تاوان کے لیے کسی نے رابطہ نہیں کیا؟ عموماً چوبیس گھنٹے میں مطالبہ سامنے آجاتا ہے۔ اب میں یہ کر سکتا ہوں کہ فون کو آبزرویشن پر لگوا دوں۔ کال کا پتا تو فون سے چل ہی جائے گا۔ آواز بھی ریکارڈ ہونا چاہیے۔''

''رپورٹ کا کیا ہوگا؟''

''اگر واقعی کسی کو علم نہیں تو میں بعد میں لکھوا دوں گا۔ سی پی ایل سی والوں سے بات کی جا سکتی ہے لیکن پہلے میں خود ایک نظر دیکھ لوں جائے واردات کو اور دکھی ماں سے مل لوں۔ چل اٹھ۔'' وہ میرے ساتھ باہر آگیا۔

''گاڑی کہاں ہے آپ کی سر۔'' میں نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔

''یہ کیا اونٹ کھڑا ہے۔'' اس نے ایک بالکل نئی سفید کرولا کی طرف اشارہ کیا۔

''واہ سالے صاحب' کیا لمبا ہاتھ مارا ہے ترقی پاتے ہی۔'' میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کے کہا۔

''ہذا من فضل ربی۔'' اس نے میرے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا۔ ''وہ خیر بھی اچھی تھی۔ تیری بہن کو دے دی۔''

جب اس کی بیوی نے مجھے بھائی کے مرتبے پر فائز کیا تو بدلہ لینے کے لیے ظالم خان نے ڈاکٹر صائمہ کو بہن بنانے میں دیر نہیں کی۔ چنانچہ اب ہم دونوں بیک وقت سالے بہنوئی بھی تھے۔ وہ ذرا عقل سے کام لیتے تو ایسی غلطی نہ کرتے۔ اس پر اب دہرا دباؤ تھا۔ ایک گھر والی کا دوسرا بہن کا... اور میں دونوں کو لیور کی طرح استعمال کرتا تھا۔ تاہم وہ میرا احسان مند بھی تھا کہ اس کی اعلیٰ کارکردگی اور ''ایمانداری'' کا ڈھول میں نے بھی اپنے کالموں میں پیٹا تھا اور دو چار صحافی دوستوں سے بھی مدد لی تھی۔ اس کی پروموشن میں خاصا دخل اس پروپیگنڈے کا بھی تھا۔

لوٹی کے گھر میں ''اسٹیٹس کو'' تھا یعنی صورت حالات جوں کی توں تھی۔ میڈم پولیس کی وردی میں ڈی ایس پی کو دیکھ کر گھبرائی تھی مگر ظالم خان نے اس کو بہت تسلی دی۔ ''آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں۔ کیونکہ صائمہ میری بہن ہے۔''

وہ حیران ہوئی۔ ''صائمہ تم نے کبھی ذکر نہیں کیا؟''

''جی، یہ دونوں ہی آپس میں سالے بہنوئی ہیں اور حقیقی بھائی ہوتا میرا تب بھی شاید اتنا خیال رکھنے والا نہ ہوتا۔ آپ ان پر اتنا ہی بھروسا کر سکتی ہیں جتنا مجھ پر۔''

میڈم کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ ''تم دیکھو

سے پہلے جائے واردات کو۔“

ظالم خان نے سر ہلایا۔ ”ظاہر ہے اور آپ مجھ سے کچھ چھپا نہیں رہی تھیں، نہ غلط بیانی کریں گی۔ سو فیصد سچ بولیں گی۔“

ظالم خان نے دونوں کمروں کا تفصیلی جائزہ لیا اور میڈم سے بہت زیادہ سوالات کیے جو سب تفتیش میں اس کی تجربہ کاری اور مہارت کا ثبوت تھے۔ کچھ سوالات نے میڈم کو پریشان بھی کیا لیکن ظالم خان کا چہرہ بے تاثر اور سپاٹ رہا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے کچھ ہدایات دے کر رخصت لی۔ میڈم چاہتی تھی کہ میں بھی رات کو وہیں رک جاؤں مگر میں نے انکار کر دیا۔

اس کی گاڑی گیٹ سے باہر آئی تو ظالم خان نے کہا۔ ”بڑھیا، بچی تو خیر ہوئی مگر وہ فراڈ بھی ہے۔ جھوٹ بول رہی ہے۔“

میں بھونچکا۔ رہ گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”میں نے فارسی تو نہیں بولی سائیں صاحب۔“

”یعنی ڈکیتی کی کوئی واردات نہیں ہوئی؟ وہ ڈراما کر رہی ہے؟“

ظالم خان نے سر ہلایا۔ ”واردات ہوئی ہے مگر میڈم اور اس کی بیٹی دونوں کو نہیں لوٹا گیا۔ سارا زیور ماں کے پاس تھا جو قیمتی ہوگا۔ سونا آج کل کی لڑکیاں کہاں پہنتی ہیں۔ فیشن ہے امیٹیشن جیولری کا اور اس قبائلی جیولری کا جو زینب مارکیٹ میں بھری پڑی ہے۔ بڑے بڑے پلاسٹک کے یا پتھر کے رنگ برنگے نیکلس... غالباً انہیں امیٹیشن سیٹ جیولری کہا جاتا ہے۔ ایسے ہی کڑے اور انگوٹھیاں۔“

”اس کا اندازہ کیسے ہوا تجھے؟“

”ان ڈبوں سے یار جو نوشی کے کمرے میں تھے۔ میڈم کے کمرے میں خالی باکس اصلی جیولری کے تھے اور خاص بات یہ کہ ڈاکوؤں نے ان کو عجلت میں خالی کر کے اِدھر اُدھر پھینک دیا تھا۔ کپڑے بھی اسی طرح پھینکے گئے تھے مگر نوشی کے کمرے میں کپڑے بیڈ پر تھے کچھ... اور خالی ڈبے بھی وہیں تھے۔“

”اس سے کیا ثابت ہوا؟“

”ثابت یہ ہوا کہ نوشی نے خود اطمینان سے بیٹھ کے کپڑے بھی منتخب کیے، جیولری بھی چھانٹی اور پھر چلی گئی۔“

میں پھر بھونچکا۔ رہ گیا۔ ”یعنی ڈاکو نہیں لے گئے اسے؟“

”نہیں، وہ بعد میں گئی ہے اپنی مرضی سے، کیوں، کہاں، کس کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے گا۔“

میں اس انکشاف پر دم بخود بیٹھا رہا لیکن اس کی پیشہ ورانہ مہارت پر مبنی رائے کو مفروضہ یا خیالِ خام قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر بھی واضح ہو رہا تھا کہ میڈم کسی ڈاکو کی کال کے لیے بے چینی سے منتظر کیوں نہیں تھی۔ وہ معاملے کو پولیس کے پاس کیوں نہیں لے جا رہی تھی۔ اگر ظالم خان نے حقیقت سمجھ لی تھی تو یہ انتہائی صدمے اور غصے کی بات تھی کہ بڑی بی نے مجھ سے یا صائمہ سے بھی سچ نہیں بولا۔ بے وقوف عورت... آخر اس بات پر کب تک پردہ پڑا رہ سکتا تھا کہ اس کی بیٹی اغوا نہیں ہوئی، بھاگ گئی ہے۔ اسے رشتہ ٹوٹنے کی پریشانی زیادہ تھی۔

ظالم خان مجھے اپنے گھر لے گیا جہاں رات کا کھانا ہم نے دس بجے کھایا۔ اس کی حد سے زیادہ خدمت گزار نیک اور سلیقہ مند اور خوب صورت بیوی نے مجھے روک لیا پھر رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ اب مجھے نوشی کی طرف سے کوئی تشویش لاحق نہیں تھی۔ اس کی جان محفوظ تھی، یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔

رات ایک بجے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے صائمہ کو فون کیا۔ اس نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ”جی ہیلو۔“

میں نے لہجے میں اصلی اسلامی شہد سے بھی زیادہ مٹھاس پیدا کر کے کہا۔ ”جانم! جاتی ہو اس وقت میں نے فون کیوں کیا؟“

”نہیں اور جاننا بھی نہیں چاہتی۔“

”ظالم حسینہ اثر کرے نہ کرے سن تو لے میری فریاد۔“

”کیا فریاد، وہی ڈائیلاگ بولو گے کہ شبِ فرقت ہے اور راتے تارے گن چکا ہوں، صبح تک جینا محال ہے۔“

”تمہاری قسم یہ نہیں کہوں گا۔ حالانکہ تم سننا چاہتی ہو۔ اس کا تعلق اس چیز سے ہے جو تمہاری میڈم تھی۔“ ”اسے کچھ نہ سننا ہوتا تو پہلے جواب کے بعد لائن کاٹ کے فون بند کرتی اور سو جاتی۔ مگر یہ لڑکیاں...“

”تھی کیا مطلب، اس کی جان کو خطرہ ہے کوئی؟ کس سے ہے؟“

”خطرہ مجھ سے ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔ ”اس وقت جو کتاب میں پڑھ رہا ہوں اس کا نام ہے، قتل کر کے پکڑے نہ جانے کے ایک سو ایک طریقے، یہ تمہاری میڈم کی زندگی کی آخری رات گزر رہی ہے۔ تم چاہو تو اسے جگا

سے کہہ دو کہ کلمہ وغیرہ پڑھ لے۔“

”کیا فضول بولے جا رہے ہو، ایسی کیا بات ہو گئی آخر؟“

”اب جو انکشاف میں ایٹمی دھماکے کی طرح کرنے والا ہوں اسے سن کے تم اچھل پڑو گی۔ ایسا نہ ہو بیڈ سے گر جاؤ۔“

”یا میرے خدا... کچھ بتاؤ تو سہی، ورنہ میں فون بند کرتی ہوں۔“

”بلبل جان، میں بزدل ضرور ہوں۔ دیوانہ بھی ہوں تمہارا... لیکن بے وقوف اور احمق بالکل نہیں ہوں۔ آخر کیا سمجھ کے اس نے اتنا سفید جھوٹ بولا۔ وہ جو اس کی دخترِ نیک اختر ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس نے خود قتل کر کے اسے کہیں گاڑ دیا ہو، مثلاً اسی بیڈ روم کے فرش کے نیچے جہاں اوپر تم خواب ناز میں ہو۔“

”تم نے کیا پیا ہے؟ بھنگ، چرس، ہیروئن یا شراب؟“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لالچی عورت نے زرِ کثیر کے عوض اپنی لختِ جگر کو بیچ دیا ہو کسی عرب شیخ کے ہاتھوں لاکھوں درہم میں... لیکن وہ اغوا نہیں ہوئی ہے۔ اس نے ڈکیتی کا ڈراما رچایا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ پریشان ہوئی۔

”ہاں، ہو گئے نا چودہ بلکہ پندرہ طبق روشن... جب تفتیش ہو گی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا... اول تو اس کے گھر میں کوئی ڈاکا نہیں پڑا۔ اس کے آنسوؤں پر مت جاؤ، ڈاکٹر ہو، دیکھ سکتی ہو کہ رومال جس سے وہ آنکھیں صاف کرتی تھی اس میں گلیسرین تو نہیں تھی۔“

”یہ ظالم خان نے کہا ہے؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”اس کا امکان پھر بھی ہے کہ ڈاکو اس کے گھر سے سب لے گئے۔ مگر اس کی بیٹی انہیں پسند نہیں آئی ہو گی۔ وہ نہیں لے گئے۔“

”پھر نوشی کہاں گئی؟“

”یہ ہے تمہارا پہلا دانش مندانہ سوال... ڈاکو اسے نہیں لے گئے اور ماں کے ہاتھوں اس کا خون بھی نہیں ہوا تو پھر وہ بھاگ گئی۔ مطلب یہ کہ دوڑی نہیں، کسی آشنا کے ساتھ نکل گئی۔ ہمت ہوتی تم میں تو تم کب کی میرے ساتھ نکل جاتیں اور ہم بیٹھے ہوتے دنیا دے اس نکڑ سے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔“

”کسی بزدل کے ساتھ کیسے نکل جاتی مگر نوشی کو ایسی حرکت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں صبح بات کرتی ہوں میڈم سے۔“

”نورِ چشم... راحت جان ابھی تم یہ سمجھو کہ بقول ظمی شاعر... نہ میں نے کچھ کہا نہ تم نے کچھ سنا۔ یہ بڑھیا ہر صورت میں میرے ہی کندھے پہ بندوق رکھے گی۔ اس کے فرار کا راز فاش ہو گیا تب بھی مجھ سے ہی کہے گی کہ اب سراغ لگاؤ میری لختِ جگر کا۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ دو پیار کرنے والوں کی دنیا اجاڑوں اور وہ بیٹھے ہوں گے کہیں قطب شمالی پر یا ماؤنٹ ایورسٹ پر تو ان کی تلاش میں خود گم ہو جاؤں، ہاں تم ساتھ چلو تو...“

دل کی بات زبان پر یوں رہ گئی کہ میرا موبائل داغِ مفارقت دے گیا۔ میں نے اسے چارج پر لگایا اور سو گیا۔

ظالم خان جب تھانے دار سے ڈی ایس پی بنا تو کڑوا کریلا نیم چڑھا کے مقابلے میں اس کے اختیارات تو بڑھ گئے تھے مگر رعب داب یا دہشت کم ہو گئی تھی۔ پہلے وہ گشت پر نکلتا تھا تو ہر طرف سے تھانے دار صاحب سلام کی صدا آتی تھی جس نے خواب میں بھی چوری یا ڈکیتی کا سوچا ہو وہ دبک جاتا تھا کہ تھانے دار کی نظر تاڑ رہی ہے کہ یہ ہے جو جرم کرنے کے ابھی خواب دیکھ رہا ہے۔ اب کئی تھانے دار اس کے ماتحت تھے مگر اسے آفس میں بیٹھنا پڑتا تھا جہاں اس سے بڑے کئی فرعون تھے اور تھانے داروں سے بھی بنا کے رکھنی پڑتی تھی کہ ان کے کام کرتے رہیں۔ وہ میرے جاگنے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں چلنے لگا تو اس کی بیوی نے کہا۔ ”بھیا! خیر کھڑی ہے لے جاؤ۔“ مگر میں نے ٹیکسی کو ترجیح دی۔

ٹیکسی میں بیٹھ کے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسپتال کے لیے روانہ نہیں ہوئی۔ صائمہ، میڈم کے ساتھ ڈاکوؤں کی کال کا انتظار کر رہی ہے جو ابھی آئی ہی نہیں تھی۔ ”میری تو مت ماری گئی ہے کس کی مانوں کس کی نہ مانوں۔“ اس نے فون پر کہا۔ ”میڈم کی یا تمہاری۔“

میں نے آہ بھری۔ ”میری پہلے کب مانی ہے تم نے قاتل مسیحا عرف خوب صورت بلا... ورنہ آج میرے دو چار بچوں کو کھلا رہی ہوتیں گود میں۔“

عادی ہو جانے کے بعد وہ ایسی باتوں کا نوٹس ہی نہیں لیتی تھی۔ ”رات کو چین کی نیند سو کے اٹھی ہے اور اب میرے سامنے بیٹھی دہل رہی ہے صبح سے کہ ڈاکوؤں نے بیچ بیچ ایک کروڑ کا تاوان مانگ لیا اور پچاس لاکھ پر اڑ گئے تو کیا ہو گا۔ کہاں جاؤں گی میں بڑھاپے میں؟“

’’اس سے جنا ید کی اولاد ہوم ہے اور فی الحال شہر خموشاں میں قیام فرمانے کا ارادہ نہیں ہے۔‘‘

’’میں سارا دن یہاں بیٹھ کے جھک نہیں مار سکتی۔ کتنی دیر میں آ رہے ہو تم؟‘‘

’’جانم میں تو آ پہنچا سمجھو۔‘‘ میں نے ٹیکسی سے اتر کے کہا اور سیدھا اندر چلا گیا۔

صائمہ کا چہرہ مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ ایسا پہلے بھی ہوا تھا تو مجھے یاد نہ تھا۔ خود میں نے اسے دیکھا تو میری نظریں اس کے نظارۂ حسن میں گم ہو گئیں۔ وہ ایک نئے روپ میں جلوہ گر تھی جو میرے لیے اب تک فقط آرزو کی بات تھی۔ وہ خوش لباس اور خوش ذوق تھی۔ انداز حسن میں رنگوں کا جادو بھی جگاتی تھی لیکن اس کے مزاج میں متانت تھی۔ وہ فیشن سے چکاچوند پیدا کرنے کی قائل نہ تھی اور میری فرمائش کے باوجود تھی یا فیشن انچرز کے انداز کو چھچھورپن سے تعبیر کرتی تھی۔ حالانکہ اپنی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش سے وہ ڈاکٹر سے زیادہ کالج گرل ہی لگتی تھی۔

اس وقت وہ ایسے ہی ڈریس میں تھی جس میں رنگ ہی نہیں تراش خراش کا وہ جلوہ تھا کہ لگتا تھا وہ ریمپ پر کسی ماڈل کی طرح کیٹ واک کے لیے تیار ہے۔ اس بے محابا جلوۂ حسن نے جیسے میرے خرمن عقل و ہوش کو خاکستر کر دیا۔

صائمہ میرے گھورنے سے لال ہو گئی۔ ’’یہ... نوشی کے کپڑے مجھے میڈم نے پہنا دیے۔ میرے پہلے ہو رہے تھے نا۔ کل دن میں پہنے اور پھر رات کو پہن کر سوئی۔‘‘

’’بیٹھو۔‘‘ میڈم نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ’’نوشی کی وارڈ روب دیکھی تھی تم نے... ہر مہینے پرانے قرار دے کر وہ چار نکال دیتی تھی۔ خواہ دو بار پہنے ہوں۔‘‘

میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ’’صائمہ کے اندر ایک دلکش متانت ہے۔ ایک جمالیاتی ذوقِ حسن۔‘‘

صائمہ نے سکون کا سانس لیا اور شکر گزاری کے ساتھ مجھے دیکھا۔ ’’وقت گزرتا جا رہا ہے اور ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔‘‘

’’اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ رپورٹ لکھوانے کا کوئی فائدہ نہیں اور لکھوانی ہو گی تو ظالم خان ہے۔ آپ پچاس لاکھ تیار رکھیں، کال کسی بھی وقت آ سکتی ہے۔‘‘

میں نے میڈم کے تاثرات دیکھے۔ وہ واقعی غم زدہ اور پریشان تھی۔ ’’پچاس لاکھ... کون دے گا مجھے؟‘‘

میں نے اسے مزید ہراساں کیا۔ ’’فوراً تو یہ سودخور دیتے ہیں جو ہنڈی کا کام بھی کرتے ہیں۔ بینک سے لون میں لمبی کارروائی ہوتی ہے۔ یہ رہن کے کاغذات سائن کراتے ہیں اور پیسا ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ شرح سود بے شک بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن اب اور راہ سے بڑھ کر کیا ہے۔ آپ کہو تو میں بات کروں کسی سے؟‘‘

’’تم ڈاکوؤں سے بات کرو نا۔ کیا فائدہ تمہارے صحافی ہونے کا اور ان مراسم کا...‘‘

میں نے بات کا رخ ایک دم پلٹ دیا۔ ’’نوشی کا رشتہ جہاں طے کیا تھا آپ نے اور شادی کب تک متوقع تھی؟‘‘

’’میں نے بتایا تھا نا... اسے کوئی اچھی سی جاب مل جائے۔‘‘ اس نے بے چینی سے گھڑی دیکھی۔

’’میڈم نے بتا دیا ہے مجھے سب۔‘‘ صائمہ نے مجھے آنکھ ماری۔

’’دیکھو مجھے تو اسپتال جانا ہے۔ وہاں سارا انتظام الٹ پلٹا ہو گا۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔‘‘

صائمہ نے کہا۔ ’’میرا تو ڈے آف ہے۔ پھر بھی مجھے ہوسٹل جا کے کپڑے تو بدلنے ہوں گے۔‘‘

’’میں نوشی کا کمرا ایک نظر پھر دیکھ سکتا ہوں، صائمہ کے ساتھ۔‘‘

’’دیکھو، دیکھو۔‘‘ میڈم نے کہا۔ ’’میں چلتی ہوں۔ گاڑی دوبارہ آ جائے گی تمہارے لیے، دن میں فارغ ہی ہوتی ہے۔‘‘

ظالم خان کی بریفنگ کے بعد میری نظر کا جیسے لینز بدل گیا تھا۔ میں نے پھر الماری کا معائنہ کیا تو اس کی باتوں میں چھپی ہوئی سچائی یوں سامنے آنے لگی جیسے بہو کے اصلی جوہر ساس کو شادی کے بعد نظر آنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ ترتیب سے لٹکے ہوئے کپڑوں میں ترتیب باقی تھی۔ درمیان میں مجھے بہت سے خالی ہینگر نظر آئے۔ میں نے الماری کے پیچھے والی درازیں کھولیں۔

صائمہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ’’کیا تلاش کر رہے ہو جاسوسِ اعظم؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’ایک ایسی ہی لڑکی جن کے دیکھو جیسی اس وقت تم نظر آ رہی ہو۔‘‘

’’کیا دیکھوں؟‘‘

’’اوہو یار مجھے نہیں، اس وارڈ روب میں کہ کیا نہیں ہے۔ یہ جو کپڑے موجود ہیں، کتنے پرانے ہیں۔ زیورات کے جو ڈبے موجود ہیں، کیا وہ بیش قیمت ہیں؟ جوتے کیسے ہیں؟‘‘

"کپڑے زیادہ پرانے نہیں مگر قیمتی نہیں۔ یہ لان کے پرنٹس برانڈ ونظر آتے ہیں۔ فرسٹ کاپی ہیں اور یہ سیکنڈ کاپی۔" اس نے ہینگر میں لٹکے کپڑوں کو آگے پیچھے ہٹا کے کہا۔

"ذرا آسان اردو میں سمجھاؤ۔"

"دیکھو آج کل ہر سیزن میں نئے ڈیزائن کی لان آتی ہے۔ گل احمد، نشاط جیسے ملز کے پرنٹ مہنگے ہوتے ہیں۔ کوالٹی کی وجہ سے کچھ نام بھی چلتے ہیں، ہر سال گرمیوں سے پہلے ہی پبلسٹی شروع ہو جاتی ہے۔ اوریجنل بہت مہنگے ہوتے ہیں تو چھوٹی مل دوسرے درجے کے کپڑے پر وہی پرنٹس لے آتے ہیں۔ اصل میں ہاتھ کا کام ہوتا ہے تو کاپی میں مشین کا... یہ نسبتاً سستے ہوتے ہیں پھر بالکل فضول کپڑے پر وہی ڈیزائن مشینی پرنٹس میں آجاتے ہیں۔ یہ سیکنڈ کاپی کہلاتے ہیں۔ اور غریب لڑکیاں بھی اپنا شوق پورا کر لیتی ہیں۔ پاکستان میں کاپی رائٹ کی خلاف ورزی تو سگنل توڑنے کی طرح ہے۔ کوئی نہیں پوچھتا۔" اس نے شاکی لہجے میں کہا۔ "یہ جو میں نے پہن رکھا ہے یہ فرسٹ کاپی ہے۔"

"تو شی غریب لڑکی تو نہیں تھی۔"

"کنجوس ماں پیسے خرچ نہیں کرنے دیتی ہوگی۔" میں نے غور فرما کے کہا۔ "ہوں، جوتے اور ہینڈ بیگ۔"

"سب برانڈڈ لگتے ہیں... مگر کاپی ہیں۔" اس نے کسی ماہر کی طرح فرمایا۔

"او کے، اب زیورات کو دیکھو اور پھر کاسمیٹک کو۔" میں نے کہا۔

"جیولری تو سب امیٹیشن ہے۔ خیر امیٹیشن کا فیشن ہے لیکن امپورٹڈ بھی کم مہنگی نہیں۔ یہ سب میڈ ان ڈالو کمیت ہے اسی لیے ڈاکو نے کر نہیں گے۔"

"وہ چھوڑ گئی۔" میں نے تصحیح کی۔ "ضرورت کی تھوڑی بہت چیز لے گئی۔"

"تم اتنے یقین سے ساتھ کہہ رہے ہو؟"

"دیکھو، اس نے ایک بیگ پیک کیا، سفری بیگ اور نکل گئی۔ ضرور کوئی آیا ہوگا اسے لے جانے کے لیے، ڈاکو بعد میں آئے۔ ماں کو یقین ہے کہ اس کا کوہ نور ہیرا ڈاکو لے گئے مستند ہے اس کا فرمایا ہوا۔"

"مستند ہے کس کا فرمایا ہوا؟"

''ظالم خان دی گریٹ کا اور کس کا۔ اس کی نظر نے جو دیکھا تمہاری نظر نے تصدیق کر دی۔ ابھی یہاں ہمارا کام ختم۔''

''تم میڈم سے بات کیوں نہیں کر لیتے کہ تمہیں کیا شک ہے۔'' وہ میرے ساتھ باہر آ گئی اور اس نے میرے کمر کے گرد ہاتھ ڈالنے پر بھی احتجاجی مظاہرہ نہیں کیا۔ ''دیکھو وہ اس سفید جھوٹ پر کیا پردہ ڈالتی ہے۔''

''بلبلِ بغداد، ذرا میں تصدیق کر لوں۔ گاڑی آ جائے پھر ہم چلتے ہیں۔''

وہ کسمسا کے مجھ سے الگ ہو گئی۔ ''خادمہ بھی ہے گھر میں۔''

''پھر کیا ہوا۔ اسے اپنی جوانی یاد آ جائے گی جب کوئی اس طرح...'' میں نے غیر متوقع حملہ کیا اور جملہ نامکمل چھوڑ کے اسے چوم لیا۔ خلافِ توقع اس نے برہمی نہیں دکھائی۔ شاید اس نے فیشن کے گیٹ اپ میں اپنی دلکشی کا مجھ پر اثر دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ قصوروار میں نہیں اس کا انداز حسن ہے۔ اس کا چہرہ لال ہوا اور زیرِ لب مسکرا کے اس نے کہا۔ ''بدتمیز۔'' اور بیگ سے کٹ نکال کے لبوں کی لالی کو ٹھیک کرنے لگی۔

باہر سے کار کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے کہا۔ ''میری ایک بات مانو گی؟''

اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔ ''کیا؟''

''آج تمہارا ڈے آف ہے۔ مجھے تو بقول غالب، عشق نے ہم کو نکما کر دیا۔ آج آوارہ گردی کرتے ہیں۔''

''کہاں آوارہ گردی کرتے ہیں؟''

''بس تم اسی ادائے حسن کے ساتھ میرے ساتھ رہو۔ آج سارا دن تمہارے سوا میں کسی کو نہ دیکھوں۔ کسی کے بارے میں نہ سوچوں۔ گاڑی بھی ہے ہمارے پاس۔ فرصت بھی ہے۔ رسمِ دنیا بھی ہے موقع بھی دستور بھی ہے۔''

اس نے ایک ادائے ناز سے سر پہ ہاتھ رکھا۔ ''یا میرے خدا! کیسے خبطی سے پالا پڑا ہے۔ گاڑی میں ایک ڈرائیور بھی ہوگا اور تم جذبات سے بے قابو ہو رہے ہو۔''

''ڈرائیور کو سمجھو لو کار کا ایک پرزہ ہے جس سے گاڑی چلتی ہے۔ ویسے میں وعدہ کرتا ہوں، بدتمیزی کوئی نہیں ہو گی۔ سمندر پر چلتے ہیں۔ کچھ دیر گھومیں گے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ پھر وہیں ''سائن پلیکس'' میں کوئی فلم دیکھنے بیٹھ جائیں گے مگر فلم نہیں دیکھیں گے۔ بس اندھیرے میں ساتھ ساتھ بیٹھے رہیں گے۔ ہاتھ میں ہاتھ دیے۔ آج ٹین ایجرز کی طرح بی ہیو کریں گے۔ ٹھیک ہے؟''

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر مسکرائی اور آہستہ سے اقرار میں سر ہلا دیا۔ وہ شاید میری زندگی کا خوب صورت ترین دن تھا۔ ہم نے اپنے موبائل بند کر دیے تھے اور دنیا کو بھلا دیا تھا۔ ہم سمندر پر قدموں کو چومتی لہروں میں ساحل کی ریت پر چل رہے تھے۔ جوتے ہمارے ہاتھوں میں تھے اور تیز ہوا میں اس کے کپڑے اور بال اڑ رہے تھے۔ ہم نہیں دیکھ رہے تھے کہ دیکھنے والے ہمیں کیسے دیکھ رہے ہیں۔

''میڈم کہے گی کہاں بھاگ گئے گاڑی لے کر... فون بھی بند ہے۔ نوشی کی ذرا فکر نہیں۔'' صائمہ بولی۔

''بھاڑ میں جائے نوشی، جب اس کی ماں کو پیسے کی زیادہ فکر ہے تو ہمیں کیوں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے یہ لڑکی ہے کیسی؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ تم سے زیادہ خوب صورت تو خیر نہیں ہو سکتی مگر صورت کیسی ہے اور لچھن کیسے ہیں؟''

وہ ہنسی۔ ''صورت اچھی ہے۔ لچھن کیسے ہیں یہ مجھے نہیں معلوم۔ کیوں؟''

میں نے کہا۔ ''چاہنے والوں اور جان دینے والوں کا تعلق انہی دو خوبیوں سے ہوتا ہے، کتنے ہیں اور کیسے ہیں، بہت ہوں تو ایک عقل کا اندھا ایسا نکل ہی آتا ہے جو سارے خطرات مول لے کر نکال لے جائے، جان کی بازی لگا دے۔''

''آخر اسے ڈکیتی کی کہانی سنانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تم سے کہتی کہ نوشی کا پتا چلاؤ اور اسے سمجھاؤ۔''

''ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے یقین کے مطابق نوشی کو ڈاکو لے گئے ہوں۔ ورنہ وہ میرے تمہارے پاس کیوں آتی۔ لڑکی نے سچویشن کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا تاکہ اسے تھوڑی سی مہلت مل جائے۔ یہ شام تک پتا چل جائے گا۔''

''کیا پتا چل جائے گا؟''

''یہی کہ منگیتر کون ہے اور مجنوں کون... مگر یہ ہم ان کی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟''

''مجھے تھوڑا سا احساسِ جرم ہو رہا ہے۔ میڈم پریشان ہوں گی۔''

''یہ سزا ہے میڈم کی۔ چلو میٹنی شو کا ٹائم ہو گیا۔''

سینما کے اندھیرے میں وہ میرے کندھے پر سر

رہے بیٹھی رہی۔ ہم پاپ کارن کے چوکور کارٹن میں سے ایک دوسرے کو کھلاتے رہے۔ یہ انجانی نین ایج رومانس کی حرکت اسے بھی اچھی لگی۔ میں تو خیر بادلوں میں پرواز کرہی رہا تھا۔ انٹرول ہوا تو میں باہر سے دو کوک لے آیا۔ فلم دوبارہ شروع ہوئی تو اس نے اچانک کہا۔ ”آخر ایسے کب تک چلے گا؟“

”اس کا جواب تم ہی دے سکتی ہو، بہتر دل حسینہ۔“

وہ چپ رہی۔ ”دو کمروں کا ایک فلیٹ لینا تمہارے لیے ناممکن نہیں تھا۔“

”جیسے کرائے کے فلیٹ میں رہنا تمہارے لیے ناممکن نہیں تھا۔“

”تمہارے لچھن خراب ہیں اور تمہارے وہ لٹیرے یار...“

”انہیں بھی ٹھیک کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے مگر تم ضد پر اڑی ہوئی ہو۔“ میں نے کہا۔

فلم ختم ہونے سے پہلے ہی ایک رومینٹک دن تمام ہو گیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھے تو صائمہ نے کہا۔ ”ڈرائیور اسپتال چلو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے ایف ٹی سی پر اتار دینا۔“

خواب جیسا ایک دن یوں ختم ہوا کہ گاڑی سے اترتے وقت میں نے صائمہ کی طرف نہیں دیکھا اور اس نے مجھے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ میں نے ایک ٹیکسی روک کے کہا۔ ”شیر شاہ چلو۔“

یہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ نوشی کے ہونے والے شوہر کا باپ بزنس مین ہے بزنس کی نوعیت کا مجھے علم نہیں تھا۔ شیر شاہ کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ہی بزنس آتا تھا۔ گاڑیوں کے پرانے پارٹس کا بزنس۔ میڈم نے کہا تھا کہ وہ لوگ خاصے خوش حال ہیں۔ نوشی کے ہونے والے سسر کی شیر شاہ میں فیکٹری بھی ہو سکتی تھی۔ یہ انڈسٹریل ایریا سے ملا ہوا علاقہ تھا۔ مگر خوش حال تو وہ کباڑی بھی بہت ہوتے ہیں جو شیر شاہ کی تنگ سی ڈیزل کی اور کیچڑ سے بھری گلیوں میں کروڑوں کا بزنس کرتے ہیں اور ٹوٹی پھوٹی گاڑیوں، پرزوں کے ڈھیر، نامکمل انجنوں اور ٹائروں کے درمیان خود بھی کباڑ ہو جاتے ہیں لیکن ایک اسپتال کی ایم ایس کسی کباڑی کہلانے والے سے اپنی تعلیم یافتہ بیٹی کا رشتہ کیوں کرنے لگی خواہ وہ کروڑپتی ہو۔ اس کا ایک سوشل اسٹیٹس ہے اور اسے رشتوں کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، فوجی افسر، سول سروسز سب ملتے ہیں اکلوتی دولت مند لڑکی کے لیے۔

یہ کام پولیس میں سفید بھیڑ تلاش کرنے سے زیادہ مشکل تھا مگر اللہ مہربان تھا۔ کباڑی بازار اور انڈسٹریل ایریا کے سنگم پر مجھے ایک خضر راہ مل گیا۔ وہ ایک چائے کے کھوکھے والا تھا جس کی مار خاصی دور تک تھی۔ چھوٹی چھوٹی بغیر پرچ کی پیالیوں کی ایک کثیر تعداد اس کا ثبوت تھی۔ تقریباً پچاس کے قریب اس کے کھوکھے میں معلق تھیں۔ اتنی ہی کا دو بالٹیوں کے پانی میں غسل دیا جا رہا تھا۔ بالٹی کا پانی اس حد تک چائے کے رنگ کے ہو چکا تھا کہ اب وہ گرم کر کے اور چینی گھول کے پلاتا تو پینے والا چائے کا حظ اٹھاتے۔ غالباً اس سے دگنی تعداد میں گردو نواح کے کاروباری علاقے میں گردش پذیر تھے۔

چائے کے کھوکھے پر جو شخص بیک وقت ابلتی چائے میں مسلسل دودھ، چینی، پتی ڈالنے، چمچہ چلانے، گاڑھے میٹھے لذیذ مشروب سے قطار میں رکھی چھوٹی بڑی ہر پیالی بھرنے اور کپ رکھ کے ٹرے سمیت اپنے ٹریولنگ سیلز مین کو کسی سمت روانہ کرنے اور واپس آنے والوں سے رقم کی وصولی کے ساتھ سب کو حسب ضرورت درمیانے درجے کی گالیاں دینے میں مصروف تھا، وہ یقیناً بجلی سے چلتا تھا کیونکہ اس کے کھوکھے پر ”الیکٹرک ٹی ہاؤس“ پروپرائٹر بہادر خان بجلی“ لکھا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی میرے سامنے رکھ دی۔

چائے پیتے ہوئے میں نے موقع پا کے کہا۔ ”بہادر... میں بزدل ہوں۔“

اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”او یارا ہم بھی نام کا بہادر ہے... اندر سے ایک دم... ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یار یہ نام ہے میرا، تم سے ایک پتا پوچھنا تھا اگر فرصت ہو تو۔“

”بولو بولو، اپنا کان فری ہے۔“ اس نے کوئی حرکت روکے بغیر کہا۔

زبان تو فری نہیں ہے۔ میں کہتے کہتے رک گیا۔ ”راجا شرافت علی اینڈ کمپنی...“

میری بات مکمل ہونے سے پہلے اس نے راجا شرافت نام کے چار حوالے بتائے۔ سب سے قریب کا اشارہ اندر کی جانب تھا چنانچہ چائے جیسے گرما گرم شربت کے پیسے ادا کر کے میں مسز شاہ کباڑی مارکیٹ کی ایک گلی میں گھس گیا اور کچھ دیر بھٹکنے کے بعد پہلے راجا شرافت علی کو دریافت کر لیا۔ وہ ملیشیا کے کرتے شلوار میں ایک قابل فخر

توند کا مالک ادھیڑ عمر کا شخص تھا جس کے سر کے اوپر والے سارے سفید بال اس کی ٹھوڑی کے نیچے نکل آئے تھے۔ ٹرک کے کالے انجنوں کے درمیان وہ خود بھی ڈیزل کے رنگ کا ہو گیا تھا اور ایک ختم ہو جانے والا انجن لگتا تھا۔ میری اصل آزمائش اب شروع ہوئی۔

''راجا صاحب، مجھے میڈم نے بھیجا ہے۔ وہ جو اسپتال میں ایم ایس ہیں۔''

اس کی صورت کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ ''اچھا اچھا، بیٹھو۔'' اس نے کسی ٹرک کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کون سا انجن چاہیے؟''

میں نے کہا۔ ''انہی کی بیٹی نوشابہ آپ کی بہو بنے گی نا... ماشاء اللہ بہت بڑا بزنس ہے آپ کا۔''

وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسکرایا۔ ''اللہ کا فضل ہے... کُڑی عیش کرے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے۔ لاکھوں کی آمدنی ہو گی تو عیش کیوں نہیں کرے گی۔ آپ کا بیٹا نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''اب اس کی آنکھوں میں شک نمودار ہوا۔ آپ کون ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں بزدل ہوں۔''

''او جی نام پوچھا تھا میں نے۔ میں نے کون سا باڈی گارڈ رکھنا ہے آپ کو۔''

میں نے کہا۔ ''نام ہی بتایا تھا میں نے۔ دراصل مجھے میڈم نے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کے لیے کسی اچھی سی ملازمت کا بندوبست کروں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ پڑھا کتنا ہے اس نے؟''

ایک دم وہ دکھی باپ بن گیا۔ ''سور کا بچہ... پڑھ ہی لیتا کم سے کم... جوتے مار مار کے دس جماعت کرایا۔ گالیاں دے دے کے بی اے تک کالج بھیجا۔ پڑ گیا شوقینی میں... کہتا ہے افسری کروں گا۔ اے پاگل کی اولاد، تھرڈ ڈویژن تو افسری کا امتحان بھی نہیں دے سکتا یہاں اس کے ہاتھ کالے ہوتے ہیں۔ کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ پتا ہے مجھے یاروں میں کہتا ہو گا کہ بزنس تو ملازم چلا رہے ہیں ہم امپورٹ ایکسپورٹ کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نوکری تو یہی تھی بے تیس چالیس کی۔ میں نے بات کی تھی۔ سوچا اس سے مل لوں مگر وہ کرے گا نہیں۔''

''وہ کچھ نہیں کرے گا۔ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ اکلوتی اولاد ہے نا، بلیک میلر بن کے عیش کر رہا ہے۔ میں کما رہا ہوں، وہ اُڑا رہا ہے۔ ڈر ہی رہتا ہے کہ ستر اسی سال جینے بھی نہیں دے گا۔ ٹھکانے لگائے پہلے مجھے... پھر بزنس کو...''

''بڑا افسوس ہوا یہ سن کر... برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں... یہ نوشابہ کی ماں کیسے مان گئی بیٹی کے رشتے پر؟''

اس نے ہانک لگائی۔ ''اوئے چھوٹے... دو چائے نا کافت... اب کیا بتاؤں ڈرپوک صاحب۔''

''بزدل۔'' میں نے ٹوکا۔

''وہی... باہر کہیں دیکھا اور مجنوں بن گیا۔ ماں کے سر ہو گیا۔ یہ ماںتا جو ہے نا، کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ میں نے تو کہا کہ نطفہ حرام کیوں اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی برباد کرتا ہے۔ اس نے ماں کے سامنے ڈراما کیا زہر کھانے کا... لیٹ گیا اور لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ کیا کرتا چلا گیا ہاتھ مانگنے۔ مجھے پکا یقین تھا کہ بے عزت ہو کے نکالے جائیں گے۔ لو جی آگے مل گئی سیر کو سوا سیر... میرے بیٹے سے بھی بڑی بلیک میلر۔ کہنے لگی کہ تمہارا بیٹا نکما، کیا کھلائے گا میری بیٹی کو کیا پہنائے گا، کہاں رکھے گا۔ اس کی ضمانت دو۔ بس جی لمبی بات کیا۔ اس نے کہا کہ حق مہر دس لاکھ شادی کے فوراً بعد دینا شریعت ہے۔ اس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دو۔ لو جی یہ کہاں کی شریعت ہے کہ نکاح سے پہلے دے دو۔ بے شک ایک گھر دینے کا حکم ہے شادی کے بعد۔ اس نے کہا کہ کوٹھی کر دو بیٹی کے نام۔ ڈیفنس میں رہی ہے میری بیٹی، گلشن میں چار سو گز پر سودا ہو گیا۔ میں تو ہو گیا کنگال۔''

''پھر شادی کب ہو رہی ہے؟''

''پہلے صفر کے بعد تھی۔ اب محرم کے بعد ہو گی۔ مگر آپ نے بتایا نہیں کہ نوشابہ اور اس کی ماں سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

''میں نوشابہ کا چاچا خوامخواہ ہوں۔ میرا مطلب ہے دور کا۔ بہت دور امریکا میں تھا۔ اب یہاں اسی کمپنی کا منیجر ہوں۔ نوکری تھی چالیس ہزار کی۔ پچاس دے دیتا اگر لڑکا کسی قابل ہوتا۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ویسے وہ ہے کہاں؟''

''صبح میں آیا تو پڑا اینٹھ رہا تھا دس بجے... اب ہو گا اپنی چنڈال چوکڑی کے ساتھ کہیں۔''

بالکل یہی لفظ صائمہ میرے یارانِ غار کے لیے استعمال کرتی تھی۔ اس سے اچانک میرے دل میں اس کی یاد کا درد اٹھا اور مجھے کچھ دیر پہلے کا اس کا دکھی چہرہ یاد آیا۔

میں ایک احمق پاگل عاشق... سارے دن کی خوشی پل بھر میں غارت کردی۔ اب کتنا مشکل ہوگا اسے منانا۔ مطلب کی بات وہ تھی جو آخر میں پتا چلی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور نوشی کے سسر سے ہاتھ ملاکے کباڑی بازار سے نکل آیا۔ میرے خیال کی تصدیق ہوگئی تھی۔ لالچی ماں نے بیٹی کے مستقبل کا سودا کیا تھا۔ وہ تو میرے ساتھ بھی فرار ہوجاتی۔

میں سڑک پر آیا ہی تھا کہ میرا موبائل فون فریاد کرنے لگا۔ ''جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔''

میرا دل خوشی سے دھڑکا۔ صائمہ نے خود مجھے کال کیا تھا۔ کیا وہ بھی اپنے رویے پر شرمسار تھی؟ ''ہیلو جانم۔''

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''مسٹر سراغ رساں! تم اور تمہارا وہ پولیس چیف دونوں یہاں آکے ناک رگڑو۔''

''بندے کی ناک تو خیر ہے ہی افسوسناک... مگر...''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ابھی ابھی ڈاکوؤں نے کال کی ہے۔ ایک کروڑ تاوان مانگا ہے۔ چوبیس گھنٹے دیے ہیں۔''

میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا لیکن میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی صائمہ نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

ظالم خان نے چھڑی میز پر بجائی۔ ''جھوٹ... یہ بھی جھوٹ۔''

''کیا مطلب؟ کوئی کال ہی نہیں آئی۔'' میں نے جز بز ہو کے کہا۔

''آئی ہوگی۔ کال کا کیا ہے، میں بھی کرسکتا ہوں میڈم کو اور ان کو خاک پتا نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں۔''

''تفتیش کیے بغیر ایک پولیس افسر ایسا کہے تو وہ حرام خوری پر کمربستہ کہلائے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ میں نے کب کہا کہ تفتیش نہیں کروں گا لیکن میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ لڑکی کو ڈاکو نہیں لے گئے ویسے تو نوشی کو بھگا لے جانا بھی میڈم کی عزت پر ڈاکا ہے لیکن نوشی نے جہاد کیا ماں کے جبر کے خلاف... قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی تو مفروضہ ہے آپ کا سر۔''

''پولیس مفروضات پر ہی کام کرتی ہے اور اپنے تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ غلطی کا امکان ہے تو بہت کم۔''

''یعنی پولیس اب کوئی ایکشن نہیں لے گی، آپ نے فیصلہ کرلیا۔''

''یار کیوں ایکشن لے پولیس... مدعی سست گواہ چست۔ خود اس نے رپورٹ تک نہیں لکھوائی اور قانون کی نظر میں اگر ایک بالغ لڑکی اپنی مرضی سے گھر چھوڑتی ہے اور کسی بالغ مرد سے شادی کرلیتی ہے تو یہ کوئی جرم ہے نہ گناہ۔''

''ظالم خان، ڈکیتی تو جرم ہے۔''

''میڈم رپورٹ لکھوائے پھر ہم کریں گے تفتیش۔''

میں نے کہا۔ ''تفتیش میں نے کی ہے آج... لیکن یہ بریانی کی خوشبو کہاں سے آرہی ہے یا فاقے میں میرا دماغ خراب ہورہا ہے؟ اُف اب نہاری کی خوشبو۔''

''اسٹاف کے ایک ممبر نے صاحب اولاد ہونے کی خوشی میں دعوت کا اہتمام کیا ہے۔''

''بن بلائے مہمان آجاتے ہیں ہر جگہ...''

ایک سب انسپکٹر نے اجازت لے کے اندر آکے کہا۔ ''سر! آپ وہیں شریک ہوں گے یا...''

ظالم خان نے کہا۔ ''میرا خیال ہے یہیں بھیج دو... مہمان بیٹھے ہیں۔''

حسب توقع ہم دونوں کا کھانا بڑے پُرتکلف انداز میں میز پر سجادیا گیا۔ کھانے کے دوران میں، میں نے دن بھر کی کہانی رومینٹک مناظر سینسر کرکے سنائی۔ ''مجھے شک تھا کہ وہی کباڑی کا لونڈا تو یہ کونو رہیرا...''

''میں نے منگوایا ہے اسے... آتا ہی ہوگا۔'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''کیا تمہیں اس پر بھی شک ہے؟''

''شک تو مجھے تم پر بھی ہوسکتا ہے۔ ڈپریشن اور فرسٹریشن میں بندہ کچھ بھی کرسکتا ہے صائمہ کو سزا دینے کے لیے... مگر ابھی میں اس پر کام نہیں کررہا... ورنہ اعتراف تو کرایا جاسکتا ہے تم سے بھی۔''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی... اور مشکوک افراد میں کون کون ہے؟''

''وہ بولا۔ ''یہ جو ابھی لایا جارہا ہے سرفہرست ہے۔ دیکھنا کہ وہ کس قماش کا نوجوان ہے۔''

''مگر اس کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت جب اسے شرعی طریقے پر یہ لڑکی مل رہی ہے۔''

''ممکن ہے اسے شک ہو کہ لڑکی راضی نہیں اور ٹال رہی ہے۔ ابھی نکاح تو ہوا نہیں، کیا پتا کسی کے ساتھ نکل جائے۔ کیا پتا لڑکی نے کہہ دیا ہو کہ یہ منہ اور مسور کی

والی... پنکھے سے لٹک جاؤں گی یا بھاگ جاؤں گی کسی کے ساتھ مگر تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی لالچی باپ کے بچے... یا خود اسے شک ہو گیا ہو کہ لڑکی کا کوئی سچا جانباز عاشق اسے نہ لے جائے۔''

''اس نے اغوا کیا ہونے والی زوجہ کو اور اپنی ساس کو بھی لوٹ لیا۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''میاں بزدل، دنیا میں ناممکن کچھ نہیں۔ اس نامرد شوہر کی محبت بھی ایسی ہی ہوگی کہ یہ پلان بنانا اس کے لیے ناممکن نہیں۔ اب وہ کہہ سکتا ہے کہ آجاؤ ایک قاضی اور دو گواہ لے کر۔ نکاح پڑھوا کے لڑکی لے جاؤ، ورنہ اب تک نکاح کیا شب عروسی کی سحر بھی ہو چکی ہوتی۔ یہ ایک تیر دو کے تاوان کا ڈراما سب کو گمراہ کرنے کے لیے ہے۔ دقت لینے کا طریقہ ہے اور ساس سے لوٹی ہوئی رقم واپس لینے کا طریقہ بھی۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ایک دوسرا مفروضہ۔''

''ایسا ہوتا ہے، تم نے اخبار میں دیکھا ہوگا۔ اولاد خود ماں باپ کی دولت ہتھیا لیتی ہے۔ اپنے اغوا اور تاوان کا ڈراما بھی ہوتا ہے۔ کنجوس باپ مرنے کا نام نہ لیتا ہو۔ وارث کیا برطانوی ولی عہد کی طرح خود بوڑھا پھوس ہو جائے۔ ملکۂ عالیہ سو سال کی حد پار کر گئیں مگر بیٹھی ہیں مسند پہ۔''

میں نے کہا۔ ''یعنی بیٹی نے خود اغوا کا ڈراما رچایا ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔

''اور یہ جو نامرد شوہر ہے جو اسے خرید چکا ہے؟''

''وہ کیا مسئلہ ہے... ماں کو کہہ دے گی کہ سودا منسوخ کرو۔ رقم واپس، میں شادی کر چکی ہوں۔ اس کباڑی کی اولاد سے تم نے زبردستی رشتہ طے کیا تھا۔''

''اب یہ مشتبہ ملزم نمبر دو، مفلس عاشق کون ہے؟''

''اس کا پتا تم اپنی نہ ہونے والی بیوی کے ساتھ مل کر چلاؤ، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

ایک کانسٹیبل برتن اٹھا کے لے گیا اور کپڑا مار کے میز کا شیشہ چمکا گیا۔ پھر نوشی کا نامرد شوہر پیش کیا گیا جو باہر روک لیا گیا تھا کہ صاحب، حضرت تناول فرما رہے ہیں۔ وہ پچیس تیس سال کا باڈی بلڈر ٹائپ نوجوان تھا۔ بغیر بازو کی کالی بنیان پر ایک ناگ بنا ہوا تھا۔ حد سے زیادہ ٹائٹ جینز کمر پر بہت نیچے بندھی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ بیٹھے گا تو اتر جائے گی۔ اس کے بال وہ تھے جو برگر کٹ کہلاتے ہیں اور

وہ چیونگم چبا رہا تھا۔ وہ بغیر کہے کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا۔

نفسیاتی دہشت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ظالم خان نے غرا کے کہا۔ ''اس الو کے پٹھے کو باہر لے جا کے ملزم کی طرح پیش ہونے کا طریقہ سکھاؤ۔ اکڑفوں دکھائے تو پتلون اتار کے لاؤ۔''

اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اسے پیش کرنے والے گھسیٹ کر باہر لے گئے اور دوبارہ لائے تو نہ وہ جگالی کر رہا تھا اور نہ کسی اکڑفوں میں تھا۔ وہ با ادب سیدھا کھڑا رہا۔ جو گالیاں اسے باہر پڑی تھیں میں نے بھی سنی تھیں۔

ظالم خان نے اسے گھور کے کہا۔ ''کباڑی کی اولاد، نام بتاؤ اپنا، کام تو تم کچھ کرتے نہیں۔''

''ساجد سر، میرا قصور کیا ہے؟''

''جتنا پوچھا جائے اتنا جواب دو۔'' ظالم خان گرجا۔ ''نوشی کہاں ہے؟''

وہ چونکا۔ ''نوشی؟ اپنے گھر میں ہوگی، مجھے نہیں معلوم۔''

''کل اور آج تم کس کے ساتھ تھے اور کیا کر رہے تھے۔ نام بتاؤ سب دوستوں کے۔ وہ کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔'' ظالم خان نے مجھے اشارہ کیا کہ میں کاغذ پر نوٹ کروں۔ ساجد نے جو تفصیلات مہیا کیں، وہ میں نے لکھ لیں۔ وہ سب اچھے گھروں کے لڑکے تھے۔

''نوشی سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟''

وہ حیران بھی ہوا اور برہم بھی۔ ''سر یہ ذاتی سوال ہے مگر میں بتا دیتا ہوں۔ وہ اچھی لگتی ہے مجھے۔''

''تمہیں اس سے پہلے کتنی لڑکیاں اچھی لگی ہیں؟''

''سر! اچھی تو بہت لگی تھیں مگر کسی سے شادی کی کوشش نہیں کی تھی میں نے۔''

''اسے تم شادی کہتے ہو۔ تم نے تو خریدا ہے اسے۔''

وہ کچھ پریشان ہوا۔ ''اگر آپ یہ جانتے ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کی ماں نے لالچ کیا تھا۔ اس نے سودا کیا تھا میرے باپ سے، میں نے نہیں۔''

چونکہ وہ ڈھنگ سے بات کر رہا تھا اور صحیح جوابات دے رہا تھا اس لیے ظالم خان نے کہا۔ ''اچھا بیٹھ جاؤ۔ کل میں تصدیق کراؤں گا کہ دو دن میں تمہاری اپنے دوستوں کے ساتھ کیا مصروفیت تھی اور وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔''

''سر، میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ساجد! یہ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ نوشی گھر سے اغوا کی گئی ہے۔ ڈاکو اس کے ساتھ کافی مال بھی

لے گئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ وہ ڈاکو نہیں تھے اسی لیے ابھی تک رپورٹ درج نہیں کرائی گئی۔''

اس نے فریاد اور احتجاج کے انداز میں کہا۔ ''اور آپ نے مجھ پر شک کیا۔ صرف دو ماہ بعد شادی تھی میری۔''

ظالم خان نے کہا۔ ''ہم تمام امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میڈم سے ذاتی تعلق کی بنا پر۔ اب یہ بات تمہارے علاوہ کسی کو معلوم ہوئی تو میں تمہیں اندر کرا دوں گا، کسی بھی جرم میں۔ اب تم جا سکتے ہو اور یہ بات یاد رکھنا، ابھی تم کسی کو کچھ بھی نہیں بتاؤ گے۔ نہ کسی اور کو، نہ اماں ابا کو۔''

وہ اٹھا اور سلام کے انداز میں سر ہلا کے باہر نکل گیا۔

اس نے میز پر سے ٹوپی اور چھڑی اٹھائی۔ ''چل بھائی کھانا تو ہو گیا اب ذرا ان کی مزاج پرسی بھی کر لیں، دلہن کی اماں کی۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم کچھ نفسیاتی مریض لگتی ہے مجھے، بے وقوف تو خیر ہے۔''

''بالکل ہے، اسے خوش فہمی ہے کہ اپنی ذہانت سے وہ ساری دنیا کو چکر دے سکتی ہے۔''

تقریباً پون گھنٹے بعد میڈم کے گھر میں روٹھی حسینہ مجھے مزید خفا نظر آئی۔ ''ڈھائی گھنٹے لگے ہیں جناب کی سواری کو یہاں آتے آتے۔''

''اب کیا بتاؤں کہ تفتیش کتنے زور و شور سے چل رہی تھی۔'' میں نے کہا۔

''پھر پکڑ لیے ڈاکو، پتا چل گیا لوشی کا؟'' اس نے طنز سے کہا۔

اس کے طنز کو نظر انداز کر کے رحمدل خان نے کہا۔ ''کال کس وقت آئی تھی میڈم؟''

''میڈم کا چہرہ مجھے سچ مچ دکھی لگا۔'' ''سات بجے، نمبر محفوظ ہے۔ سم لاہور کی ہے۔''

''اگلی کال میں سم کراچی، اسلام آباد یا کوئٹہ کی بھی ہو سکتی ہے۔ کال کی لوکیشن اہم ہے۔ وہ جگہ بدلیں گے۔ آواز بدلیں گے۔ ہو سکتا ہے موبائل فون بھی بدل دیں لیکن یہ سب معلوم ہو جائے گا کہ مجرم کون ہے۔'' اس نے میڈم کا دکھایا ہوا نمبر نوٹ کر لیا۔

صائمہ نے پھر مداخلت کی۔ ''آپ کا تو خیال تھا کہ کوئی جرم سرے سے ہوا ہی نہیں۔''

ظالم خان نے اسے گھور کے دیکھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اگر پوسٹ مارٹم کے دوران میں کوئی پولیس افسر دخل دے تو آپ کو کیسا لگے گا؟ سیکنڈ اوپینین یعنی مشورے کے لیے میڈیکل بورڈ کیوں تشکیل دیا جاتا ہے؟''

صائمہ نے نظر جھکا کے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔''

وہ پھر میڈم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''میں نے علاقے کے ایس ایچ او کو بلایا ہے جو آپ کا بیان لے گا۔ ایف آئی آر درج کرے گا۔ اس کے بعد میں ذاتی طور پر جو کر سکا، کروں گا۔ کچھ ذاتی سوال ہیں جو اس لیے ضروری ہیں کہ میں ڈی ایس پی کی حیثیت سے نہیں، بزدل کے دوست یا بھائی کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ سوال بعد میں۔''

صائمہ نے میری طرف دیکھا تو میں نے آنکھیں نکال کے اسے شرمندہ کیا کہ سن رہی ہو؟ ایسے ہوتے ہیں دوست۔

چوکیدار نے ناک کیا اور اس کے ساتھ ہی ایس ایچ او ایک ماتحت اور ایک منشی کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے اپنے افسر کو سلیوٹ کیا اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے منشی نے اپنا کھاتا کھولا۔

ظالم خان اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا ابھی کوئی کام نہیں۔ صبح پھر آؤں گا۔ رات کو میں اپنا پرائیویٹ نمبر کھلا رکھتا ہوں۔ کوئی نئی بات ہو تو فوراً مجھے بتا دیں میڈم۔''

میں اسے چھوڑنے باہر گیا۔ اس وقت میڈم کا وہ بیان شروع ہو چکا تھا جو انہوں نے سب سے پہلے میرے سامنے دیا تھا۔ ''ظالم خان تو نے مجھے دوست اور بھائی کہہ کے شرمندہ کیا۔''

''اونہوں... شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ قسمت اچھی ہے میڈم کی۔ رشوت خور تو ہے مگر اتفاق سے یہ تھانے دار ذہین بھی ہے۔''

''جیسے میں واحد بزدل صحافی ہوں۔ ورنہ حق گوئی کی پاداش میں آج سب سے زیادہ صحافی مارے جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ گاڑی لے کر نکل گیا تو میں واپس کمرے میں پہنچا جہاں ابھی سوال جواب کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ آداب میزبانی پورے کرنے کے لیے صائمہ کچن میں چائے پانی کا بندوبست کرنے میں مصروف تھی۔ میں نے دبے پاؤں پیچھے سے جا کے اسے دبوچ لیا اور کسی روٹھی حسینہ کو منانے کا سب سے موثر نسخہ آزمایا یعنی اسے مہر بہ لب کر دیا۔ یہ مہر اظہار محبت کی مہر اور مختصر کس کہلاتی ہے۔

''بدتمیز، وحشی، جانور۔'' اس نے رہائی کے بعد اسی غصے سے کہا جس کے بارے میں ایک تجربہ کار شاعر بہت

پہلے کہہ گیا تھا کہ ”انہیں آتا ہے پیار پر غصہ... ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔“ میں صرف گردن ہلاتا رہا اور لبوں سے جھڑنے والے پھول چنتا رہا۔ تیس سیکنڈ بعد وہ ہنس پڑی۔ ”شرم تو نہیں آتی۔“

”آتی ہے اکیلے میں۔“ میں نے لڑکیوں کی طرح ہاتھوں سے منہ چھپا کے کہا اور بھاگ گیا۔

منشی اب مال مسروقہ کی تفصیل لکھ رہا تھا اور تھانے دار زیور کی خریداری کی رسید لے کر پرکھ رہا تھا۔ ڈاکوکس عمر، قد، جلیے کے تھے۔ کیا پہنے ہوئے تھے۔ کون سی زبان میں بات کر رہے تھے۔ ڈھاٹے منہ پر تھے مگر ہاتھ کھلے تھے، جو انہوں نے دیکھے تھے کہ ویسے عمر، ہاتھ پر جھری تھی یا نہیں۔ میڈم پال کی کھال نکالنے سے اپ سیٹ لگتی تھی۔ اس نے نوشی کے بارے میں سوال کیے۔ تصویر مانگی۔ روایتی سوال کیا کہ ان کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی۔ اس کے تعلقات کی نوعیت اور انکار کے رشتوں کی تفصیل جو پہلے آتے رہے۔

اس نے جائے واردات کا دیر تک معائنہ کیا۔ اس کا ماتحت تصویریں بناتا رہا۔ فنگر پرنٹس لیتا رہا اور بیچ بیچ میں کوئی سوال کرتا رہا۔ بڑا تھانے دار تو وہ بھی تھا۔ میڈم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک تو اس نے سب سچ نہیں بولا تھا۔ ساجد سے رشتے کی بات پر اندر کی بات تو اس نے صائمہ کو یا مجھے بھی نہیں بتائی تھی تو پولیس کو کیسے بتاتی۔ اسے یہ فکر ہوگی کہ بعد میں جھوٹ سچ کا یہ میچ بیانات کسی مرحلے پر غلط بیانی نہ بن جائے۔

رسمی تسلی دے کر اور کوئی یقین دہانی کرائے بغیر تفتیش کار چلے گئے تو میڈم یوں بیڈ پر گرے لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے ابھی ڈیلیوری سے فارغ ہوئی ہو۔ ”ہائے گاڈ! جان عذاب میں ڈال دی۔ صائمہ مجھے پانی پلاؤ۔“

میں دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ اب آیا اونٹ پہاڑ تلے۔ صائمہ بھی پھنس گئی تھی۔ اب وہ اسے چھوڑ کے بھی نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اجازت طلب کی تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ”اب آدھی رات کو تم کہاں جاؤ گے اور تمہارے کون سے بیوی بچے رو رہے ہیں گھر پر۔“

میں نے یہ نہیں کہا کہ جانا ہوتا تو میں ظالم خان کے ساتھ چلا جاتا۔ ”بس میڈم! قسمت ہی ایسی ہے میری۔“

صائمہ نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ”سو جاؤ یہیں رات کو۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا میں بھی سو جاؤں گا گیسٹ بیڈ میں۔ ڈبل بیڈ تو ہوگا۔“

”ابھی نوشی کا کمرا ہے نا۔“ میڈم نے صائمہ کا چہرہ شرم اور غصے سے لال ہوتا دیکھ کے کہا۔ ”صاف ہی ہے۔“

نیند مجھے فوراً کہاں آسکتی تھی۔ کمرا نوشی کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ ہر پرفیوم کی جو وہ استعمال کرتی تھی۔ مختلف کاسمیٹکس کی اور بستر کے ہر شکن میں خود اس کی۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگی؟ واقعی ڈاکوؤں کی تحویل میں یا کسی کی آغوش محبت میں... اور وہ خوشی کا زرخرید مزدور ہو جو اب شاید عشق سے بھی تائب ہو جائے کہ کاروباری عیش میں گیا تو گزری جائے اب بھاڑ میں۔ میں باز آیا محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا۔ چن کتنے گزاری آ رات وے... فلم چھو سے میں نور جہاں کے گانے کی آواز میرے کان میں آئی۔

پھر دروازہ آہستہ سے کھلا اور باہر سے آنے والی روشنی میں مجھے صائمہ کا ہیولا نظر آیا۔ ”کیا سو گئے؟“

”ہاں، خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اندر آئی ہو۔“ میں نے کہا اور اٹھ بیٹھا۔ اس کے ہاتھ میں دو مگ تھے۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ کافی کا ایک مگ اس نے مجھے تھما دیا۔ ”بزدل! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں بھونچکا سا رہ گیا۔ ایسی بات وہ کہہ سکتی ہے۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔

”ہم شادی بھی کر لیں گے بہت جلد۔ میں اپنی ساری بچت ہاؤس بلڈنگ فنڈ میں ڈال رہی ہوں۔ کمی رہی تو ہم لون لے لیں گے۔“

میں شرم سے پانی ہو کے اس کے قدموں میں بہہ گیا۔ ”آئندہ میں پیسا پیسا تمہارے حوالے کروں گا۔“

یہ تو میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر... چنانچہ اس نے موضوع بدل دیا۔ ”تم نے کچھ معلوم کیا؟“

”اتنا کہ سنو گی تو تمہارے ہوش ہاتھوں کے طوطے بن کر اڑ جائیں گے اور میں تو ہوں بزدل، مگر کچھ پتا نہیں کہ تم غصے میں جا کے ابھی اس نالائق بڑھیا کو میڈم سے مرحوم بنا دو۔ اس لیے اب جگر تھام کے بیٹھو۔“

میں نے اسے ساجد کے کباڑی باپ سے لے کر ساجد تک سب سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ سنا دیا۔

”یا میرے خدا! کیا قبر میں لے جائے گی یہ مال اور جائداد۔“ صائمہ نے ساری بات سن کے کہا۔

''کیا اس نے تمہیں بتایا کہ نوشی اس رشتے پر راضی نہیں تھی؟''

''نہیں، وہ تو خوش حال بزنس مین گھرانا کہتی رہی۔ اور وہی کہ بیٹا اپنے باپ کے بزنس میں شرکت نہیں چاہتا۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ وہ خوددار ہے۔ اس کے ہینڈسم ہیرو ہونے کا ذکر کرتی رہی۔ پھر اس کی تصویر بھی دکھائی۔''

''ہینڈسم ہیرو تو ہے۔ بدتہذیب بھی نہیں۔ یا ظالم خان نے اسے تہذیب سے پیش آنے کا شارٹ کورس میرے سامنے کرا دیا تھا لیکن اس کے باپ جیسا باپ ہو تو میں بھی کاروباری شریک نہ بنوں۔ بزنس لاکھوں کا ہو یا کروڑوں کا۔ یار اس مغرور حسینہ کا دیدار بھی کیا ہے میں نے۔ پولیس کو اس کی تازہ ترین تصویر دی ہے میڈم نے۔ برا مت ماننا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے اور بزدل ہونے کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس کے مقابلے میں تم ایسی ہی ہو جیسے نیلی بار کی بھینس کے مقابلے میں تھر پارکر کی بھینس۔''

صائمہ ہنسی۔ ''میں نے دونوں نہیں دیکھیں مگر وہ لوٹ آئے تو اس پر بھی فریفتہ ہو جانا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب کیا فائدہ اس کی بنگنگ ہو چکی اور پھر غزالہ کو قائم مقام محبوبہ کے عہدے سے ہٹانا پڑے گا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اس پری کے تو پرستار بھی قطار در قطار ہوں گے۔''

''یہ سب مجھے کیا معلوم؟''

''ہم کل معلوم کرلیں گے۔ عشق اور مشک والا نظریہ درست ہے۔ عموماً ماں باپ کے سوا سب جانتے ہیں کہ کون کس کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔''

''کیا بازاری زبان میں بات کر رہے ہو۔''

''ابھی ڈاکٹر صاحب، بازار کا زمانہ ہے۔ مارکیٹنگ کا دور ہے نی... رو کڑا چلتا ہے رو کڑا... اپنا کو دیکھو، سالا ہکلو اور بزدل... ہوتا سیٹھ ڈائمنڈ والا بابا تو کھر یدلیتا تیرے جیسا دس۔ یا پچھے والا ڈاکو ہوتا تو اماں کو بھی اٹھا لیتا کہ ایک دانہ اور نکالو۔''

منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی دبانے میں وہ دوہری ہوگئی۔

''ادھر دومگ، ہنسی نکل گئی تو تمہاری مجازی ساس اٹھ کے آجائے گی، صبح دیر تک نہیں سوتا۔''

اس کے جانے کے بعد میں یوں سو گیا تھا جیسے نیند کی گولی کھالی ہو۔ صبح جاگنا اس لیے ضروری تھا کہ تاوان مانگنے والوں نے صبح پھر کال کرنے کا کہا تھا اور آٹھ بجے ان کی کال آئی تو میں سب کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ میڈم نے رونا دھونا اور منت سماجت شروع کی۔ ''ایک کروڑ کہاں سے لاؤں گی میں۔ ادھار بھی نہیں دے گا مجھے کوئی اور مکان بیچ دیا تو خود کیا ایدھی ہوم میں رہوں گی۔''

حسب توقع انہوں نے رقم آدھی کر دی اور کہا کہ دن بھر میں بندوبست کرلو۔ شام کو پھر کال کریں گے۔

میں نے کال کے بعد تسلی دی۔ ''شدہ آجائیں گے دس لاکھ پر... اب شام تک آپ کے پاس ٹائم ہے۔''

صائمہ نے کہا۔ ''میں تو ہوسٹل جاؤں گی۔ ان کپڑوں میں ایزی نہیں ہوں۔''

''میں بھی اسپتال جاتی ہوں۔ تم ذرا خبر کو شائع ہونے سے روکنا، اگر روک سکتے ہو۔''

''خبر نہیں آئے گی مگر صائمہ بھی اسپتال نہیں آئے گی۔ میرا میڈیکل چیک اپ کرائے گی آغا خان سے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' وہ بولی۔

''میرا دل اور دماغ دونوں خراب ہیں اور غالباً کردار بھی۔ پوچھ لیں صائمہ سے۔''

میں چاہتا تھا کہ میڈم کو صائمہ کے میرے ساتھ جانے کا پتا نہ چلے اس لیے میں نے مذاق میں بات ٹال دی۔ میں چاہتا تو صائمہ کے اپنے کمرے سے پھر تیار ہو کر آنے تک میڈم کے کمرے میں انتظار کرتا لیکن میں ایک جگہ راستے میں اتر گیا اور پیدل چلتا ہوا اپنے ''لو اسپاٹ'' بلکہ لو اسٹاپ پر جا کھڑا ہوا۔ یہ جگہ ایک ٹیلی فون پول تھی جہاں کھڑا رہ کے میں صائمہ کا انتظار کرتا تھا۔ ایک کھڑکی سے جھانک کر مجھے صائمہ دیکھ لیتی تھی لیکن سامنے بنے ہوئے ہوسٹل کی دیگر کھڑکیوں سے ایک عاشق مجبور کا نظارہ کرنے والی دیگر نرسوں اور ڈاکٹرز نے مجھے ٹیلی فون پول کی مناسبت سے ٹی پی کا لقب بھی عطا کر رکھا تھا۔ اس کی موجد میری قائم مقام محبوبہ ڈاکٹر غزالہ تھی۔

میں اسی کھمبے سے بندھے سائبان کے نیچے ایک بنگالی نے گنے اور کھیوں کا جوس ٹانک بنانے کی مشین بھی لگا رکھی تھی۔ ہمارے درمیان چھیڑ خوباں سے چلی جائے ہے اسد... والی نوک جھونک کا سبب یہ تھا کہ میں سائبان کے نیچے کھڑا ہوتا تھا مگر جوس کا میں نے کبھی ایک گلاس بھی نہیں پیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اقدام خودکشی ہوتا۔ ہر گلاس میں اوسطاً تین سے چھ مکھیاں ضرور شامل ہوتی تھیں اس کی بے بسی یہ تھی کہ وہ مجھے بے دخل نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مشین سمیت اٹھوانے کی دھمکی دیتا رہتا تھا۔ بلامعاوضہ یہ ٹانک پینے والے تصدیق کر چکے تھے کہ

میرے سب ڈاکوؤں سے سسرالی مراسم تھے۔

حسبِ معمول مجھے دیکھ کر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ''شاید تم ابھی مرے نہیں؟''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''میں مر گیا تھا واقعی... مگر اوپر سے واپس کر دیا گیا۔''

بنگالی میرے دوستانہ ہاتھ سے رکوع میں چلا گیا۔ ''ایسا ہی مار پیٹ ہم کرے گا تو شاید تم ایمرجنسی کا وارڈ میں جائے گا۔'' حسبِ عادت اس نے دھوتی کا ایک کونا اٹھا کے ناک صاف کی۔ سامنے سے آنے والی نوعمر طالبات منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسی کرنے اور ایک دوسرے کو ٹہوکے دینے لگیں۔ اس موضوع پر میرے اور بنگالی کے درمیان ہونے والے مذاکرات قابلِ اشاعت نہیں۔

صائمہ کی ڈیما کار میرے سامنے آرکی۔ میں سر جھکا کے بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔ ''اب کیدھر؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو تمہی جہاں لیکچرر تھیں۔ اس کالج میں کوئی جان پہچان نکالو۔''

صائمہ نے سوچ کے کہا۔ ''ایک تو لیکچرر تھی جو ڈیلیوری کے لیے آئی تھی اور اس کا خیال تھا کہ میں نے بروقت آپریشن کر کے اس کی جان بچالی تھی اور بچے کی بھی۔ دوسری بی اے کی ایک طالبہ تھی جس کی ماں کی میں نے مدد کی تھی۔ اپنڈکس کا کیس تھا اور یہاں وہی روایتی رونا تھا۔ بیڈ خالی نہیں ہے۔ آپریشن تھیٹرز میں کیس ہیں۔ الٹرا ساؤنڈ کی مشین خراب ہے۔ وہ رو پیٹ رہی تھی کہ میری ماں مر جائے گی اور ایک ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ جلدی ہے تو آغا خان چلی جاؤ۔ اس وقت میری کوشش سے فوراً آپریشن ہوا تھا۔ بس وہ مرید ہے۔''

''یاہو...'' میں نے چلا کے صائمہ کے کان میں نعرہ لگایا۔

''اُف، یہ کیا حرکت ہے؟'' صائمہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''بچے بن جاتے ہو تم بھی، حادثہ ہو سکتا ہے ایسے۔''

''کتنا اچھا ہو اگر اسی طرح تمہارے ساتھ اچانک انتقال پُرملال ہو جائے... اور جیسے فلم ٹیکو بادرا میں دونوں کی ارواح ساتھ ساتھ بادلوں میں اڑتی جا رہی ہیں اور پس منظر میں گانا چل رہا ہے۔''

گاڑی ایک گیٹ میں داخل ہوئی اور پرنسپل کے آفس کے باہر جا رکی۔

صائمہ نے اپنا تعارف کرایا۔ ''میں ڈاکٹر صائمہ ہوں اور یہ مشہور صحافی بزدل...''

''جیسے جیسے مسز بزدل میں تو آپ کے شوہر کا کالم باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ وہ جو ابھی جلیم کی زبوں حالی پر لکھا تھا اس سے اگلے دن ڈائریکٹر کالجز نے بلا لیا۔ رکی ہوئی گرانٹ مل گئی، ورنہ میرا تو ٹرانسفر کر دیتے۔ فرمایئے کیسے زحمت کی۔ داخلے کا مسئلہ ہے؟''

صائمہ نے بی اے فائنل کی طالبہ کا نام بتایا۔ ''اسے بلوا دیں۔'' اور اس سے تعلق کی وجہ بھی بتائی۔ ''اس کے ساتھ گھر جانا ہے۔''

عام حالات میں شاید کلاس روم سے کسی طالبہ کو بلوانا آسان نہ ہوتا لیکن اب چند منٹ میں وہ آ گئی۔ اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری۔ ''ڈاکٹر صائمہ آپ! میری امی تو دعائیں دیتی ہیں۔''

''آج میں نے سوچا اتنی بار کہہ چکی ہو تم... آج ان سے مل ہی لوں۔'' صائمہ نے کہا۔ ''زیب النسا ہے نا تمہارا نام؟ مجھے ٹھیک یاد تھا۔''

اسے ساتھ لے جانے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ بس شرط کے طور پر ہمیں پرنسپل صاحبہ کی چائے پینا پڑی۔ یہ انہوں نے بعد میں بتایا کہ مجھ سے ان کو اپنا ایک مسئلہ حل کرانے میں بھی مدد درکار ہے۔ زیب النسا عرف زیبی خوشی خوشی گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔

''دیکھو زیبی۔'' صائمہ نے ایک سڑک کے کنارے کولڈ ڈرنک کارنر کے سامنے گاڑی روک کے کہا۔ ''تمہارے گھر بھی جائیں گے ہم بعد میں... لیکن پہلے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

وہ گھبرا گئی۔ ''ایسی کیا بات ہے ڈاکٹر صاحبہ؟''

''تمہارے کالج میں انگلش کی لیکچرر ہیں مس نوشابہ۔''

''جی، وہ ہماری کلاس بھی لیتی ہیں۔ بہت سویٹ ہیں۔'' زیبی نے کہا۔ ''بہت اچھا پڑھاتی ہیں۔''

''تم سینئر ہو، ان کے بارے میں کتنا جانتی ہو؟''

وہ کنفیوز نظر آنے لگی۔ ''جی، تین سال سے ہیں وہ۔ دو سال میں نے پڑھا ہے۔ تھرڈ ایئر میں بھی...''

صائمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کے علاوہ، ان کی پرائیویٹ لائف کے بارے میں... میں خود کالج میں تھی تو ساری گوسپ سنتی تھی اور خود بھی اس میں شریک تھی۔ خاص طور پر ان کے فیچرز کے بارے میں جو گپ شپ ہوتی ہے۔ وجہ بعد میں بتاؤں گی۔ تمہارے کالج میں میل ٹیچر،

بھی ہیں لیکن خبریں اور افواہیں تو باہر سے بھی آجاتی ہیں۔''

وہ بدستور تذبذب کا شکار رہی پھر صائمہ کے تسلی دینے پر بولی۔ ''یہاں اس کا نچ کا تو کوئی نہیں... مگر ایک ہے اسمارٹ سا آدمی۔ اس کی نیو ہنڈا اسوک ہے۔ چار پانچ سال پہلے کے ماڈل کی۔ اس کے ساتھ نظر آتی ہیں وہ... مجھے بھی... دوسری لڑکیوں نے بھی دیکھا۔ وہ منگیتر تو نہیں تھے۔ میرا منگیتر... اور دوسرے منگیتر... اتنے رومانٹک نہیں ہوتے۔''

صائمہ نے کہا۔ ''نام نہیں معلوم، گاڑی کا نمبر... تمہارا دوست بھی۔''

''میڈم مجھے معلوم ہوتا تو ضرور بتاتی۔ وہ ویٹر سے پوچھ کے بتا سکتی ہوں۔ ی وی پر جو پیزا ہٹ ہے۔ وہاں جاتے ہیں۔ میں نے وہیں دیکھا تھا اور لڑکیوں نے بھی۔''

آہستہ آہستہ وہ کھل گئی۔ اس انفارمیشن کا قرض اتارنے کے لیے ہم اس کی ماں سے بھی ملے اور خود کو بڑی مشکل سے دوپہر کے کھانے سے بچایا۔ تاہم سموسے، کیک پیس، بسکٹ وغیرہ جو شاکا بھائی دوڑ کے کسی بیکری سے لے آیا تھا کسی کھانے سے کم نہ تھے۔ زینی نے بہت پوچھا کہ مس نوشابہ کا معاملہ کیا ہے لیکن صائمہ ٹال گئی۔

دوپہر کے وقت ی وی پر کون ہوتا۔ پیزا ہٹ بھی ویران پڑا تھا۔ یہ چھوٹا سا ''آؤٹ لیٹ'' تھا جہاں بیٹھ کر کھانے کا انتظام نہیں تھا۔ لوگ فریش پیزا بنوا کے گاڑی میں یا سمندر کے کنارے کی دیوار پر بیٹھ کے کھاتے تھے چنانچہ ویٹر ایک ہی تھا جو فارغ بیٹھا تھا۔ محض خریداری کے لیے ہم نے اسمال پیزا لیا تھا جو سامنے آیا تو ہم نے کھا بھی لیا۔ سو روپے کی ٹپ سے وہ ہمارا غلام بن گیا تو میں نے کام کی بات کی۔

''یہاں ایک گاڑی آتی ہے۔ نیلے رنگ کی ہنڈا سوک... دو ہزار پانچ چھ کا ماڈل۔''

اس نے تھوڑا سا سوچ کے سر ہلایا۔ ''آتی ہے جی... ہفتے میں ایک بار تو آتے ہیں دونوں۔''

دونوں کا لفظ اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''گاڑی کا نمبر بتا سکتے ہو؟''

اس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہو جناب؟''

میں نے کہا۔ ''ایک بار ہم بھی یہاں تھے۔ گاڑی والے نے مجھ سے موبائل فون لیا تھا، اسے کوئی ارجنٹ کال کرنا تھا۔ اس کے فون میں بیلنس نہیں تھا۔''

''ان کی فرینڈ کے پاس بھی تو موبائل فون ہوگا؟'' ویٹر بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ان کے پاس فون ہی نہ ہو یا وہ اس سے کال نہیں کرنا چاہتا ہوگا۔ ایک کال کی بات تھی اس لیے میں نے پوچھا نہیں۔ ہم بھی اپنی باتوں میں لگ گئے اور وہ گاڑی چلی گئی۔''

''وہ آپ کا موبائل فون لے گئے۔'' ویٹر چونکا۔

''پچیس ہزار کا سام سنگ گلیکسی تھا۔ نمبر بتادو تو میں ان سے لے لوں گا۔'' میں نے کہا۔

اس نے تھوڑے سے تذبذب کے بعد نمبر بتادیا۔ ''سر میرا نام نہ لیں۔''

''نام معلوم کہاں ہے مجھے۔ نہ میں نے پوچھا اور تم بیچ میں کہیں نہیں آتے۔ میں نے دیا تھا میں واپس لے لوں گا۔''

''ایسے لوگ سکتے نہیں دیتے سر۔'' وہ بولا۔

''صورت سے تو میں بھی بہت بہادر لگتا ہوں مگر بزدل ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، تم نے کہا کہ ان کے ساتھ گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ وہ میاں بیوی بھی ہوسکتے ہیں۔''

''اندازہ ہے جی میرا۔ دیکھتے ہیں ہر قسم کے ساتھ آنے والے جوڑے۔ سرجی میں غریب آدمی ہوں۔''

''میں اپنے بچوں کے سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تمہارا نام نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔

اس موقع پر صائمہ نے بڑا اچھا رول کیا۔ ''میرے بچوں کو بیچ میں مت لاؤ جی۔'' وہ خفگی سے بولی۔

کچھ دور آکے میں نے اس کا بایاں فارغ ہاتھ چوم لیا۔ بہتھ کی مالکن کو چھیڑتا تو گاڑی سمندر کی طرف مڑ جاتی۔ ''تم نے کمال کردیا۔ سب چھپن چھری... بس اب ہمارا کام ہوگیا۔ سب کریڈٹ تمہیں جاتا ہے۔'' میں نے ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''گاڑی کا پتا چلا ہے، لڑکی کا نہیں۔''

''غلام خان دی گریٹ سن آف بابا وخان... ایک نمبر لکھو... پہلے لکھو برادر، اس کے مالک کا پتا چلاؤ شام تک ورنہ واپس انسپکٹر بنوادوں گا سفارشی۔'' میں نے کہا اور اس کا جواب نہیں سنا۔

☆☆☆

کال چھ بجے آئی جب ہم میڈم کے ساتھ لان میں بیٹھے البم میں ممی نوشی کی پرانی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

حسبِ توقع نمبر مختلف تھا۔ ایک ماہر نیلی کام نوجوان صائمہ کے ڈیپارٹمنٹ میں کلرک کے اعلیٰ مرتبے پر فائز تھا اور بے حد مصروف عاشق تھا۔ اسپتال میں آنے والی خواتین کے ساتھ کوئی اچھا سا فرنہ ہوتا تھا تو اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا فوارہ پھوٹ پڑتا تھا اور وہ اتنے خشوع و خضوع سے ان کی مدد کرتا تھا کہ ساتھ آنے والی لڑکی اسے شکریے کا فون کرتی تھی اور اپنا نمبر فراہم کر دیتی تھی۔ اس کی کال خودبخود ریکارڈ ہوتی تھی اور اس کے مستقبل کو خوابناک، تابناک بناتی تھی۔ تو فریقِ ثانی کے مستقبل کو دردناک، شرمناک وغیرہ۔ اس نے میڈم کے موبائل فون کو بھی خودکار بنا دیا تھا۔ اب کال ریکارڈ ہو رہی تھی۔ جو میں نے بعد میں سنی اور کچھ یوں تھی۔

کالر: ”او میڈم! بندوبست کرلیا پیسوں کا؟“

میڈم: ”خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو، آخر تمہاری بھی ماں ہوگی بیٹی ہوگی۔“

وہ غرایا۔ ”ابھی ڈائیلاگ نہیں مار بڑھیا۔ اپن ایموشنل نہیں ہونے کا۔ یہ فائنل بات ہے۔ پچاس لاکھ۔“

میڈم نے کہا۔ ”مجھے وقت چاہیے اتنا قرض بھی کوئی کھڑے کھڑے نہیں دیتا۔ مکان گروی رکھنا پڑے گا۔“

وہ بولا۔ ”کل فون کرے گا۔ جگہ بتائے گا۔ اُدھر پیسا لانے کا۔ چھوکری لینے کا۔“

میڈم نے کہا۔ ”ایک دن میں کیسے ہوگا؟“

وہ بولا۔ ”نہیں ہوئیں گا تو چھوکری بھی نہیں ہوئیں گا۔“

میڈم گھبرائی۔ ”کیا مطلب تم اسے مار ڈالو گے؟“

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ ”اپن کا مغز کھراب نہیں ہے۔ گھاٹے کا سودا نہیں کیا کبھی۔ تیرا چھوکری بمباٹ چیز ہے۔ ابھی کورا مال ہے۔ پچیس لاکھ سے جیادہ کا مارکیٹ ہے۔ جو کھریدے گا پچیس بنائے گا تو پچیس میں نکالے گا۔ تیس تو میں بکا۔ پانچ سال بعد بھی پانچ لاکھ کا مارکیٹ ہے۔ دبئی کا مال ہے ایک نا کھوروز کا بکنگ ملے گا۔“

میڈم نے کہا۔ ”اچھا، اچھا، میں کروں گی، جیسا تم کہو گے۔“

کال بند ہوگئی۔ میں نے کان سے ایئر فون نکالے۔ چند منٹ کی خاموشی رہی۔ میڈم کی حالت غیر ہو رہی تھی اور وہ مظلوم نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”کال مجھے فیک لگتی ہے میڈم... یہ ڈاکو نہیں ہیں۔“

وہ چونکی۔ ”ڈاکو نہیں ہیں؟“

”یہ میرا خیال ہے۔ اس کی تصدیق بھی ہو جائے گی جب مجرم پکڑے جائیں گے اور وہ پکڑے ضرور جائیں گے۔“

”میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی۔ ڈاکو نہیں ہیں تو کون میرے ساتھ یہ کھیل کر رہا ہے؟“

میں نے صائمہ کی طرف دیکھا اور اس نے سر کی خفیف جنبش سے مجھے گرین سگنل دیا۔ صاف بات کرنے کا وقت آگیا تھا۔

”کھیل آپ کر رہی ہیں میڈم! آپ کو تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔ یہ فون کرنے والے جو بھی ہیں، وہ نوشی کو بیچنے کی بات آج کر رہے ہیں لیکن آپ اسے پہلے ہی بیچ چکی تھیں۔“

وہ کچھ دیر دم بخود بیٹھی رہی۔ ”میں... اسے بیچ چکی تھی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمارے ملک کے دیہی اور قبائلی معاشرے میں لڑکیوں کے سودے آج بھی ہوتے ہیں۔ بازارِ حسن تو بدنام ہیں وہاں عورت کی غیرت و ناموس کے محافظ بننے والے اس کے اپنے باپ اور بھائی... معصوم نابالغ لڑکیوں کو ”ونی“ اور ”سوارا“ کے نام پر بیچتے ہیں یا نہیں۔ قتل بھائی کرے تو جرگہ........ اس کی نابالغ بہن کو جرمانے کے طور پر مقتول کے ورثا کے حوالے کرنے کا حکم دیتا ہے۔ روز اخباروں میں ایسی خبریں شائع ہوتی ہیں مگر ان کی تعداد تو کئی سو گنا ہے جن کی خبر بھی نہیں آتی۔“

”مگر مجھ پر یہ الزام کس لیے ہے؟“

”آپ اس طبقے میں ہیں جو اپنی مرضی سے لڑکی کا رشتہ طے کرتے وقت اپنے ذاتی مفادات کو دیکھتے ہیں کہیں کاروباری رشتے استوار ہوتے ہیں تو کہیں سیاسی... آپ نے نقد وصول کیا۔ رشتہ مانگنے والوں کو بلیک میل کر کے۔“

”یہ... یہ جھوٹ ہے۔“ وہ ہکلائی۔

”سنو۔“ میں نے دہاڑ کے کہا۔ ”تم نے ایک تعلیم یافتہ بیٹی کے مستقبل کی خوشی نہیں، اپنا آج کا فائدہ دیکھا۔ اسے زبردستی اس کے پلے باندھ دیا جو کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ ایک شرط بنائے کہ تم نے نکاح سے پہلے ہی حق مہر نقد وصول کیا اور لڑکی کے نام کوٹھی لکھوائی۔ شیر شاہ کے ایک کباڑی کا بیٹا ساجد ہے وہ جسے تم نے کہا کہ خوش حال بزنس مین گھرانا ہے۔ لڑکا نوکری کرنا چاہتا ہے۔ مائی فٹ! وہ کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ اور تم کیا سمجھتی ہو وہ شادی کر کے اپنا

گھر بسانا چاہتا ہے؟ وہ ایک خوب صورت لڑکی کے ساتھ اس کا شوہر بن کے وقت گزارنا چاہتا ہے اور بس، جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ اسے ایک سوٹ کیس پکڑا کے گھر کے باہر کھڑا کردے گا کہ بس اب جاؤ بابل کے گھر... آج رات تمہاری جگہ دوسری آرہی ہے۔ اس کو نین بدل کہتے ہیں، تین سیکنڈ لگیں گے۔ حق مہر وہ پہلے ہی ادا کرچکا ہے۔''

وہ منہ چھپا کے رونے لگی۔ ''ایسا نہیں ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور یہ بھی سمجھ لو کہ اسے ڈاکو نہیں لے گئے۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس کو جانا ہی تھا۔ اس کے ساتھ جسے وہ اپنا جیون ساتھی پہلے ہی منتخب کرچکی تھی۔ یہ تمہیں معلوم ہوگا ضرور... مگر تم نہیں بتاؤ گی تب بھی معلوم ہوجائے گا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور جب ڈاکو چلے گئے تو اس نے جلدی جلدی اپنا سامان پیک کیا اور نکل گئی۔''

''تم میری بات تو سنو پلیز۔'' وہ روتی رہی۔

''نہیں، پہلے تم میری بات پوری سن لو۔ میں خبروں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ فلموں کی طرح خبریں بھی بنائی جاتی ہیں آج کل۔ جو اخبار پڑھتے ہیں وہ اتنا ہی اور وہی جانتے ہیں جو خبر ہے۔ اس کے پیچھے کیا ہے یہ اکثر اخبار والے ہی جانتے ہیں۔ اغوا برائے تاوان کی واردات بعض اوقات ڈراما بھی ہوتی ہے۔ ایسا کئی بار ہوا ہے کہ کسی خودغرض یا غرض مند لڑکے نے بہت انتظار کیا کہ کروڑپتی باپ خود ہی مر جائے جو خزانے کے منہ پر سانپ بن کے بیٹھا ہوا ہے۔ پھر انہیں بھی حقِ وراثت ملے۔ آج وہ جوان ہیں اور بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ شادی کے علاوہ... ان کے بھی کچھ خواب ہیں۔ کامیابی کی جدوجہد کے لیے بھی صرف ارادہ کافی نہیں۔ تھوڑی بہت مالی بنیاد بھی چاہیے۔ انہیں تو اپنی ضمانت پر کسی بینک سے قرض بھی نہیں مل سکتا۔ یہ بنیاد باپ بہ آسانی فراہم کرسکتا ہے مگر وہ کنجوس ہے یا اولاد پر اعتماد نہیں کرتا۔ ان کو اپنی مرضی پر چلانا چاہتا ہے۔ وہ تیل یا صابن کا ہول سیلر تھا۔ یا بکرا منڈی کا... وہ چاہتا ہے کہ اولاد بھی یہی کام کرے۔ وہ جما جمایا کاروبار کیوں نہیں چلاتے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیوں کھڑی کرنا چاہتے ہیں؟ فرض... ڈکٹیٹر باپ کی کھوپڑی میں یہ بات نہیں آتی کہ پہلے تو پیسے کے بل پر اس نے بیٹوں کو ایم بی اے کرایا۔ ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن اور اب کہتا ہے کہ چلاؤ تایہ بزنس... جو اس نے پچاس سال پہلے شروع کیا تھا۔ یہ ماننے کو تیار نہیں کہ نئے زمانے کے نئے بزنس ہیں جو معاشرتی طور پر زیادہ قابلِ عزت سمجھے جاتے ہیں۔ لڑکے پھر اغوا برائے تاوان کا ڈراما کرتے ہیں۔''

''تم اپنی بیوی لے جارہے ہو؟''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ایسی ہی ڈکٹیٹر ماں تم ہو۔ پیسا پیسا تمہارے کنٹرول میں ہے اور مجھے نہیں معلوم پیسے کی یہ ہوس تمہاری فطرت ہے یا عادت بن گئی ہے۔ وہ کیا پہنے گی کیا نہیں۔ اس کا فیصلہ بھی تم کرتی رہی ہو۔ اب شاید وہ اپنی تنخواہ میں سے پورا کرلیتی ہو۔ اپنی مرضی تم نے شادی میں بھی چلانی چاہی۔ اس نے بغاوت کی اور شاید انتقام بھی لیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کال اس کی طرف سے کرائی جارہی ہو۔ وہ کہیں بیٹھی ہنس رہی ہو۔''

میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ دوسری سم باقی دنیا کے لیے تھی چنانچہ اس کی رنگ ٹون شریفانہ تھی۔ دوسری طرف سے ظالم خان نے کہا۔ ''ہم نے اسے منگوا لیا ہے۔ جو تمہارا موبائل فون لے کر بھاگ گیا تھا۔ میرے آفس آکے اس سے مل لو۔''

میں ایک دم اٹھا۔ ''مجھے فوراً جانا ہے، ڈرائیور سے کہو مجھے لے جائے۔''

''تم خود کہہ دو۔ وہ لے جائے گا مگر تم نے میری بات نہیں سنی۔''

''آکے سنوں گا۔'' میں نے جاتے جاتے کہا۔

بیس منٹ بعد میں نے ظالم خان کے آفس میں قدم رنجہ فرمایا تو موبائل فون لے جانے والے کو دیکھ کر مجھ پر چودہ نہیں پندرہ طبق روشن ہوگئے۔ وہاں پھر ساجد فریادی بنا بیٹھا تھا اور ظالم خان بڑے ظالمانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

میں سامنے بیٹھنے کے بجائے تیسری سمت کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا مسٹر ساجد۔''

''بزدل صاحب! آپ تو بہت بہادر ہیں۔ بڑی ہمت کی کہ مجھ پر موبائل لے بھاگنے کا الزام لگا دیا۔ ڈی ایس پی صاحب سے کہہ کے، ڈکیتی، قتل یا منشیات رکھنے کا کیس بناتے کہ ضمانت بھی نہ ہوتی۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''آئی ایم سوری، وہ ویلیو سوک تمہاری ہے؟''

''میرے باپ کی ہے۔'' اس نے اتنے ہی تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں تو پھکو آدمی ہوں۔''

''نوشابہ تمہارے ساتھ گھومتی تھی؟''

''نہیں جی، میں اسے ساتھ لے کر گھومتا تھا۔ گن پوائنٹ پر۔'' وہ بولا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ بلاشبہ وہ ایک ہینڈسم ہیرو تھا جو پہلے شہزادہ گمنام کہلاتا تھا۔ چھ فٹ سے چھ انچ قد کا صحت مند اور وجیہ نوجوان جس نے آج مختلف ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا چاہے نہ ہو مگر اس کے جوابات سے اس کی ذہانت ثابت ہوتی تھی۔ اس جیسا نوجوان کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا تھا۔ آئیڈیل سماجی رتبہ عہدہ یا کاروبار ہو سکتی ہے مگر ڈگری کبھی نہیں ہوتی۔ ایک گھسیا ساماورہ ہے۔ گدھی پر دل آ جائے تو وہی لیلیٰ... فارسی میں کہتے تھے کہ لیلیٰ را بہ چشم مجنوں باید دید... اس کا الٹ کسی نے نہیں سوچا کہ مجنوں کون؟ گدھے پر دل آ جائے تو وہی مجنوں... اور مجنوں کو لیلیٰ کی نظر سے دیکھو۔

لیلیٰ کی نظر کا کیا مطلب... لڑکی معشوق ہی ہو سکتی ہے۔ عاشق کیسے ہو سکتی ہے۔ یا عقل تیرا ہی آسرا... عورت کیا انسان نہیں ہوتی؟ اس کے پاس دل اور دماغ نہیں ہوتے؟ وہ اپنی پسند ناپسند صرف جوتے، کپڑے تک رکھ سکتی ہے؟

''اچھا مسٹر ساجد آئی ایم ویری سوری...'' الزام لگانا پڑا اس ہیرو کا پتا چلانے کے لیے جو ہیروئن کے ساتھ نظر آتا تھا۔ وہ ویٹر نام بتاتا یا ہم اسے کام بتاتے تو خرابی ہوتی۔ نوشی محبت کرتی ہے تم سے یہ بات میرے ناقص دماغ میں بالکل نہیں آسکتی تھی۔ وجہ پتا نہیں۔ بس وہی روایتی سوچ تھی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک اچھی خوب صورت لیکچرر کسی کباڑی کے بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو۔ کباڑی کا لفظ مجھے استعمال کرنا پڑا۔''

''اس میں بھی آپ کا قصور نہیں، یہی ہے میرا باپ۔''

''اچھا تو نوشی تمہارے ساتھ ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ ایسا کریں۔ مجھے کسی تھانے کے ڈرائنگ روم میں رکھیں آج کی رات اور مجھ سے اعتراف کرانے کی کوشش کریں۔ میں اپنے انکار پر قائم رہوں گا۔ مرتے دم تک۔ کیونکہ بات صرف اعتراف کی نہیں ہے۔ نوشی میرے پاس نہیں ہے تو برآمد کیسے ہوگی؟''

مجھ پر مزید چند روشن روشن ہوئے۔ ''نوشی تمہارے پاس نہیں ہے؟ اچھا، غلام خان! میں ساجد کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں، یہ اغوا برائے تاوان کا مجرم ہے اور تم بزدل...'' وہ طنز سے ہنسا۔ ''خطرناک کام ہے مسٹر سراغ رساں۔''

باہر آ کے میں نے میڈم کے ڈرائیور کو رخصت کر دیا اور خود ساجد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''بہت عرصے سے میں کسی نئی لو اسٹوری کی تلاش میں تھا، فلم بنانے کے لیے۔ ذرا مجھے اپنی داستانِ محبت سناؤ۔''

وہ مسکرایا۔ ''ہم کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ سالٹ اینڈ پیپر وِلیج کیسا ہے؟''

ہم آرڈر دے چکے تھے جب فون فریاد کرنے لگا۔ ''جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جی میری انارکلی... میری مس یونیورس...''

''فوراً گھر آؤ، میڈم کے گھر...'' اس نے میرا رومینٹک خطاب نے تغیر کیا۔

''جب ایک عاشق کسی فائیو اسٹار ریسٹورنٹ میں مفت کا ڈنر تناول فرما رہا ہو تو محبوبہ کی دعوتِ وصل کو بھی ٹھکرا دیتا ہے۔'' میں نے کہا اور فون آف کر دیا۔ پھر میں ساجد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہ ہے تمہاری نوشی سے بھی زیادہ پاگل لڑکی... ایسی فریفتہ ہے مجھ پر کہ نہ دن دیکھے نہ رات... ہاں اب شروع کرو کہ پہلی نظر میں عشق کہاں اور کیسے ہوا؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''یہ سو فیصد روایتی فلمی آغاز تھا۔ ایک رات میں اور نوشی مفت میں پھنس گئے۔ میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا جہاں میں اکثر جاتا رہتا تھا۔ باہر نکلا تو میرے سر میں درد تھا۔ میں نے سوچا ٹاپ فلور کے ریسٹورنٹ میں جا کے چائے کافی کچھ پی لوں۔ نوشی کو وہاں ایک صنعت کار نے بلایا تھا۔ وہ کوئی کالج قائم کر رہا تھا۔ اسے پرنسپل کی ضرورت تھی۔ نوشی اپنی لیکچرر کی نوکری سے خوش نہیں تھی۔ سرکاری نوکری غلامی سے کم نہیں ہوتی۔ پھر تنخواہ میں سال کے سال انکریمنٹ کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے بھی پرنسپل کے جاب کے لیے اپلائی کیا اور اسے کالج کے مالک نے پسند کر لیا۔ منتخب نہیں... پسند... وہاں تنخواہ اس کی موجودہ تنخواہ سے چار گنی تھی۔ اور پھر ماتحت سے باس... پرنسپل کا عہدہ۔ لیکن وہ مالک کے بلانے پر گئی تو اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ صرف پرنسپل ہی نہیں مالک کی مسٹریس بھی ہوگی۔ ہوتا ہے یہ بھی۔ وہ انکار کر کے نکلی تو محض اتفاق یہ ہوا کہ اس کے بھی سر میں درد تھا اور اس نے بھی یہی سوچا کہ اوپر ریسٹورنٹ میں جا کے چائے یا کافی کے ساتھ دو گولی سر درد کی نگل لے۔ اس زمانے میں ٹینشن سے اس کے سر میں درد ہوتا تھا۔ وہ گولیاں کھانے لگی تو اس کی عادی ہو گئی۔ میں نے یہ عادت چھڑا دی ہے اور اب اس کے سر

میں درد نہیں ہوتا۔ وہاں ہم الگ الگ ٹیبل پر تھے۔ لفٹ ایک فلور نیچے سے ملتی تھی۔ وہاں ہم اکٹھے ہو گئے کیونکہ رات کے وقت تین میں سے صرف ایک لفٹ کام کرتی تھی۔ اب کرنا خدا کا یوں ہوا کہ لفٹ چلی اور بجلی چلی گئی۔ وہ گھبرائی مگر میں نے ایمرجنسی کا بٹن دبایا اور اسے بھی تسلی دی مگر لفٹ وہیں رکی رہی۔ بار بار ایمرجنسی کا بٹن دبانے سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے پریشانی میں موبائل فون نکالا تو اس کا رنگ اُڑ گیا۔ فون میں سگنل نہیں آ رہا تھا۔ اس کے کہنے سے پہلے میں نے بھی موبائل فون نکالا کہ اپنے دوست کو مطلع کروں۔ سگنل اس میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ نوشی تو بے ہوش ہونے والی تھی مگر میں نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ ابھی کسی اور کو لفٹ کی ضرورت پڑے گی تو معلوم ہو جائے گا۔ بجلی آ جائے گی ورنہ جنریٹر چلا دے گا کوئی۔ میں نے کہا کہ آپ آرام سے بیٹھ جائیں بے ہوش ہو کر گرنے سے پہلے اور مجھ سے بالکل نہ ڈریں۔ خیر وہ بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھ میں پانی کی استعمال شدہ بوتل تھی۔ میں نے کہا کہ یہ پانی جھوٹا ضرور ہے مگر پی لیں۔ تھوڑے سے تذبذب کے بعد اس نے پی لیا۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں ہوا۔ بجلی آئی نہیں۔ بعد میں پتا چلا کہ رات کے وقت جنریٹر نہیں چلایا جاتا۔ موبائل فون کا سگنل بھی نہیں آیا۔ جن کو جانا ہوگا وہ سیڑھیاں اتر کے چلے گئے۔ ہم دو لفٹ کے قیدی رہ گئے۔ بالآخر میں بھی بیٹھ گیا۔ ہم رات بھر کیا کر سکتے تھے باتوں کے سوا۔ بجلی آئی صبح۔ کچھ دیر بعد دفتر کے لوگ بھی آ جاتے۔ وہاں میں نے اسے پسند کیا بلکہ اس پر سو جان سے عاشق ہو گیا۔ اور اس کا رویہ بھی دوستانہ ہو گیا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ اس کو بھی میں اچھا لگا تھا۔ جب دوسری بار ہمارا آمنا سامنا دو ہفتے بعد ایک دکان میں ہوا اور وہ پہچان کر میرے پاس آئی اور بولی کہ مسٹر ساجد کیسے ہیں آپ... اور اس نے میری کافی کی دعوت قبول کر لی۔"

"گڈ، ایک بچ کے رومینس کا فلمی اسٹارٹ۔" میں نے کہا۔ "لیکن اصل کہانی اس کے بعد شروع ہوتی ہے جب ہیرو نے اپنے ابا کو ہیروئن کی ماں کے پاس بھیجا اس کا ہاتھ مانگنے کے لیے... گویا ولن کا کردار کہانی میں آیا۔ اس نے انکار کر دیا۔"

"ہاں، پہلے تو ابا کو راضی کرنے کا مرحلہ تھا۔ اتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ بہو کے خیال سے اماں کی روح فنا ہوتی تھی کہ اس کی بہنی چوٹی تو ہو گی نہیں میری چوٹی پکڑ کر گھر سے نکال باہر کھڑا کرے گی اور ہماری خاک خدمت کرے گی۔ ہم سے بھی ناز نخرے اٹھوائے گی۔ ابا کی مخالفت کا ایجنڈا اور نکاتی تھا۔ دوسرا پوائنٹ یہ تھا کہ شہزادہ گلفام، تمہیں وہ کوہ قاف کی پری کیسے قبول کر رہی ہے جو بدحرام نمک اور ایک کباڑی کی اولاد ہے۔ تم اس کے غلام بن سکتے ہو، شوہر نہیں... مگر میں نے کہا کہ اچھا نہ جائیں آپ... میں خود جا کے اس سے شادی کر لیتا ہوں کورٹ میں... مگر اس کی ماں بھی نہ مانی اور ایسا ہی سین دوسری طرف ہوا، یہی ڈائیلاگ ہوئے۔"

میں نے کہا۔ "وہ سب ٹھیک، لیکن یہ جو تم نے ایڈوانس حق مہر دیا اور لڑکی کو مکان خرید کے دیا۔ اس کی پھر کیا ضرورت تھی؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "آف کورس، ہم نے بلیک میل کیا اپنے پیدا کرنے والوں کو۔"

"ہم کا مطلب ہے دونوں؟"

"یس، اس نے ماں کو، کورٹ کی دھمکی دی۔ میں نے بھی دی۔ مگر یہ ایڈوانس حق مہر اور مکان کا آئیڈیا میرا نہیں تھا۔ میں نہ پاگل ہوں اور نہ اتنا لالچی خود غرض اور ذلیل۔ فرض کریں میں ایسا کرتا تو کیا دنیا کی کوئی لڑکی مجھ سے شادی کرتی؟ جوتا نہ مارتی منہ پر کھینچ کر کہ اسے محبت سمجھتے تھے تم اور اس لیے شادی کر رہے تھے مجھ سے؟"

"جوتا نہیں جوتی مارتی جس کی نوکیلی ہائی ہیل تمہارے سر کے بیچ میں شگاف کر کے اندر اتر جاتی۔"

"آپ کب سے جانتے ہیں میڈم کو اور کیسے؟"

میں نے حقیقت بتا دی۔ "میں ایک حسین خاتون کے حکم کا غلام ہوں۔ جو آپ کی ساس کی غلام ہیں۔ یعنی میں غلاموں کا غلام۔"

یہ پاکستان کے سب سے بڑے گمنام سراغ رساں ہیں... بزدل ہیں تو کیا؟

"آپ کو علم نہیں، میں جو اتنا مطمئن اور تھوڑا سا بے فکر ہوں، آپ کی وجہ سے ہوں۔ ورنہ نوشی اغوا ہو جاتی تو میں سکون سے بیٹھ سکتا تھا۔ کسی نے فون پر مجھ سے کہا کہ آپ اسے بازیاب کرا لیں گے۔ وجہ بھی بتائی، ڈاکو آپ کے مرید ہیں۔"

"جس نے بھی یہ فرمایا بکواس فرمائی، اسے چھوڑو، تم نے یہ بلیک میلنگ کیوں کی؟"

"میں نے نہیں، نوشی نے۔ آپ جانتے ہیں اس کی ماں کیسی خود غرض اور لالچی ہے۔ ماں سے زیادہ جیلر ہے۔ نوشی نے صاف کہا کہ میں تمہارے گھر میں نہیں رہ سکتی اور تم

گھر داماد بن کے میرے گھر میں نہیں رہ سکتے۔ میں نے اس کی بات سے سو فیصد اتفاق کیا تو اس نے کہا کہ تمہارا اپنا کوئی گھر ہے نہیں، کرائے کے گھر میں رہنا مجھے منظور نہیں۔''

صائمہ کی آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔ آفرین ہے اس بہادر لڑکی کی دور اندیشی پر اور دانش پر۔

ساجد بولتا رہا۔ ''اب میں اپنی ماں کو مزید بلیک میل کرتی ہوں۔ ان کو الٹی پٹی پڑھاتی ہوں۔ تمہارے ابا کو انکار تو وہ کریں گی۔ میں کہوں گی کہ انکار کرتا ہے تو اس کے باپ کے سامنے دو مطالبات رکھیں۔ یہ کہ لڑکی کے نام سر چھپانے کا ٹھکانا کرو۔ دور لڑکا ہے تو اس کی طرف سے تم میری بیٹی کو مالی تحفظ فراہم کرو... اس کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم ڈالو، ظاہر ہے وہ آتش فشاں کی طرح ابلتا وہیں چلا جائے گا۔ آگے دونوں مطالبات باپ سے منوانا اصل امتحان ہے۔ مگر اکلوتا بیٹا سپر پاور ہوتا ہے۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے اور یہ ہمارے لیے محبت ہے ہمارے والدین کے لیے جنگ۔ مجھے بھی یہ کام ناممکن لگتا تھا مگر نوشی نے کہا کہ کوشش کر کے تو دیکھو، میری خاطر... میں نے کہا کر او کے۔ لیکن میں ناکام رہا تو پھر میری چلے گی۔ لو جی، میری بات پر ابا صاحب نے مجھے جو گالیاں دیں اور اماں نے جو کوسا، وہ میں کیا بتاؤں۔ قصہ مختصر، میں نے ٹرمپ کارڈ کھیلا۔ اس کی کوئی دوست ڈاکٹر ہے۔ اس نے کوئی دوا دی کہ چند گھنٹے کے لیے اتنا شل ہو جاؤ گے مگر مرو گے نہیں۔ سرکاری اسپتال تو وہ لے کر جائیں گے نہیں۔ وہاں پولیس کیس بن جائے گا۔ قریب ترین پرائیویٹ اسپتال یہی ہے جہاں میں ہوں۔ اور وہ خود علاج کے لیے یہاں آتے ہیں۔ یہاں میں سنبھال لوں گی ورنہ ہمدردوں کی کسی اور کو جو ڈیوٹی پر ہوا۔ خودکشی سے پہلے جو نوٹ لکھو کسی خاتون رائٹر سے لکھواؤ تو زیادہ موثر ہوگا۔ ویسے تو میں بھی لکھتی ہوں زنانہ رسالوں میں کہانیاں۔ بس جناب کام تو وہیں بن گیا۔ اور سب ویسے ہی ہو گیا جیسے ہم نے پلان کیا تھا۔''

''ہم نے نہیں صرف نوشی نے۔ خیر، اس نے بھی اچھا کیا۔ ہر فرعونے را موسیٰ... ایسی ماں کو ایسی ہی بیٹی ٹھیک کر سکتی تھی۔ تم دونوں نے اپنا اپنا الو سیدھا کیا۔ لیکن اب یہ نیا ڈراما کہاں بیٹھ کے کر رہی ہے وہ... یہ بہت زیادتی ہے۔''

وہ چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب وہی ہے جو وہ پچاس لاکھ نقد اپنی ماں سے بھی اپنے اکاؤنٹ میں چاہتی ہے۔ یہ ڈاکو ڈاکو کا کھیل...''

''یہ کوئی کھیل نہیں ہے اور جو اُلو کا پٹھا ایسا سمجھتا ہے...'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میرا ڈی ایس پی دوست ایسا سمجھتا ہے کہ اسے ڈاکوؤں نے اغوا نہیں کیا۔ وہ خود چل کے کہیں گئی ہے۔ ڈاکوؤں کے جانے کے بعد۔''

''گدھا ہے آپ کا یہ ڈی ایس پی دوست۔ اس قابل ہے کہ اسے کانسٹیبل بنا کے چوک میں کھڑا کر دیا جائے۔ آپ کا خیال ہے کہ یہ بھی بلیک میلنگ ہے؟ میں شریک ہوں اس ڈرامے میں۔ آپ اس کی جان سے کھیل رہے ہیں۔ آپ بزدل ہی نہیں احمق بھی ہیں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک منٹ۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے۔ تمہاری ساس کے گھر۔''

''تماشا بننے، ذلیل ہونے، میں نہیں جاؤں گا۔ اس بڑھیا کی بکواس سننے۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''نہیں، ہمارے ساتھ مل کر اس نئی صورت حال اور اس چیلنج سے نمٹنے کے لیے۔ اپنے اور ظالم خان کے بارے میں تمہارے خیالات سے میں متفق ہوں۔''

☆☆☆

صبح دس بجے نیلی ہنڈا سوک پھر میڈم کے گھر میں داخل ہوئی تو گھر میں چار افراد موجود تھے۔ ایک سوگوار اشکبار ماں۔ ایک شرمسار ڈاکٹر، ایک شرمسار پولیس افسر اور ایک خاکسار... صورت حال ایک دم عجیب ہو گئی تھی اور اس کا ذمے دار ظالم خان کے ساتھ میں بھی تھا جس نے اس کی بات کو سو فیصد قابلِ اعتبار مان لیا تھا۔

ظالم خان نے تفتیش کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کیا تو مجھے توپ صاحب کا خیال آیا۔ آج تو ان کا سوم ہونا چاہیے اصولاً۔ جب ان کا وقتِ شہادت قریب تھا تو میں واقعی بزدل ثابت ہوا تھا اور بھاگ آیا تھا۔ تمام شکایات کے باوجود توپ صاحب کی شفقت اور ان کے دورِ رفاقت کو یاد کر کے میں آب دیدہ ہو گیا۔ روزنامہ ''حقیقت ساز'' بھی مرحوم اور میرے بقایا جات بھی یوم حساب تک موقوف۔ مگر ایسی شقاوت بھی کیا کہ میں مرقدِ مبارک پر فاتحہ تک نہ پڑھوں۔ بہت سے دردناک اشعار مجھے یاد آئے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج تم کل ہماری باری ہے۔ دشمن مرے تے خوشی نہ کرے سجناں وی مر جانا... پھر کیا عجب کہ ناقابلِ اعتبار فرشتۂ اجل نے قاتل کو مقتول کر دیا ہو۔ توپ صاحب کرپی اوارت پر نہ ہوں حوالات میں ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ یوں لاتعلق اور بے خبر رہنا بے حسی اور بزدلی ہونے کی دلیل ہے۔ ویسے بھی اس جائے واردات پر میرے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ جو دوسری گئی ’ہچکی‘ سے تو میں فرار ہو گیا تھا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا کہ توپ صاحب کئی بار فون کر چکے ہیں اور آخری بار تو انہوں نے بڑا دردناک شعر پڑھا تھا کہ تک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے۔ کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا... اور وہاں سے نکل آیا۔

روزنامہ ’’حقیقت ساز‘‘ کے دفتر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میری نظروں کے سامنے شعور میں جو مناظر آئے وہ اندھا دھند تک ہی تھے مگر دروازے سے اندر قدم رنجہ فرماتے ہی میں نے جو منظر دیکھا، ناقابلِ یقین تھا۔ توپ صاحب اسی قتل کا عہد کر کے جانے والے پٹھان کے ساتھ میز پر آمنے سامنے شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ دونوں کی نظر مہروں پر تھی چنانچہ کسی نے نظر اٹھا کے میری طرف نہیں دیکھا۔ پھر میرے سامنے پٹھان نے توپ صاحب کو نسوار پیش کی اور انہوں نے سر ہلا دیا۔ ’’میاں تم ہماری گلوری قبول کرتے تو ہم بھی ایک چٹکی نسوار کی لے لیتے۔‘‘

’’خو یارا، یہ تو ایک دم بمباٹ چیز ہے۔ جنت کا نشہ۔‘‘

’’اور ہماری بارہ مسالے والی گلوری شاہانہ شوق۔‘‘ توپ صاحب بولے پھر انہوں نے مجھے دیکھا۔ ’’ارے میاں بزدل! تم کیا زمین سے اُگے ہو گویا کہ گڑے کھڑے ہو وہیں۔‘‘

میں ان کے درمیان تیسری طرف بیٹھ گیا۔ ’’کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنے موافق حالات تھے مگر آپ میں سے کسی کو فوت ہونے یا فوت کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ اب تک آپ ایک دوسرے کو قتل کر چکے ہوں گے۔‘‘

توپ صاحب مرغی کی طرح کڑکڑائے جو ان کے ہنسنے کا انداز تھا۔ ’’لو بھئی اپنے خان صاحب، ذرا اس کو بھی سمجھاؤ کہ ہم اور کیا کر رہے ہیں آخر۔‘‘

اس نے مجھے افسوس ناک نظر سے دیکھا۔ ’’خو ابھی ہم بتائے گا تم کو... ڈرپوک کا بچہ... اپنا ایگریمنٹ ہو گیا ہے پکا۔ جو یہ بازی ہارے گا وہ لکھ کر دے گا کہ اس نے خودکشی کی۔ پھر دوسرا اس کو قتل کرے گا۔‘‘

میں نے ان دونوں کو مشتبہ نظر سے دیکھا۔ ’’اور بازی ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو گئی تو... ایسا ہوتا ہے۔‘‘

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پھر توپ صاحب گلوری کے منصوبے سمیت گڑگڑا کے ہنسے۔ ’’برخوردار عزیز من، یہ تو ہمیں اندازہ ہے کہ ایسا ہو گا بلکہ ہو چکا ہے۔‘‘

پٹھان ہنسا۔ ’’ابھی ہم کل سے ادھر بیٹھا ہے۔ ایک بھی چال نہیں چلا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بہت خوب، بیٹھے رہیے جب تک فرشتۂ اجل خود کسی ایک کو اٹھا کے نہ لے جائے میں چلتا ہوں۔‘‘

حیرت انگیز سرعت کے ساتھ توپ صاحب نے کرسی کے سہارے کھڑی چھتری اٹھائی اور اس کا حلقہ میری گردن میں ڈال دیا۔ ’’ایسے کہاں چلے میاں بزدل... کل قطعہ کی جگہ کیا ہم جلاب کا نسخہ چھاپیں گے؟‘‘

میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی ادائے فرض کے خیال سے آ گیا تھا، وصولیٔ قرض کی کوشش کے لیے بھی وقت کہاں تھا۔ میں نے قطعہ جیب سے نکال کر ان کے حوالے کیا۔

’’بھئی خان صاحب! بڑا اونچے دار برخوردار ہے گویا اپنا بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔‘‘ توپ صاحب بولے۔

پٹھان نے سوچ کے کہا۔ ’’خو، یہ کون ہے۔ ہم تو نہیں جانتا۔‘‘

توپ صاحب خندہ زن ہوئے۔ ’’بھئی اپنا بزدل اور کون، اب اتنا لمبا نام آدمی فرصت میں لے سکتا ہے گویا۔ ہم نے مختصر کر دیا ہے۔ جیسے اب تمہارا اسلم شریف ہے گویا... آغا حکیم مقصود قریشی... تو پہلا حروف لے کر ملائیں تو بنتا ہے احمق...‘‘

پٹھان نے غرا کے کہا۔ ’’احمق بولا تم ہم کو؟‘‘

’’اماں لاحول ولاقوۃ... ہم تو بزدل کی مثال دے رہے تھے کہ ہم نے نام کو مختصر کر کے بزدل بنا دیا۔ تم چال سوچو...‘‘

ابھی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں توپ صاحب کی درورزہ میں جتلا کیج کی آواز جیسی ہنسی سن ہی رہا تھا کہ موبائل فون میائلہ سے منسوب رنگ ٹون میں گانے لگا۔ ’’جگر چھلنی ہے دل گھبرا رہا ہے۔‘‘

میرے ہیلو کہنے سے پہلے ہی اس نے مجھے ڈانٹنا شروع کیا۔ ’’حد ہوتی ہے غیر ذمے داری کی بھی۔ اتنے اہم معاملات پر بات چھوڑ کے نکل گئے۔ کہاں ہو اس وقت؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’مراجعت کے راستے پر، شرمسار یہ

تابعدار نابکار۔۔۔ اے میری بلبل کو ہسار۔“

مگر میری آواز نظم کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ فون بند کر چکی تھی۔ اس کی آواز سے صورتِ حالات کے کچھ سنگین ہونے کا اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ جب میں پھر جائے واردات پر نمودار ہوا تو سب کی نظر میں میرے لیے صرف ملامت تھی لیکن میں نے پھر بھی مسکرانے کی حماقت کی اور سب سے مخاطب ہوا۔ ”اب مجھے بتا دیا جائے کہ میرے جاتے ہی کون سی قیامت آ گئی؟“

میڈم نے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔ ”تمہارے جانے کے بیس منٹ بعد یہ کال آ گئی تھی۔“

میں نے ریکارڈنگ کو آن کیا۔ ”ہیلو۔“ میڈم نے جواب دیا۔

”تو چالاک بن کے ڈاج دینے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہے نا؟“

”دیکھو، میں ایک ماں ہوں۔ مجھے اپنی بچی کی جان عزیز ہے۔“

”ہم جانتے ہیں تو نے نمبر بھی نوٹ کیے ہوں گے۔ کال بھی ریکارڈ کی ہوگی۔ کوئی ضرور تجھے الٹی پٹی پڑھا رہا ہوگا لیکن اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم نے بولا نا کہ تیرا چھوکری اس سے زیادہ مزہ کے دے گا۔“

”دیکھو، اگر تم چاہو تو تصدیق کر لو۔ میں نے صرف ڈکیتی کی رپورٹ لکھوائی ہے۔ وہ بھی دوسرے دن۔“

”سب پتا ہے اپن کو۔ کسی سے بات نہیں کرنے کا۔ کسی کو بتائیں گا تو بات خلاص۔۔۔ نیشنل اسٹیڈیم۔۔۔ تم خود آئیں گا ادھر اپنا گاڑی میں۔ خود چلائیں گا۔ کوئی اور ساتھ یا آگے پیچھے ہوئیں گا تو ہم کو پتا چل جائیں گا۔ پھر ادھر انتظار کرنا ساری عمر۔“

میں نے کال ختم ہوتے ہی فون بند کر دیا اور ظالم خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ پروفیشنل لوگ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور غالباً ڈاکو بھی۔ ابھی یہ جگہ بدلیں گے۔“

”کالز کہاں کہاں سے کی گئی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ایک کراچی سے، دوسری اندرونِ سندھ سے آئی تھی۔ کچے کے علاقے کی طرف سے۔ اسی سے کچھ اندازہ ہوا کہ یہ ڈاکو ہیں۔ ابھی جو کال آئی۔۔۔“ اس کی بات بیچ میں رہ گئی۔ کیونکہ اس کا موبائل چلانے لگا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہیلو، ہاں۔۔۔ تمہیں پکا پتا ہے۔ اچھا او کے تھینک یو۔“ وہ کال بند کر کے پھر ہم سے مخاطب ہوا جو سانس روکے بیٹھے تھے۔ ”یہ کال مری سے آئی تھی۔“

”مری سے؟“ میڈم نے بے یقینی سے کہا۔

”مری، پشاور، کوئٹہ کال کہاں سے نہیں کرائی جا سکتی میڈم۔ میرے آپ کے بھی دوست بیٹھے ہیں۔ میں اب چلتا ہوں۔ آپ طے کر لیں۔ کسی کی مداخلت میں ففٹی ففٹی چانس ہے کہ رقم بچ جائے۔۔۔ مگر لڑکی نہ بچے۔ آپ کی جگہ میں بھی ہوتا تو رسک نہ لیتا۔“

اس کے جانے کے بعد خادمہ کافی لے کر آئی مگر صرف میرے لیے۔۔۔ ایک سمجھدار بیوی کی طرح بعض اوقات وہ مجھے حیران کر دیتی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ میں کہاں گیا تھا۔ وہاں مجھے کافی نہیں ملی ہوگی۔ چنانچہ درمیان میں وہ دو منٹ کے لیے اٹھ کر اندر گئی تھی تو اس نے خادمہ کو کہہ دیا تھا کہ صرف میرے لیے کافی لائے۔

میڈم نے کسی گہری سوچ سے نکل کر کہا۔ ”بزدل! انہوں نے مجھے بلایا ہے کیا۔۔۔ نیشنل اسٹیڈیم، شہر کے بیچ میں۔“

”میں نے کہا نا جگہ بدلیں گے وہ۔ آپ کو اکیلا جانا تو پڑے گا۔ گاڑی چلا سکتی ہیں نا آپ؟“ میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”لیکن۔۔۔ انہوں نے رقم لے لی۔۔۔ اور نوشی نہ ہوئی وہاں۔۔۔ میں کسی کو پہچانتی تو نہیں نا، جیسے وہ پہچانتے ہیں۔“

”ایسا تو ہوتا ہے۔ یہ رسک تو لینا پڑتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا ہوگا اگر۔۔۔ وہ مجھے بھی گولی مار کے چلے گئے۔۔۔ میرا تو والی وارث بھی نہیں کوئی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ عجیب باتیں کرتی ہیں میڈم۔۔۔ ان حالات میں کوئی ایسا سوچتا ہے؟ والی وارث ہوتا تو کیا فرق پڑتا؟ سوم، چہلم ہی کراتا نا۔۔۔ ایف آئی آر لکھی جاتی اور بس آپ کی ساری توجہ نوشی کو بچانے کے لیے ہونی چاہیے۔ میں نے دیکھا تھا ایک کیس جس میں باپ نے خود کو آفر کر دیا تھا۔ بیٹے کے بدلے اور تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس کا بھی اکلوتا بیٹا تھا۔ لمبے چوڑے کاروبار کا مالک۔۔۔ روپیا پیسا سب اس کی تحویل میں تھا۔ وہ اگلے ہی دن ایک کروڑ لے کر خود گیا مگر ڈاکو نہیں آئے۔ اس نے دو دن انتظار کیا پھر پتا چلا کہ اس کے باپ نے ریوالور چھین کے دو ڈاکو مار دیے اور خود بھی مارا گیا۔ پولیس نے کہا کہ بھاگ جاؤ بیوی بچوں سمیت اور وہ روپوش ہو گیا پھر باہر نکل گیا۔ یہاں جو کچھ تھا، سب اس کے وکیلوں نے بیچ دیا۔ وہ برطانیہ کا شہری تھا۔

وہاں کاروبار کر رہا ہے۔''

میرے خاموش ہونے کے کچھ دیر بعد میڈم نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے... میں بھی ریوالور سے جاؤں اور مار دوں انہیں؟''

میں نے اپنے سر پر علامتی انداز میں ہاتھ مارا۔ ''اس باپ نے بھی کوئی عقل مندی نہیں کی تھی۔ وہ خود بھی زندہ رہتا اور بیٹے کا کاروبار بھی یہاں چلتا رہتا۔ شاید اس نے سوچا کہ خون لگ گیا ہے ان کے منہ کو... اگلی بار یہ بیٹے کے بیٹے کو اٹھالیں گے۔ میری عمر تو 75 سال ہے اور ستانی لوں گا۔ بس یہی سوچ کے وہ لڑ گیا۔ حالانکہ اس سے فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ وہ آدمی پورا گروہ نہیں تھے۔ باقی پہلے دشمن نہیں تھے۔ دو ساتھی مارے گئے تو دشمن ہو گئے اور لڑکے کو جان بچا کے بھاگنا پڑا۔ آپ جاؤ، شرافت سے رقم دو اور بیٹی کے ساتھ واپس آجاؤ۔ فالتو بات کوئی نہیں۔''

مجھے اس رات پھر نوشی کے کمرے میں سونا پڑا۔ کھانے کے دوران میں میڈم کو پوری طرح یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ تاوان ادا کرنے کے بعد نہ اس کے بیٹے کو خطرے کی بات ہے اور نہ نوشی کے لیے۔ ڈاکو ہمارے حکمرانوں سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ تمام عمر کوئی دوسرا ڈاکو بھی دوبارہ تاوان طلب نہیں کرے گا۔ یہ بھتا لینے والوں کی طرح ہوتا ہے پروٹیکشن منی کہتے ہیں دنیا بھر میں... یہ گارنٹی ہوتی ہے کہ وہ اور ان کا کاروبار محفوظ رہے گا۔ یہ رقم بھی ایک طرح کی لائف انشورنس ہے۔

کھانے کے بعد صائمہ کی تحریک پر میں نے اسے لاؤنج میں گرین ٹی پیتے ہوئے ایک دماغ درست کرنے والا لیکچر دیا۔

''اب نوشی لوٹ آئے تو آپ خدا کا شکر ادا کریں۔ اس اتفاق پر کہ آپ نے جس سے لالچ میں اس کا سودا کیا تھا وہی تھا جس کو نوشی چاہتی تھی۔ پسند کی منطق کوئی نہیں ہوتی اور میری آپ کی دنیا میں ہر شخص کی پسند الگ ہے۔ جو میرے نزدیک بے وقوفی ہے دماغ کی خرابی ہے وہ دوسرے کے نزدیک عشق ہے۔ ایک ناقابلِ علاج جان لیوا مرض۔''

''اور تم سمجھتے ہو ہر عشق سچا ہوتا ہے۔ کسی میں دھوکا نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھو، عبرت کی تصویر ہوں میں کہ نہیں۔''

مجھے ایک شاک سا لگا۔ خود صائمہ بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، اسی جوانی کی دیوانی کو بھگت رہی ہوں آج تک۔ تیس سال بعد بھی۔ میں نے کسی کی نہیں سنی۔ کچھ نہیں دیکھا۔ کیسے دیکھتی۔ میری آنکھوں پر اس کے عشق کی پٹی جو بندھی ہوئی تھی۔ اس کی حقیقت تو ملک اور مجازی خدا بننے کے بعد سامنے آئی۔ کتنا بڑا ایکٹر تھا وہ۔ تین سال میں جتنا عذاب وہ دے سکتا تھا اور ایک بیٹی دے کر وہ چلا گیا۔ پچیس سال پہلے میں کیا تھی، نوشی کو معلوم ہے۔ میں ایکٹرس تھی... مگر نوشی نے سب چوری کر کے جلا دیا۔ ایک بھی تصویر، اس کا ایک بھی خط نہیں چھوڑا۔ اور وہ آج عیش کر رہا ہے۔ لاہور میں۔ سچ اپنی جوانی میں وہ واقعی شہزادہ گلفام تھا۔ لیڈی کلر... مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے شکار کیے اور بعد میں کتنے دھوکے شادی کے نام پر دیے۔ ایک مشہور فلمی اداکارہ کے ساتھ اس کی تصویریں شائع ہوئی تھیں، اس کے شوہر کی حیثیت سے۔ بعد میں وہ پریس کانفرنس کرتی رہی۔ بڑی مشکل سے پھر فلمی دنیا میں سیٹل ہوئی۔ ہو سکتا ہے اب وہ بھی کسی کے ساتھ سیٹل ہو گیا ہو بڑھاپے میں۔''

خاموشی کے ایک پرافسوس وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ''نوشی یہ سب جانتی تھی اسی لیے اس نے آپ سے چھپایا۔ کیونکہ وہ خود آپ کی غلطی دہرا رہی تھی۔ آپ اس کی راہ میں دیوار بن جاتیں... مگر... مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ بھی غلط ثابت ہوگا۔ مستقبل کا حال تو خدا ہی بہتر جانتا ہے... جو اس نے دھوکے سے لیا اس کا تھا۔ باقی بھی اس کے نام کر دیں۔ خوشی اور سکون سے معمور دوسری زندگی کے لیے... جو آپ کو نواسے نواسیوں کی صورت میں ملے گا۔ یہ دوسری زندگی آپ کے سارے غم سارے دکھ بھلا دے گی۔ میں نے لوگوں کی یہ دوسری زندگی دیکھی ہے۔''

آدھی رات کے بہت بعد تک میں اور صائمہ اس چھوٹے سے گھر کے چھوٹے سے لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھے رہے اور اس پورے چاند کو دیکھتے رہے جو نہ جانے ایسی کتنی راتوں میں ہمیں اسی طرح دیکھ چکا تھا۔ کبھی ساحلِ سمندر پر، کبھی مری کے کوہساروں کی خاموشی میں، کسی روف ٹاپ ریسٹورنٹ میں، یا ایسے ہی ویران سڑکوں پر سرگرداں... بے چارہ ایک مہربان چاند اور لاکھوں ہم جیسے پیار کرنے والے۔ کسی نے بھی اسے ٹھیک یوں نہیں کہا۔ ہاں شاعروں نے اس پر لکھا۔ مصوروں نے اس کے جادو کو اپنے کینوس پر یا اپنے کمرے میں اتارنے کی کوشش ضرور کی۔ ناکام کوشش۔ چودھویں شب کا جادو وہ کہاں سے لاتے۔

کمرے میں اندھیرا تھا کیے کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا

ہٹائے میڈم ہمیں دیکھتی رہی۔

''کوئی بدتمیزی مت کرنا۔ میڈم دیکھ رہی ہیں چھپ کے۔'' صائمہ نے کہا۔

''ہاں تو یہ وہی بات ہے کہ... تم تو مجھے چھیڑو گے۔'' میں نے ہنس کے کہا۔ ''اس بڑھاپے کی سزا تو یہی ہے کہ اب اپنے خوابوں کی تعبیر دوسروں کی زندگی میں دیکھے۔''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے قصوروار میڈم تھی۔''

''میں یہ بھی نہیں مان سکتا کہ سارا قصور اس کے شوہر کا تھا۔ تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔''

''اس نے بتادیا کہ وہ کس قماش کا مرد تھا۔ اس کے باوجود...'' وہ احتجاج کے انداز میں بولی۔

''دیکھو بی بی، عورت کو خدا نے سپر پاور بنایا ہے۔ قلوپطرہ سے ایوا براؤن تک جو ہٹلر کو کنٹرول کرتی تھی۔ مسز سمپسن تک جس کی خاطر ایڈورڈ ہشتم نے تاج برطانیہ کو ٹھکرا دیا جس پر آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اور طلاق یافتہ مسز پارکر تک جس کے سامنے موجودہ ولی عہد برطانیہ چارلس کو ڈیانا جیسی حسینہ قبول نہ ہوئی۔ خیر، یہ تو تاریخ کی مثالیں ہیں۔ آج بھی عورت نے کتے کی دم جیسے مردوں کو سیدھا کیا ہے۔ ان کی نشے کی لت سے ہوس پرستی کی عادت تک سب چھڑادی ہے۔ انہیں اپنا غلام بنالیا ہے۔ غصے اور چیخ پکار سے نہیں۔ پیار محبت سے۔ جس سے کتا بھی قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔ اگر یہ اتنی خوب صورت تھی تو وہ کسی اور کی طرف گیا ہی کیوں؟ شرط لگالو... اس کی بک بک اور بدمزاجی کی عادت کے باعث... مرد تو ہے طاقتور... اسے طاقت سے عورت کیسے زیر کرسکتی ہے۔''

صائمہ سنتی رہی۔ ''میڈم کا غصہ اور ضد تو دیکھی ہے میں نے بھی۔''

''فارسی میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ مرد عورت سب کے لیے۔ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد... جو عورت محکوم بن کے رہتی ہے وہی مرد پر حکومت کرتی ہے۔''

''اچھا حاکم صاحب آپ کچھ کہہ رہے تھے؟ میں نے سنا نہیں۔ نیند میں تھی۔'' وہ اٹھتے ہوئے مکاری سے بولی۔

اس نے بتادیا تھا کہ وہ محکوم بن کے ہی مانے گی اور حاکم ہوگی۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس نے میری تھیوری سنی ہی نہیں۔

☆☆☆

''ابے ظالم خان! میں اللہ کو پیارا ہونے والا ہوں... الو کے پٹھے۔''

''یار میں سورۂ یٰسین پڑھتا ہوں۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ ڈکی کے لاک کو بھی اسی وقت خراب ہونا تھا۔ ظالم خان نے باہر سے فرمایا۔ ''اللہ کی مرضی، اس کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا تو مکینک کیسے ہٹے گا۔''

''میری بھی نہ ہونے والی بیوی کو بیوہ تو نے کیا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ سیٹ بھی تو نہیں ہٹتی۔''

سین یوں تھا کہ میں میڈم کی گاڑی کی ڈکی میں لیٹا ہوا تھا اور مجھے اندر سے ڈکی کھول کے باہر آنے کی پریکٹس کرنی تھی۔ جو بظاہر بہت آسان کام تھا۔ ایک پیچ کس کی مدد سے مجھے ڈکی کے ایک ہک کو تھوڑا سا ہلانا تھا۔ کھٹ کی آواز کے ساتھ ڈکی اٹھ جاتی، ایسا دو بار ہو گیا۔ تیسری بار نہیں ہوا۔ میری تمام عقل لڑانے کے باوجود اور باہر سے ملنے والی ظالم خان کی ہدایات کے باوجود... میرے پاس ٹارچ بھی تھی۔ اس کی روشنی میں میکانکی خرابی کو تلاش کرنے کی کوشش بھی ناکام رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ کار کی پسنجر سیٹ پیچھے والی لمبی سیٹ کو ہک سے نکال کے آگے جھکایا جاسکتا ہے اور میں دوسری طرف سے کار کا دروازہ کھول کے بھی باہر آجاؤں گا۔ لیکن اس سیٹ کا میکانکی سسٹم کچھ اور تھا۔ مزید یہ کہ اس کے عین نیچے چار فٹ کا گول سفید اور بم کی شکل کا گیس سلنڈر نصب تھا۔

یہ کارروائی ایک خاص پلان کے تحت ہورہی تھی جو ظالم خان نے صبح میرے سامنے رکھا تھا۔ مجھے اس نے آٹھ بجے خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ''بزدل صاحب! رات کیسی گزری؟''

''جیسی تمہاری گزری ہوگی ویسی نہیں گزری۔ کوئی خاص بات تھی کہ آپ نے... اٹھ کر مری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔ علامہ کے فرمودہ پر عمل ضروری سمجھا؟''

''ہاں، پلان بدل گیا ہے۔ میڈم کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''ہوگی تاوان کی رقم کے انتظام میں مصروف۔ کل میں نے اور صائمہ نے اس کا دماغ درست کر دیا۔''

وہ ہنسا۔ ''وہ تیرا دماغ تو درست کر نہیں سکی۔ خیر، میری بات دھیان سے سن۔ وہ رقم کا بندوبست کرنے... بینک سے... قرض دینے والوں سے ملے تاکہ کوئی دیکھنے پر مامور ہو تو اسے یقین آجائے۔ گیارہ بجے وہ آئی آئی چندریگر روڈ پر جائے۔ نیشنل بینک کے ہال میں ایک پٹھان

خود اس سے رابطہ کرے گا اور سب کے سامنے اسے پچاس لاکھ دے گا۔"

"کون پٹھان؟"

"تیرا ماما، نام اور ولدیت سے کیا لینا دینا میڈم کا۔ یہ سین کیمرے بھی ریکارڈ کریں گے۔ پھر وہ رقم ایک تھیلے میں ڈال کے باہر نکلے گی اور اپنی گاڑی میں اسپتال چلی جائے گی۔ فکر کی بات نہیں۔ سادہ کپڑوں میں پولیس کے کمانڈوز کی گاڑیاں آگے پیچھے ہوں گی۔ کسی نے لوٹنے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ صائمہ کے پاس گاڑی ہے۔ وہ ٹائم پر اسپتال جائے گی اور تم کو توپ صاحب کے آفس پر اتار دے گی۔ سب معمول کے مطابق نظر آئے اگر وہ دیکھ رہے ہوں۔"

"مگر اس وقت وہاں آلو بھی نہیں بول رہے ہوں گے۔ توپ صاحب بھی نہیں ہوں گے۔"

"الو تیرے جانے کے بعد بولنے لگیں گے۔ سب تو وہیں سوتا ہے یا پھر وہ تجھے اپنے مرقد پر اتار دے۔ یہی بہتر ہے۔ چار بجے آپ جائیں میڈم کے پاس۔ صائمہ سے ملنے اور وہاں سے صائمہ کی گاڑی میں میڈم کے گھر... تب تک وہ پچاس لاکھ کی رقم کے ساتھ گھر پہنچ چکی ہوگی اور فکر کی بات نہیں۔ دن میں جب گھر بند تھا تین کمانڈوز اندر پہنچ چکے ہیں، چار بجے میں بھی اندر ہی ملوں گا۔ فیصلہ یہ کیا ہے کہ میڈم اکیلی نہیں جائے گی رقم لے کر۔"

"پھر؟ کمانڈوز ساتھ جائیں گے؟ تجھے اس میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا؟ میڈم یا نوشی کے لیے؟"

"کمانڈو ساتھ نہیں جائیں گے۔ ایک بہت بہادر بندہ ساتھ جائے گا۔ نام کا تو بزدل ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "میں؟ ظالم خان دشمنی نکالنے کا اچھا طریقہ سوچا۔ صائمہ بیوی سے پہلے بیوہ ہو جائے۔"

"برادر عزیز، آپ ایسے جائیں گے کہ نظر نہیں آئیں گے۔"

"اچھا! سلیمانی ٹوپی ایجاد کر لی ہے پولیس نے یا کسی سے مال مسروقہ میں برآمد کی ہے؟" میں نے کہا۔

"آپ ڈکی میں آرام سے لیٹ کر جائیں گے۔ میڈم کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں بہت طاقتور کیمرے نصب کر دیے گئے ہیں۔ کل رات جب گاڑی گھر کے گیراج میں تھی۔ سامنے کی گرل میں بھی ایک کیمرا ہے اور سب کے ساتھ مائک ہیں۔ یہ سب آج کل بچوں کے کھلونے ہیں۔ پولیس کے پاس بہت اعلیٰ پروفیشنل سامان ہے۔ ڈکی میں

ایک ٹیبلٹ ہے۔"

"جلاب بند کرنے کی گولی... جو مجھے لگ چکے ہوں گے۔"

"ابے اینڈرائیڈ ٹیب... اس پر تصویر صاف نظر آئے گی۔ باہر کے کیمروں کی اور آواز بھی ریکارڈ ہوگی۔ دن کی روشنی میں فلیش لائٹ کی ضرورت نہیں۔ بس میڈم کو گاڑی نیشنل اسٹیڈیم کے سینٹر میں بیچ کے پاس روکنی ہے۔ اور باہر نکل کے گاڑی کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ یونٹ سے ٹیک لگا کے انتظار کرنا ہے۔ ابھی تک انہوں نے جگہ نہیں بدلی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بدلیں گے۔ ایسا ہوتا ہے۔ دو تین دفعہ بھی وہ ایک جگہ بتائیں گے اور کبھی دوسری جگہ۔"

"اور میں بار بار اسی طرح پنجرے میں بند ہو کے...؟"

"انہیں اسی طرح گرفتار کریں گے ہم... بعد میں۔"

نتیجہ یہ کہ عین وقت پر میں لاک ہو گیا تھا اور لاک جام ہو گیا تھا۔ اب مجھے سکون سے لیٹ کر دعا کرنا تھی کہ لاک ٹھیک کرنے والا آ جائے۔ میں نے ڈکی میں موجود سات انچ کی ٹیبلٹ کے فنکشن چیک کیے۔ مجھے باہر کا منظر

بھی صاف نظر آ رہا تھا اور میں باہر کی ہر آواز سن سکتا تھا۔ جب سلیپنگ نمودار ہوا تو اس نے ایک منٹ سے کم وقت میں نہ صرف اسے کھول دیا بلکہ مجھے تار کا بنا ہوا مچھلی کے کانٹے جیسا ایک ہک بھی فراہم کر دیا جو... خدانخواستہ پھر اسے جام ہونے کی صورت میں میری مشکل آسان کر سکتا تھا۔

روانگی کے وقت تک اغواکاروں نے کوئی کال نہیں کی تھی۔ ایک خوف زدہ، پریشان حال، بے ہوش ہونے کے قریب میڈم نے پچاس لاکھ کے ساتھ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اب مجھے ایک نیا اندیشہ لاحق تھا۔ میڈم راستے میں بے ہوش ہو گئی یا اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تو نہ جانے گاڑی کس سے ٹکرائے گی۔ وہ گدھا گاڑی بھی ہو سکتی ہے اور ویگن یا ڈمپر ٹرک بھی۔ میڈم کس حال میں نکالی جائے گی۔ یہ میں دیکھ سکوں گا یا نہیں۔ آہ صائمہ... اس دنیا سے تمہارا واحد عاشق صادق ناکام و نامراد جائے گا۔ اس کے بعد کے منظر میری نظر میں پھرنے لگے۔ بال بکھیرے ٹوٹی قبروں پر... جب کوئی مہ جبین روتی ہے... اگلا شعر مستر د... مجھے اکثر خیال آتا ہے... موت کتنی حسین ہوتی ہے... کی نٹ... اور وہ بھی حسین بھی غلط کہ عام اردو میں دو پاک روحوں کا ملن ہو... صائمہ الو کی پٹھی... میری برسی سے پہلے ہی...

میرا پریشان خواب ایک دم ٹوٹ گیا۔ نیشنل اسٹیڈیم تک کا راستہ میرے سامنے ٹیپ پر چل رہا تھا اور راستے کی ٹریفک کا سارا شور بھی سنا جا سکتا تھا مگر میں نے نہ کچھ دیکھا نہ سنا۔ وہ اب گاڑی نیشنل اسٹیڈیم میں کھڑی تھی۔ میں ٹیپ پر پویلین دیکھ سکتا تھا۔ اور سنسان پڑے اسٹیڈیم کے اسٹینڈ... جو میچ کے دوران چالیس ہزار سے زائد تماشائیوں کے شور سے گونجتے تھے۔ آسیب زدہ منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نے میڈم کو گاڑی سے اتر کے سامنے آتا دیکھا اور دعا مانگی کہ وہ جتنی ہوش و حواس اپنے پیروں پر کھڑی رہیں۔ حالانکہ مجھے خود اپنے لیے بھی یہی دعا کرنا چاہیے تھی۔ دعا شاید پہنچی بھی نہ ہو کہ میں نے ایک موٹر سائیکل کو آتا دیکھا جس پر دو بچے کے جوان سوار تھے۔ ان کے جوان ہونے کا اندازہ ان کی جینز سے اور بازوؤں سے ہوتا تھا ورنہ انہوں نے منہ نقاب میں چھپا رکھے تھے۔ سامنے آ کر وہ موٹر سائیکل رکتے ہی چھلانگ مار کے اترے... ان کی موٹر سائیکل بے جان ہو کے گری اور انہوں نے میڈم کو بوچ کے گاڑی میں پیچھے دھکیل دیا۔ دوسرا ان کے ساتھ اندر گیا۔ اس کے دروازہ بند کرنے تک پہلے نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی اور اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

میں مفلوج پڑا دیکھتا رہ گیا۔ انہیں کچھ سمجھنے کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اب میڈم کی زندگی بھی ان کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ ایک طرح سے خوش نصیب تھے۔ ان کو شوٹ کر کے گاڑی کو روکا جا سکتا تھا مگر میڈم کی لاش گرنے کے بعد... گاڑی شاید الٹ جاتی اور اس میں آگ لگ جاتی۔ پچاس لاکھ کے نوٹ بھی جل کے راکھ ہو جاتے۔ میڈم کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو جاتا۔ قاتل تو مرنے کے لیے تیار ہو کے آئے تھے۔ اب وہ کہاں جا رہے تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ نیشنل ہائی وے کی طرف جا رہے تھے۔ ڈالمیاں سیمنٹ فیکٹری کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ گھر بن چکے تھے۔ اس کے سامنے بحریہ یونیورسٹی تھی۔ نامعلوم سپاہی کا قبرستان تھا۔ میں نے نہیں دیکھی تھی مگر سنا تھا جہاں لوٹی کہلانے والی رئیسوں کی بستی تھی جس میں سنا تھا کروڑوں سے نیچے کا گھر نہیں ہوتا۔

میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ آگے پیچھے کی ٹریفک میں کوئی ہمیں بچانے کی کوشش کرنے والا بھی ہے یا نہیں۔ اور وہ بچائے گا تو کیسے؟ گاڑی کو روکنے کے لیے اگلے ٹائروں کو نشانہ بنا کر فائر کیا جاتا تو گاڑی الٹ جاتی۔ یقیناً وہ پیچھے ہی فائر کریں گے۔ اور گولی جب متحرک ٹارگٹ پر چلائی جائے اور خود نشانہ لینے والے متحرک ہوں تو نشانہ خطا ہونے کا امکان بہت زیادہ تھا۔ چھ انچ چوڑے ٹائر سے زیادہ بڑا ٹارگٹ ڈکی تھی۔ گولی اس میں سوراخ کر کے میرے جسم کے قدرتی سوراخوں میں ایک کا اضافہ کر سکتی تھی۔ صرف خون کے نکلنے کے لیے۔ اب تو دعا مانگنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے کلمہ شہادت کا ورد شروع کیا۔ ایک بار، دو بار، تیسری بار... اور ایک ایک دھڑکن شمار کرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ گزرتا گیا۔ گاڑی چلتی رہی۔ دوڑتی رہی۔ ڈالمیاں روڈ گزر گئی۔ عسکری پمپ نظر آیا۔ گاڑی چوراہے سے کھوئی اور شاہراہ فیصل کی طرف ہوئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ شاہراہ فیصل آ گئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔ گاڑیوں کے رواں جلوس سے آگے نکل گئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

ظالم خان، الو کے پٹھے۔ پاگل خانے کے مستحق۔ "یہ کیوں نہیں سوچا تھا تو نے؟ اللہ میرا گناہ معاف کرے کہ تجھے ترقی دلوانے کے لیے میں نے کالموں میں جھوٹ لکھا۔ تو نے مکھی ماری تو میں نے اسے شیر کا شکار بنا دیا۔ میں نے حرام کھانے میں تیری مدد کی۔ اور خود بھی وہ کھانا کھاتا رہا جو

نقد و حرام تھا۔ یہ سب اسی کی سزا ہے۔ صائمہ... صائمہ... مجھے معاف کر دینا۔ بس میدان حشر میں سامنا ہوگا پھر ہم جائیں گے جہنم میں لیکر تھوہڑ کا ساگ اور تم پیتی رہنا نہر سے دودھ اور شہد۔ جنت میں کسی مولانا کے ساتھ۔"

گاڑی نیشنل ہائی وے تک بلا روک ٹوک پہنچی۔ اب ٹریفک بہت کم تھی۔ کرولا یا سی ناؤل سے نئی مرسیڈیز تک مگر اب اندھیرا آ رہا تھا۔ اور ہیڈ لائٹس میں کیمروں کی نظر کمزور ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میڈم ہوش میں ہے یا بے ہوشی میں ہی اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں ڈکی کھلنے تک میری زندگی کی ضمانت تھی۔ گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک... کیا اپنے چچا غالب... تم بھی کہاں نازل ہوتے ہو... کل بھی جب میں کموڈ پر بیٹھا تھا تو تم نے کیا کہا تھا...

گاڑی رک گئی مدھم روشنی میں کسی ویران گھر کے خدوخال دکھائی دیتے تھے۔ اچانک مجھے بڑے کام کی بات سوجھی۔ یا اللہ میاں یہ لوگ مجھے اسی ڈکی میں چھوڑ کے اندر چلے جائیں۔ پچاس لاکھ اور میڈم کو... زندہ یا مردہ گاڑی میں ہی چھوڑ جائیں۔ بس دو چار گھنٹے میں رات گہری ہو جائے گی۔ اغوا کار سو جائیں گے۔ مطمئن اور خوش کہ ان کا مشن کامیاب رہا۔ پھر میں اندر سے ڈکی کھولوں گا۔ اگر چابی کہیں مل گئی تو ٹھیک... ورنہ نکل کے اندھیرے جنگل میں گم... شیر تو ہوتے نہیں اب... ایک فون کال کر کے چڑھ جاؤں گا کسی درخت پہ۔ بھیڑیوں کو بریکنگ نیوز کون دے گا کہ فلاں پیڑ پر خوراک تشریف فرما ہے۔ وہ آئیں گے بعد میں گھومتے پھرتے ہوتے تو گزرن اور ہم صورت ہیں گیدڑ اور لومڑی بھی... خیر، جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے تھے۔

ڈکی کھٹ سے کھلی اور میں نے انہی دونوں جوانوں کے مسکراتے چہرے ملاحظہ کیے۔

"یہ ٹیب مجھے دے دو اور باہر آ جاؤ ہیرو..." ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتے نہیں تھے، ورنہ زیرو کہتے۔

دوسرا قہقہہ مار کے ہنسا۔ "بڑھیا کے محافظ کو تو دیکھو... سالا ہڈیوں کا کولبس... سات فٹ کی قبر والا۔"

میں نے خوشامدانہ انداز میں دانت نکالے اور باہر آ گیا۔ "گولی مت ضائع کرو۔ بڑھیا تو ایسے ہی مر گئی ہو گی۔ میں بھی مرنے والا ہوں، بھوک سے۔"

ایک نے مجھے دھکا دیا اور ہنسا۔ "دیکھو اس بھوتنی والے کو... اسے بھوک لگ رہی ہے۔"

"ابھی کھاتے ہیں بیٹا بریانی اور حلیم تھے..." اس نے مجھے دھکا دیا۔ "بھوکے کو مارنا ہمارے پر حرام ہے۔"

اندر ایک کمرے میں پرانے میلے بیڈ پر میڈم کسی لاش کی طرح پھینکی گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ہمارے میزبان چلے گئے اور جاتے جاتے واحد دروازہ بند کر گئے۔ کمرے کی ایک دیوار کی کھونٹی سے لالٹین لٹک رہی تھی۔ اس کی اندھی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پیچھے کی دیوار دھوئیں سے سیاہ ہو رہی تھی۔ نیچے اینٹوں کا گرد آلود فرش تھا اور بان کی کھری چارپائی۔ ایک نیم شکستہ کرسی اور ایجاد ہونے والی پہلی میز... ایک اجنبی اندر آیا اور اسٹین لیس اسٹیل کا جگ اور گلاس رکھ کے ہمیں گھورتا واپس چلا گیا۔ اس وقت تک میڈم نے رونا دھونا، کوسنا اور سارے زمانے کو گالیاں دینا شروع بھی نہیں کیا تھا حالانکہ مزید سامعین کا انتظار لاحاصل تھا۔ واحد سامع میں ہی تھا۔

میں میڈم کی قصیدہ خوانی سن رہا تھا کہ وہی شخص جو پانی لایا تھا، ایک ٹرے کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوا۔ ٹرے اس نے ہمارے درمیان رکھی اور لوٹ گیا۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا۔ یا مظہر العجائب... صحرا میں پانی کا سراب... مگر ٹرے میں واقعی بریانی اور حلیم رکھے تھے۔ اس کی اشتہا انگیز خوشبو نے بچی کچی عاقبت اور عذاب قبر کے خیال کو بجھا دیا جو کچھ دیر پہلے مجھ پر غالب تھا۔ مجھے صائمہ تک یاد نہ آئی۔

میں نے میڈم سے کہا۔ "بسم اللہ کریں۔ اب یہ تو طے ہے کہ یہ آخری طعام ہے۔ سزائے موت سے پہلے والا۔"

"تم کھا سکتے ہو اس کیفیت میں؟" وہ غرائی۔

"میں اس کا عملی مظاہرہ کرتا ہوں۔ آپ کے سامنے۔" میں نے چمچہ اٹھایا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ "کھا لیں ورنہ وہ بچا ہوا اٹھا کے لے گئے تو دنیا سے خالی پیٹ جاؤ گی جیسے سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

کھانے کے بعد میں نے بیڈ پر سے ایک تکیہ اٹھایا اور کھری چارپائی پر لیٹ گیا۔ ڈکی میں لیٹ کر مرغا بنے رہنے میں ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ جب کوئی باقی بچا کھانا اٹھانے نہ آیا تو میرے دل میں ایک امید کی کرن جاگی۔ کیا وہ ہمیں چھوڑ دیں گے؟ ابھی تو میں اندر کے کسی کمرے سے ان کے جشن طرب کے قہقہے سن رہا تھا۔ وہ یقیناً پی کے ہنکار رہے تھے پھر کسی عورت کی ہذیانی ہنسی بھی اس شور میں شامل ہو گئی۔

نہ جانے کس وقت میں سو گیا پھر آنکھ ایک ضرورت سے کھلی۔ میں نے دیکھا کمرے میں کچھ بھی بچا ہوا نہیں ہے اور میڈم بیڈ پر چت سو رہی ہے۔

میں نے دروازے کے پاس بیٹھ کے ضرورت پوری کی اور زیادہ سکون سے سو گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ دروازے کے پاس فرش پہلے سے گیلا تھا مگر نشیب باہر کی طرف تھا۔ میری آنکھ میڈم کے ہلانے سے کھلی۔ گھڑی دیکھی تو صبح کے سات ہی بجے تھے مگر ناشتا میز پر رکھا ہوا تھا۔ دو پیالے دودھ پتی اور چینی کے مکسچر سے بھرے بھاپ دے رہے تھے۔ ایک رنگین چنگیر میں روٹیاں رکھی تھیں اور اسٹیل کی پلیٹ میں سفید مکھن کا ڈھیر۔ میرے کانوں میں توپ صاحب کا قہقہہ گونجا۔ ''وہ کیا ہے بزدل صاحب! بھول جاؤ صبح اٹھ کے دانت برش کرنے یا منہ دھونے کو... اور اپنی ٹی ودھ کے بغیر پھیکی سیاہ چائے یا کافی کو... ٹوسٹر سے نکلے براؤن کرسپی سلائس اور ہاف فرائی انڈوں کی جوڑی کو... سنی سائیڈ اپ... دیسی کی تو یہ مشروب جس کو یہاں چائے کہا جاتا ہے شربت بن جائے گا۔''

ابھی میں مکھن روٹی نگل کے گرم دودھ پتی اور میڈم کی حالت پر ہنس بھی نہ پایا تھا کہ ایک شخص گھبرایا ہوا سا نمودار ہوا اور ہمارے قریب صوفے جیسی کوئی چیز رکھ گیا۔ جاتے جاتے وہ برتن اٹھا کے لے گیا اور ہمیں بتا گیا... ''پیر سائیں آنے والے ہیں۔''

موصوف اس اعلان کے ساتھ ہی نمودار ہوئے۔ روایتی پلے ہوئے جسم کلف سے کھڑکھڑاتی شلوار کرتے اور ٹوپی کی روایتی وردی... کھچڑی داڑھی... ہاتھ میں تسبیح اور آنکھوں میں جلال... میرے ہاتھوں کو چھو کے وہ دھم سے صوفے پر گر گئے۔

''دیکھو بابا! ویسے تو اللہ نے ہمیں بڑی عزت دی ہے اور خیر سے ہمارے مرید سب ہیں۔ اچھے بُرے لیکن تمہارے لیے جو سفارش آئی ہے ہم اس پر کچھ نہیں کر سکتے۔''

''سفارش؟ کس نے کی ہے؟'' میں کچھ حیران ہوا۔

''بابا ابھی چھوڑو نام کو... بڑا نام ہے اور بڑا عہدہ ہے اس کا... وڈا وزیر ہے... لیکن وہ بھی مجبور ہے... زبان سے بات کرتا ہے۔ دل سے جانتا ہے کہ معاملہ روزی روٹی کا ہے۔''

''کس کی روزی روٹی؟''

''وہی... جو ہمارے مرید اور غلام ہیں مگر محافظ بھی ہیں۔ ہم ان کے کاروبار میں دخل نہیں دے سکتے۔''

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ڈاکوؤں کی بات کر رہا ہے جو ہمیں اٹھا لائے تھے۔ وہ ڈاکے ڈالتے تھے یا اغوا برائے تاوان کی وارداتیں کرتے تھے تو ان کو قانون کی گرفت سے تحفظ ملتا تھا۔ پولیس ان سے صرف نظر کرتی تھی اور ڈاکو اپنی آمدنی کا ایک حصہ محافظوں کو نذرانہ دیتے تھے۔ صحافی برادری یا این جی اوز کسی سیاست داں پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اغوا ہونے والوں کو بازیاب کرایا جائے یا تاوان نہ لیا جائے تو وہ رسم پوری کرنے کے لیے کوشش کا وعدہ کرتے تھے۔ اس سے بعض اوقات تاوان کی رقم میں رعایت ہو جاتی تھی اور کسی حد تک جان کی سلامتی کی ضمانت بھی مل جاتی تھی۔

پیر سائیں اپنی ہمدردی اور معذوری کا ڈراما کر کے چلے گئے تو مجھے کوئی شک نہ رہا کہ اب ہمیں کسی اور بااختیار اتھارٹی کے سامنے پیش کیا جائے گا جہاں ہم کو ساری رقم تو واپس شاید نہ ملے... شاید نصف مل جائے اور پھر باعزت طور پر واپسی ہو تو گویا مقصود مل چکا ہو۔ ماں اپنی بچی کے ساتھ خوش و خرم لوٹے اور میاں بزدل شرمسار کہ... میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی۔

پیر سائیں نے مجھے پہچانا نہیں تھا اور نہ مجھ سے شناسائی کا اعتراف کیا تھا۔ حالانکہ سفارش کرنے والے نے بتا دیا ہو گا کہ وہ نام کا بزدل کتنا بڑا توپ صحافی ہے۔ مقصد مجھ پر واضح کرنا تھا کہ ہم نہیں توپ سے تلوار سے ڈرنے والے... توپ تو ایک بار بھی داغی جاتی ہے مگر کیا سلامی لینے والے کی پتلون گیلی ہوتی ہے۔

میڈم نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ پیر کیا کہہ رہا تھا، کیوں آیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ بتانے کہ اب ہماری جان کو خطرہ نہیں۔ مال کو ہم جان کا صدقہ سمجھیں اور بھول جائیں۔''

''لیکن نوشی... وہ بھی تو نہیں ملی۔''

''آج مل جائے گی۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''ہمارے ساتھ ہی واپس جائے گی۔''

''کیا فائدہ ہوا تمہارے تعلقات اور اثر رسوخ کا۔''

وہ تلخی سے بولی۔ ''بڑی دھوم تھی اس کی۔''

میں نے کہا۔ ''وقت بدل گیا ہے میڈم، پیسا سب پر غالب ہے۔ کیا خون کے رشتے اور کیا خلوص کے... سب برائے فروخت ہے۔ عورت کی عزت بھی مرد کی غیرت بھی۔ شرافت بھی اور انسانیت بھی۔''

دو اجنبی چہرے نمودار ہوئے، ایک نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ”چلو سائیں۔“

میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ باہر وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں ہمیں لایا گیا تھا۔ ہم کو دوسری پراڈو جیسی ڈبل کیبن پک اپ میں بٹھا دیا گیا جو ائر کنڈیشنڈ بھی تھی۔ بس اس کے دروازے اندر سے نہیں کھولے جا سکتے تھے اور سیاہ شیشوں کو اتارنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ آگے والے کیبن میں ڈرائیور کے ساتھ بھی خوفناک داڑھی مونچھوں والے شخص کو دیکھ سکتا تھا جس نے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

کسی نامعلوم سفارش کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ ہماری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی اور ہاتھ بھی کھلے چھوڑ دیے گئے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد گاڑی رکی تو ہمیں ایک اونچی دیواروں والی عمارت کے اندر لے جایا گیا۔

اب ہمیں جہاں بٹھایا گیا وہ بہتر طور پر آراستہ کمرا تھا۔ فرش پر قالین بھی تھا۔ صوفے نئے تھے اور سر پہ ایک پنکھا بھی چل رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جب ہم چائے پانی کے تکلف سے فارغ ہو چکے تھے، میزبان نے قدم رنجہ فرمایا۔ میں روایتی حلیے کے کسی بھاری بھرکم جسم، جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھ اور کرخت چنگھاڑتی آواز کا منتظر تھا مگر اندر آنے والی ایک عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی لیکن قدرتی طور پر اس کا بدن پھیلا اور پھولا نہیں تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور اس نے سیاہ بالوں کو ایک دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ سادہ ہلکے رنگ کے پرنٹ والے شلوار قمیص میں وہ ایک عام گھریلو عورت لگتی تھی۔

ہمارے مقابل بیٹھ کے اس نے میڈم کو اور پھر مجھے نظر بھر کے دیکھا۔ ”تو تم ہو بزدل؟“

میں چونک پڑا۔ ”تم کیسے جانتی ہو مجھے؟“

”تمہیں کون نہیں جانتا۔ میں ڈاکوؤں کے اس گروہ کی سردار ہوں۔“

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ”سردار! میں نے کبھی سنا نہیں۔“

”کیوں نہیں سنا؟ کیا اس میں میرا قصور ہے؟ اور میں نے تمہارے بارے میں نہیں سنا تھا تو کیا، تمہارا قصور تھا بزدل صاحب!“ اس کے لہجے میں ناراضی بالکل نہیں تھی۔

”تم منڈے ڈاکو کو جانتے ہو، جو پہلے سونا ڈاکو تھا۔“

”مجھے معلوم ہے، پہلے وہ صرف سناروں کو لوٹتا تھا تو سونا ڈاکو تھا پھر ایک ہاتھ زخمی ہوا اور کاٹ دیا گیا تو وہ منڈا ڈاکو ہو گیا تھا مگر وہ تو مر گیا تھا۔“

”اچھا؟“ وہ حیران ہونے کے انداز میں مسکرائی۔ ”کب؟ اس کی بیوی کو تو پتا نہیں۔“

”چھ سال پہلے اسے پھانسی ہو گئی تھی.... تم کس بیوی کی بات کر رہی ہو۔ اس کی بیوی خود لاش لے گئی تھی۔“ میں نے کہا۔

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”ہاں، وہ بیوی میں تھی۔“

میں محاورے کے مطابق اچھل پڑا۔ ”تم، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تم نے غور سے مجھے دیکھا ہی کب تھا کہ آج پہچان لیتے.... اس کی بیوی کا نام چندراوتی تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے منڈے سے نکاح کیا تو چاند بی بی ہو گئی۔ آؤ، اس سے مل لو۔ سونا تم سے ملنے نہیں آ سکتا۔“

میڈم کے ساتھ میں اس کے پیچھے دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں مسہری پر تکیے کا سہارا لیے منڈا ڈاکو بیٹھا تھا۔ وہ مفلوج تھا اور ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا تھا۔ مگر وہ دیکھ سکتا تھا اور بات کر سکتا تھا۔ اس کی داڑھی آدھی سے زیادہ سفید تھی اور سر کے بال بہت کم رہ گئے تھے۔ میں بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم.... تم زندہ ہو۔“

وہ مسکرایا۔ ”ہاں مگر مردے کی طرح.... وکیل صاحب۔“

”مگر تم کو تو پھانسی ہو گئی تھی۔“

”ہاں، پھانسی تو ہو گئی تھی۔ جیل ریکارڈ کے مطابق۔ ایک رات پہلے میں مر گیا تھا۔ چاندی.... میری بیوی اس غریب کی لاش لے آئی تھی جو لاوارث تھا۔ دفنا دیا تھا ہم نے عزت سے۔ قبر پہ نام میرا لکھا ہوا ہوگا۔ دیکھ لینا کبھی لاہور کے میانی صاحب جا کے۔“

”میں کیا کروں گا یہ دیکھ کر.... مگر یہ کیسے ہوا تھا؟“

”جیسے ہوتا ہے، پچاس لاکھ تھی میری زندگی کی قیمت.... وہ میں نے ادا کر دی تھی۔ میرے ساتھی وفادار تھے۔ مگر سونا ڈاکو کو بچایا چاندی نے.... اس کی بیوی نے.... یہ اب بھی مجھے سونا کہتی ہے اور میں بھی اسے چاندی....“ وہ ہنسا۔

میں نے چاندی کو دیکھا جو سونے کی حفاظت کر رہی تھی۔ اپنے سہاگ کی، اپنی محبت کی حفاظت کر رہی تھی۔ سونا چاندی ایک ٹی وی ڈراما سیریل تھا جو بے حد ہٹ ہوا تھا۔ یہ ڈراما نہیں اصل زندگی تھی۔ سونا چاندی میری حیرت پر حیران تھے۔ میڈم دم بخود بیٹھی تھی۔

"پہلے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے کہا۔ "تم کب سے اس حال میں ہو؟"

"پانچ سال ہو گئے۔ سال بھر بعد گولی گردن میں پیچھے کی طرف لگی تھی اس سے نیچے کا دھڑ ختم ہو گیا۔ یہ لمبی کہانی ہے کہ چاندی نے مجھے بچانے کے لیے کیا کوشش کی۔ اور اب مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ مجھے کل پتا چلا کہ میرے بندے تمہیں بھی اٹھا لائے تھے بے وقوف۔"

"مگر میں تمہیں سزائے موت سے نہیں بچا سکا تھا۔"

"مگر تم نے کوشش ضرور کی تھی اور تم کامیاب بھی ہو جاتے اگر ذاتی دشمنی کا معاملہ نہ ہوتا۔ سیشن کورٹ کے اس جج کا ایک دوست میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دو سال پہلے۔"

"تم اعتراض کر سکتے تھے کہ مقدمہ کسی اور عدالت میں ٹرانسفر کیا جائے۔"

"لیکن یہ بات تو مجھے اپیل مسترد ہونے کے بعد معلوم ہوئی تھی۔ ہائی کورٹ میں تم میرے وکیل نہیں تھے۔ وہاں مرنے والے کا سالا ایک جج تھا۔ بے شک اپیل اس نے نہیں سنی تھی مگر اس نے اپیل مسترد کرائی تھی۔" وہ بولا۔ "چاندی..."

چاندی نے سر ہلایا اور بیڈ کے نیچے سے وہ بیگ نکال کے سامنے رکھ دیا جس میں پچاس لاکھ تھے۔ "معاف کرنا تم کو تکلیف ہوئی اور یہاں تک آنا پڑا مگر کوئی بات نہیں۔ ایک مردے سے موت کے چھ سال بعد ملاقات ہوئی۔" وہ ہنسا۔

"ایک بات پوچھوں... جب میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے لیے... تو تم یہ نیکی کیوں کر رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"ایک وجہ تو بتائی میں نے... لیکن دوسری وجہ تو سب جانتے ہیں... تم نے میری برادری کے کتنے لوگوں کی جان بچائی... ہم پیشہ ڈاکو ایک برادری ہوتے ہیں تم برادری کے محسن ہو... جا چاندی... اسے لے آ۔"

چاندی اندر گئی اور لوٹی تو نوشی اس کے ساتھ تھی۔ درمیان کا وقفہ خاموشی کا تھا۔ میں پانسا پلٹ جانے سے اتنا حیران نہیں تھا جتنا ڈاکو برادری کے رشتے کی بات سے۔ کیا اور کسی برادری میں قربانی کا ایسا جذبہ ہوگا؟ اس دور میں جب خلوص کے رشتے کمزور پڑتے جا رہے ہیں اور ہوس کا رشتہ غالب آ رہا ہے۔

میڈم نے نوشی کو دیکھ کر ایک چیخ ماری۔ "میری بچی۔" اور وہ دونوں بھول گئیں کہ بچی نے کتنی چالاکی سے اسے لوٹا تھا اور ایک تیسرے ڈاکو نے کتنی سادگی سے اسے لوٹا مال واپس کر دیا تھا۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں اور سب گلے شکوے بھول چکی تھیں۔ اس دوسری زندگی میں پیسا ان کے لیے بڑا اہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ایک ڈاکو نے اتنی بڑی رقم کو کاغذ کے پرزوں سے زیادہ اہم نہیں سمجھا تھا۔

☆☆☆

ایک دن کی مہمانی کے بعد واپسی کے سفر میں سب کچھ وہی لگتا تھا جو گزرے وقت کا حصہ تھا۔ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں... میڈم کی وہی گاڑی تھی۔ آگے میں بیٹھا تھا۔ پیچھے ماں اپنی بچی سے ان ڈاکوؤں کے حسن سلوک اور ان کی میزبانی کا قصہ سن رہی تھی۔ سونا چاندی پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کی زندگی اور محبت کا انوکھا افسانہ ایک نہ بھولنے والی کہانی بن گیا تھا۔

ہمیں میڈم کے گھر کے اندر اتار کے ڈرائیور نے مجھے سلام کیا۔ "مجھے اجازت دیں سر۔"

میں نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے کھانا کھا کے جانا۔"

"نہیں سر، میں اس گھر کا نمک نہیں کھا سکتا۔ اپنا اصول نہیں۔" وہ دست بوسی کے انداز میں ہاتھ ملا کے پیدل چلتا باہر نکل گیا۔ ساجد کے ساتھ برآمدے میں کھڑی صائمہ اس منظر کو بے یقینی سے دیکھتی رہی۔ میڈم نے اپنے ہونے والے داماد کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ تاریخ بدل چکی تھی جب میں صائمہ کی ذاتی کار میں باہر نکلا۔ اس نے گاڑی کا رخ ساحلِ سمندر کی طرف موڑ دیا۔

ساحل پر چاندنی کا رومانس لہروں میں اترا ہوا تھا۔ صائمہ اور میں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

پھر میں نے کہا۔ "میں جو کہتا تھا کہ ہمارا جنم جنم کا ساتھ ہے یہ دوسرا جنم مجھے تمہاری محبت کے لیے ہی ملا ہے۔ اب تو ہاں کہہ دو۔"

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ "اتنی جلدی کیا ہے آخر... یہ دوسرا ہی جنم ہے نا، ابھی تو کئی جنم باقی ہیں۔"

"چاندی اور سونا کی محبت دیکھ کے میں سخت جذباتی ہوں۔ آئندہ میں تمہیں چاندی کہوں گا اور تم مجھے سونا۔"

وہ شرارت سے ہنسی۔ "سونا... اتنی بے قدری میں نہیں کر سکتی۔ تم تو ہیرا ہو... سونا کیسے کہہ دوں۔"

چاند حیرانی سے ہمیں دیکھتا رہا۔ یہ محبت کرنے والے بھی کتنے پاگل ہوتے ہیں۔

●۔

خونی تصویر

تنویر ریاض

وقت کی گردشوں کا شکار ہو جانے والوں کی زندگی کبھی سکون و آشتی سے نہیں گزرتی... وہ تاعمر ناخوش... مضطرب اور بے کل ہی رہتے ہیں... وقت کی دبیز تہوں میں پنہاں واقعات کبھی نہ کبھی عیاں ہو ہی جاتے ہیں... ماضی کے ایک واقعے سے جڑی، خونی تحریر... قصہ ختم ہو چکا تھا... مگر اس کی بازگشت باقی تھی... سنسنی... تجسس اور ہر موڑ پر چونکا دینے والی صورتِ حال اختیار کرتی دلچسپ اور متحیر کہانی کے پیچ و خم...

تھیٹر کی دنیا سے تعلق رکھنے والی ایک ڈراما ساز اداکارہ کی فنکاری...

میرے لیے ماں کی دردناک موت انتہائی دہشت ناک واقعہ تھا اور اسے اتنی جلدی بھلا دینا آسان نہ تھا۔ اس کی ایک ایک یاد میرے دل میں تازہ زخم کی طرح ہری ہو جاتی اور اگر میں اپنی سوچوں میں گھر کر اس واقعے کو بھلانے کی کوشش کرتا تو ماں کا زخمی چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ اس کی اس دنیا سے روانگی بھی ڈرامائی انداز میں ہوئی۔ وہ گرانڈ ریڈ نامی تھیٹر میں اپنا شو ختم کر کے باہر نکلی ہی تھی کہ پارکنگ لاٹ میں اس پر حملہ ہوا اور کسی ظالم نے

چند ڈالرز کی خاطر اس کی جان لے لی۔ اس کی موت کی تحقیقات کرنے والے سراغ رساں کا کہنا تھا کہ اسے مزاحمت نہیں کرنا چاہیے تھی۔ عقل مندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ ڈاکوؤں کی بات مان کر جو کچھ بھی پاس ہو، وہ ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اس صورت میں وہ کوئی جسمانی یا جانی نقصان نہ پہنچائیں۔ لیکن میری ماں کے پاس تھا ہی کیا۔ اس کی تو ساری عمر پروڈیوسروں اور تھیٹرز ایجنٹوں کو اپنے کوائف بھیجتے گزر گئی۔

وہ ایک اداکارہ تھی اور گزر اوقات کے لیے اسے سال کے تین سو پینسٹھ دن کام کرنا ہوتا تھا۔ گزشتہ چند برسوں سے مقامی تھیٹرز میں وہ کیریکٹر رول تک محدود ہو کر رہ گئی تھا۔ اس لیے بہتر کرداروں کی تلاش میں اسے دور دراز کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ موت سے چند ہفتے پہلے اس نے مرکز شہر میں واقع ڈیٹرائٹ فرسٹ فیڈرل بینک کے نزدیک ایک ریستوران میں میرے ساتھ لنچ کیا تھا۔ یہ وہی بینک ہے جہاں میں کام کرتا ہوں۔

ماں کی حال ہی میں میرے سوتیلے باپ سے علیحدگی ہوئی تھی جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وارن ٹریوس پرانی اشیا کا کاروبار کرتا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ ماں نے اس کے ساتھ اتنا عرصہ کیسے گزار لیا۔ میرا اپنا باپ ایک صحافی تھا اور ڈیٹرائٹ فری پریس کے لیے جنگی نامہ نگار کے طور پر خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ 2002ء میں افغانستان کی جنگ میں مارا گیا۔ اس نے بہت کٹھن زندگی گزاری تھی اور اس کی تقلید کرنا بہت مشکل تھا۔ خاص طور سے وارن جیسے شخص کے لیے جو بظاہر نرم مزاج اور آرام دہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ ماں کو دوسری شادی ختم ہونے کا کوئی ملال نہیں تھا اور وہ ایک بار پھر اپنے کام کے بارے میں پرجوش نظر آ رہی تھی۔ ان دنوں وہ فری پریس کے ایک نوجوان رپورٹر کے ساتھ کام کر رہی تھی جو اس کے کیریئر کے بارے میں ایک کتاب لکھنا چاہ رہا تھا کہ اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا اور وہ میری زندگی سے دور چلی گئی۔ میں نے اپنے سوتیلے باپ کو ماں کی آخری رسومات کے موقع پر دیکھا۔ چرچ، تھیٹرز کے لوگوں، ساتھی اداکاروں، ایکسٹراز اور اسٹیج ورکرز سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بظاہر وہ سب خوش لباس اور خوش مزاج نظر آ رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ مجھے لگا کہ یہ سب میرے ہی خاندان کے افراد ہیں۔

میں نے تین سال کی عمر سے ہی چھوٹے موٹے کام شروع کر دیے تھے، کبھی مزدوروں کے فورمین کے ساتھ مل کر اس کا ہاتھ بٹاتا، کبھی پینٹر کی معاونت کرتا اور کبھی اسٹیج کے پیچھے مختلف امور سرانجام دیتا۔ ہر ہفتے کسی نئے شہر یا نئے تھیٹر سے واسطہ پڑتا۔ میرا بچپن اسی طرح گزرا لیکن جب کالج میں آیا تو ماں نے مجبور کیا کہ کوئی ایسا مضمون منتخب کروں جس کا تھیٹرز سے کوئی تعلق نہ ہو چنانچہ میں نے مشی گن اسٹیٹ سے ایم بی اے کیا اور بینک میں ملازمت کر لی۔ میری شادی ایک اسکول ٹیچر سے ہوئی۔ ہماری دو جڑواں بچیاں ہیں اور شہر کے مضافات میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہوں۔ اسٹیج کی دنیا سے میرا کوئی واسطہ نہیں لیکن اسٹیج کے لوگ ہمیں نہیں بھولے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہر وہ فرد اس موقع پر موجود تھا جس کے ساتھ ماں نے کبھی کام کیا ہو۔ یہ ان کی محبت تھی اور وہ میرے دکھ میں شریک ہونے آئے تھے۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ماں یہ دیکھ کر کتنا خوش ہوتی۔ یہ بہت بڑا مجمع تھا جو برسوں بعد دیکھنے میں آیا۔ کچھ لوگ میرے سوتیلے باپ سے ملنا چاہ رہے تھے لیکن وہ نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ مجھ سے بھی اس کے بارے میں پوچھا گیا لیکن میں کیا جواب دیتا، میں نے تو خود اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ البتہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میری ڈراما کوئین ماں نے کیا دیکھ کر اس معمولی شخص سے شادی کی تھی۔ بہت جلد مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا۔

ایک ہفتے بعد ہماری ملاقات ماں کے وکیل نل ہارک ڈیل کے دفتر میں ہوئی۔ وہ میری ماں کا پرستار اور شاید پرانا عاشق بھی تھا لیکن اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ فربہ ہو گیا تھا لیکن اس کے سیاہ گھنے بال ہمیشہ کی طرح پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔

”مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔“ نل نے کہنا شروع کیا۔ ”لیکن میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے میز کے وسط میں رکھا ہوا ڈیجیٹل ریکارڈر آن کیا اور بولا۔ ”ہم یہاں آرلین سیمو یئرز ٹریوس کی وراثت کے سلسلے میں جمع ہوئے ہیں اور اس کے وارثوں میں آرلین کا شوہر وارن ٹریوس اور پہلے شوہر سے اس کا بیٹا ڈیوڈ سیمو یئرز موجود ہیں۔ اب میں اس کی وصیت کی طرف آتا ہوں۔ وکیل کی حیثیت سے میں نے گزشتہ برسوں میں کئی بار اس کی وصیت میں ردوبدل کی ہے۔“

”کئی بار کیوں؟“ وارن نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ فنکار تغیر پذیر زندگی گزارتے ہیں۔“ نل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”آرلین نے ہمیشہ اپنے

کاغذات کو حالات کے مطابق مکمل رکھنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود وہ تازہ ترین وصیت کے بغیر ہی مرگئی۔ ہماری ملاقات گزشتہ ماہ ہوئی تھی جب اس نے سسٹر زیوس سے طلاق لینے کی درخواست دائر کی۔ اس موقع پر اس نے مجھ سے نئی وصیت تیار کرنے کے لیے کہا جس کے مطابق اس کی جائداد کا وارث اس کا بیٹا اور پوتیاں ہوں گی۔ میں نے ایسا ہی کیا لیکن اس کی موت کے وقت تک طلاق کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی نئی وصیت پر دستخط ہوئے تھے۔ اس لیے پرانی وصیت ہی قابلِ عمل ہے۔ جس کے مطابق اس کی جائداد شوہر اور بیٹے میں برابر برابر تقسیم ہوگی۔ اگر کوئی تنازع ہوا تو میں ثالثی کروں گا۔ کوئی سوال؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ وہ وصیت نہیں ہے جو میری ماں چاہتی تھی۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں قانون بالکل واضح ہے۔'' بل نے کہنا شروع کیا۔

''قانون کو بھول جاؤ۔'' وارن نے کہا۔ ''ڈیوڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ وہ وصیت نہیں جو آرلین چاہتی تھی۔ ہم نے دس سال اکٹھے گزارے۔ اس لحاظ سے اگر میں دس فیصد پر قناعت کرلوں تو کیا یہ جائز ہوگا ڈیوڈ؟''

''یہ بہت مناسب ہے۔'' میں نے اعتراف کیا کوکہ میں وہرن فریوس کو دس برس سے جانتا تھا لیکن کسی موضوع پر ہمارے درمیان ہونے والی یہ پہلی گفتگو تھی۔

''مجھے کاغذات بھیج دینا۔'' وارن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جہاں جہاں ضرورت ہوگی، میں دستخط کردوں گا۔ کیٹ اور بچیوں کو میری طرف سے پیار۔''

''تم کسی روز ڈنر پر آؤ۔'' میں نے کہا۔ ''وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے مجھ سے وعدہ کیا لیکن ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہمارے درمیان صرف ماں کی وجہ سے ایک تعلق قائم تھا اور وہ اب نہیں رہی تھی۔ جب ہم جدا ہوئے تو مجھے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ وارن سے دوبارہ ملاقات ہوگی یا اس کے بارے میں کچھ سنوں گا لیکن ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس نے ہم دونوں کو ایک بار پھر آمنے سامنے آنے پر مجبور کردیا۔

ماں کے انتقال کے چند ہفتوں بعد میں نے اپنی زندگی کو پرانے معمول کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ ماں کے ترکے میں سے ملنے والی رقم میں نے اپنی بچیوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج کے فنڈ میں جمع کروادی اور اس کے مکان پر برائے فروخت کا بورڈ لگا دیا۔ ان دنوں مارکیٹ میں کچھ مندی تھی۔ اس لیے فوری طور پر اچھی قیمت ملنے کی امید کم تھی۔ میں نے اس معاملے میں جلدی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہمارا گزارہ ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا۔ کیٹ، وائن اسٹیٹ یونیورسٹی میں تاریخ کی استاد تھی اور میں ڈیٹرائٹ فرسٹ فیڈرل بینک میں لون آفیسر کی حیثیت سے کام کررہا تھا۔

اس روز میں بینک میں بیٹھا اپنی ای میل چیک کررہا تھا کہ ایک پیغام نے مجھے چونکا دیا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں وہ ای میل کھولنا چاہ رہا تھا لیکن میری انگلیاں فضا میں معلق ہوگئیں۔ وہ میری ماں کا ای میل ایڈریس تھا۔ یہ ای میل میری ماں کی طرف سے تھی لیکن میں بھیجنے والے کا پتا نہیں پہچان سکا۔ یقیناً یہ میری ماں کے ای میل ایڈریس سے مختلف ہوگا کیونکہ وہ تو اس دنیا میں نہیں تھی۔

بینک میں کام کرنے والی ایک لڑکی میرے قریب سے گزری اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ڈیوڈ؟''

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ای میل کھول کر پڑھی۔ اس میں لکھا تھا۔

''جان سے پیارے بیٹے ڈیوی! جس وقت تم یہ ای میل پڑھ رہے ہوگے میں شاید اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ میں نے یہ پیغام چھوڑ دیا ہے تاکہ ایسی صورت میں یہ تمہیں پہنچا دیا جائے۔ میرے بیٹے اسے ضائع مت کرنا، صرف ایک بار تم میری بات پر سنجیدگی سے غور کرو، تمہیں اپنی خاطر اس معاملے کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ڈھیروں دعائیں۔''

اس کے نیچے ایک چودہ ہندسوں کا نمبر اور ایک ٹیلی فون درج تھا۔ میں نے یہ پیغام کئی مرتبہ پڑھا اور اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی۔ کیا کسی نے میرے ساتھ بے ہودہ قسم کا مذاق کیا تھا لیکن ایسا لگ نہیں رہا تھا۔ صرف میری ماں ہی مجھے ڈیوی کہہ کر پکارتی تھی اور مذاق میں مجھے پیارا بیٹا کہا کرتی تھی کیونکہ میں اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ لہٰذا یہ خط یقینی طور پر ماں کی طرف سے ہی تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی ڈراما کوئین تھی اور اب بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس چودہ ہندسوں والے نمبر کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔ میں نے ای میل میں دیے گئے فون نمبر پر رابطہ کیا جواب میں ایک سرد آواز سنائی دی۔ ''مردہ خانہ۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تم ڈیٹرائٹ فری پریس کے ریکارڈ سیکشن سے بات کر رہے ہو۔ ہماری اصطلاح میں اسے مردہ خانہ کہا جاتا ہے۔ کیا تم اس اخبار کے ملازم ہو؟''

''نہیں، مجھے ایک پیغام ملا تھا کہ اس نمبر پر بات کروں۔''

''کیا تم کسی خبر کا موضوع یا ذریعہ ہو؟''

''نہیں، لیکن تمہارا سیکشن کیا کام کرتا ہے؟''

''میں نے بتایا نا کہ یہ ریکارڈ سیکشن ہے۔ یہاں ہر چیز محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ہمارے پاس تمام اخبارات کی قسمیں، رپورٹروں کے نوٹس، ریسرچ، پیغامات...''

''پیغامات۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''اگر کوئی رپورٹر یا ذریعہ اپنے آپ کو ظاہر نہ کرنا چاہے تو ہم ایک ڈاک خانے کے طور پر کام کرتے ہیں اور کسی بھی خبر سے متعلق تمام ریکارڈ محفوظ کر لیتے ہیں۔ آج کل یہ ایک قانونی ضرورت ہے۔''

''میں نے تمہارا فون نمبر ایک ای میل سے لیا ہے لیکن یہ کوئی جائز خبر نہیں ہے۔''

''اس طرح کے مضامین تاخیر سے جاری کیے جاتے ہیں اور جب وہ خبر پریس کو بھیجی جاتی ہے تو قلمی معاون کو بھی اطلاع دے دی جاتی ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کا کوئی نمبر ہے جس کے بے شمار ہندسے ہوں؟''

میں نے وہ چودہ ہندسوں والا نمبر پڑھا تو وہ بولا۔ ''یہ پیغام ایری کوہن کی جانب سے ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''نہیں۔''

''کیا تمہیں اب بھی یہ پیغام چاہیے۔ ہمیں ہدایت تھی کہ اسے اس وقت تک التوا میں رکھا جائے جب تک کوئی اس کا مطالبہ نہ کرے۔''

''وہ پیغام کیا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔ یہ ایک ای میل اٹیچ منٹ ہے۔'' اس نے بے صبری سے کہا۔ ''کیا تمہارا یہ پتا درست ہے۔'' اس نے میرا ای میل ایڈریس پڑھنے کے بعد کہا۔

''ہاں، یہ میرا ہی پتا ہے لیکن...''

''تمہارا مطلوبہ پیغام بھیجا جا رہا ہے۔ فری پریس ریکارڈ سیکشن سے بات کرنے کا شکریہ۔''

''ایک منٹ! ایری کوہن کے بارے میں تم نے کیا کہا تھا؟''

لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ میرا جملہ فضا میں بکھر گیا تھا۔ عین اس وقت میرے لیپ ٹاپ پر آواز ابھری۔ ریکارڈ سیکشن سے مجھے ایک ای میل مع آڈیو پیغام آئی تھی۔ میں نے اپنے کانوں سے ہیڈ فون لگایا اور ای میل کھول دی۔

''ہائے ڈیوی۔'' میری ماں کی آواز سنائی دی۔ ''میرا پیارا بیٹا کیسا ہے؟''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ''تم میری آواز سن کر حیران ہو رہے ہو گے۔'' میری مری ہوئی ماں کہہ رہی تھی۔ ''غور سے سنو ڈیوڈ، آج فروری کی بیس تاریخ ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرے پاس کتنا وقت باقی رہ گیا ہے۔''

اس کا خدشہ درست تھا۔ اس پیغام کے ریکارڈ ہونے کے چار دن بعد وہ مر گئی اور اب اس بات کو چھ ہفتے گزر گئے تھے۔

''جنوری میں ایری کوہن نامی رپورٹر نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے اخبار کے لیے میری کہانی لکھ رہا تھا۔ میں اس کی باتوں میں آ گئی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا اس نے صرف مجھ پر ہی ریسرچ نہیں کی بلکہ تمہارے باپ کے خطوط بھی دیکھے اور سوتیلے باپ کے پس منظر کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وارن ایک جنگی ہیرو تھا۔ یہ بات میں بھی نہیں جانتی تھی اور میں نے اس شخص کے ساتھ زندگی کے دس سال گزار دیے۔''

اس کے ساتھ ہی اسکرین پر ایک تصویر ابھری۔ جس میں امریکن فوجی ایک لاش کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ لباس سے وہ کوئی عرب معلوم ہو رہا تھا۔ تصویر کے نیچے جو کیپشن درج تھا۔ اس کے مطابق میرین فوج کے کارپورل کارل بکنر نے ایک میل کے فاصلے سے ایک باغی کو گولی مار دی۔ تصویر کے درمیان میں جو رائفل بردار کھڑا ہوا تھا اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کارل بکنر ہی میرا سوتیلا باپ وارن مریوس تھا۔

''میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔'' ماں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے شوہر کا اصلی نام بھی نہیں جانتی تھی لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ تمہارے باپ نے یہ تصویر اپنے پاس رکھ لی اور اس کے چند ہفتوں بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ یقیناً وہ ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے جس کا مطلب ہے کہ وارن نے اپنے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا وہ سچ نہیں تھا۔ ایری نے اس تصویر کے بارے میں پینٹاگون سے معلومات حاصل کیں کہ کارل بکنر 2002ء میں افغانستان میں مارا جا چکا ہے۔ انہوں نے اس تصویر اور اس کی کاپیوں کو ضائع کرنے کی ہدایت بھی کی۔ میں اسے ایک غلطی سمجھ کر نظر انداز کر دیتی لیکن ایری کا کہنا تھا کہ جانا اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے اور...''

لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوگئی پھر اس کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”ایری مر گیا۔ صبح کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اس کی موت کثرت شراب نوشی سے ہوئی لیکن میں شوبزنس کے کئی لوگوں کو جانتی ہوں جو بہت زیادہ پیتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی اس وجہ سے نہیں مرا۔ ایری نشے باز نہیں بلکہ اسمارٹ اور سرگرم شخص تھا۔ جس طرح تم میری آواز سن رہے ہو اسی طرح میں نے بھی ایری کے بارے میں خبر سنی تھی۔ میں سمجھ لیا کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم اس سلسلے میں کچھ کرو۔ میں نے ایک بہت اچھی زندگی گزاری ہے۔ تم، کیٹ اور بچیاں میری زندگی کا بہترین حصہ تھے، اگر میں کسی سازش کا شکار ہوئی ہوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم پر کوئی آنچ آئے۔ اسی لیے تمہیں انتباہ کر رہی ہوں تاکہ تم اپنی فیملی کی حفاظت کر سکو۔ ڈیوڈ اپنا سر جھکا کر رکھو اور زبان پر تالا ڈال دو جو میں کبھی نہ کر سکی۔ خدا تمہارا نگہبان ہو۔“

اس کا پیغام ختم ہو چکا تھا۔ میں کافی دیر تک بیٹھا اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا پھر میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور گھر آگیا۔ شام کو میں کچن ٹیبل پر کیٹ کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا جب میں نے کیٹ کو ساری روداد سنائی تو وہ بولی۔ ”مجھے تو یہ محض پاگل پن لگتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اگلی مرتبہ اگر تمہاری ماں سے ملاقات ہو تو اس سے یہ بات ضرور کہنا۔“ میں نے جل کر کہا۔

”دیکھو ڈیوڈ! میں بھی تمہاری ماں سے محبت کرتی تھی لیکن تم جانتے ہو کہ وہ ایک اداکارہ تھی اور اسے ڈرامائی انداز میں بات کرنے کا فن آتا تھا اور تم اپنے سوتیلے باپ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”یہ تو ہے۔ میں واقعی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”ان دنوں کالج میں تھا جب ماں سے اس کی ملاقات ہوئی۔ میرے والد نے یہ تصویر اپنے مرنے سے چند ہفتے قبل لی تھی۔ وہ اور وارن یقیناً ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے لیکن میں نے پہلی بار اس کے بارے میں سنا ہے اور میری ماں بھی اس کے ماضی کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے تمہیں کچھ نہ بتایا ہو؟“

”خدا کے واسطے یہ مت کہو۔ میں تمہیں ان آدھے درجن لڑکوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں جن سے میری ماں کے ہائی اسکول میں تعلقات تھے۔ اس کی زندگی میں کوئی بات خفیہ نہیں تھی لیکن وارن نے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی۔ وہ اپنے آپ کو پرانی چیزوں کا بیوپاری کہتا تھا لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔“

خانی تصویر

ٹیڑھا سوال

سردار جی اپنی بیگم کے ساتھ بہت رومانی موڈ میں باغ میں بیٹھے تھے۔ دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ بیگم نے اچانک ایک ٹیڑھا سوال کر دیا۔ ”سردار جی! یہ بتاؤ کہ پیار اور عشق میں کیا فرق ہوتا ہے؟“

سردار جی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد بولے۔ ”پیار وہ ہوتا ہے جو میں اپنی بہن سے کرتا ہوں... اور عشق... عشق وہ ہوتا ہے جو میں تمہاری بہن سے کرتا ہوں۔“

اعتراف

البرٹ بستر مرگ پر تھا۔ بیوی قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نقاہت زدہ آواز میں کہا۔ ”ڈارلنگ! میں تم سے کچھ اعتراف کرنا چاہتا ہوں... تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں، خاموش لیٹے رہو۔“ بیوی نے ترشی سے کہا۔

”نہیں... میں اپنے ضمیر پر بوجھ لے کر نہیں مرنا چاہتا۔“ وہ بولا۔ ”میں نے زندگی بھر تم سے بے وفائی کی ہے۔ تمہاری کئی سہیلیوں سے مراسم رکھے... تمہاری بہن سے میری گہری دوستی تھی... تمہاری بھاوج بھی...“

”چپ چاپ لیٹے رہو۔“ بیوی نے غراتے ہوئے اسے ڈانٹا... ”مجھے تمہارے سارے کرتوتوں کا علم ہے... اب خاموشی سے پڑے رہو تاکہ زہر تیزی سے اپنا اثر دکھا سکے۔“

دبئی سے عرفان اظہار کی بے بسی

”اس کی چھوٹی سی دکان ہے لیکن وہ بہت سفر کرتا ہے اور اپنی دکان کے لیے چیزیں ذخیرہ کرتا رہتا ہے۔“

”اور اگر تم اس سے کسی خاص شے کی بابت دریافت کرو تو وہ زمین آسمان کے قلابے ملا دے گا اور ایسی ایسی چیزوں کے نام گنوانا شروع کر دے گا جو تمہاری سماعت پر گراں گزریں گے۔“

”اس طرح تو وہ اپنے آپ کو جیمز بانڈ نہیں بلکہ بور ظاہر کرتا ہے۔“

”جیمز بانڈ ایک کردار ہے بے بی جبکہ وارن ٹریوس ایک

جیتا جاگتا انسان ہے جو لوگوں کو نام بدل کر قتل کرنے کا عادی ہے اور جن دو لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہوا وہ مار دیے گئے۔"

کیٹ حیرت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو؟"

"بہت زیادہ۔ میں نے بڑی باریک بینی سے وارن کے بینک اکاؤنٹ کا کھوج لگانے کے علاوہ اس کے خفیہ اثاثوں کا بھی پتا لگایا ہے۔ اس کے پاس گولڈ کریڈٹ کارڈ اور ڈیٹرائٹ میں دو بڑے اکاؤنٹس کے علاوہ سوئٹزرلینڈ میں بھی اکاؤنٹ ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسے اکاؤنٹ کھولنے کے لیے کم از کم پانچ لاکھ ڈالر جمع کروانا ضروری ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پرانی چیزوں کا بیوپاری جس کی ایک چھوٹی سی دکان ہو، اتنا بڑا اکاؤنٹ کھول سکے۔"

"او میرے خدا۔" کیٹ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"آگے بھی سنو۔" میں نے کہا۔ "وارن کی دولت میں اضافہ اس وقت شروع ہوا جس سال کارل بگنز اور میرے ڈیڈی افغانستان میں مارے گئے۔"

"اب ہم کیا کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں اسی پر کام کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس حوالے سے میری تیاریاں بڑی مضحکہ خیز تھیں۔ میری جیب میں صرف ایک پین کے سائز جیسا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ کیٹ نے ایک کونے میں گاڑی پارک کی اور انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا تاکہ بھاگنے میں آسانی رہے۔ میں صرف وارن سے کچھ اگلوانا چاہ رہا تھا۔ اس کے مالی معاملات کے بارے میں تفصیلات پہلے ہی حاصل کر چکا تھا اور مجھے امید تھی کہ یہ دونوں چیزیں پولیس کے لیے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

میں نے اپنی ماں کے لیونگ روم میں قدم رکھا تو آتش دان روشن تھا۔ ایسا لگا جیسے وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وارن ٹریوس ایک کھڑکی کے پاس کھڑا سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے عام سا لباس یعنی کرتے شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ باقی سب کچھ ہمیشہ جیسا ہی تھا۔ وہی ہلکی سی مسکراہٹ، خالی آنکھیں، وہ پورا بہروپیا تھا۔ میری ساری عمر اداکاروں کے درمیان گزری تھی پھر میں اس کی اداکاری کو کیسے نظرانداز کر سکتا تھا۔

"مجھ سے ملنے کا شکریہ۔" میں نے کہا۔ "دراصل میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ میں مکان کے بارے میں..."

"تم مکان کے بارے میں بات کرنے نہیں آئے۔" وہ میری طرف گھومتے ہوئے بولا۔ "جانتا ہوں کہ تم نے بڑی شدت سے میرے اکاؤنٹ چیک کیے ہیں، کیوں؟

آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے جھوٹ بولنے کے بارے میں سوچا لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا۔ اب میری ماں زندہ نہیں تھی اور میرا صبر جواب دے چکا تھا۔ میں نے جیب سے وہ تصویر نکالی جس میں وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ایک لاش کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملی۔ اس کارروائی کی تمام نشانیاں مٹا دی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہماری شناخت بھی ختم کر دی۔"

"میرے باپ نے یہ تصویر فری پریس کو بھیجی تھی لیکن تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ جنگ میں حصہ لے چکے ہو؟"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جنگی ہیروز کو آرلنگٹن میں دفن کیا جاتا ہے۔ میں تو صرف ایک ماہر نشانے باز تھا جسے سی آئی اے نے ایک مشن پورا کرنے کے لیے وہاں بھیجا۔"

"اور وہ مشن کیا تھا، لوگوں کی لاشیں گرانا؟"

"بعض اوقات یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔" اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یاد ہے کہ کیا ہوا تھا؟ نائن الیون کے بعد جب ہم افغانستان میں داخل ہوئے تو ہمارے وہاں تعلقات تھے اور نہ ہی کوئی حمایت۔ یہاں تک کہ ہم روسیوں سے چرائے ہوئے نقشے استعمال کر رہے تھے۔ ہم طالبان سے نہیں لڑ سکتے تھے کیونکہ اس وقت نہ ہمارے پاس اسلحہ تھا اور نہ ہی افرادی قوت لہٰذا ہم نے چھپ کر ان کے سرداروں کو مارنا شروع کر دیا۔"

"اس معاملے میں اتنی رازداری کیوں برتی گئی؟ تم نے فرضی نام کیوں اختیار کیا؟"

"ہم نے ایک غلط آدمی کو مار دیا تھا۔" وہ سنگ دلی سے بولا۔ "ہمیں ایک مقامی سردار کی طرف سے غلط اطلاع ملی۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ طالبان وار لارڈ ہے لیکن غلطی سے ایک امام کو مار دیا۔ وہ ایک طاقتور مذہبی شخص تھا اور شمالی اتحاد کے آدھے سے زائد قبائل میں اس کی رشتے داری تھی۔ آج بھی اگر یہ سچائی سامنے آ گئی تو اس خطے میں موجود کوئی بھی امریکی محفوظ نہیں رہے گا۔ اس واقعے کے بعد ہمارے اتحادی خوف زدہ ہو گئے۔ انہوں نے ہمارا یونٹ ختم کر دیا۔ ہمیں ملازمت سے نکال دیا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے نام بھی تبدیل کر دیے گئے۔"

"تم میرے باپ کو کس طرح جانتے تھے؟"

"وہ ایک رپورٹر تھا اور اسی علاقے میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا جہاں ہم کارروائیاں کر رہے تھے۔ وہ اسی

ہفتے ایک بم دھماکے میں ہلاک ہو گیا جب سی آئی اے نے ہمیں فارغ کیا۔ تمہیں یہ بات بھی پتا ہونی چاہیے کہ میں محاذ پر کام کر رہا تھا اور اچانک ہی مجھے ایک نئے نام اور بھاری بھرکم بینک اکاؤنٹ کے ساتھ ایک طرف کر دیا گیا لیکن میرے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ میرا کوئی مستقبل اور کوئی زندگی نہیں تھی۔ مجھے کچھ تو کرنا تھا، پھر میری ملاقات تمہاری ماں سے ہوئی۔ ہم دونوں ہی زخم خوردہ تھے۔ میں نے سوچا کہ ساتھ رہ کر ہم اپنے اپنے دکھوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔“

”تم نے اس کے ساتھ دس سال گزارے لیکن اسے بھی کچھ نہیں بتایا؟“

”میں نے کبھی یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔“

بینک میں لون آفیسر کے طور پر کام کرنے کی وجہ سے مجھے سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی مہارت حاصل ہو گئی ہے۔ جب لوگ وقت پر قرضے کی قسط ادا نہیں کر سکتے اور میرے سامنے بیٹھ کر مختلف کہانیاں سناتے ہیں تو میں فوراً سمجھ جاتا ہوں کہ اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ، لہٰذا مجھے یقین تھا کہ وارن نے سچ بولا ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ اس نے بارہ سال تک رازداری برتی اور اب وہ آزادانہ گفتگو کر رہا تھا کیونکہ وہ بھی اب تھک چکا تھا۔

”دیکھو، میں کسے لے کر آیا ہوں۔“

ہم دونوں نے بیک وقت وہ آواز سنی۔ چمڑے کی جیکٹ میں ملبوس ایک شخص کیٹ کا بازو پکڑے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ ”یہ عورت نیچے گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ شاید یہ پولیس کا انتظار کر رہی تھی۔“

مجھے اس جیکٹ والے شخص کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بھی اس تصویر میں وارن کے ساتھ موجود تھا۔ اس وقت اس نے ایک آٹومیٹک ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ پھر اس نے کیٹ کو میری جانب دھکیل دیا۔

”آرام سے چارلی، غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وارن نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہ چارلی سکی ہے۔ افغانستان میں میرے لیے کام کرتا تھا اور اب میرا بہترین دوست بھی ہے۔“ پھر اس نے چارلی سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ”یہ ڈیوڈ ہے۔ میرا سوتیلا بیٹا اور یہ عورت اس کی بیوی ہے۔“

”معافی چاہتا ہوں مس۔“ چارلی بولا۔

”تم انتہائی وحشی ہو۔“ کیٹ نے غصے سے کہا۔ ”اتنی زور سے دھکا دیا کہ میری پنڈلی میں درد ہونے لگا۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں فضول باتوں میں پڑنے کے بجائے اس مسئلے کا حل نکالنا چاہیے۔“ وارن نے کہا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ چارلی نے پوچھا۔

”یہ دیکھو۔“ وارن نے تصویر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

تصویر دیکھ کر چارلی کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”انہوں نے تو کہا تھا کہ تمام ریکارڈ ضائع کر دیا گیا ہے پھر یہ تصویر کہاں سے نکل آئی؟“

وارن نے اسے جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔ چارلی نے پوچھا۔ ”اس رپورٹر کی موت کب ہوئی تھی؟“

”جب اس نے پینٹاگون سے اس تصویر کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے دس روز بعد۔“ میں نے کہا۔

”کیا تمہیں اس بارے میں کوئی اطلاع تھی؟“ چارلی نے وارن سے پوچھا۔ ”کسی نے تمہیں وارننگ دی کہ کوئی شخص اس تصویر کے بارے میں سوالات کر رہا تھا؟“

”نہیں، آج میں نے پہلی بار یہ بات سنی ہے۔“

”ہم کیسے اس پر یقین کر لیں۔“ کیٹ نے کہا۔ ”تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب جھوٹ ہے۔“

”اس بحث میں نہ پڑو۔“ چارلی نے کہا۔ ”ہم تمہارا مسئلہ نہیں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔“

”تم کس بارے میں بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اس تصویر کی بات کر رہے ہیں۔“ وارن نے کہا۔ ”صرف ہم ہی اس تصویر میں نہیں ہیں۔“

”امام کا کوئی مسئلہ نہیں۔“ چارلی نے کہا۔ ”وہ مر چکا ہے لیکن اس تصویر میں موجود تیسرا شخص ابھی زندہ ہے۔“

”ہاکس۔“ وارن نے اس کا نام لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

”یہ کیسے مسئلہ بن سکتا ہے۔ تم اس کے ساتھ کام کر چکے ہو۔“ میں نے کہا۔

”اپنی مرضی سے نہیں۔“ وارن نے کہا۔ ”تم فٹ بال کھیلتے رہے ہو۔ بعض اوقات ٹیم میں کوئی ایسا لڑکا بھی ہوتا ہے جسے تم پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اس پر بھروسا کرتے ہو۔ اس کے باوجود تم اسے ٹیم میں دیکھنا چاہتے ہو کیونکہ وہ اچھے نتائج دیتا ہے۔ ہاکس بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔“

”شاید اس لیے کہ وہ ایک مستعد قاتل تھا۔“ میں نے کہا۔

”اس زمانے میں ہم سب ایسے ہی تھے۔“ چارلی نے کہا۔ ”لیکن ہم میں ایک فرق تھا۔ میں اور وارن اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے تھے جبکہ ہاکس اسے پسند کرتا تھا اور ممکن

ہے کہ اب بھی کرتا ہو۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" کیٹ نے پوچھا۔

"کسی شخص نے مجھے یا چارلی کو منتخب نہیں کیا کہ ایک رپورٹر ہمارے بارے میں چھان بین کر رہا ہے۔" وارن نے کہا۔

"لیکن اگر ہاکس کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ابھی تک اس کھیل میں شریک ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس تصویر سے جڑے دو افراد کی موت محض ایک اتفاق ہے۔"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"نائن الیون کے بعد درجنوں سیکیورٹی ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔" وارن نے کہا۔ "ان میں سے کچھ وفاقی، کچھ پرائیویٹ اور کچھ کو قومی سلامتی کے نام پر لوگوں کو قتل کرنے کا لائسنس دے دیا گیا ہے۔ ہاکس ان میں سے کسی بھی ایجنسی کے لیے سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔"

"میرے لینگلے میں کچھ تعلقات ہیں۔" چارلی نے کہا۔ "میں معلوم کر سکتا ہوں کہ کیا ہاکس اب بھی اس کمپنی کے لیے کام کر رہا ہے۔ اس میں چند دن لگ سکتے ہیں۔ اس وقت تک ہمیں خاموش رہنا ہوگا۔"

"ہم تم پر کس طرح بھروسا کر سکتے ہیں۔" میں نے وارن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے ڈیوڈ۔" کیٹ نے کہا۔ "ہم کسی سے رجوع کر سکتے ہیں۔ پولیس یا کسی وفاقی ایجنسی سے۔ ممکن ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک کے لیے کام کر رہا ہو۔"

میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

ایک کے بعد دوسرا ہفتہ گزر گیا لیکن چارلی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ایک روز میں بینک سے نکل کر اپنی کار کی طرف جا رہا تھا کہ ایک سایہ میرے راستے میں آگیا۔ وہ وارن تھا۔ وہ وحشت زدہ اور پریشان نظر آرہا تھا۔ یوں لگا جیسے اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا ہو۔

"چارلی مر گیا۔" اس نے کہا۔ "اس کی موت ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی۔"

میں نے کچھ نہیں کہا بلکہ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

"یہ حادثہ کسی بھی وقت ہو سکتا تھا۔" اس نے خالی گیراج کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ کبھی بھی نشے میں گاڑی چلاتا تھا۔"

"کیا تمہیں اس پر یقین نہیں آرہا۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ ہم پہلے ہی بہت کچھ کر چکے ہیں۔ اب ہاکس مجھے مارنے آرہا ہوگا۔ میں کافی عرصہ ہوا سب کچھ چھوڑ چکا ہوں۔ اس لیے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔ اگر میں اس کی پہنچ سے باہر ہو گیا تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں کچھ نہ کہے۔"

"لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا وارن تو یہ معاملہ کنٹرول سے باہر ہو جائے گا۔ ہمیں اس بارے میں حکام کو مطلع کرنا چاہیے۔"

"تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو۔ پولیس پہلے ہی ان اموات کو حادثہ قرار دے چکی ہے اور اگر وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں تو اس وقت تک ہم بھی چارلی کی طرح مر چکے ہوں گے۔ میں ان لوگوں سے کہنے کے لیے لینگلے جا رہا ہوں کہ اپنے منہ زور بیل کو قابو میں رکھیں۔"

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ اس بارے میں نہیں جانتے ہوں گے۔ تم نے ہی کہا تھا کہ اگر اس تصویر کی حقیقت سامنے آگئی تو اس کی وجہ سے آج بھی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔ شاید اسی لیے وہ ہر اس نشانی کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو قومی سلامتی کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ اس میں ہماری حکومت کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔"

"تم جو چاہو یقین کرو لیکن میں اپنے بچوں کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ میں تمہارے تیسرے ساتھی سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اس کا انتظام کر سکتے ہو؟"

"کیا تم ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔ ہاکس کو غالباً معلوم نہیں کہ تم اس کے بارے میں جانتے ہو۔ شاید اسی وجہ سے تم ابھی تک زندہ ہو۔"

"پھر تو میں اسے ایک اور اچھی وجہ بتاؤں گا۔ تم جانتے ہو کہ پیسے میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔"

"تم اسے خریدنا چاہ رہے ہو۔ یہی تمہارا شاندار منصوبہ ہے؟"

"تم نے اسے پاگل کہا لیکن احمق نہیں۔ وارن، میں ایک بینکر ہوں اور ایسی دنیا میں رہتا ہوں جہاں پیسا بولتا ہے۔ بے شک تم لینگلے والوں کو وارننگ دے دو لیکن اس سے پہلے ہاکس سے بات کرو۔ میں اس سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو ڈیوڈ۔"

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ

رہا تھا۔ وہ مڑا اور سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا لیکن اسے اسٹارٹ نہیں کیا۔ سوچ رہا تھا کہ وارن اپنی جگہ پر ٹھیک ہے۔ میں پیشہ ور لوگوں سے سودے بازی کرنے میں بالکل اناڑی تھا۔ میں نے کبھی زندگی میں اپنے پاس کوئی گن نہیں رکھی تھی لیکن ہاکس کے پاس گن ہی نہیں بلکہ وہ چاقو کا استعمال بھی جانتا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میری نظروں کے سامنے ماں کا خون آلود چہرہ گھوم گیا۔

تین دن بعد ہاکس ڈسٹرکٹ فرسٹ فیڈرل بینک کی اس برانچ میں داخل ہوا جہاں میں کام کرتا تھا۔ اس نے عام سا لباس یعنی اسپورٹ جیکٹ، پتلون اور دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا اور وہ چاروں طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ یہ جگہ خریدنے آیا ہو۔ اس کی عمر کچھ زیادہ ہو گئی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ وہی قاتل تھا جس کی تصویر کئی سال پہلے میرے باپ نے اتاری تھی اور اس تصویر نے میری ماں کی جان لے لی تھی۔ میرے دل میں نفرت اور غصے کی لہر ابھری لیکن میں نے اس پر قابو پا لیا۔ میرا اس سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ قتل کرنا اس کا کاروبار تھا اور پیسوں کا لین دین کرنا میرا...

میں نے گہرا سانس لیا اور اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور چشمہ اتار کر مجھے تجسس بھرے انداز میں دیکھنے لگا پھر غراتے ہوئے بولا۔ ”تم ڈیوڈ سیویئر ہو؟“

انتہائی فضول سوال تھا۔ میں نے میز پر رکھی نیم پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے علاوہ بھی میری کوئی شناخت چاہیے۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری خوب صورت بیوی وائن اسٹیٹ میں پڑھاتی ہے اور وہ راستہ بھی جس سے وہ ہر روز کام پر جاتی ہے۔ تمہاری جڑواں بیٹیاں برنگھم ایلیمنٹری میں تیسرے گریڈ میں پڑھتی ہیں، ان کی ٹیچر کا نام مس والٹر ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ اور وزن ایک سو ساٹھ پونڈ ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایروز میں رہتی ہے، کچھ اور بتاؤں۔“

”نہیں۔“ میں اس کی معلومات پر ششدر رہ گیا۔ اس نے اتنے غیر جذباتی انداز میں سب کچھ بیان کر دیا جیسے موسم کا حال سنا رہا ہو۔ ”تم نے اپنا مطلب واضح کر دیا ہے مسٹر ہاکس۔“

”بہت خوب۔“ اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”بکنر کہاں ہے؟“

”کون؟“

”کارل بکنر۔ وارن ٹریوس۔ وہ اپنے آپ کو کسی بھی نام سے پکارے۔ میں اسے بکنر ہی کہوں گا۔“

”میں نہیں جانتا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کہیں دور جا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم سے نہیں نمٹ سکتا۔“

”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے پیغام بھیجا تھا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے ہینڈل کر سکتے ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک بینکر ہوں اور صرف میز پر بیٹھ کر کام کر سکتا ہوں۔“

”اس کے باوجود تم مسلح ہو۔“ اس نے کہا پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آیا اور اپنی انگلی سے میرے کوٹ کا گریبان کھول دیا۔ میری بغل کے ساتھ ایک آٹومیٹک ریوالور لٹکا ہوا تھا۔

”کبھی تم نے غصے میں فائر کیا ہے؟“

”نہیں۔ میں صرف اسے اس لیے ساتھ لایا تھا کہ مجھے تمہارے ہاتھوں مرنے سے ڈر لگ رہا تھا۔“

”تمہیں یہی کرنا چاہیے۔“ ہاکس نے کہا۔ ”لیکن اگر تم نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو اس سے پہلے تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔“

”مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔“

”اگر تم سمجھتے ہو کہ بینک کے محافظ تمہیں بچا لیں گے تو اسے بھول جاؤ۔ گو کہ تمہارے یہاں کی سیکیورٹی کافی سخت ہے۔ تمہیں کس سے ڈر ہے؟“

”ہم شہر کے مرکز میں بیٹھے ہیں مسٹر ہاکس اور یہ ایک خطرناک شہر ہے۔“

”لیکن اس کا موازنہ کابل سے نہیں کیا جا سکتا۔ تم سمجھ رہے ہو گے کہ میں کوئی عفریت ہوں لیکن اگر وہ تصویر منظر عام پر آ گئی تو شدت پسند میری گردن اڑا دیں گے۔ لہٰذا میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا اور یہ کرتا رہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ چکے ہیں۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم نے اس ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اگر تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو تو تمہیں پچھتانا پڑے گا۔ تم کیا چاہتے ہو؟“

”میرے پاس تمہارے لیے کچھ ہے۔“ میں نے جیسے ہی دراز کھولی اس کا جسم اکڑ گیا۔ میں نے ایک لفافہ نکال کر اس کے آگے بڑھا دیا لیکن اس نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور بولا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”ساٹھ ہزار ڈالر۔“

"ساٹھ۔" اس کی زبان سے بے اختیار نکلا پھر اس نے وہ لفافہ اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا پھر اس نے وہ لفافہ اپنے جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ "کیا یہ تمہاری یا تمہاری بیوی کی زندگی کی قیمت ہے؟"

"ہمارے پاس یہی کچھ تھا مسٹر ہاکس۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ بہرحال اس رقم کو ایڈوانس کے طور پر رکھ رہا ہوں لیکن اگر مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو تو اسے دگنا کردو۔ ساٹھ ساٹھ ہزار تم دونوں میاں بیوی کی زندگی کی قیمت ہوگی۔ تمہاری جڑواں بیٹیوں کی جان بخشی کے عوض کچھ نہیں لوں گا بشرطیکہ وہ میرے راستے میں نہ آئیں۔ تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔"

"پلیز مسٹر ہاکس اس میں مزید اضافہ نہیں کرسکتا۔"

"تم بینک میں کام کرتے ہو۔ کوئی حل تلاش کرو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ورنہ تمہارا خاندان مزید کچھ شاخوں سے محروم ہوجائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس وقت میں یہی کر سکتا تھا۔

"تمہارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ اس میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوگا۔" وہ مڑا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔

میں اس پر حملہ کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے میری بیوی اور بیٹیوں کو مارنے کی دھمکی دی تھی۔ میرا دل چاہا کہ کرسی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں اور اس وقت تک مارتا رہوں جب تک وہ مر نہ جائے لیکن میں جانتا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا لہٰذا میں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چالیس سیکنڈ گزر گئے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پچاس سیکنڈ پورے ہونے پر میں اس کی جانب لپکا۔

"ہاکس وہیں رک جاؤ۔" میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے دیکھنے کے لیے ایڑیوں پر گھوم گیا اور جب اس نے مجھے ریوالور نکالتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں لیکن وارن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں اس کے مقابلے میں اناڑی تھا۔ جیسے ہی میں نے ریوالور نکالا تو اس نے میری جانب حرکت کی اور میرے بازو پر جوڈو کا وار کیا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں لڑکھڑاتا ہوا کمر کے بل فرش پر جا گرا۔ اس نے ریوالور اٹھالیا اور میرے سر کا نشانہ لینا چاہ رہا تھا کہ میں چلا اٹھا۔

"اس کے پاس ریوالور ہے، اسے روکو۔"

میری آواز سنتے ہی دونوں محافظ اس کی جانب متوجہ ہوئے اور اس پر فائر کھول دیا۔ بینک میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ چیختے چلاتے ہوئے باہر کی جانب بھاگنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد ہاکس زمین پر گر پڑا۔ اسے نصف درجن گولیاں لگی تھیں۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر میں نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی تو ہاکس کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ ہم دونوں ہی زخمی تھے اور ہمارے چہروں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا۔ وہ اس وقت کسی خون آشام بھیڑیے کے مانند نظر آرہا تھا اور اس کی آنکھوں سے درندگی جھلک رہی تھی۔ اس کا چہرہ تاریک ہوچکا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ اس کا آخری وقت قریب آچکا ہے۔ اس کے باوجود اس کی وحشت اور درندگی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس نے سیدھا ہاتھ بڑھا کر میری گردن میں ڈالا اور اپنی جانب کھینچنے لگا۔ میں نے اس کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت طاقت ور تھا۔ تاہم دیر ہوچکی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی طاقت میں کمی واقع ہورہی تھی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور پیچھے کی جانب گر پڑا۔ لیکن اس کی نظریں اب بھی مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ زندگی کی آخری سانس تک بھی اگر وہ مجھے مار سکتا تو ضرور مار ڈالتا۔

یوں لگا جیسے میں بھی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا جارہا ہوں۔ پورا کمرا گھوم رہا تھا اور میں خود کو ایک طویل سرنگ کے دہانے پر محسوس کررہا تھا جس کے آخری سرے پر سورج کی روشنی ایک ٹمٹماتے ہوئے ستارے کے مانند نظر آرہی تھی، پھر میرا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ میرے سرہانے پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھا وارن فریس اونگھ رہا تھا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن کھنکھارنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔ وارن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبا کر ٹی وی کی آواز بند کی اور بولا۔ "نئی زندگی مبارک ہو۔ اب کیسا محسوس کررہے ہو؟"

"ہاکس کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ موقع پر ہی مر گیا۔ تمہارے کولہے میں چوٹ آئی ہے گو کہ زخم زیادہ گہرا نہیں لیکن تم کچھ عرصہ لنگڑا کر چلو گے۔ کیٹ نیچے ہال میں کافی پی رہی ہے۔" پھر اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔ "کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"تم نے کہا تھا کہ میں ہاکس سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تمہارا خیال ٹھیک تھا۔ ایک اناڑی ہمیشہ پیشہ ور کھلاڑی سے ہار جاتا ہے لہٰذا میں نے کھیل کا نقشہ ہی بدل دیا جس میں ہاکس اناڑی اور میں کھلاڑی تھا۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"میں اداکاروں کا بیٹا ہوں اور میں نے تھیٹر کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ لہٰذا میں نے بھی ایک ڈراما اسٹیج کیا۔"

"بینک ڈکیتی کا۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور تم نے ہاکس کو اسٹار بنا دیا۔"

"جبکہ وہ برا آدمی تھا۔ بہرحال کس طرح کے تبصرے سامنے آئے ہیں؟"

"سب لوگ اس بینک ڈکیتی کو ایک دہشت ناک منظر سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ ہاکس کے سرکاری تعلق کے بارے میں کچھ ظاہر نہیں کیا گیا۔ البتہ اس کے ریوالور کے بارے میں سوالات اٹھ رہے ہیں۔"

"میں جانتا تھا کہ وہ مسلح نہیں ہوگا ویسے بھی بینک میں میٹل ڈیٹکٹرز لگے ہوئے ہیں۔"

"لیکن وہ مسلح تھا۔ اس نے اپنی آستین میں پانچ انچ لمبا چاقو چھپایا ہوا تھا جسے ڈیٹکٹر نہیں پکڑ سکا۔ جب وہ مرا تو چاقو اس کی مٹھی میں تھا۔"

"اس نے کہا تھا کہ وہ میرا گلا کاٹ دے گا لیکن میں نے اسے محض ایک دھمکی ہی سمجھا۔"

"پولیس کا خیال ہے کہ وہ ریوالور بھی اسی طرح چھپا کر لایا ہوگا جبکہ ایک عورت کا کہنا ہے کہ اس نے وہ ہتھیار تم سے چھینا تھا لیکن پولیس سمجھتی ہے کہ اس عورت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں۔" اس نے اپنا بازو آگے بڑھا کر مجھے بیٹھنے میں مدد دی۔ میں نے بولنا شروع کیا۔

"میں تم سے ایک آخری بات کی وضاحت چاہتا ہوں۔ وہ تصویر کھنچنے کے کچھ دن بعد میرے ڈیڈی افغانستان میں مر دیے گئے اور یہ کام ہاکس کا تھا۔ تاکہ وہ تصویر منظر عام پر نہ آسکے۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم تھی؟"

"اس وقت نہیں۔" اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ بلکہ اس کے چند ماہ بعد بھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ مجھ سے کہا گیا کہ نیا نام اختیار کر کے گوشہ گمنامی میں چلا جاؤں۔ اس لیے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

"سوائے اس کے کہ تم نے میری ماں سے ملاقات کی اور اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس سے شادی کرلی۔"

"ممکن ہے کہ شروع میں ایسا ہی ہو۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن بعد میں اس کی نوعیت بدل گئی۔ بہت زیادہ۔"

"ہاں اور اسی وجہ سے وہ بھی ماردی گئی۔ تم بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہو۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ڈیوڈ! میں نے کبھی نہیں چاہا کہ ایسا ہو جائے۔ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

"میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ بارہ سال پہلے تم اور تمہارے ساتھیوں نے غلطی سے ایک آدمی کو مار دیا اور اس کے بعد سے مسلسل لاشیں گر رہی ہیں۔ میری ماں کا آخری پیغام مردہ خانے سے آیا اور تم نے اسے موت کے منہ میں پہنچایا۔"

وہ آہستہ سے اٹھا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری ماں سے محبت کرتا تھا ڈیوڈ۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات کا یقین کرلو گے۔"

"وہ بھی تمہارا بہت خیال رکھتی تھی۔ اگر تم اسے سچ بتا دیتے تو ممکن ہے کہ وہ تمہیں معاف کر دیتی اور شاید اب تک زندہ بھی ہوتی۔ ہم بھی یہ نہیں جان پاتے۔"

اس نے جواب دینا چاہا لیکن نہیں دے سکا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ مڑا اور باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا سر تکیے پر رکھا اور ایک گہری سانس لی۔ میرے کولہے میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے کئی مناظر گھوم رہے تھے۔ ایک منظر میں چارلی، کیٹ کو لیونگ روم میں دھکیل رہا تھا اور وارن کا سایہ پارکنگ گیراج میں نظر آ رہا تھا۔ دوسرے منظر میں ہاکس بینک کے فرش پر خون میں لت پت پڑا ہوا تھا اور اس کا چہرہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا لیکن ان میں سب سے واضح تصویر میری ماں کی تھی جو اب بھی اپنی زندگی کا سب سے بڑا ڈراما کر رہی تھی اور مرنے کے باوجود اسٹیج پر حکمرانی کر رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں دس یا گیارہ سال کا تھا تو اکثر ڈراموں کے اختتام پر پردہ گرنے سے پہلے ماں کو دیکھتا جو اپنے دونوں بازو پھیلائے اسٹیج کے وسط میں کھڑی حاضرین سے داد وصول کر رہی ہوتی تھی۔ گوکہ اس وقت میں بہت چھوٹا تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ لیتا تھا کہ اس لمحے وہ بہت خوش ہوتی تھی اور مجھے اس کا آخری پیغام بھی یاد تھا۔ "اگر میں کسی بڑی سازش کا شکار ہو جاؤں تو کوئی بات نہیں۔ میں ہمیشہ سے دھوم دھام سے رخصت ہونا چاہتی تھی۔" اور یقیناً وہ اسی طرح دنیا سے روانہ ہوئی۔ اس نے واقعی اپنا کردار بڑی خوبی سے نبھایا اور جاتے جاتے ایسا بندوبست کر گئی کہ اصل مجرم اپنے انجام سے نہ بچ سکا۔ میں اس کا کوئی کریڈٹ نہیں لینا چاہتا کیونکہ میں نے وہی کیا جو ماں چاہتی تھی۔

ناجائز کسی جاندار کی جان لینے کا کڑا عذاب ہے... اس کے باوجود لوگ اپنے ہاتھوں کو لہو کی سرخی سے آلودہ کر بیٹھتے ہیں... دو بھائیوں کی ذاتی چپقلش کا فسانہ ایک جرم کا سنگین شاخسانہ...

واردات کا راز فاش کردینے والے موسم کی کارگزاری

خونِ ناحق

بابر نعیم

خون بہانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ الفریڈو جانتا تھا کہ خون ریزی نے بے شمار قاتلوں کے کیے کرائے کاموں کو الٹ کر رکھ دیا تھا اور یہ ان کی بربادی کا سبب بن چکا تھا۔ وہ ان کی بربادی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

اس کا بھائی میکلسن برابر کے کمرے میں سو رہا تھا اور ایسی نیند جس سے وہ کبھی بیدار نہیں ہوسکتا تھا۔ الفریڈو نے اس بات کا پختہ عزم کر رکھا تھا کہ یہ اس کے بھائی کی آخری نیند ثابت ہو۔ وہ پوری احتیاط کے ساتھ اس کے بیڈروم کی جانب چل پڑا۔ اس نے ہاتھ میں ہائپوڈرمک سرنج پکڑی ہوئی تھی جس میں زرد رنگ کا مہلک سیال بھرا ہوا تھا۔ یہ مہلک سیال اس نے خود تیار کیا تھا۔

وہ دبے پاؤں محتاط انداز میں اپنے بھائی کے بیڈ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ سانس بھی اتنی آہستگی سے لے رہا تھا کہ اسے اپنے دل کی دھڑکن اپنے دماغ میں کسی طوفان کی گرج کی طرح محسوس ہورہی تھی... ساتھ ہی اسے اس بات کی خوشی بھی ہورہی تھی کہ جلد ہی اس کے بھائی کی نبض کی رفتار بے قاعدہ ہوجائے گی۔

اس کا بھائی میکلسن ایک سراغ رساں تھا۔ وہ ان ایمان دار اور اخلاقی طور پر قانون کے پاس داروں میں سے ایک تھا جو الفریڈو کو خونی رشتے کے باوجود جیل کی سلاخوں کے پیچھے

پہنچانے میں کسی قسم کی رعایت نہیں برتتے۔

الفریڈو ایک چور تھا اور یہ حقیقت بالآخر اس کے سراغ رساں بھائی کے علم میں آ گئی تھی۔ الفریڈو کو یقین تھا کہ اس کا بھائی کسی پس و پیش کے بغیر اس کا کچا چٹھا کھول دے گا۔ بہ شرطے کہ الفریڈو چوری کی تمام رقم واپس کر دے یا اس نقصان کی تلافی کر دے۔

تمام رقم واپس کرنا، اور وہ بھی ہر مرتبہ رسک لینے کے بعد؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الفریڈو کو اس خیال پر طیش آ گیا۔

اور طیش کی اسی کیفیت میں اس نے سرنج کی سوئی اپنے بھائی کے جسم میں پوری طرح اندر تک اتار دی۔

سوئی کی نوک اتنی باریک اور چھید اتنا مخفی تھا کہ اس کے گہری نیند میں سوئے ہوئے بھائی کو چبھن قطعی محسوس نہیں ہوئی اور اس کی آنکھ تک نہیں کھلی۔ ایک منٹ بعد اس کے بھائی کے حلق سے خرخراہٹ کی بلند آوازیں نکلنے لگیں۔ جیسے اس کی سانسیں اٹک رہی ہوں۔

پھر یہ آوازیں کریہہ ہوتی چلی گئیں اور ان کا درمیانی وقفہ بھی بڑھ گیا پھر یہ غیر واضح آوازیں بالکل ہی بند ہو گئیں۔

الفریڈو کو باہر گڑھا کھودنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ وہ پوری تندہی کے ساتھ خاموشی سے اپنے بیلچے کی مدد سے سخت مٹی کو کھودنے میں مصروف رہا۔ پھر جب وادی میں چاند کی پیلی روشنی پھیل گئی تو وہ اپنے بھائی کی لاش مکان کے عقبی حصے میں اٹھا کر لے گیا جہاں اس نے قبر کھودی ہوئی تھی۔ اس نے لاش قبر میں اتار دی۔

کچھ دیر سستانے کے بعد اس نے لاش پر سخت مٹی کے ڈھیلے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ اس وقت تک مٹی ڈالتا رہا جب تک مٹی کا ڈھیر زمین کی سطح کے ہموار نہیں ہو گیا۔ ساتھ ہی وہ مٹی کو پیر سے دباتا بھی جا رہا تھا تاکہ قبر زمین کے لیول میں آ جائے۔

اب قبر زمین کی سطح کے ہموار آ چکی تھی اور زمین کا ایک حصہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔

الفریڈو صبح دیر تک سوتا رہا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب کوئی اس کا عقبی دروازہ زور زور سے پیٹ رہا تھا۔

”کون ہے؟“ الفریڈو نے بلند آواز سے پوچھا۔

”میں ہوں برنارڈ۔ کیا تم دونوں بھائی گھوڑے بیچ کر سو رہے ہو؟ میں اتنی دیر سے داخلی دروازے کی گھنٹی بجا رہا ہوں اور تم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا؟ تمہارے بھائی نے صبح نو بجے میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن نہیں آیا حالانکہ وہ وقت کا ہمیشہ سے پابند رہا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے کے لیے چلا آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ کیا وہ بھیگ جانے کے ڈر سے گھر سے نہیں نکلا؟“

”بھیگ جانے کے ڈر سے؟“ الفریڈ نے دہرایا پھر اٹھ کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔

باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔

الفریڈو، برنارڈ کو اندر بلانے کے ارادے سے دروازے کی جانب بڑھا۔ پھر جب اس نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اس کے بھائی کے سراغ رساں دوست برنارڈ کی نظریں مکان کے عقب میں شیڈ کی جانب مرکوز تھیں۔

عین اس مقام پر جہاں اس نے اپنے بھائی کی قبر کھودی تھی۔

اور اس مقام پر جہاں اس نے لاش دبائی تھی انسانی خاکے کی طرح مبہم سی جگہ بالکل علیحدہ دکھائی دے رہی تھی اور اس خاکے کے نما زمین سے مٹی سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔

برنارڈ، الفریڈو کی جانب گھوم گیا۔ ”کسی نے حال ہی میں اس جگہ کھدائی کی ہے۔“ برنارڈ نے قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے کہ جو زمین حال ہی میں کھودی گئی ہو تو جب اس میں پانی جاتا ہے تو بلبلے اٹھنا لازمی ہوتے ہیں۔“

پھر اچانک برنارڈ نے الفریڈو کو تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا بھائی کہاں ہے؟“

الفریڈو خوف زدہ نظروں سے کھڑا سکتے کے عالم میں ان بھانڈا پھوڑ دینے والے بلبلوں کو دیکھ رہا تھا جو بدستور زمین کی سطح پر نمودار ہوتے جا رہے تھے۔

”تمہارے بھائی نے مجھے تمہاری چوریوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔“ برنارڈ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ الفریڈو نے اچانک اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔

لیکن یہ الفریڈو کی ایک فاش غلطی تھی۔

برنارڈ پہلے ہی چوکنا تھا۔ اس نے خود کو الفریڈو کی زد سے بچاتے ہوئے اس کے جبڑے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

الفریڈو زمین پر گر پڑا۔ برنارڈ نے فوراً ہی جیب سے ہتھکڑی نکال کر الفریڈو کے ہاتھ میں پہنا دی۔

پھر اس مقام کی جانب بڑھ گیا جہاں وہ عجیب سے بلبلے کثرت سے اٹھ رہے تھے۔ الفریڈو کی نظریں بھی ان بلبلوں پر جمی ہوئی تھیں۔ خون نہ بہانے کے باوجود یہ بلبلے اس کے جرم کی گواہی دے رہے تھے۔

اس نے ندامت سے اپنا سر تھام لیا۔

دوسری وصیت

جمال دستی

انسیت... محبت اور الفت کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں... تبھی یہ بندھن مضبوط تر ہو پاتا ہے... کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی محبت نبھانے والی لڑکی کا انوکھا ماجرا... اس کے اردگرد ایسے رشتوں کی باڑھ تھی... جن سے خون کا رشتہ نہ تھا... دو بہنوں کے عجیب و غریب تعلقات کی پرتیں... ایک پرت ہٹی تو سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا...

بہن بھائی... ماں اور بیٹی کے درمیان حائل رکاوٹیں... مغرب کی طمع پرستی کا زہریلا روپ...

میں پہلی بار رینو گیا تھا اور وہاں جانے کا مقصد نینسی ہلوسر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ وہ چھبیس ماہ پہلے وہاں گئی تھی اور اس عرصے میں شاید سب اسے بھلا چکے تھے۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہری وہاں کے استقبالیہ سے بھی اس کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ میں نے اس ہوٹل کے ریستوران، بار اور ہوٹل کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ سے بھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اس نے وہاں کوئی کار کرائے پر نہیں لی تھی نہ ہی اس

شہر میں اس کا کوئی رشتے دار یا دوست تھا۔ اس نے وہاں کی عدالت میں طلاق کی درخواست دائر نہیں کی اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی وکیل سے رجوع کیا۔ اگر وہ جوا کھیلنے کسی کیسینو میں گئی ہوگی تو وہاں سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل تھا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں کو اس کے بارے میں کچھ بتاتا۔ ائرپورٹ کی طرف واپس جاتے ہوئے میں نے آخری کوشش کے طور پر مقامی اخبار میں اشتہار دے دیا جس میں اس کی تصویر اور میری کمپنی کا پتا مع فون نمبر درج تھا۔ اس کا مفہوم بالکل روایتی تھا یعنی کسی کو اس خاتون کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو اس پتے پر اطلاع دی جائے۔

☆☆☆

میرا نام موریَن میکارٹی ہے۔ آر جے کار کو میں ابھی تک نہیں بھولی تھی گو کہ ہمارے درمیان بات چیت نہیں تھی اور اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پچاس کی دہائی میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں صنفِ مخالف سے گفتگو کرنے میں احتیاط برتتے تھے۔ دوسری وجہ یہ کہ میں عمر میں اس سے دو سال بڑی تھی اور اپنے سے چھوٹے لڑکوں میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور تیسری یہ کہ وہ بہت لمبا چوڑا اور بدصورت تھا۔ موٹے شیشوں کا چشمہ لگانے سے اس کا چہرہ اور زیادہ بدنما دکھائی دیتا تھا۔ بعض اوقات اس شخص کو نظرانداز کرنا بہت مشکل ہوتا کیونکہ وہ ہم سے چار گھر کے فاصلے پر رہتا تھا اور اب تیس سال بعد بھی میں اس سے ملنے کے بارے میں سوچ کر ہی خوف زدہ ہو رہی تھی لیکن میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کیونکہ اپنے والد سے وعدہ کرچکی تھی۔ ٹیلی فون پر پیغامات کے تبادلے کے بعد اس سے ملنے کا پروگرام طے پا گیا۔ مجھے منگل کی شام پانچ بجے اس کے دفتر جانا تھا۔

میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گئی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”تم اپنے والد کے کسی مسئلے پر بات کرنے آئی ہو۔ اس کی کیا عمر ہوگی؟“

”وہ ستر سال کا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”اور اس کی صحت کیسی ہے؟“

”جسمانی طور پر وہ صحت مند ہے تاہم بلڈ پریشر، ذیابیطس اور کولیسٹرول کی دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرتا ہے لیکن اس مسئلے کا تعلق اس کی ذہنی کیفیت سے ہے اور میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔ اس کی دوسری بیوی کا فروری کے آخری ہفتے میں اچانک اور غیر متوقع انتقال ہوگیا تھا۔“ یہ کہہ کر میں رک گئی۔ شاید اس سے زیادہ کہنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی کیونکہ اس سادہ بیان کی تہ میں حقائق کا انبار تھا جو آر جے کار کے علم میں نہیں تھے اور ان کی وضاحت کرنا مجھے ناممکن لگ رہا تھا۔

شاید اس نے میرا ذہن پڑھ لیا، وہ بولا۔ ”جلدی کی ضرورت نہیں۔ کوشش کرو کہ مجھے سب کچھ ترتیب سے بتا سکو۔“

میں نے ماضی کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ میری ماں کا انتقال 1982ء میں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد ڈیڈی بہت زیادہ تنہائی اور افسردگی محسوس کرنے لگے پھر ان کی ملاقات نینسی بلوسر سے ہوئی جسے عرصہ ہوا طلاق ہوچکی تھی۔ وہ ڈیڈی سے چار برس چھوٹی تھی۔ 1984ء میں انہوں نے شادی کرلی اور فلوریڈا کے اس مکان میں رہنے لگے جہاں پہلے ممی اور ڈیڈی اور بعد میں ڈیڈی اور نینسی موسم سرما اور موسم بہار کا کچھ حصہ گزارتے تھے۔ نینسی کی ایک چھوٹی بہن لی کلائن ایک ریٹائرڈ میڈیکل ڈاکٹر ہے اور اسے بھی طلاق ہوچکی ہے۔

”شروع میں ہم بہن بھائیوں میں سے کسی نے بھی نینسی کو پسند نہیں کیا۔ وہ ڈیڈی سے بہت محبت کرتی تھی۔ شاید ہم خوف زدہ تھے کہ اس کی قربت میں رہ کر ڈیڈی ہماری ماں کو بھلا دیں گے لیکن وہ بہت اچھی عورت ثابت ہوئی۔ خاص طور پر میرے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اسے معدے میں تکلیف رہنے لگی اور جب بھی تکلیف بڑھ جاتی تو وہ بیمار نظر آنے لگتی۔ گزشتہ سال وہ اور ڈیڈی سردیوں میں ٹامپا گئے لیکن وہ فروری میں چند ہفتے اپنی بہن کے ساتھ گزارنے کے لیے اکیلی واپس آگئی جبکہ ڈیڈی اپنے دوستوں کے ساتھ گالف کھیلنے چلے گئے۔ اسی دوران ایک بار پھر اس کے پیٹ میں تکلیف شروع ہوگئی اور اس کی بہن نے اس کی تیمارداری کی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ ریٹائرڈ ڈاکٹر ہے۔ تبھی وہ دونوں فلو میں مبتلا ہوگئیں اور نینسی کا انتقال ہوگیا۔

تدفین میں ڈیڈی بھی شریک ہوئے لیکن وہ شدید صدمے کی کیفیت میں تھے جبکہ نینسی کی بہن کا حال اس سے بھی برا تھا۔ وہ خود ایک زندہ لاش نظر آرہی تھی۔ وہ وہاں دس دن ٹھہرے لیکن پھر انہیں معاملات نمٹانے کے لیے ٹامپا جانا پڑ گیا۔ ہم میں سے کسی کو ان کے ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بہرحال وہاں سے واپس آنے کے بعد وہ نینسی کی یادوں میں کھو گئے۔ وہ

ہر وقت اس کی چیزیں ٹٹولتے رہتے۔ شاید وہ بھی میری طرح اسے یاد کر کے روتے ہوں۔ نینسی کی موت نے ہم دونوں کو دکھی کر دیا تھا۔ ایک دن اس کے سفری بیگ سے ایک کتاب ملی جس میں کسی فضائی کمپنی کا بورڈنگ کارڈ رکھا ہوا تھا۔'' ڈیڈی نے یہ کارڈ مجھے بھیجا ہے تاکہ تمہیں دکھا سکوں۔''

آر جے نے وہ کارڈ ہاتھ میں لیا اور اپنے موٹے شیشوں کی عینک سے اس کا بغور معائنہ کرتے ہوئے بولا۔

'' نینسی بلوسر۔ اس نے اپنا سابقہ نام برقرار رکھا تھا۔''

'' اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن تم تاریخ دیکھو۔ 19 فروری 1987ء۔ اس سال وہ ٹامپا نہیں گئے بلکہ اس کے بجائے انہوں نے دسمبر میں بحری جہاز کے ذریعے ہوائی کا سفر کیا اور وہاں تین ہفتے گزارے۔ ڈیڈی سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ہر سال کی طرح اپنے دوستوں کے ساتھ گالف کھیلنے چلے گئے۔ وہ پندرہ فروری کو گئے تھے اور چوبیس فروری کو نینسی کے مرنے کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ لیکن ڈیڈی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں بتائے بغیر رینو کیوں گئی تھی۔ یہ وہم ان کے دل میں بس گیا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔''

میں ایک بار پھر سانس لینے کے لیے رک گئی۔ میرا خیال تھا کہ کار کوئی تبصرہ کرے گا لیکن وہ خاموش رہا۔ میں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔'' میں شکاگو میں رہتی ہوں اور ڈیڈی دوسروں کے مقابلے میں مجھ پر زیادہ بھروسا کرتے ہیں۔ خاص طور پر نینسی کے معاملے میں کیونکہ میں اسے بہتر طور پر جانتی تھی۔''

'' کیا تم نے اس بارے میں اس کی بہن سے پوچھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔'' ڈیڈی کو یاد پڑتا ہے کہ ان دنوں للی اپنے کسی دوست کے ساتھ چھ ہفتے کے لیے آسٹریلیا اور دوسرے مقامات پر گئی ہوئی تھی۔ وہ حال ہی میں ریٹائر ہوئی ہے اور یہی وہ بات ہے جو ڈیڈی کو پریشان کر رہی ہے۔ وہ واقعی چاہتے تھے کہ نینسی جنوب کی طرف جائے کیونکہ وہ اپنی بہن سے یہاں نہیں مل سکے گی۔''

'' کسی نے اس کی بہن سے بات کی؟''

'' نہیں، وہ اس کی آخری رسومات میں شریک ہوئی تھی لیکن اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ شاید اس وقت بھی اسے قلق تھا۔ تاہم ڈیڈی اسے اس معاملے سے الگ رکھنا چاہیں گے۔''

آر جے نے دروازے کی طرف دیکھا اور بولا۔

'' اس کام میں کافی اخراجات ہوں گے اور میں نتائج کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ممکن ہے کوئی ایسی بات سامنے آ جائے جو دھوکا دہی سے بھی زیادہ سنگین ہو۔''

'' میں جانتی ہوں لیکن ڈیڈی کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ وہ اور نینسی ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ البتہ نینسی نے انہیں بتائے بغیر ایک انشورنس پالیسی لی تھی، اس کا پچاس ہزار ڈالر کا چیک ڈیڈی کو ملا۔ میں جانتی ہوں کہ پیسوں سے محبت نہیں خریدی جاتی لیکن بعض اوقات اس کا مطلب محبت ہی ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو اسی طرح حیران کر دیتی تھی اسی لیے ڈیڈی اتنے دل شکستہ اور پریشان ہیں۔''

'' اس کام میں پچاس ہزار تو نہیں البتہ آٹھ دس ہزار ضرور خرچ ہو جائیں گے۔''

'' تمہیں فوری طور پر کتنی رقم چاہیے۔'' میں نے پوچھا۔

'' سب سے پہلے تو مجھے رینو جانا ہوگا۔ اس کے سفری اخراجات کے لیے پندرہ سو ڈالر چاہئیں، باقی رہی میری فیس.....''

'' کچھ رعایت نہیں ہو سکتی؟''

'' اس پر ہم بعد میں بات کر لیں گے۔'' آر جے کار نے کہا۔'' پہلے میرے کچھ سوالوں کے جواب دو۔ نمبر ایک، کیا نینسی جوا کھیلتی تھی؟''

'' نہیں، ڈیڈی سے شادی کے بعد اس نے کبھی جوا نہیں کھیلا بلکہ وہ تو تاش بھی نہیں کھیلتی تھی۔ وہ انتہائی نفیس عورت تھی اور شاعری و موسیقی سے دل بہلاتی تھی۔''

'' ٹھیک ہے، میرا دوسرا سوال ہے کہ کیا پہلے شوہر سے اس کی کوئی اولاد تھی؟''

'' اس کی ایک بیٹی تھی لیکن اس نے ستر کی دہائی کے شروع میں ایک مختلف مسلک اختیار کر لیا اور کہیں چلی گئی۔ نینسی نے اسے کئی مرتبہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔''

'' اس کا نام بتا سکتی ہو؟''

'' میں معلوم کر کے بتاؤں گی۔''

'' آخری سوال۔'' آر جے نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' تم نے بتایا کہ نینسی بہت مال دار عورت تھی لیکن تمہارے والد کو اس کی وصیت سے کچھ نہیں ملا۔ کیا تم جانتی ہو کہ اس کے وارث کون تھے؟''

''ڈیڈی کو معلوم ہوگا۔''

''ان سے پوچھ کر بتاؤ، اس طرح ہمارا کچھ وقت اور پیسا بچ جائے گا۔''

☆☆☆

میرا نام آر جے کار ہے اور میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ رینو کے بے نتیجہ دورے سے واپس آنے کے تین دن بعد میں للی کلائن سے ملنے گیا گو کہ میرے کلائنٹ کی یہ خواہش نہیں تھی لیکن میں نے اپنے طور پر اس سے ملنا ضروری سمجھا۔ وہ نینسی کی چھوٹی بہن تھی اور اس وقت اس کی عمر اڑسٹھ سال تھی۔ وہ ریٹائرڈ ڈاکٹر ہونے کے علاوہ نباتات سے بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کا گھر مضافات کے ایک پوش علاقے میں تھا۔ میں اسے اطلاع دیے بغیر صبح ساڑھے دس بجے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے تاخیر سے دروازہ کھولا اور جو لباس اس نے پہن رکھا تھا اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ باغبانی میں مصروف تھی۔

میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''کرونن خاندان نے تمہاری مرحومہ بہن کے بارے میں چند مسائل کے حوالے سے میری خدمات حاصل کی ہیں گو کہ وہ نہیں چاہتے کہ تمہیں پریشان کیا جائے لیکن میرا اپنا ایک طریقۂ کار ہے اور میں کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے میرا کارڈ غور سے دیکھا اور مجھ پر گہری نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ''اندر آجاؤ۔''

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ''میں باغبانی کے لیے جا رہی تھی۔ ہم وہیں باتیں کریں گے۔ تم اپنا کوٹ اتار دو، گرمی لگ رہی ہوگی۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں شوقیہ ماہر نباتیات بن گئی ہوں۔ اگر بیٹھنا چاہو تو فولڈنگ چیئر لے لو۔''

باغ میں پہنچ کر وہ ایک میز کے پاس جھک گئی جس پر بہت سارے اوزار رکھے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''اس سے پہلے کہ تم کوئی سوال کرو، میں چند باتیں واضح کر دینا چاہتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ نینسی کو ایسے مرد پسند تھے جو اس کو ماں جیسی محبت دے سکیں اور کرونن اس معیار پر پورا اترتا تھا جبکہ میں اپنے جیسے مردوں کو پسند کرتی ہوں۔ اس کے باوجود نینسی میری زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی تھی بلکہ ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ کالج کے دنوں میں ہی اس میں ایک بیماری کی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں جو آگے چل کر مرضِ شکم میں تبدیل ہو گئی۔ میں اس سے پانچ سال چھوٹی ہوں۔ میں نے 1942ء میں گریجویشن کیا جب نئے ڈاکٹرز... کی شدید ضرورت تھی۔ اس لیے میں نے شکاگو یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر اس نے کہا۔ ''تم مرضِ شکم کے بارے میں جانتے ہو؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ پیٹ کی کوئی بیماری ہے۔''

''اس بیماری میں گندم اور آٹے کی لحمیات کو جذب کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے جبکہ لحمیات ڈبل روٹی، پاستا، کیک اور گندم کے آٹے سے بنی ہوئی ہر چیز میں موجود ہوتے ہیں اور طبی اصطلاح میں انہیں گلوٹین کہا جاتا ہے۔ اسی لیے میں ڈاکٹر بنی پھر میں نے پیٹ کے امراض میں اسپشلائز کیا کیونکہ میں نینسی کا علاج کرنا چاہ رہی تھی۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جوئے کرونن یا اس کی بیٹی نے اس طرح کی ذمے داری اٹھائی ہو۔''

میں خاموش رہا۔ ممکن ہے میری مداخلت سے اس کی گفتگو کا تسلسل ٹوٹ جاتا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے نینسی کو کرونن سے شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس عمر میں کرونن کو شادی کرنے کی کیا سوجھی اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کے بچے بھی یہ نہیں چاہتے تھے لیکن نینسی اس کی محبت میں پاگل ہو چکی تھی۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب تم سوال کرو۔ مجھے پوچھنے دو کہ اب کرونن کو کیا مسئلہ ہے؟''

''میں اسی طرف آرہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تم اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ، کیونکہ مجھے اس کا کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہے۔''

''جوانی میں وہ بہت زیادہ سوشل ہوا کرتی تھی۔ اس نے مجھے بھی اپنے جیسا بنا دیا۔ وہ ہمیشہ سے ہی دبلی پتلی اور خوب صورت تھی۔ البتہ پیٹ کی بیماری نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اسے قے اور دست کی شکایت ہونے لگتی اور اگر اس کے کھانے میں گلوٹین کی معمولی سی مقدار بھی چلی جاتی تو پھر وہ کئی دن کے لیے کھانا چھوڑ دیتی تھی۔ اس کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی۔ جب جوزف کرونن گالف کھیلنے چلا گیا تو وہ میرے پاس آگئی۔ ہم لوگ دوسرے روز اوک بروک میں واقع ایک نئے فرانسیسی

ریستوران میں کھانے کے لیے گئے۔ ہم نے انھیں تاکید کی کہ کسی چیز میں بھی گلوٹین نہ ہو۔ کھانے میں چاکلیٹ کیک بھی تھا جس کے بارے میں ہم نے فرض کرلیا کہ وہ محفوظ ہوگا لیکن بدقسمتی سے اس کے کسی ایک جز میں گلوٹین کی تھوڑی سی مقدار موجود تھی۔ جس کے نتیجے میں اس پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ اس سے بھی خراب بات یہ ہوئی کہ ہم دونوں کو فلو ہوگیا لیکن نینسی نے مجھے اس بارے میں نہیں بتایا۔ تاہم بیماری کے دوران میں نے اس کا پورا خیال رکھا کیونکہ وہ میرے لیے سب سے اہم تھی۔ پانچ دن بعد یعنی بدھ والے روز میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی اور تب مجھے احساس ہوا کہ نینسی بھی فلو میں مبتلا ہوگئی ہے جبکہ وہ پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی بہت کمزور ہوگئی تھی۔

''میرا خیال تھا کہ جلد ہی ٹھیک ہوجاؤں گی لیکن بدھ کی شب میری حالت اتنی خراب ہوگئی کہ مجھے بچنے کی امید نہ رہی۔ صبح میری آنکھ کھلی لیکن بیماری اور نقاہت کی وجہ سے میں اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی بمشکل نینسی کے کمرے تک پہنچی، وہ مر چکی تھی۔ غالباً اس کی موت ایک یا دو گھنٹا قبل ہوئی تھی۔ کاش میں اس کے پاس ہوتی۔ وہ اکیلی ہی موت سے لڑتی رہی اور اب میں تنہا ہوگئی ہوں۔''

''کیا نینسی کی پہلے بھی کوئی شادی ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہ بھی ایک دردناک کہانی ہے۔ ہم نیویارک میں رہا کرتے تھے۔ نینسی نے گریجویشن کرلیا تھا۔ اس کے ایک سال بعد میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے ریڈکلف چلی گئی۔ نینسی بہت خوب صورت اور سوشل تھی۔ اس لیے مرد اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے لیکن وہ اپنی بیماری کی وجہ سے شادی کرنے سے ڈرتی تھی پھر میں شکاگو آگئی۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں نے ماں اور نینسی کو اپنے پاس بلالیا۔ وہاں اس کی ملاقات چیف بلوسر سے ہوئی جو کالج میں مجھ سے سینئر تھا۔ صرف تین ملاقاتوں کے بعد ہی نینسی اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ بلوسر بھی ماہرِ امراض شکم ہے اور وہ میری طرح اس کا خیال رکھ سکتا ہے۔

''ان کی شادی 1948ء میں ہوئی اور 1950ء میں وہ ماں بن گئی لیکن وہ اپنی بیماری کی وجہ سے شادی کے فطری تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھی۔ اس لیے تمام تر جذباتی وابستگی کے باوجود بلوسر اس کی زندگی سے دور چلا گیا۔ یہ غالباً 1960ء کی بات ہے پھر ماں کا انتقال ہوگیا اور میری بھی شادی ہوگئی۔ ہم دونوں ایک ہی عمارت کے علیحدہ علیحدہ اپارٹمنٹس میں رہنے لگے کیونکہ بے حد قریب ہونے کے باوجود میں اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتی تھی تاہم میں نے اس کی پوری نگہداشت کی جب تک جوئے کروش اس کی زندگی میں نہیں آیا۔''

''اس کی بیٹی کہاں ہے؟''

''این اپنی ماں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی تھی لیکن نینسی نے اس پر بہت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جس کے نتیجے میں وہ باغی ہوگئی۔ اس نے نینسی کی مرضی کے خلاف کیلی فورنیا کے ایک مذہبی کالج میں داخلہ لے لیا اور ایک گروہ میں شامل ہوگئی جو رہبانیت پر یقین رکھتا تھا اور جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ خاندان اور دوستوں سے قطع تعلق کرلیا جائے۔ مجھے نینسی کے تاثرات اچھی طرح یاد ہیں جب اس نے این کا آخری خط مجھے دکھایا۔ خوش قسمتی سے اس وقت میں اسے سہارا دینے کے لیے وہاں موجود تھی۔''

''اس کے بعد این سے کوئی رابطہ نہیں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، حالانکہ وہ گروپ چند سالوں بعد ٹوٹ گیا تھا اور نینسی کو توقع تھی کہ اس کی بیٹی واپس آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ نینسی اور اس کے پہلے شوہر کے درمیان قانونی طور پر طلاق ہوگئی تھی؟''

''ہاں اور بلوسر کا انتقال 1981ء میں ہوگیا تھا۔ اس نے بھی دوسری شادی کرلی تھی۔''

''کیا تمہاری بہن کو کبھی جوا کھیلنے سے دلچسپی رہی تھی؟''

''نہیں، فضول باتیں مت کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں جس معاملے کی تحقیقات کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ 1987ء میں جب جوزف کروش، فلوریڈا میں گالف کھیل رہا تھا اور تم ظاہر ہے ملک سے باہر تھیں، تمہاری بہن نے نینسی بلوسر کے نام سے شکاگو سے رینو کا سفر کیا۔ وہ انیس فروری سے بائیس فروری تک وہاں رہی اور اس نے اپنے شوہر کو اس سفر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور مجھے لگتا ہے کہ اس نے تم سے بھی یہ بات چھپائی۔''

''میرا خیال ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دینا چاہیے۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''نینسی نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی اور اگر اس نے یہ معاملہ مجھ سے خفیہ رکھا تو اس راز کو اس کے ساتھ ہی دفن ہوجانا چاہیے۔ کروش خاندان کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی

تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور بولی۔ "میرے ناشتے کا وقت ہو گیا ہے، تم چاہو تو میرے ساتھ شریک ہو سکتے ہو۔"

☆☆☆

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت مورین میکارٹی کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ اس کی شادی جون 1961ء میں جم میکارٹی سے ہوئی۔ وہ تین لڑکوں کی ماں تھی جو اپنے باپ کے ساتھ ایم ووڈ پارک کے علاقے میں ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے اور ان میں سے ایک اس کے گرافک آرٹ بزنس سے وابستہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اسے اپنی سوتیلی ماں کے مرنے کا بہت غم تھا اور اس سے بھی بڑھ کر وہ اپنے باپ کے بارے میں فکرمند تھی۔ مجھ سے ملنے کے چند روز بعد وہ اپریل کی ایک سہ پہر اپنے دفتر میں بیٹھی کسی کام میں مصروف تھی کہ سیکریٹری لیزا نے ایک مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو مورین اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ تقریباً تیس برس کی ایک بے حد پرکشش سنہرے بالوں والی لڑکی تھی۔ مورین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ "کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" لڑکی سامنے والی نشست پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "البتہ اس کی شاید تمہارے نزدیک کوئی اہمیت ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے پرس کھولا اور چار ضرب چار انچ کا ایک کاغذ اسے پکڑا دیا۔ یہ کسی اخبار کا تراشہ تھا جس میں نینسی کی تصویر کے ساتھ اس مضمون کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ "نینسی بلوسر نے جون 1987ء میں رینو کا تین روزہ دورہ کیا تھا۔ اس بارے میں مصدقہ اطلاعات فراہم کرنے والے کو معقول انعام دیا جائے گا۔ رابطہ کریں، کارانویسٹی گیشن اینڈ سکیورٹی 5099 شکاگو۔" مورین نے اشتہار دیکھ کر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، یہ میرے ڈیڈی کی دوسری بیوی ہے اور مجھے بہت عزیز تھی۔"

"میں تمہارے لیے ایک چیز لائی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پرس سے ایک لفافہ نکالا اور بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ اس میں کیا ہے۔ شکاگو آ رہی تھی کہ ایک دوست نے یہ لفافہ مجھے دے کر کہا کہ اسے تم تک پہنچا دوں۔"

"لیکن..." مورین لفافہ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔

"اب چلتی ہوں۔ باہر ٹیکسی میرا انتظار کر رہی ہے۔"

"کیا تمہارے دوست کو نینسی کے بارے میں کچھ علم ہے۔ تم رینو میں ہی رہتی ہو؟"

"میرے دوست نے یہ کچھ نہیں بتایا بس لفافہ تمہیں دینے کے لیے کہا تھا۔ میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے مورین نے فون کر کے بتایا۔ "ایک عورت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے مجھے وہ اشتہار دکھایا جو تم نے رینو کے اخبار میں دیا تھا اور پھر مجھے ایک لفافہ دیا لیکن اس نے اپنا نام نہیں بتایا اور چلی گئی۔ اس لفافے میں نینسی کی وصیت تھی جس پر 21 فروری 1987ء کی تاریخ درج ہے۔ ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے تمام اثاثوں کی وارث للی ہے لیکن اس وصیت کے مطابق اس کے آدھے اثاثے نیوادا میں واقع خواتین کے ایک فلاحی مرکز کے حصے میں آئیں گے جبکہ چوتھائی مجھے اور چوتھائی للی کو ملے گا۔ اس عورت کا کہنا تھا کہ یہ لفافہ اس کے دوست نے دیا ہے اور اسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں جبکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہوگی۔ براہ کرم مجھے بتاؤ کہ اب کیا کرنا ہے۔"

اگلے دن مجھے ڈاک کے ذریعے اصل وصیت موصول ہو گئی جس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "تمہارے اشتہار کے جواب میں یہ وصیت بھیجی جا رہی ہے۔ براہ کرم نینسی کے شوہر جوزف کروشن اور اس کی سوتیلی بیٹی مورین کو اس بارے میں مطلع کر دیا جائے۔" اس لفافے پر شکاگو کی مہر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے وکیل کو فون کر کے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے بتایا کہ اس وصیت کو عدالت میں تصدیق کے لیے پیش کرنا ہوگا۔ ممکن ہے کہ وہاں پہلے سے کوئی وصیت موجود ہو اور نئی وصیت پر بعد میں دستخط کیے گئے ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ اس وصیت پر عمل کرنے کی ذمے داری کس کو سونپی گئی ہے۔ میں نے وصیت نامہ غور سے دیکھا۔ اس میں مورین میکارٹی کا نام درج تھا۔ میں نے وکیل کو اس کا فون نمبر دے دیا اور مورین کو وہ وصیت نامہ پہنچا دیا پھر میں نے اس سے سنہری بالوں والی عورت کا حلیہ پوچھا تو اس نے مجھے اس کا تفصیلی اسکیچ بنا کر دے دیا۔

اس وقت انٹرنیٹ کا استعمال عام نہیں ہوا تھا لہٰذا مجھے معلومات کے حصول کے لیے اخبارات اور لائبریری کا سہارا لینا پڑتا تھا تاہم تین گھنٹے کے اندر میں اس وکیل کا پتا چلانے

اوراس سے بات کرنے میں کامیاب ہوگیا جس نے نینسی کی وصیت تیار کی تھی۔ دوسرے روز میں نے اسے نینسی کی موت کا سرٹیفکیٹ اور مورین کا خط فیکس کر دیا جس میں اس نے مجھے اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا۔ اس کے بعد وکیل کا لہجہ قدرے تبدیل ہوگیا۔ اس نے معذرت کی کہ وہ میری جانب سے دیا گیا اشتہار نہ دیکھ سکا۔ اس نے بتایا کہ اسے وصیت کی تیاری اچھی طرح یاد ہے۔ البتہ یہ بات غیر معمولی تھی کہ فوراً ہی ایک اجنبی عورت اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے آگئی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان عورت بھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا اس کے بال سنہرے تھے تو اس نے میری بات کے جواب میں ہاں کہا اور بتایا کہ اسے وہ عورت اس لیے بھی یاد ہے کہ اس کے نام کے ساتھ ہوپ آتا تھا۔

میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے پتا لگا لیا۔ اس عورت کا پورا نام کرسٹائن ہوپ تھا اور وہ عورتوں کے ایک فلاحی مرکز میں کام کرتی تھی۔ اس مرکز میں کسی مرد کا داخل ہونا آسان نہیں تھا لیکن میں استقبالیہ کلرک کو چکما دے کر اندر جانے میں کامیاب ہوگیا۔ کرسٹائن ہوپ اس وقت کسی ضرورت مند اور مصیبت زدہ عورت سے باتیں کررہی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم فرنیچر کی سپلائی کے سلسلے میں آئے ہو۔ اس کے لیے تمہیں...“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں فرنیچر کی نہیں تمہاری بات کرنے آیا ہوں۔ میرا نام آر جے کار ہے۔ حال ہی میں تم نے میری ایک کلائنٹ مورین میکارٹی سے ملاقات کی اور مجھے یقین ہے کہ تم نے ہی میری کمپنی کے پتے پر وہ قانونی دستاویز بھی بھیجی تھی۔ کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟“

وہ میرے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

”کیا تم میری بات سننا پسند کروگی؟“

”نہیں۔“ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”یہاں نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بڑے کمرے کی طرف دیکھا جہاں تقریباً تمیں عورتیں بیٹھی نیچی آواز میں باتیں کررہی تھیں۔

”ہم کہیں لنچ پر چلتے ہیں۔“ میں نے پیشکش کی۔

”میں یہاں سے نہیں جاسکتی۔“

”ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تمہیں آسانی ہو

اور ہم سکون سے بیٹھ کر بات کرسکیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے مجھے رینو کے ایک ریستوران کا نام بتایا اور بولی۔ "سوا آٹھ بجے۔ ممکن ہے کچھ دیر ہو جائے لیکن..."

"میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

☆☆☆

میں نے اپنی کرائے کی کار اس ریستوران کے باہر پارک کی اور اسی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ مقررہ وقت سے دو منٹ پہلے ہی پہنچ گئی۔ وہ ایک سفید فورڈ وین میں آئی تھی جس پر اس کے مرکز کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور فوراً ہی ریستوران میں چلی گئی۔ اس کے تیس سیکنڈ بعد میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ میں نے اسے ہیلو کہا تو وہ جواب میں مسکرا دی۔ ایک ہوسٹس ہمیں اس بوتھ کی جانب لے گئی جو میں پہلے ہی ریزرو کروا چکا تھا۔ ہم نے اپنے پسندیدہ ڈرنک کا آرڈر دیا اور میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ جب نینسی بلوسر کروشن دو سال پہلے خفیہ طور پر رینو آئی تو تم اس کے ساتھ وکیل کے دفتر گئیں جہاں ایک نئی وصیت تیار کی گئی۔ اس وکیل کے ذریعے تمہاری شناخت ہو گئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ نئی وصیت میں سب سے بڑا حصہ اس مرکز کا ہے جہاں تم پروگرام ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتی ہو۔ ان دونوں باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم پوری طرح اس معاملے میں ملوث ہو۔ مجھے تمہارے محرکات پر اعتراض نہیں۔ غالباً تم چاہتی ہو کہ تمہیں تنہا چھوڑ دیا جائے لیکن بدقسمتی سے یہ ممکن نہیں۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تم نے جو وصیت مجھے بھیجی اور جس نے مورین کو بھی حیران کر دیا۔ وہ تصدیق شدہ ہے اور اس کے بعد پرانی وصیت منسوخ ہو گئی۔ اس نئی وصیت کی رو سے تمہارے ادارے کو نینسی کے ترکے کا ایک معقول حصہ ملے گا گو کہ اسے نینسی کی بہن کی جانب سے چیلنج کیے جانے کا امکان موجود ہے کیونکہ پرانی وصیت کے مطابق..."

"سب کچھ اسے ہی ملتا تھا۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی لیکن میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آخر نینسی یہاں آئی تھی..."

"کیوں؟"

اس کے معاندانہ رویے نے مجھے بھی اپنا انداز بدلنے پر مجبور کر دیا اور میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"پانچ ہفتے پہلے جوزف کروشن کو اپنی مرنے والی بیوی کے سامان کو سمیٹتے ہوئے معلوم ہوا کہ اس نے دو سال قبل فروری 1987ء میں اسے بتائے بغیر رینو کا دورہ کیا تھا کیونکہ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس لیے اس انکشاف سے اسے بہت صدمہ ہوا۔ اس کی عمر ستر سال ہے اور بیوی کی اچانک موت نے اسے بے حد دکھی کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے مجھے ایک خط لکھ کر اس معاملے میں مدد کی درخواست کی۔ ہم کافی عرصے پڑوسی رہے ہیں۔ اس لیے اس کا دھیان فطری طور پر میری طرف ہی گیا۔ پھر اس کی مجھلی بیٹی مورین میکارٹی میرے دفتر آئی اور اس نے مجھے وضاحت سے بتایا کہ اس کے باپ کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کا باپ جوئے کروشن ہمارا پڑوسی اور میرے والد کا قریبی دوست تھا۔ اس لیے میں نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔

"میں نے رینو جا کر نینسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں لیکن دو سال پرانی بات کسی کو یاد نہیں تھی۔ اس کے وہاں جانے کی تین وجوہات ہو سکتی تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہ رہی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ وہاں جوا کھیلنے گئی ہو۔ میں نے متعلقہ جگہوں پر جا کر معلوم کیا تو یہ دونوں باتیں غلط نکلیں۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی این بوسر کی تلاش میں وہاں گئی ہو جو کئی سالوں سے لاپتا تھی۔ لہٰذا میں نے اسی لیے اخبار میں اشتہار دیا کہ شاید اسے پڑھ کر وہ لڑکی مجھ سے رابطہ کرے۔ اس کی جگہ تم وصیت کے ساتھ سامنے آ گئیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اس وصیت میں بیٹی کے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم این بلوسر کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

وہ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد بولی۔ "وہ مر چکی ہے۔"

"لیکن تم اسے جانتی ہو؟"

"کچھ زیادہ نہیں۔ کم از کم اس کے مرنے تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔" اس نے سلاد کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ سب جان کر کیا حاصل ہوگا؟"

"مجھے اسی کام کے پیسے ملتے ہیں جس سے میرا گھر چلتا ہے لیکن تمہیں جھوٹ بول کر کیا ملے گا۔ بہتر ہے کہ تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ اس لڑکی نے جب کالج چھوڑ کر اس گروہ میں شمولیت اختیار کی تو اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے؟"

"وہ گروہ چند سالوں بعد بکھر گیا اور وہ رینو چلی آئی۔

یہاں اس نے گزر اوقات کے لیے چھوٹے موٹے کام کیے اور جب 1983ء میں ہمارا مرکز قائم ہوا تو وہ وہاں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئی پھر بولی۔ ''کیا تم اس کی خالہ سے مل چکے ہو؟''

''ہاں، وہ تم سے بالکل مختلف ہے۔ اس نے پوچھے بغیر ہی مجھے سب کچھ بتا دیا۔''

''اور تم نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا؟''

''اس نے تم سے زیادہ جھوٹ نہیں بولا۔''

''کیا جھوٹ؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اگر کوئی جھوٹ بولے تو فوراً سمجھ جاتا ہوں۔''

''میں نے کیا جھوٹ بولا؟'' وہ کچھ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال تھا کہ تم سب کچھ سچ سچ بتا دو گی۔ میں آج دوپہر میں فارغ تھا اس لیے اس وقت کو کام میں لیتے ہوئے کچھ باتوں کی تصدیق کر لی۔ جوڈی این بلوسر کا پیدائشی سرٹیفکیٹ تمہارے قبضے میں ہے۔ تم نے 1984ء میں قانونی طور پر یہ نام تبدیل کر کے کرسٹائن این ہوپ رکھ لیا۔ تم 1983ء کے اواخر سے نینسی کروزن سے رابطے میں تھیں...''

''تم نے میرے اپارٹمنٹ میں نقب زنی کی۔'' وہ بپھرے ہوئے بولی۔

''مجھے اپنا اطمینان کرنا تھا۔''

''بہرحال جوڈی این بلوسر اب مر چکی ہے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے، مجھے کرسٹائن ہوپ اور اس مرکز کے بارے میں بتاؤ۔''

''میں نے وہاں ایک رضا کار کے طور پر کام شروع کیا پھر مجھے وہاں سے معاوضہ ملنے لگا۔ کچھ عرصے بعد اسسٹنٹ ڈائریکٹر چھٹیوں پر چلی گئی تو مجھے اس کی جگہ عارضی طور پر لگا دیا گیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ڈائریکٹر نے بھی استعفیٰ دے دیا اور میں ہی واحد عورت رہ گئی۔ یہ ڈھائی سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے نینسی کو اس بارے میں نہیں بتانا چاہیے تھا کیونکہ اس طرح ہمارے درمیان معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی۔ بہرحال اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے اطلاع دیے بغیر چلی آئی۔ مجھے اس کی دولت اور جائداد سے کوئی غرض نہیں تھی۔ 1982ء میں باپ کی طرف سے جو کچھ ملا وہی بہت تھا۔ شاید اسی لیے میری ماں نے دھمکی کے طور پر وہ وصیت تیار کی جس میں سب کچھ للی کے نام تھا۔''

''وہ تمہیں کیوں ڈرا رہی تھی؟''

''تاکہ میری مزاحمت دم توڑ جائے اور جہاں تک للی کا تعلق ہے تو کیا اس نے تمہیں یہ بتایا کہ میں نے کالج کیوں چھوڑا۔ وہ ہمیشہ مجھے برا بھلا کہتی رہتی تھی۔ اس نے میرے ماں باپ میں اختلافات پیدا کیے۔ اس کے ایک دوست نے تیرہ سال کی عمر میں مجھے اذیت دی اور یہ کہ اس نے مجھے زہر آلود چاکلیٹ کا ڈبا ڈاک سے بھیجا۔ اور مجھے گاڑی سے ٹکر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے اس نے تمہیں یہ بتایا ہوگا کہ وہ ہمیشہ میری ماں کا خیال رکھتی رہی۔ جب میں نو عمر تھی تبھی دیکھ لیا تھا کہ ان بہنوں کے رشتے کی نوعیت کیا ہے۔ میری ماں ہمیشہ ڈرتی رہتی تھی کہ للی نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

''اسی لیے تم غائب ہو گئیں؟''

''جوڈی بلوسر کے لیے یہی ایک راستہ تھا۔ پھر وہ مر گئی۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں وہ وصیت بھیجنا ایک غلطی تھی لیکن میں وعدہ کر چکی تھی اور میرے مرکز کو بھی پیسوں کی ضرورت تھی اور اس کا فائدہ معورین کو بھی ہوتا۔''

اس کے بعد میں اسے اپنے موٹل لے گیا اور اسے اس کی ماں کی موت کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ اس وقت تک میں اپنی بیوی گریلی سے بات کر چکا تھا۔ وہ کچھ معاملات میں میری معاون ہے۔ میں نے اسے للی سے ہونے والی گفتگو کی ریکارڈنگ سنائی اور اس کی رائے مانگی۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ نینسی اپنی بہن پر بھی بھروسا نہیں کرتی تھی اور اس نے اپنے سفر کے بارے میں بھی اسے نہیں بتایا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بیمار عورت کو یہ دور دراز سفر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس نے اپنی بہن سے بھی اسے خفیہ رکھا جس سے وہ بے حد قریب تھی اور اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یقینی طور پر اس سفر کا تعلق اس کی بیٹی سے تھا۔ کاش میں اس کی تصدیق کر سکتا۔

گریلی نے مجھے فون کر کے ایک اہم بات بتائی۔ جس روز میں رینو کے لیے روانہ ہوا، وہ معمول کے مطابق ساڑھے چار بجے گھر واپس آئی۔ اس نے ایک نظر باغ پر ڈالی اور یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ پودینہ چٹنی کے پودے چھ سے آٹھ انچ تک بڑے ہو گئے تھے اور اگلے ہفتے تک چٹنی بنانے کے لیے ان سے مناسب مقدار میں کریم حاصل ہو

سکے گی پھر اچانک اسے خیال آیا کہ زیادہ مقدار میں اس کا استعمال خطرناک بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے تصدیق کے لیے انسائیکلوپیڈیا دیکھا اور اس کے بعد فون کرکے اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی تو اس نے فون کرکے مجھ سے پوچھا۔

”تم نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس نینسی کی موت کے سرٹیفکیٹ کی نقل موجود ہے؟“

”ہاں، میرے بریف کیس میں ہے۔ تم ہولڈ کرو۔“

”کیا اس میں کسی ڈاکٹر کا حوالہ موجود ہے؟“

”للی کلائن۔“ میں نے جواب دیا۔ ”موت کی وجہ انفلوئنزا۔“

”لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا اندازہ ہے کہ ایک بیمار چہتر سالہ عورت جو انفلوئنزا میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی ہو، وہ طبعی موت ہی کہلائے گی۔“

”اور للی کلائن یہ بات جانتی تھی؟“

”ہاں، وہ پیٹ کی بیماریوں کی ماہر ہے۔“

”اب میں سمجھ گئی کہ اس نے تمہیں جس گلاس میں پانی دیا تھا، اس میں کیا ملا ہوا تھا جسے پینے کے بعد تمہیں بار بار واش روم جانا پڑ گیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ایک مرتبہ پھر للی کلائن سے ملنا ہوگا۔“

ہفتے کی سہ پہر میں اور گریبی اس کے گھر پہنچے تو بظاہر اس نے پُرتپاک انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ وہ ہماری آمد سے پریشان ہوگئی ہے۔ اس نے اپنا چشمہ سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ عورت کون ہے؟“

میرے بجائے گریبی نے جواب دیا۔ ”ورجینیا روب۔“ میں ایک دوا ساز کمپنی میں کام کرتی ہوں۔ میں نے ہی تم سے فون پر ملاقات کا وقت طے کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، لونگ روم میں آجاؤ۔“

اس نے میز پر سے وہسکی کی بوتل اٹھائی اور تھوڑی سی مقدار گلاس میں انڈیلنے کے بعد ایک گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم اس وصیت کے بارے میں بات کرنے آئی ہو۔ مورین مجھ سے زیادہ ہوشیار نکلی۔ اس نے بے چاری نینسی کو بے وقوف بنا کر یہ وصیت تیار کروائی تاکہ اس کی ساری جائداد پر قبضہ کر سکے۔ فلاحی مرکز تو ایک دکھاوا ہے۔ اس کے پیچھے بھی کرونن اور مورین ہی ہیں۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ وہ فلاحی مرکز ایک جائز اور قانونی ادارہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہم اس وقت وصیت نہیں بلکہ کاسٹر آئل کے پودے کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں۔“

اسے ایک جھٹکا سا لگا لیکن وہ اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ ”تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔ تم نے شاید ہی اس کا ذائقہ چکھا ہو لیکن میرے یہاں ایسی کوئی چیز نہیں۔ شاید یہ بات بھی مورین نے ہی تمہارے کان میں ڈالی ہے۔ نینسی میرے لیے سب کچھ تھی اور اس کی موت میرے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔“

”کیا تم نے اسے زہر دیا تھا؟“

اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تقریباً تیس سیکنڈ تک کچھ نہیں بولی پھر اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”شاید تم نہیں جانتیں کہ وہ موت سے کتنی قریب تھی۔ اس کے اندر بدترین زہر بھرے ہوئے تھے۔ جوزف کرونن کا زہر، مورین کا زہر، ان سب نے مل کر اس کی زندگی کو زہر آلود بنا دیا تھا۔“

”کیا انفلوئنزا سے پہلے بھی نینسی کے پیٹ میں تکلیف ہوتی تھی؟“ گریبی نے پوچھا۔

”ہاں، یہ مناسب نہیں ہے کہ تم میرے بیان پر شبہ کرو۔ اسے واقعی پیٹ کی تکلیف تھی۔“

”کیا اسے انفلوئنزا بھی ہوا تھا؟“

”ہاں لیکن اس کی کسی لیبارٹری سے تصدیق نہیں ہوئی تھی۔“

”کیا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ انفلوئنزا اور ارنڈ کے بیجوں سے بنائے ہوئے سفوف ریسین کی علامات ایک جیسی ہوتی ہیں؟“

”زیادہ تر پیٹ کی بیماریوں کی ایک جیسی علامات ہوتی ہیں، یہ کسی جانب اشارہ نہیں کرتیں۔“

”آخری سوال۔ کیا تمہیں واقعی فلو ہے؟“

”مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے واقعی کا لفظ استعمال کیا۔“ اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے واقعی فلو نہیں ہوا تھا کیونکہ میں نے ریسین نگل لی تھی۔ مجھے مر جانا چاہیے تھا لیکن بچ گئی۔“ وہ شاید طنز کر رہی تھی۔

”لیکن نینسی بہت کمزور تھی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہ مر گئی۔ مجھے بھی اس کے ساتھ مر جانا چاہیے تھا۔ تم کسی طرح بھی ثابت نہیں کر سکتے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ وصیت کے مطابق اس کی لاش جلائی جا چکی ہے اور معائنہ کے لیے کچھ نہیں بچا۔ میں بھی یہ اقرار نہیں کروں گی

کہ ہمارے درمیان کبھی یہ گفتگو ہوئی تھی۔ اب تم جا سکتے ہو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اس سے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر کلائن! اب کرونن یا کسی دوسری پارٹی کے حوالے سے مزید حماقت مت کرنا۔ پہلی بات یہ کہ میں نے یہ ساری گفتگو ریکارڈ کرلی ہے۔“ میں نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”دوسری بات یہ کہ میری معاون ایک ماہر نفسیات بھی ہے، اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ہم تمہارا دماغی معائنہ کروانے پر مجبور ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ تمہیں کسی دماغی اسپتال میں داخل ہونا پڑ جائے۔“

”دفع ہو جاؤ۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ وہ چلاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں واقعی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے اس کا جو اعترافی بیان ریکارڈ کیا وہ قدرے مبہم تھا اور دوسری بات کہ یہ بیان اس کی رضامندی کے بغیر ریکارڈ کیا گیا جو غیر قانونی تصور کیا جاتا ہے۔ ویسے بھی کسی گواہ اور ثبوت کے بغیر اس پر اپنی بہن کو قتل کرنے کا الزام عائد کرنا بے سود تھا۔ اگر اس نے یہ قدم غصے، حسد اور خوف کی حالت میں اٹھایا تو بھی وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہی تھی اور اسے احساس تھا کہ وہ اس ہستی سے محروم ہو چکی ہے جو اس کے سب سے زیادہ قریب تھی۔ اسے صرف یہ ڈر تھا کہ کرونن سے شادی کے بعد اس کی بہن کہیں اپنی وصیت تبدیل نہ کر دے۔ نینسی اور مورین کے درمیان بڑھتی ہوئی قربت بھی اسے پریشان کر رہی تھی لیکن وہ بھول گئی تھی کہ نینسی کی ایک لاپتا بہن بھی ہے اور اگر زندگی کے کسی موڑ پر وہ نینسی کو مل گئی تو صورت حال بدل سکتی ہے۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ایسا ہو چکا ہے اور نینسی دوسری وصیت تیار کر چکی ہے۔ اس نے اسی ممکنہ خوف کے پیش نظر اپنی بہن کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ نینسی نے دوسری وصیت میں اس کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس کا زندہ رہنا کسی کے لیے نقصان دہ نہیں تھا اور اس کے لیے زندگی خود ایک سزا بن کر رہ گئی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسری طرف میں سمجھتا ہوں کہ اس کیس میں مجھے ایک بڑی اور واضح کامیابی ضرور ہوئی۔ کرونن خاندان نے میری خدمات اس لیے حاصل کی تھیں کہ نینسی بلومر کرونن کے خفیہ طور پر رینو جانے کی وجہ تلاش کروں جس نے جوزف کرونن کو ذہنی اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا اور میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا۔ اس طرح کرونن کے ذہن پر چھائے ہوئے شک و شبہے کے بادل چھٹ گئے اور وہ ذہنی طور پر پُرسکون ہو گیا۔ بونس کے طور پر اس تحقیقات کے نتیجے میں نینسی کی اصل وصیت بھی سامنے آ گئی۔ اگر میں رینو نہ جاتا اور نینسی کے حوالے سے مقامی اخبار میں اشتہار شائع نہ کرواتا تو کرسٹائن ہوپ مجھ سے کبھی رابطہ نہ کرتی۔ اس کے نتیجے میں وہ بھی گمنامی کے اندھیرے سے باہر آ گئی۔ مورین کو اس کی بے غرض نیکی کا صلہ مل گیا اور گراں قدر خدمات انجام دینے والے ایک فلاحی ادارے کے حصے میں بھی ایک معقول رقم آ گئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں سوتیلی بہنیں یعنی مورین اور کرسٹائن آپس میں مل گئیں۔

میں سمجھ رہا تھا کہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اعتراف جرم کر لینے کے بعد للی کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو گا لیکن اس کے باوجود اس کے ضمیر کی خلش کم نہ ہوئی۔ اس نے ممکنہ گرفتاری یا پاگل خانے جانے سے بچنے کے لیے ایک انتہائی قدم اٹھایا جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہفتے کے روز ہونے والی ملاقات کے دو روز بعد اس نے ٹرین کے نیچے آ کر خودکشی کر لی۔ شاید ایک بار نہ کام ہو جانے کے بعد اسے ربیکن پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ میں اور گریچی اس کی آخری رسومات میں شریک ہوئے جس کا انتظام بھی مورین میکارتی نے ہی کیا تھا۔

ایک سال بعد مورین کا منجھلا بھائی میتھیو ایک تجارتی کنونشن میں شرکت کے لیے رینو آیا۔ مورین نے اسے تاکید کی کہ وہ کرسٹائن ہوپ سے ضرور ملے۔ میتھیو نے اس کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی وہ یہ جانتا تھا کہ نینسی کے رشتے سے وہ اس کی سوتیلی بہن ہے۔ اس نے تقریباً بارہ سال نیوی میں گزارے اور چونتیس سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ لے کر ایک دوا ساز کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اب وہ پینتالیس سال کا ہو چکا تھا جبکہ کرسٹائن چونتیس برس کی تھی۔ اس کنونشن کے چھ ماہ بعد اس نے اپنا دفتر رینو منتقل کر لیا اور کرسٹائن سے شادی کر کے سب کو حیران کر دیا۔ خود کرسٹائن کو بھی اس معجزے کی توقع نہیں تھی۔

ختم

محی الدین نواب

مسیحا

آخری حصہ

انسان کی حیثیت محض پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے سمندر کے جھاگ کی طرح ہے... جب ہوا چلتی ہے تو وہ اس طرح غائب ہو جاتا ہے جیسے کبھی تھا ہی نہیں... بالکل اسی طرح ہماری زندگیاں، موت کے ہاتھوں بکھر جاتی ہیں... گزرنے والے ماہ و سال جاودانی زندگی کے سامنے ایک لمحے سے زیادہ کچھ نہیں... مادے کی یہ دنیا اور جو کچھ اس دنیا میں ہے... اس بیداری کے مقابلے میں ایک خواب کی طرح ہے... ہمارے قہقہے کی صدائیں... اور ہر آہ جو ہمارے دلوں کی گہرائی سے نکلتی ہے... ان کی صدائے بازگشت کہیں اور محفوظ ہو رہی ہوتی ہے... فرشتے غم کے بہائے ہوئے ہر آنسو کا حساب رکھتے ہیں... آج جس عمل کو ہم احساسِ جرم کی وجہ سے کمزوری سمجھتے ہیں، وہ کل کو انسانی زندگی کی مکمل زنجیر میں ایک اہم کڑی بن کر ظاہر ہوتا ہے... ایسے ہی چہروں سے نقاب اتھاتی کہانی کے نشیب و فراز... جو اپنے مفادات کی خاطر دین کو محض ایک ڈھونگ سمجھ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں... ان کے اندر اور باہر دونوں اس طرح یکجا ہیں جیسے انہوں نے اسی خمیر سے جنم لیا ہو... نظارہ... ناپسندیدہ اور فرسودہ نظامِ سیاست اور ان کے منتخب کردہ بے ایمان اور بے ضمیر چہروں کے گھناؤنے کارناموں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ...

طلسمی طاقت رکھنے والے دو فرشتوں کی بلند سرفرازی... ایمان... اقتدار اور محبت کی درد مسیحائی

معظم گھبرا کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ "تت... تم... تم ربانی یا رحمانی ہو؟"

انہیں ربانی کی آواز سنائی دی۔ "ہمارے دلوں میں تابوں کی عزت ہے۔ ان سے پیار بھری عقیدت ہے۔ ہمیں تمہارے جیسے شرپسندوں کی محفل میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ لعنت ہے تم پر۔ ہم مجبوراً تابوں کی خاطر آئے تھے۔"

معظم نے کہا۔ "ہمارا کہا سنا معاف کرو۔ آج سے ہماری تمہاری دشمنی ختم اور اب ہماری رشتے داری شروع ہو چکی ہے۔"

ربانی نے کہا۔ "تم دشمن بن کر رہو۔ تب بھی رشتے داری تو ضرور رہے گی۔ ہم میں سے کوئی ایک تمہارا داماد بن کر ہی رہے گا۔"

"جو بھی داماد بنے گا، میں اسے ابھی دل سے قبول کرتا ہوں۔ پلیز میری مدد کرو۔ کامران کو دشمنوں کے شکنجے سے نکال کر لے آؤ۔"

"وہ جو ہم سے دشمنی کرنے تمہارے پاس آیا تھا۔ اسے ہم مصیبتوں سے کبھی نہیں نکالیں گے۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کہو۔ جو ہو چکا، اسے بھول جاؤ۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" اسی وقت رحمانی نے معظم کے فون پر رابطہ کیا۔ "ہیلو میں ضروری میٹنگ میں ہوں۔ تم جو بھی ہو بعد میں کال کرو۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں کامران سمندر پار سے بول رہا ہوں۔"

معظم کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ وہ ایک دم اُچھل پڑا۔ حیرت اور مسرت سے بولا۔ ”کامران...! یہ تم بول رہے ہو؟ تم ہی ہو نا...؟“

اس کا نام سنتے ہی اعظم خوش ہو کر فون کے قریب آ گیا اور بے یقینی سے بولا۔ یہ ہمارا کامران ہے نا؟ اچانک کہاں سے آ گیا...؟“

معظم نے پوچھا۔ ”تم اب تک کہاں تھے؟ کیا ہمارے پاس آ رہے ہو...؟“

”آ کر کیا کروں گا؟ آپ تو میٹنگ میں مصروف ہیں۔ میں جا رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

وہ چیخ کر بولا۔ ”خبردار...! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ تمہارے ہی بارے میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ اتنا بتا دو تم کسی کے آگے بے بس اور مجبور تو نہیں ہو؟ کسی کی قید میں تو نہیں ہو؟“

”کیا اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے؟ میں کسی کی قید میں ہوتا تو ابھی آزادی سے آپ کو فون نہ کرتا۔“

”کیا تمہیں اغوا کیا گیا تھا؟“

”ہاں۔ یہ پرانی بات ہو گئی ہے۔“

”کیا صبح سے اب تک کوئی مجبوری تھی۔ تم نے ہم سے بات تک نہیں کی۔“

”ہاں مجبور تھا۔ میرے موکل نے اچانک شادی کی ہے۔ وہ ہنی مون منانے گیا تھا اور میں یہاں مصیبت میں تھا۔“

”تمہیں اسے ڈانٹنا چاہیے۔ اپنے منتروں میں جکڑ کر رکھنا چاہیے۔“

”اب میں نے اسے جکڑ لیا ہے۔ میرے منتر پڑھتے ہی یہ اپنی دلہن کو طلاق دے کر آ گیا ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے اس کی دوسری شادی کراؤں گا۔“

”تم ابھی کہاں ہو؟“

”میں بیچ سمندر میں ہوں۔“

”وہائٹ اسکائی جاؤ۔ میں ابھی روڈنی ویبر کو خوش خبری سنا رہا ہوں۔“

ربانی نے کہا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ ابھی تم نے وعدہ کیا تھا کہ کامران کو سپر پاور کا غلام نہیں بناؤ گے۔ اسے بوستان واپس لے آؤ گے۔“

وہ بولا۔ ”سنو ربانی اور رحمانی! ہمارا عامل ہمارا موکل آ گیا ہے، ہمیں ڈسٹرب نہ کرو۔ یہاں سے جاؤ۔ ہمیں اپنی ضروری باتیں کرنے دو۔“

اعظم نے کہا۔ ”جاؤ۔ ورنہ کامران کا موکل تمہیں اُٹھا کر سمندر میں پھینک دے گا۔“

ربانی نے کہا۔ ”ارے عمر اتوا بدلنے میں بازاری عورتیں بھی ایسی پھرتی نہیں دکھاتیں، جیسی تم دکھا رہے ہو۔ ذرا دم لو۔ سوچ سمجھ کر پٹڑی بدلو۔“

”جاؤ یہاں سے۔ تم نے ہمارے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی ہے۔ ہمارے عامل کو مصیبتوں سے نہیں نکالا ہے۔ دیکھ لو ہمارا عامل تمہارا محتاج نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔ تایا ان کے کہنے سے آئے تھے۔ ہمارے کہنے سے جاؤ۔ پیچھا چھوڑ دو۔“

ربانی نے شکایت کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تم دوغلے اور دغا باز ہو۔ ابھی بنی کے ذریعے ہماری خوشامد کر رہے تھے۔ لعنت ہے تمہاری خود غرضی اور مطلب پرستی پر۔ ہم جا رہے ہیں۔ تمہارے کامران سے نمٹ لیں گے۔“

پھر خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ جا چکے ہوں۔ معظم نے فون پر کہا۔ ”کامران! معلوم کرو یہ جا چکے ہیں یا چھپے ہوئے ہیں؟“

”ابھی میرا موکل معلوم کرے گا۔ اگر وہ پیلس میں کہیں چھپے ہوں گے تو ان کی گردنیں دبوچ لے گا۔“

معظم اور اعظم خوش ہو گئے۔ انتظار کرنے لگے۔ فون خاموش ہو گیا تھا۔ ملازموں نے میز پر کھانا لگا دیا۔ وہ کھانے لگے۔ انتظار میں کھانا بوجھ لگ رہا تھا۔ کامران کو واپس آ کر بتانا چاہیے تھا کہ دشمن نہیں ہیں یا جا چکے ہیں لیکن وہ تو جیسے واپس آنا بھول گیا تھا۔

جس نمبر سے کال آئی تھی، معظم نے اس نمبر کو پنچ کیا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ”سوری، آپ کا مطلوبہ نمبر ٹریس نہیں ہو رہا ہے۔“

اس نے تھوڑی دیر بعد پھر اسی نمبر پر رابطہ کیا پھر وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔ وہ جھنجلا کر بولا۔ ”لعنت ہے۔ یہ کامران کہاں مر گیا ہے؟“

اعظم نے کہا۔ ”مرنے کی بات نہ کرو۔ کبھی کبھی زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہو جاتی ہے۔ وہ کمبخت مر ہی نہ جائے۔“ معظم پریشان ہو رہا تھا۔

اس نے لقمہ چبانے کے بعد پانی سے بھرا گلاس اُٹھایا۔ ایسا لگا کہ گلاس کو جھٹکا لگا ہو۔ وہ ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور پانی دور تک میز پر پھیلتا چلا گیا۔ وہ دونوں تھک

گئے۔

اعظم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آواز دی۔ "کامران! کیا تم آ گئے ہو...؟" مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

اچانک ہی جیسے ہر سمت سے فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ معظم کے، اعظم کے فون سے اور میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون سے بیک وقت کالنگ ٹون ابھرنے لگیں۔ انہوں نے فوراً ہی اپنے اپنے فون اٹینڈ کیے تو وہ بند ہو گئے۔ معظم نے ٹیلیفون کے پاس آ کر ریسیور اُٹھایا تو وہ فون بھی خاموش ہو گیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کے اندر کی دوغلی کیفیت سمجھ رہی تھی کہ انہوں نے جس خوش نصیبی کو ابھی ٹھکرایا تھا، وہ بدنصیبی کا تماشا دکھا رہی ہے۔

وہ پھر چونک گئے۔ انٹرکام سے کالنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ معظم انٹرکام کو گھور کر دیکھنے لگا۔ آخر اس نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔ پی اے کی آواز سنائی دی۔ "سر! کامران کی کال ہے۔"

اس نے فوراً ہی ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔ کامران کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہاں اس کے نام سے کیا تماشا ہو رہا ہے؟ "سوری آنے میں دیر ہو گئی۔ دراصل موکل سے ایک معاملے میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ وہ اپنا ایک مطالبہ منوانا چاہتا ہے۔"

"جو بھی مطالبہ ہے مان لو، دیر نہ کرو۔ وہ ہمارے لیے بہت ضروری ہے۔"

"مطالبہ بہت بڑا ہے۔ اس کی اوقات سے زیادہ ہے۔ وہ کہتا ہے، آئندہ وہ آپ کا غلام بن کر رہے گا۔"

معظم نے خوش ہو کر پوچھا۔ "کیا واقعی؟ وہ تمہارا نہیں میرا غلام بن کر رہنا چاہتا ہے؟"

"جی ہاں۔ اس کا دماغ پھر گیا ہے۔"

"دماغ تمہارا پھر گیا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے وہ میرا تابعدار بن کر رہے؟ فوراً اس کا مطالبہ مان لو۔ ابھی مجھ سے بات کراؤ۔"

"وہ آپ سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے۔"

"اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟"

"وہ کہتا ہے آپ اسے اپنا فرزند بنا لیں۔"

اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ "کیا بکواس ہے یعنی وہ میرا داماد بننا چاہتا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ مستی میں جھوم جھوم کر قسمیں کھا رہا ہے کہ ساری عمر آپ کا غلام بن کر رہے گا۔"

اعظم خان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ غصے سے بولا۔ "یہ کیا بدمعاشی ہے۔ تمہارا موکل تو میری بیٹی سے شادی کرے گا۔"

کامران نے کہا۔ "آپ آرام سے بیٹھیں۔ آپ کی بیٹی سے رشتہ پکا ہے۔ اب معظم صاحب کی بیٹی سے بھی بات پکی کرنا چاہتا ہے۔"

معظم نے کہا۔ "میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"اسے گولی نہیں لگتی۔ وہ تو کبھی دکھ بیماری میں بھی گولی نہیں کھاتا ہے۔"

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ "تم سب اپنی اوقات میں رہو۔ اپنے پُراسرار علوم سے اپنے منتروں سے اس بدمعاش کو قابو میں رکھو۔"

"وہ میرے قابو میں نہیں رہتا۔ اپنی بدمعاشی سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے جب دو آنکھیں دو ہاتھ اور دو پاؤں ہیں تو دو بیویوں سے بھی دو کا ہندسہ پورا ہونا چاہیے۔ وہ میری ایک نہیں سنے گا۔ ابھی اس نے آپ کی تمام فون کالز کو گڑبڑا دیا تھا۔ میرے اور آپ کے درمیان رابطہ منقطع کر رہا تھا۔ پلیز اس کے لیے نرم گوشہ رکھیں ورنہ..."

"ورنہ کیا...؟"

"وہ ہمارا دشمن اور ربانی رحمانی کا دوست بن جائے گا۔"

یہ زبردست دھمکی تھی۔ بہت بڑا چیلنج تھا کہ ربانی اور رحمانی اس موکل کے اتحاد سے زیادہ ناقابلِ شکست بن جائیں گے۔ اُدھر رحمانی نے ان کی گردنوں میں فکر کا پھندا ڈال کر گھبرانے کے انداز میں کہا۔ "یہ... یہ... دیکھیں۔ میرے ہاتھ سے فون چھوٹ رہا ہے۔ موکل ہمارا رابطہ کاٹ..."

بات ختم ہونے سے پہلے ہی فون بند ہو گیا۔ معظم ہیلو ہیلو کہتا رہ گیا۔ کوئی جواب ملنے والا نہیں تھا۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ موکل نے اپنے آقا کامران کے ہاتھ سے فون گرا دیا ہے۔

وہ ڈوبتی آواز میں اعظم سے بولا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ اُدھر ہم نے ربانی اور رحمانی کو پھر سے دشمن بنا لیا ہے۔ اِدھر کامران کا موکل پٹری بدل رہا ہے۔"

اعظم نے کہا۔ "جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔ اس موکل کے لیے سوچو ابھی وہ دشمن نہیں ہے مگر ہونے والا ہے۔ ایک بات سراسر ہمارے فائدے کی ہے، وہ ساری عمر میرا اور تمہارا غلام بن کر رہنے کی قسمیں کھا رہا ہے۔"

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "میں تو مجبور

ہو کر اسے داماد بنا لوں گا لیکن تم تو جانتے ہو میری بیٹی اس پر تھوکنا بھی نہیں چاہے گی۔"

"تاباں کی فکر نہ کرو۔ موکل اسے سحر زدہ کرلے گا پھر وہ اپنے آپ میں نہیں رہے گی۔ ربانی اور رحمانی کو بھول جائے گی۔"

وہ قائل ہو کر بولا۔ "واقعی وہ جادو سے تاباں کا دماغ پھیر دے گا پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تاباں سے کچھ کہنا نہیں ہوگا۔ بیٹی کے سامنے شرمندگی نہیں ہوگی۔"

وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ "یہ ہوئی نا بات... مقدر ایسے ہی اچانک بنتا ہے۔"

اعظم نے بوتل کھولتے ہوئے کہا۔ "آج کھانے کی نہیں صرف پینے کی رات ہے۔ آج تو ڈوب کے پئیں گے۔"

بوتل کھل گئی تھی۔ دو گلاس لبالب بھر رہے تھے۔ سر پھروں کو پاگل بنانے میں دیر نہیں لگتی، ربانی اور رحمانی کو پاگل بنانے کا ہنر خوب آتا تھا۔

☆☆☆

ربانی اور رحمانی سلطانہ یاقوت کے محل میں ڈنر کے لیے آ رہے تھے۔ تاباں نے ان سے کہا۔ "پندرہ منٹ کے بعد ڈرائنگ روم میں آؤ۔ ہالہ اپنا چہرہ تبدیل کر رہی ہے۔ وہ ربانی سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتی ہے۔ میں ایسے وقت رحمانی کے ساتھ وقت گزاروں گی۔"

وہ فون بند کرکے آئینہ خانہ میں آئی۔ ہالہ بڑی حد تک تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے نئے چہرے کو بھی بہت خوبصورت اور پرکشش بنایا تھا۔ وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے تاباں سے بولی۔ "کیسی لگ رہی ہوں؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "سیدھی دل میں اتر رہی ہو۔ تمہیں دیکھنے والا کسی اور کو دیکھنا بھول جائے گا۔ تمہارے لیے خوش خبری ہے۔ وہ دونوں پندرہ منٹ میں آ رہے ہیں۔"

وہ تاباں کا ہاتھ تھام کر بولی۔ "تھینک یو تاباں! تم دل سے یہ سب کر رہی ہو۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

تاباں نے مسکرا کر سلطانہ یاقوت سے کہا۔ "ہالہ تنہائی چاہتی ہے۔ آپ اپنی بیٹی اور ربانی کے ڈنر کے لیے کسی دوسرے کمرے میں انتظام کریں۔"

دونوں ماں بیٹی خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ ان ماں بیٹی کو جیسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل رہی تھیں۔ ہالہ نے فوراً ہی اپنی خواب گاہ میں ڈنر کا انتظام کرایا۔ ربانی اور رحمانی اپنے وقت کے مطابق ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔ انہوں نے سلطانہ یاقوت کو سلام کیا۔ پھر سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق ہونے لگا۔

وہ ہالہ کی شاہانہ خواب گاہ تھی۔ موم شمعیں دھیمی دھیمی سی روشنی میں رومانی ماحول کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی سی موسیقی جیسے کانوں میں پیار کی سرگوشی کر رہی تھی۔ ہالہ ایک طرف سر جھکائے کھڑی تھی۔

جب سلطانہ یاقوت وہاں سے چلی گئی تو ہالہ نے ایک ادائے ناز سے گھوم کر سلام کیا۔ ربانی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔ تمہاری آواز سنائی دے رہی ہے اور تم دوسرے روپ میں ہی سہی رُوبرو.... دکھائی دے رہی ہو۔"

"میں بھی دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کر رہی ہوں۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ جلد ہی اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آسکوں۔"

وہ دونوں میز کے اطراف آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ ایک دوسرے کو کھانے کی ڈشیں پیش کرنے لگے۔ کھانے کے دوران میں بظاہر رکی باتیں ہوتی رہیں۔ ہالہ جیسے انجان سی بن کر لگاوٹ اور اپنائیت کی باتیں بھی کرتی رہی۔

آخر ہالہ نے کہا۔ "ایک بات پوچھوں؟ تم نے شادی کے لیے کیا سوچا ہے؟"

"شادی تو ایک دن کرنی ہی ہے۔ اس کے لیے سوچنا کیا ہے۔ فی الحال جو درجنوں پروجیکٹس جاری ہیں انہیں مکمل کرنا ہے اور پورے ملک بوستان کو سرد ماؤن جیسا شاندار بنانا ہے۔ اس کے بعد شادی کا مرحلہ آئے گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے اور کیا کہے؟

ربانی نے کہا۔ "یہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم آسیب زدہ ہو۔ اس آسیب کی گرفت سے نکلنے کی بات کرو۔ یہ بتاؤ کیا تمہاری نارمل لائف میں ایسے لمحات آتے ہیں جب تم معمول کے خلاف کچھ عجیب سا محسوس کرتی ہو؟"

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "عجیب سا...؟ ہاں کچھ عجیب سا ہی لگتا ہے۔ کبھی گھبراہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ جب کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتی ہوں۔"

"اپنے خواب بیان کرو۔ بعض خواب حقیقت کی سمت راہ نمائی کرتے ہیں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "نامہ کے ساتھ حبشہ کے جنگلوں میں جو پیش آیا تھا، وہ سب تمہیں معلوم ہے۔ وہ مجھے بھی

معلوم ہے اور وہ سب میرے ذہن میں نقش ہو گیا ہے اور وہی کچھ میں خوابوں میں دیکھتی رہتی ہوں۔''

''یعنی کیا دیکھتی ہو؟''

''وہی کالے کلوٹے لوگ ہاتھوں میں نیزے اٹھائے ایک شیطان کے قدآور مجسمے کے سامنے ناچتے گاتے ہیں۔ ایک ہاتھی جیسے ڈیل ڈول والا سیاہ فام بھدا سا پہلوان نما شخص کہتا ہے۔ ''میں زنگورارا ہوں۔''

''وہ اور کیا کہتا ہے؟''

''اس نے ایک بار کہا تھا کہ اس کے منہ سے اُگلی ہوئی شیطانی خوراک پہلے ماں کے حلق سے اُتری تھی۔ وہی خوراک میرے اندر رچ بس گئی تھی۔ اس حوالے سے میں اس کی ملکیت ہوں۔ کوئی اور مرد مجھے نہ چھو سکے گا۔ نہ ہی دور سے دیکھ سکے گا۔''

ربانی نے کہا۔ ''تم خواب بیان کر رہی ہو۔ جبکہ حقیقتاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔ تم میرے سامنے ہو اور میں تمہاری پیدائشی صورت دیکھ نہیں پا رہا ہوں۔''

''ہاں خواب سچ ہو رہا ہے۔ وہ کہتا ہے ماں اس کے پاس نہیں جائیں گی تو وہ ایک دن میرے پاس آئے گا اور مجھے یہاں سے مکھن کے بال کی طرح نکال کر لے جائے گا۔ کیا اس کی یہ باتیں سچ ہوں گی؟''

وہ سر اُٹھا کر جیسے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''خدا بہتر جانتا ہے۔ ہم ایک خدا کے سہارے ساری عمر شیطان سے لڑتے رہتے ہیں۔ تمہارے لیے بھی لڑتے رہیں گے۔''

وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیا زنگورارا یہاں بھی آ سکے گا؟''

ربانی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''زنگورارا کی یہ بات بھی غلط ہو رہی ہے۔ کوئی بھی تمہیں چھو لیتا ہے لیکن جان بوجھ کر نہیں انجانے میں...''

''ہو سکتا ہے جان بوجھ کر چھونے سے بھی کسی طرح کا شیطانی ردِعمل نہ ہوتا ہو۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہو سکتا ہے ردِعمل نہ ہو۔''

ہالہ نے بڑی خاموشی سے میز پر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ربانی نے اس کے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''مجھے چھونے سے پہلے ایک شرط ہے۔''

ربانی کی نظروں نے سوال کیا۔ وہ بولی۔ ''یہ ایک کنواری کا ہاتھ ہے۔ جو دانستہ چھوئے گا، یہ عمر بھر اسی کا رہے گا۔''

''عمر بھر کی بات صرف نکاح نامہ میں ہوتی ہے۔ منہ زبانی نہیں ہوتی اور میں کہہ چکا ہوں، شادی خانہ آبادی کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔''

ربانی نے پھر اسے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ وہ بولی۔ ''تم مجھے چھو کر جادو ٹونے کی حقیقت معلوم کر سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے منفی ردِعمل ہو۔ وہ منفی ردِعمل تمہیں زنگورارا اور اس کے جادوگروں تک پہنچا سکتا ہے۔''

ربانی اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولی۔ ''تم اس خبیث تک پہنچ سکتے ہو۔ مجھے اور ماں کو اس سے نجات دلانے کا راستہ مل جائے گا۔''

''درست کہتی ہو۔ لیکن ہاتھ پکڑنے کی شرط ایسی ہے جسے فی الحال قبول نہیں کر سکوں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ کر چکی تھی لیکن شرط منوانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ ایک طرح سے سبکی محسوس کر رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ''میں تمہارے اصولوں کو سمجھ رہی ہوں اور شیطانی ردِعمل کو بھی سمجھنا ضروری ہے... پلیز مجھے چھو لو۔''

ربانی نے ہاتھ بڑھا کر پہلے ایک انگلی اس کی ہتھیلی کی پشت پر رکھی... اسے چھو لیا۔ ہالہ کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ اندر ہی اندر جذباتی کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ پھر ربانی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے اسے تھام لیا۔

ہالہ نے بے اختیار گہری سانس لی۔ چھونے اور پکڑے جانے کے ان لمحات کو اپنے اندر کھینچ لیا۔ ایسے وقت وہ سرتاپا اُدھر کھنچی جا رہی تھی۔ حیا روک رہی تھی۔ ورنہ تڑپ کر اس کے بازوؤں میں پہنچ کر سینے میں گھس جاتی۔

ہائے رے جادوگر...! وہ خبیث زنگورارا کیا جادو کرے گا، جو تو کر رہا ہے۔

ربانی نے اپنا ہاتھ ہٹا کر کہا۔ ''تم پر منفی ردِعمل نہیں ہوا ہے۔ تم نارمل ہو۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''ہاں۔ بات سے بات نکلی ہے۔ اب دوسری بات ذہن میں آ رہی ہے۔''

''وہ دوسری بات کیا ہے؟''

''میں اگر میک اپ میں نہ رہوں۔ اور اپنا پیدائشی چہرہ دکھاؤں تو کیا اسی طرح نارمل رہوں گی؟''

''چھو لینے اور آنکھوں سے دیکھ لینے کے ردِعمل میں فرق ہو سکتا ہے۔ تکلیف دہ ردِعمل ہو سکتا ہے۔''

''تم نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میرا

دل کہتا ہے، کاتبِ تقدیر نے مجھے تمہارے نام لکھا ہے۔ تم میری اصلی صورت دیکھو گے تو زنگورارا کا جادو بے اثر ہو گا۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ تمہاری پیدائش کے دن سے دنیا کا ہر مرد تمہارے لیے ممنوع ہو چکا ہے۔ جب تک شیطانی طلسم نہیں ٹوٹے گا، میں بھی ممنوع رہوں گا۔"

اس نے ضد کی۔ "میرا دل، میرا اعتقاد کہتا ہے، میں صرف تمہیں اپنی صورت دکھا سکتی ہوں۔ میرا نام ہلالہ ہے مگر قدرت نے مجھے تاباں بنا کر، تمہاری تاباں بنا کر بھیجا ہے۔"

وہ جواباً کوئی بات سنے بغیر اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ "میں ابھی میک اپ اُتار رہی ہوں۔ ابھی ثابت کروں گی کہ تقدیر مجھے تمہارے نام کر چکی ہے۔"

وہ میک اپ اتارنے چلی گئی۔ وہ یہ ثابت کرنے پر تُل گئی تھی کہ اسے کاتبِ تقدیر نے اس کے نام لکھ دیا ہے۔

اس نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں آرہی ہوں۔ اپنی تاباں کو دیکھو...."

دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ ربانی نے نظریں اُٹھائیں۔ تاباں کی ایک جھلک دیکھی۔ اس کے ساتھ ہی ہلالہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے پھر وہ جہاں کھڑی تھی، وہیں چکرا کر بیٹھ گئی۔

ایسا بس چند ساعتوں کے لیے ہوا تھا۔ اسے تکلیف کی شدت سے چکرا کر گر پڑنا تھا لیکن وہ فرش پر بیٹھتے ہی سنبھل گئی۔ جس تکلیف سے دوچار ہوئی تھی، وہ یکلخت ختم ہوگئی۔

وہ اس کے رُوبرو ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہوئی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔

ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ کہاں گیا...؟

دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ اسے کھول کر نہیں گیا تھا... مگر جا چکا تھا۔

تاباں ڈرائنگ روم میں رحمانی کے ساتھ بیٹھی باتیں کررہی تھی اور بات بات پر ہنس رہی تھی۔ رحمانی اسے بتا رہا تھا کہ کامران اب تک کیسے کیسے مضحکہ خیز حالات سے گزر چکا ہے۔

اسی وقت ربانی وہاں آگیا۔ تاباں نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ بڑی جلدی آگئے؟"

اس نے بتایا کہ کن حالات سے گزر کر آیا ہے۔ یوں بھی اسے اور رحمانی کو وائٹ اسکائی کے معاملات سے نمٹنے کے لیے جانا تھا۔ وہ دونوں پھر آنے کا وعدہ کرکے چلے گئے۔ تاباں تنہا رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد سلطانہ یاقوت نے آکر پوچھا۔

"ربانی اور رحمانی کہاں ہیں؟"

اس نے کہا۔ "انہیں فوراً ہی جانا پڑ گیا۔ ان کی مصروفیات ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ پھر کسی وقت آئیں گے۔"

"میں ان کی مصروفیات اور مجبوریاں سمجھتی ہوں مگر ہلالہ اداس ہے۔ ربانی اس سے کچھ کہے سنے بغیر گیا ہے۔"

"میں جانتی ہوں، وہاں کیا ہوا تھا۔ ربانی اچانک نہ جاتے تو ہلالہ مستقل تکلیف میں مبتلا رہتی۔ آپ بیٹی کو سمجھائیں۔ اس نے غلطی کی ہے۔ اسے اصلی چہرے کے ساتھ اس کے سامنے نہیں آنا چاہیے تھا۔"

ماں پریشان ہورہی تھی۔ اس نے کہا۔ "بیٹی کو کیا سمجھاؤں۔ پاگل ہورہی ہے۔ ربانی کو اپنا اول اور آخر سمجھتی ہے۔ یہ سمجھنا نہیں چاہتی کہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں ہوتا۔ تقدیر ہمارے خلاف چال چلتی ہے تو ہم بے بسی سے دیکھتے اور سوچتے رہ جاتے ہیں۔"

ہلالہ دروازے پر آکر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہاں سے چپ چاپ الٹے پاؤں اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ اس کے اندر جو بے چینی سی پیدا ہوئی تھی وہ کم نہیں ہورہی تھی۔ اسے اپنا ہاتھ اب تک ربانی کی گرفت میں محسوس ہورہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا جس نے اسے چھوا تھا۔

اس نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔ "یا خدا...! مجھے دے۔ ربانی میرا ہے۔ مجھے دے۔"

اس نے الماری کے ایک حصے سے پلاسٹک کی ایک ڈبیا نکالی پھر اسے کھولا۔ اس میں وہ شیطانی معجون تھا جو پہلے اس کی ماں کے حلق سے اُترا تھا۔ پھر ماں کی کوکھ سے بیٹی تک پہنچا تھا۔

اس معجون کو ہاتھوں میں لیتے ہی ذہن پر دھند سی چھا جاتی تھی۔ وہ سحرزدہ سی ہوکر اس کی ایک خوراک زبان پر رکھ لیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے ایک چمچ خوراک حلق سے اُتار لی۔

دوا کی عجیب سی تاثیر تھی۔ ذہن کھل جاتا تھا۔ پھول کھلنے لگتے تھے۔ وہ جیسے ہوا کی ہتھیلیوں پر چلنے لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنے بیڈ پر آکر چاروں شانے چت ہوگئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے تاریکی میں کہیں تیزی سے اڑتی چلی جارہی ہے۔ پتا نہیں کن نادیدہ مقامات سے گزر رہی تھی؟ اس طلسمی معجون نے اسے جکڑ لیا تھا۔

پتا نہیں کتنا وقت گزر رہا تھا، وہ اس قد آور شیطانی مجسمے کے سامنے پہنچ گئی جس کا ذکر اپنی ماما سے سنتی رہتی تھی۔ شیطان خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

اس نے خود کو شیطان کے قدموں کے قریب دیکھا۔ وہاں وہ چاروں شانے چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اوپر ہانڈی کے پیندے میں سوراخ تھا۔ وہاں جمع ہونے والی رال قطرہ قطرہ بلالہ کے منہ میں ٹپک رہی تھی۔

گانے بجانے اور رقص کرنے والوں کے شور میں زنگورارا کی سیاہ چمکتی ہوئی صورت دکھائی دی۔ وہ شیطان کی جے جے کار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”جا... تیری مرادیں پوری ہوں گی۔ جسے مانگتی ہے۔ وہ تجھے... صرف تجھے ملے گا۔“

یکدم اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

کامران گہری نیند میں تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک حسین عورت اپنی ریشمی زلفیں لہرا رہی ہے۔ وہ ان زلفوں کی ریشمی نزاکت کو اپنے چہرے پر سے پھسلتے دیکھ رہا تھا۔ اسے عجیب سی گدگدی ہوئی۔ سرسراہٹ سی محسوس ہوئی تو آنکھ کھل گئی۔

بعض اوقات آنکھ کھلتے ہی خواب کی تعبیر مل جاتی ہے۔ اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ عین نگاہوں کے سامنے وہ حسین تعبیر تھی۔ حسن و جمال کی جیتی جاگتی صورت تھی۔

وہ اس پر جھکی بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میرا نام لیزا ہے۔“ اس نے زلفوں کو جھٹک کر ہنستے ہوئے کہا۔ ”جوانی کی راتیں سونے کے لیے نہیں، جاگنے کے لیے اور جگانے کے لیے ہوتی ہیں۔“

وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ لیزا نے اٹھنے نہیں دیا۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر بولا۔ ”تم کون ہو؟ میں بحری جہاز میں ہوں نا؟“

”ہاں تم سمندر کی گود میں اور میری بانہوں میں ہو۔ آج سے تم تنہا نہیں رہو گے۔ میں تمہارے ساتھ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن کر رہوں گی۔“

وہ اپنی ہتھیلی سے اس کے سینے کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں خوبصورت ہوں؟ تمہیں اچھی لگتی ہوں؟ مجھے قبول کرو گے؟“

وہ بولا۔ ”میں گھر کا ہوں نہ گھاٹ کا۔ کل کہاں تھا۔ آج کہاں ہوں اور یہ نہیں جانتا، اگلے لمحوں میں کہاں رہوں گا۔ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔“

دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کاسترو نے کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے موکل نے مجھ سے فون پر بات کی تھی۔ میں حیران ہوں۔ جادو ٹونے سے پیدا ہونے والا موکل موبائل فون استعمال کر رہا تھا؟“

وہ بڑے فخر سے بولا۔ ”ارے موبائل فون کیا چیز ہے۔ میرا موکل ہوائی جہاز بھی اڑاتا ہے۔ تمہارے اس بحری جہاز کو کنارے بھی لگا سکتا ہے اور پلک جھپکتے ہی اسے ڈبو بھی سکتا ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں۔ وہ اسی لاکھ ڈالرز کے دو کنٹینرز کو غرق کر چکا ہے۔ اب میں اس سے زیادہ نقصان اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“

”پھر کیا ارادہ ہے؟“

”تمہارے موکل سے سمجھوتا ہو گیا ہے۔ میں تمہیں رہا کروں گا۔ تم وہائٹ اسکائی جا کر ہمارے دشمنوں کے پاس رہو گے اور وہاں صرف روڈانی ویٹر کے ہی نہیں، میرے سسر بیتھون برنارڈ کے لیے بھی کام کرو گے۔“

وہ بولا۔ ”ہم سب کام کرنے کے لیے ہی دنیا میں آئے ہیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ سمجھوتا ہو گیا ہے۔“

وہ بہت مجبور ہو کر اسے رہا کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم اسی لمحے سے آزاد ہو۔ بوستان اور وہائٹ اسکائی کے حکمرانوں سے باتیں کرو۔ ان سے بھی معاملات طے کرو۔ انہیں بتاؤ کہ کن شرائط پر یہاں سے جا رہے ہو اور وہاں جا کر کس کے دباؤ میں رہے بغیر آزادی سے ہمارے اور ان کے کام آتے رہو گے۔“

وہ ایک نیا موبائل فون سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے، تم کسی سے بھی رابطہ کر سکتے ہو۔ اس میں تمام اہم فون نمبرز محفوظ ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں رہا ہو کر یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔“

کاسترو نے لیزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے یہ خوبصورت تحفہ دیا ہے۔ یہ تمہاری بوڑھی اور خالی دنیا کو اپنے وجود سے بھر دے گی۔ جب تک چاہو گے

تمہارے ساتھ رہے گی اور بولو کیا چاہتے ہو؟"

وہ ذرا سوچ کر بولا۔ "بوستان میں میری بیوی کے بینک اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ ڈالرز جمع کرا دو۔ اور بھی کچھ چاہتا ہوں مگر سوچ کر بتاؤں گا۔"

ربانی اور رحمانی آگئے۔ انہوں نے تحریر پیش کی۔ کامران نے اسے پڑھا۔ "میں دو بہت ہی دلیر تجربہ کار گن مین اپنے باڈی گارڈز کے طور پر چاہتا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "یہ میرے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ تم وہاں میرے دشمنوں کے پاس رہو گے اور میرے آدمی باڈی گارڈز کی حیثیت سے میرے رپورٹر بن کر رہا کریں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے اور نوشتۂ دیوار پڑھتے ہوئے بولا۔ "میں نادان نہیں ہوں۔ میرا موکل مجھے بتا رہا ہے کہ یہ لیزا بھی میری نہیں' تمہاری وفادار بن کر رہا کرے گی۔ میرے ساتھ رہ کر تمہارے لیے جاسوسی کرے گی۔"

لیزا نے کہا۔ "ابھی میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرو۔ تمہیں بہت جلد میری محبت اور وفاداری کا یقین ہو جائے گا۔"

وہ بولا۔ "عورت کی وفا مرد کو خوش نصیب بنا دیتی ہے۔ ایسا ہوا تو میں دیارِ غیر میں واقعی خوش نصیب بن جاؤں گا۔"

اس نے نیا فون سینٹر ٹیبل سے اٹھا کر وٹیر کو پہلی کال کی۔ اس کے پی اے نے بتایا کہ کامران کی کال ہے تو اس نے شدید حیرانی سے فوراً ہی کال اٹینڈ کی۔ بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا واقعی؟ تم... تم کامران ہو؟"

اس نے کہا۔ "یقین کرلو۔ ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔"

"پلیز ہماری حیرانی اور بے یقینی کو سمجھو۔ تم ایک خطرناک عامل کامل ہو کر اب تک خاموش اور لاپتا رہے۔ اس لیے ہم تمہارے معاملے میں الجھے ہوئے ہیں۔"

"میں خاموش رہ کر دیکھ رہا تھا کہ تم لوگ کتنے پانی میں ہو؟ اور میری رہائی کے لیے کیا کر رہے ہو؟ افسوس کہ سپر پاورز ڈھول کا پول ثابت ہوا ہے۔"

"ہم تمہارا کھوج لگا چکے تھے۔"

"میرے وہاں آنے اور رہائش اختیار کرنے کی شرائط سن لو۔ میری رہائش گاہ کے اندر اور باہر تمہاری طرف سے سیکورٹی کے انتظامات نہیں کیے جائیں گے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو۔ ایک بار تمہیں اغوا کیا جا چکا ہے پھر ایسی واردات ہو سکتی ہے۔ تمہاری حفاظت کرنا ہماری پہلی ذمے داری ہے۔"

اس نے نوشتۂ دیوار کے مطابق دھمکی دی۔ "تو پھر لکھ لو میں تمہارا مہمان بن کر نہیں رہوں گا، بیگون برنارڈ کو میزبانی کا موقع دوں گا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ وہ ہمارا بدترین سیاسی مخالف ہے۔ تمہیں یہاں رہ کر اس کے خلاف کام کرنا ہے۔"

"سوری، میں کسی کا دشمن نہیں' سب کا دوست بن کر رہوں گا اور اسی کے کام آتا رہوں گا جو میرے وطن بوستان کی بہتری کے لیے ہمارے کام آتا رہے گا۔"

وٹیر نے کہا۔ "اپنے ملک کے اعلیٰ حکام معظم خان اور اعظم خان سے پوچھو۔ ہم نے تمہارے ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لیے اربوں روپے قرض کے طور پر دیے ہیں۔"

کامران اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ ایک حسینہ اور دو باڈی گارڈز آ رہے ہیں۔ وہاں میں تمہاری طرف سے دو باڈی گارڈز کو قبول کروں گا پھر بیگون برنارڈ کی طرف سے دو اور باڈی گارڈز رکھوں گا۔"

"یہ کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو؟ ہمارے اور دشمنوں کے بھیجے ہوئے باڈی گارڈز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ ان کی آپس کی دشمنی سے تمہیں بھی نقصان پہنچے گا۔"

"نہیں پہنچے گا۔ میں شیر اور بکری کو ایک ہی گھاٹ میں پانی پلاتا رہوں گا۔"

وٹیر نے ناگواری سے کہا۔ "تم آؤ گے تو باتیں ہوں گی۔ ہم بگلی کو طیارہ بھیج رہے ہیں۔"

کامران بظاہر سنگین معاملات پر مغرور حکمرانوں سے باتیں کر رہا تھا۔ حقیقتاً موجودہ حالات میں اور معاملات میں اس کی فہم و فراست نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ بس وہی کہہ رہا تھا جو ربانی اور رحمانی اسے سمجھاتے تھے۔

پھر اس نے بیگون برنارڈ کو فون پر مخاطب کیا۔ "ہیلو میں کامران بول رہا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "شکریہ مسٹر کامران! میرے وجدان نے کہا تھا کہ تم مجھ سے بات کرنے والے ہو۔ میں انتظار کر رہا تھا۔ ایک بار پھر شکریہ۔ کہو میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"تم نے تو بڑی خدمت کی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے

اغوا کرایا۔ ہر طرف سے اندھی گولیاں برسائیں۔ اگر کوئی گولی مجھے لگتی اور میں مرجاتا تو تمہارے باپ کا کیا جاتا؟ میری بیوی بیوہ اور بچے یتیم ہو کر سڑکوں پر بھیک مانگتے دکھائی دیتے۔''

''سوری مسٹر کامران! سیاست بڑی کمینی شے ہے۔ برتری اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے سیاست داں کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔ اپنے باپ کی بھی گردن اُڑا دیتے ہیں۔ پلیز جو ہوگیا اسے آپ بھول جائیں۔''

''تم سے سیکھا ہوا یہ سبق کبھی نہیں بھولوں گا۔ کبھی اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے تمہیں داؤ پر لگاؤں گا۔ پھر تمہاری طرح سوری کہہ دوں گا۔''

''میں ایسی دوستی نبھاؤں گا کہ تمہیں دشمنی کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہاں آؤ کچھ سیاست روڈنی ویلر سے اور کچھ ہم سے بھی سیکھتے رہو۔''

''ہاں۔ میں سیکھنے بھی آرہا ہوں اور سکھانے بھی۔ یہ جانتے ہونا کہ کن شرائط پر دوست بن کر رہوں گا؟''

''کاسترو نے بتایا ہے کہ ہم میں سے جو بوستان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے زیادہ سے زیادہ تعاون کرے گا' تم اس کے دوست بن کر کام آتے رہو گے۔ کامران! ہم نادان نہیں ہیں کہ تمہیں دشمن بنائیں گے۔ آؤ' ہماری دوستی' ہماری محبت تمہارا انتظار کررہی ہے۔''

☆☆☆

کیپٹل زون کے ائرپورٹ میں آرمی اور انٹیلی جنس کے مسلح افراد ہر طرف موجود تھے۔ روڈنی ویلر نے سیکورٹی کے بہت سخت انتظامات کیے تھے۔ بیگون برنارڈ بھی اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ کامران کے استقبال کے لیے آیا تھا لیکن کسی کو اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔

وہ وی آئی پی روم میں تھا۔ اس سے ملاقات کرنے کی اجازت دینا تو دور کی بات ہے' اسے دور سے بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔ ربانی اور رحمانی اس وقت کامران کے پاس موجود تھے۔ اس کے کانوں میں ضرورت کے وقت بولتے رہتے تھے۔ وہ خوش تھا کہ اس کا مؤکل مسلسل رابطے میں ہے۔

اس نے آرمی کے ایک اعلیٰ افسر سے کہا۔ ''یہاں میری ایک پی اے اور دو باڈی گارڈز ہیں' جنھیں میں کاسترو سے لے کر آیا ہوں۔ بیگون برنارڈ بھی میرے لیے دو باڈی گارڈز لے کر آیا ہے۔ اسے یہاں آنے کی اجازت دی جائے۔''

آرمی کے اس کڑک افسر نے کہا۔ ''سوری' ابھی کسی کو تم سے ملنے کی اور کسی سے فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہاری اجازت کا محتاج نہیں ہوں۔ روڈنی ویلر سے بات کراؤ۔''

وہ بولا۔ ''عالی جناب روڈنی ویلر اپنے چیمبر میں تمہارے منتظر ہیں۔ وہاں ایک ہنگامی اجلاس کا تعلق تم سے ہے۔ وہاں تمہاری حاضری ضروری ہے۔''

اس نے کہا۔ ''میں جارہا ہوں۔ لیکن پہلے فون پر بیگون سے بات کرنے دو۔''

''سوری کسی سے بات کرنے میں ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ اٹھو یہاں سے چلو۔''

ہنگامی اجلاس میں روڈنی ویلر اپنی آرمی کے اعلیٰ افسران اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ موجود تھا۔ وہاں کامران پہنچا تو اسے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اسے ایک مجرم کی طرح اونچی جگہ کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ وہ سب کو نظر آسکے۔

روڈنی ویلر نے کہا۔ ''کامران! تم فون پر ایسے بول رہے تھے جیسے ہمارے آقا ہو اور ہم تمہارے تابعدار ہیں۔ ہم سے اپنی شرائط منوا رہے تھے۔ اب اپنی اوقات کو سمجھو۔''

وہ بے چارہ اپنی اوقات کیا سمجھتا۔ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ''اے میرے باپ! تُو کہاں چلا جاتا ہے؟ میں ان سے کیا کہوں؟''

ایک افسر نے کہا۔ ''یہ اپنی زبان میں منتر پڑھ رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ کرسکتا ہے۔ اس کا منہ بند کرو۔''

ایک گارڈ نے فوراً ہی قریب آکر اس کی کنپٹی سے ریوالور کی نال لگادی۔ ''شٹ اپ۔ ہماری زبان میں بولو۔ نہیں تو حرام موت مرو گے۔''

وہ بولا۔ ''میں منتر نہیں پڑھ رہا ہوں۔ میری عادت خراب ہوگئی ہے۔ لوگ مصیبت میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ میں اپنے باپ کو پکارتا رہتا ہوں۔''

''خبردار! یہاں صرف ہماری زبان بولو گے اور وہ تمہارا باپ کون ہے۔ اسے بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تم ہمیشہ ہمارے تابعدار بن کر ایک رہائش گاہ کی چار دیواری میں رہو گے۔ اس چار دیواری کے باہر بھی آسمان نہیں دیکھ سکو گے۔''

انٹیلی جنس کے چیف نے کہا۔ ''ہمیں یہ راز بتاؤ کہ

ہمارے اہم ریکارڈز روم میں کیسے پہنچ گئے تھے؟ اور وہاں سے اب تک کتنے راز معلوم کرچکے ہو؟"

وہ بولا۔ "مجھے تمہارے ملک' تمہاری سیاست اور تمہارے چھوٹے بڑے رازوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور نہ رہے گی۔ میں نے تمہارا کوئی راز نہیں چرایا ہے۔ صرف معظم خان کی ایک فائل کو دیکھا تھا اور اس کا ذکر کیا تھا۔ اب جیسے زمانہ گزر گیا ہے۔ اس فائل کو بھی بھول چکا ہوں۔"

"تمہیں ہماری سیاست سے ابھی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن دشمن تمہیں منہ مانگا معاوضہ دیں گے تو تم ہمارے ریکارڈز روم میں بہ آسانی گھستے رہو گے اور ہمیں نقصان پہنچاتے رہو گے۔

"تم قیدی بن کر بھی عیش و عشرت سے زندگی گزارتے رہو گے۔ تمہارا کام اتنا ہی ہوگا کہ ہمارے تمام مخالفین کے ارادوں' تمام رازوں اور ان کی سازشوں سے ہمیں آگاہ کرتے رہو گے۔ ان کے خفیہ ریکارڈز روم میں جاکر ہمارے لیے تمام سیاسی اور عسکری راز معلوم کرتے رہو گے۔"

وہ بے باکی سے بولا۔ "قیدی بن کر تو کبھی کوئی کام نہیں کروں گا اور کام کرنے کی شرائط پہلے ہی بیان کرچکا ہوں۔"

"تمہاری شرائط نامنظور ہیں۔ تم ہمارے لیے جتنے ضروری ہو سکتے ہو اس سے زیادہ خطرناک بن سکتے ہو۔ کسی بھی وقت ہمارے ملک کی ڈھکی چھپی ہوئی کمزوریاں مخالفین کو بتا سکتے ہو۔ اس لیے تمہیں آزادی نہیں ملے گی۔"

انہوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ کامران کو ایک تہ خانے کی چار دیواری میں قیدی بنا کر رکھا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس کی طرف سے کوئی منفی ردِ عمل ہوتا ہے یا نہیں؟

انہیں یقین تھا کہ وہ کچھ عرصہ قید میں رہ کر ان کا تابعدار بن جائے گا۔ ازل سے جادوگروں کی ہسٹری یہ بتاتی آرہی ہے کہ فرعون جیسے حکمران خطرناک جادوگروں کو اسی طرح جبراً اپنا تابعدار بناتے آئے ہیں۔

اس فیصلے کے مطابق اجلاس کے کمرے سے نکال کر باہر ایک گاڑی کے پچھلے حصے میں اسے پہنچا دیا گیا۔ اس کے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا گیا۔ اجلاس برخاست ہو چکا تھا۔ روڈنی ویلر بھی معزز اراکین کے ساتھ باتیں کرتا ہوا وہاں آیا پھر اپنی شاندار کار میں آکر بیٹھ گیا۔

اس احاطے میں کئی گاڑیاں تھیں۔ کامران کو لے جانے والے ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس کا انجن ذرا بیدار ہوا پھر سو گیا۔ روڈنی ویلر نے اپنی کار اسٹارٹ کی تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس کی مہنگی شاندار کار کا انجن گرم ہوا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ کوئی معمولی کار نہیں تھی۔ اس میں خوا مخواہ خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے دوسری بار کوشش کی تو اطمینان ہوا کار اسٹارٹ ہو گئی۔ اس نے سر گھما کر دور اس گاڑی کو دیکھا جو کامران کو لے جانے والی تھی لیکن رُکی ہوئی تھی۔

ویلر کی کار اسٹارٹ ہو کر پھر رُک گئی۔ اس نے پریشان ہو کر قریب کھڑے ہوئے گارڈ کو دیکھا۔ اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کار کا بونٹ اُٹھا کر انجن کو چیک کرے۔ اس بات کے لیے اس نے کار کے شیشے کو ذرا نیچے کرکے اسے مخاطب کرنا چاہا تو پتا چلا شیشہ جام ہو گیا ہے۔ وہ نیچے نہیں ہو رہا تھا۔ کھڑکی نہیں کھل رہی تھی۔

یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ پھر اس نے دروازہ کھول کر گارڈ کو مخاطب کرنا چاہا تو حیران رہ گیا۔ دروازہ بھی نہیں کھل رہا تھا۔

اس نے دوسری بار کوشش کی۔ پھر دوسری طرف کے دروازے اور کھڑکی کو کھولنا چاہا۔ حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ وہ دروازہ بھی مقفل ہو گیا تھا اور اس کھڑکی کا شیشہ بھی اوپر نیچے نہیں ہو رہا تھا۔ دماغ میں بات آگئی کہ یہ بلیک میجک ہے۔

اس نے پریشان ہو کر فون کے ذریعے اطلاع دی۔ "میرے ساتھ کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ یہاں آؤ اور دیکھو۔ یہ پوری گاڑی مقفل ہو گئی ہے۔ مجھے باہر نکالا جائے۔"

کار کا یوں مقفل ہونا حیرانی کی بات تھی۔ مزید حیرانی یہ دیکھ کر ہوئی کہ وہ چاروں دروازے باہر سے بھی نہیں کھل رہے تھے۔ طرح طرح سے کوششیں کی جارہی تھیں اور وہ ناکام ہوتے جارہے تھے۔

اُدھر قیدی کو لے جانے والی گاڑی کا انجن ناکارہ ہو گیا تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کامران کو دوسری گاڑی میں منتقل کیا جائے۔ پھر جب فیصلے پر عمل کرنے کے لیے اس گاڑی کے دروازے کو کھولا گیا تو سب حیران رہ گئے۔ یکبارگی روڈنی ویلر کی کار کے چاروں دروازے آپ ہی آپ کھل گئے۔

سب کے منہ ایسے کھل گئے جیسے وہ سب آنکھوں سے نہیں منہ سے کوئی معجزہ دیکھ رہے ہوں۔ وہ اسے شعبدہ بازی نہیں کہہ سکتے تھے۔ کامران کا بلیک میجک انہیں چیلنج کررہا

تھا۔

یہ بات سمجھ میں آنے کے باوجود وہ آسانی سے جھکنے اور شکست تسلیم کرنے والے نہیں تھے۔ سپاہیوں نے کامران کو دوسری گاڑی میں بٹھا کر اس کے پچھلے حصے کو لاک کر دیا۔ وہ پھر قیدی بن گیا۔

روڈنی ویلر ایک اسپورٹس کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کار کی چھت نہیں تھی۔ وہ چار دیواری کی طرح مقفل نہیں ہوتی تھی۔ اسے کسی طرح کا بلیک میجک جبراً قیدی نہیں بنا سکتا تھا۔ ویلر کار ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ربانی اور رحمانی نے اسے جانے دیا۔ وہ دشمنوں کو ان کا حوصلہ اور تدابیر آزمانے کا موقع دے رہے تھے۔ بلی ایک چھلانگ میں چوہے کو دبوچ سکتی ہے۔ لیکن ذرا سا پنجہ مار کر چھوڑ دیتی ہے۔ وہ زخمی ہو کر بھاگتا ہے تو پھر پنجہ مارتی ہے۔ آخر میں شکار خود ہی نڈھال سا ہو کر بچاؤ کی ساری تدبیریں بھول جاتا ہے۔

کامران کو قیدی بنانے والے مطمئن ہو گئے تھے کہ وہ ان پر جادوئی ہتھکنڈے آزمانے میں ناکام رہا ہے۔ آئندہ مجبور ہو کر ان کا تابعدار عامل بن کر رہے گا۔

☆☆☆

کاسترو کے بحری جہاز سے کامران کے ساتھ لیزا اور دو باڈی گارڈز آئے تھے۔ وہائٹ اسکائی کی زمین پر پہنچتے ہی آرمی کے افسران نے اسے حراست میں لے لیا تھا ساتھ ہی لیزا اور اس کے باڈی گارڈز کو بھی لاک اپ میں ڈال دیا گیا تھا۔

لیزا کو لاک اپ سے الگ ایک بنگلے میں پہنچایا گیا تھا۔ کیونکہ ایک کرنل کا دل اس پر آ گیا تھا۔ کرنل دو تین ماہ بعد ریٹائر ہونے والا تھا۔ بڑھاپے کے باعث فرائض ادا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی دعویٰ تھا کہ بوڑھا نہیں ہے۔

وہ ہنستے ہوئے کہتا تھا۔ ''جنگ کے میدان میں بوڑھا کہہ دو پر جوانی کے میدان میں جوان ہوں۔ یہ تو دنیا کہتی ہے کہ شیر کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔''

کاسترو کے سسر بیگون کے خلاف قانونی کارروائی ہو رہی تھی۔ یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ان سسر داماد نے کامران کو اغوا کرنے کے لیے قیامت برپا کی تھی۔ خون کی ندیاں بہائی تھیں اور شہر کا امن و امان تباہ کیا تھا۔

بیگون یہ دیکھ کر مایوس ہو گیا تھا کہ کامران وہائٹ اسکائی پہنچتے ہی قانونی شکنجے میں آ گیا ہے اور اس کا کوئی پُراسرار علم کام نہیں آ رہا ہے۔ اس نے اپنے داماد سے کہا۔

''ہم سے بڑی بھول ہوئی ہے۔ ہم نے کامران کی صلاحیتوں اور مہارت کو سمجھے بغیر لاکھوں ڈالرز پانی کی طرح بہا دیے اور ہمارے کئی وفادار بھی جان سے گئے۔ ہم سراسر نقصان میں رہے۔''

کاسترو نے کہا۔ ''یہ کامران کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کبھی سیدھا سادہ سا بیوقوف شخص دکھائی دیتا ہے۔ کبھی خطرناک موت کا ہرکارہ بن جاتا ہے۔''

بیگون نے ناگواری سے پوچھا۔ ''وہ خطرناک عامل اب کہاں مر گیا ہے؟ ویلر نے اسے نہ جانے کتنی رازداری سے کہاں قیدی بنا کر رکھا ہے اور وہ چپ ہے۔ اس کی طرف سے کوئی فوری ایکشن ہونا چاہیے؟''

''ذرا صبر کرو۔ وہ خاموش نہیں ہوگا۔ کچھ کر رہا ہوگا۔ کل تک ضرور اپنی اصلیت دکھائے گا۔''

انہیں تو چپ رہنا تھا۔ صبر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے لیزا اور دو باڈی گارڈز کو اپنے جاسوس کے طور پر کامران کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ تینوں بھی قیدی بن کر فی الحال ان کے لیے ناکارہ ہو گئے تھے۔

لیزا ان حسیناؤں میں سے تھی جنہیں کاسترو عیاشوں کی منڈی میں فروخت کرنے والا تھا۔ اسے اغوا کرکے جہاز میں لایا گیا تو وہ روتی گڑگڑاتی رہی تھی۔ اس نے کاسترو سے التجا کی۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ گھر جانے دو۔ مجھے برباد کرنا چاہو گے تو خود برباد ہو جاؤ گے۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''جو یہاں جبراً لائی جاتی ہیں وہ سب ہی بددعائیں دیتی اور کوستی ہیں پھر مال خوب کمانے لگتی ہیں تو دعائیں دینے لگتی ہیں۔''

پھر اس نے کہا۔ ''اگر تم چاہتی ہو کہ دس ہاتھوں میں نہ جاؤ تو کسی ایک کو ٹریپ کرو اور اسی کے ساتھ رہ کر میرے کام آتی رہو۔ تمہیں اچھی خاصی رقم ملتی رہے گی۔''

وہ راضی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ''تم کامران کو اپنا دیوانہ بنا کر میرا تابعدار بنا دو اور اس کی ذاتی اور خفیہ مصروفیات کے بارے میں رپورٹ دیتی رہو۔ اس طرح جان و مال سے محفوظ رہو گی۔ عزت آبرو سے زندگی گزارتی رہو گی۔''

وہ بولی۔ ''عزت آبرو کی سلامتی کے لیے جو بولو گے وہ کروں گی۔ لیکن جس مرد کے سائے میں رہوں گی اسے کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گی۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ کامران کو نقصان پہنچاؤ گی تو ہمیں بھی نقصان پہنچے گا۔ بس تم اتنا کرو گی کہ اسے دشمنوں کی

حمایت میں ہمارے خلاف کوئی کام نہیں کرنے دو گی۔‘‘

’’میں اسے ضرور اچھی باتیں سمجھاؤں گی۔ تم میری بہتری چاہتے ہو۔ میں بھی تمہاری بہتری کے لیے کام کرتی رہوں گی۔‘‘

اسے دولت کمانے کا شوق نہیں تھا۔ وہ عیاش اور بدمعاش لوگوں سے گھبراتی تھی۔ اس نے کامران کو دیکھا تو وہ کچھ عمر رسیدہ تھا لیکن معقول شخص تھا۔ اس کے سائے میں وہ نیک نامی سے ایک گھریلو ازدواجی زندگی گزار سکتی تھی۔ وہ نیک نیتی سے فیصلہ کرنے کے بعد کامران کے ساتھ وہاں اسکائی آ گئی تھی۔

پھر وہاں پہنچتے ہی کامران سے جدا ہو گئی تھی۔ اسے کرنل ووڈ کے حکم سے ایک بنگلے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ پہلے کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ روڈنی ویلر ان کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کرے گا۔ ویسے ربانی اور رحمانی نے ویلر اور دیگر اعلیٰ حکام کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ کامران کے ساتھ جیسا سلوک کریں گے ویسا ہی سلوک ان کے ساتھ ہوتا رہے گا۔

ویلر اور دیگر اکابرین دوسری صبح کامران سے سمجھوتا کرنے والے تھے۔ اس نے کہا۔ ’’سمجھوتا بعد میں ہوگا۔ پہلے لیزا اور میرے دونوں باڈی گارڈز کو رہا کیا جائے اور انہیں میرے پاس پہنچایا جائے۔‘‘

بوڑھا کرنل ووڈ لیزا کو حاصل کیے بغیر رہا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی رہائی کو ایک رات کے لیے ٹال دیا جائے۔ صبح ہوتے ہی اس حسینہ کو کامران کے پاس پہنچا دیا جائے۔ آرمی کے اعلیٰ افسر کے حکم کو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ کامران کا یہ خیال تھا کہ لیزا کے ساتھ جو ہوگا اس سے کامران بے خبر رہے گا۔ ویسے بھی وہ لوگ کامران کو مختلف پہلوؤں سے آزما رہے تھے۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور وہ کس افسر کے گھر میں پہنچائی گئی ہے؟ کرنل مستی میں لڑکھڑاتا ہوا بیڈروم میں آیا تو لیزا نے اسے دیکھ کر معصومیت سے پوچھا۔ ’’انکل! یہ کس کا گھر ہے؟ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کامران کہاں ہے؟‘‘

وہ ایک حسینہ کے منہ سے ’انکل‘ کا لفظ سنتے ہی غصے سے تلملا کر بولا۔ ’’نو نان سنس! انکل ہوگا تیرا باپ۔ تیری تو ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔‘‘

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے دائیں بائیں نجات دہندہ کھڑے ہیں۔ اس نے ان لمحات میں اپنے اندر عجیب سی توانائی محسوس کی۔ پھر کہا۔ ’’بڈھے کھوسٹ! کیا میں تیری بیٹی سے بھی کمسن نہیں ہوں؟ واپس جا۔ ورنہ ایک ہاتھ ماروں گی تو سر سے وِگ اتر جائے گی۔ دوسرا ہاتھ ماروں گی تو نقلی دانت باہر آ جائیں گے۔‘‘

وہ غصے سے گرجتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اس کے منہ پر ایک ہاتھ مارنا چاہا لیکن ہاتھ ہوا میں لہرا گیا۔ جواباً لیزا کا لہراتا ہوا ہاتھ منہ پر پڑا تو آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ ایک نازک حسینہ کا ہاتھ ایسا زوردار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔ اسے تو ایسا ہی لگا تھا کہ لیزا نے پٹائی کی ہے۔

ایک فوجی افسر اور ایک چھوکری سے مار کھا جائے؟ یہ تو غصے سے پاگل کر دینے والی بات تھی اور وہ پاگل ہو گیا۔ اس نے گرجتے ہوئے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ دوسری طرف کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی جان جلا رہی تھی۔

وہ اسے گالیاں دیتا ہوا پھر اس کی طرف لپکا پھر سمجھ میں نہیں آیا کہ اس پر چھلانگ لگانے کے باوجود فرش پر اوندھے منہ کیسے گر پڑا ہے؟ وہ سامنے کھڑی ہنس رہی تھی۔

اس کا دعویٰ تھا کہ جوانی کے میدان میں جوان ہے۔ لیکن ذرا سی دیر میں ہی بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ ایک جوان لڑکی کے سامنے انسلٹ ہو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرجتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ’’آج تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تجھے...‘‘

بات پوری ہونے سے پہلے لیزا نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر تو جیسے ذلت کی انتہا ہو گئی۔ جیسے دماغ پھٹ گیا۔ وہ حلق پھاڑ کر چیختا ہوا اس پر لپکا۔ لیکن دوڑتا ہوا اس سے آگے نکل گیا۔ دروازہ کھول کر بیڈروم سے باہر آ گیا۔ اس کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ مسلح گارڈز دوڑتے ہوئے آ گئے۔ انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ کرنل اپنا لباس پھاڑ رہا تھا۔ لیزا کو گالیاں دے رہا تھا اور قسمیں کھا رہا تھا کہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

گارڈز نے قریب آ کر اسے لباس پھاڑنے سے روکنا چاہا تو انہیں یوں لگا جیسے کسی نے پیچھے سے کھینچ لیا ہو۔ وہ اپنے بڑے افسر کے قریب نہ جا سکے۔ اتنی دیر میں وہ بے لباس ہو گیا تھا۔ وہاں سے دوڑتا ہوا باہر جا رہا تھا۔

بنگلے کے باہر ماتحتوں نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ فون کے ذریعے اوپر والوں کو اطلاع دینے لگے کہ کرنل ووڈ پاگل ہو گیا ہے۔ ایسی غضب کی سردی میں لباس پھاڑ کر باہر آیا ہے اور ایک موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کہیں جا رہا ہے۔

تمام حکام اور آرمی کے افسران پریشان ہو رہے تھے

اور اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

تھوڑی دیر بعد ہی روڈنی ویلر اور دوسرے تمام حکام کو اطلاع ملی کہ کرنل ووڈ کو ایک جان لیوا حادثہ پیش آیا ہے۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور اس کی بے لباس لاش ایک گڑھے میں پائی گئی ہے۔

ویلر نے ایک تھرتھری سی لی پھر کہا۔ ''ہم نے بوستان سے کامران کو نہیں' اپنی موت کو بلایا ہے۔ آج ایک ہی دن میں یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ہمارے لیے آئے دن عذاب بنا رہے گا۔''

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ''یہ یہاں اپنے مزاج کے مطابق رہے گا۔ ہمیں اپنے مزاج کے مطابق ڈھلنے پر مجبور کرتا رہے گا۔ یعنی یہ رہا تو ہم اس کے تابعدار بن جائیں گے۔''

ایک نے کہا۔ ''ہماری بہتری اسی میں ہے کہ اس سے اسی لمحے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔''

یہ ایسے سوالات تھے' جو خوف طاری کر رہے تھے۔ ان سب کے دماغوں میں یہ بات تھی کہ کامران اپنے پُراسرار علوم کے ذریعے اس وقت بھی ان کی باتیں سن رہا ہے۔

ویلر نے کہا۔ ''اس سے دوستی نہیں کی جا سکتی اور دشمنی بھی نہیں کی جا سکتی۔ نہ وہ ہمارا تابعدار بنے گا' نہ ہم اس کے آگے جھکنا گوارا کریں گے پھر کیا کیا جائے؟''

اس نے تمام اکابرین پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔ ''یہ صدیوں پرانا کالے جادو کا علم دائمی اثر نہیں رکھتا ہے۔ جادو کی تاریخ پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اثرات ہمیشہ عارضی ہوتے ہیں یا پھر کسی بھی جادو کا توڑ جلد ہی ہو جاتا ہے۔''

اس نے کامل یقین سے کہا۔ ''میں نے کچھ انتظامات کیے ہیں۔ آپ حضرات مسٹر ہارپر ہوکس جیسے قابل فخر سائنس داں کو جانتے ہیں۔ وہ سائنس داں ہیں لیکن کالے علوم کی بھی معلومات اور مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے کالے علم کو فنا کر دیتے ہیں یا اسے کمزور اور بے دست و پا بنا دیتے ہیں۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''بے شک کامران نے یہاں آتے ہی خوف زدہ کیا ہے لیکن ہم خوف سے مرنے والے نہیں ہیں۔ لڑنے والے ہیں۔ مسٹر ہارپر کل صبح یہاں آ رہے ہیں اور وہ مستقل میرے باڈی گارڈ بن کر رہیں گے۔''

ربانی اور رحمانی ان کی باتیں سن رہے تھے۔ رحمانی نے کہا۔ ''ہم کامران کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ خطرات سے دوچار ہوتا رہے گا۔''

ربانی نے کہا۔ ''ہمیں اس کی جان کا خطرہ مول لینا نہیں چاہیے۔ ہم اسے جلد ہی بوستان لے آئیں گے اور اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھا کریں گے۔''

رحمانی نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے سونے اور آرام کرنے کا وقت ہو چکا ہے۔ یہاں سے چلو۔''

وہ دونوں سرمد ٹاؤن کی رہائش گاہ میں آ گئے۔ وہاں کے وقت کے مطابق رات کے دس بجے تھے اور وہ عادتاً گیارہ بجے سو جایا کرتے تھے۔ محنت و مشقت کے عادی تھے۔ بڑی تگ و دو میں زندگی گزار رہے تھے۔ تھکنا نہیں جانتے تھے۔ ابھی ایک گھنٹے تک جاگنا تھا۔ اس کے بعد نیند پوری کرنے والے تھے۔

انہوں نے تاباں سے فون پر رابطہ نہیں کیا۔ یہ یقین تھا کہ وہ سلطانہ یاقوت اور ہلالہ کے ساتھ اچھا وقت گزار رہی ہوگی۔

رحمانی نے حسب معمول ای میل چیک کی تو وہاں ورشا کا پیغام موجود تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''آج میرا جنم دن ہے۔ آج کے دن کنول کے پوتر (پاکیزہ) پتے پر میرا نو زائدہ وجود پایا گیا تھا اور میں ایک سوال بن گئی تھی۔ یہ سوال آج بھی ہے کہ کس نے مجھے پیدا کیا تھا؟ اور جو لوگ میری پیدائش کے ذمے دار تھے' وہ تلاش بسیار کے باوجود میلوں دور تک نظر کیوں نہیں آئے؟

میں کوئی عجوبہ نہیں ہوں۔ ہماری دنیا میں کتنے ہی سوالیہ بچے جنم لیتے رہتے ہیں۔ کبھی بھید کھل جاتا ہے کہ وہ کس گھر سے پھینکے گئے تھے۔ کبھی وہ آخری سانسوں تک سوال ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش کے اسباب اندھیرے میں ہی رہتے ہیں۔

ایسے تمام بچوں میں اور مجھ میں ایک واضح فرق ہے۔ تمام بچوں کو دنیا والوں سے چھپا کر کسی گٹر یا کچرا گھر میں پھینکا جاتا ہے۔ غلاظت کی پوٹ کو غلاظت میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن مجھے کنول کے مقدس پتے پر لا کر رکھ دیا گیا تھا۔ خواہ انسانی ہاتھوں سے خواہ قدرت کی رضا سے' مجھے پاک و مصفا جگہ پہنچایا گیا تھا۔

گرو وردھان نے میری ایسی پرورش کی جیسے پوجا کرتے رہے ہوں۔ انہوں نے یادداشت کی پوتھی میں لکھا

ہے کہ میں دیوی کا اوتار ہوں اور اس آتمالوک سے آئی ہوں جہاں سے صرف دیوی اور دیوتا آتے ہیں۔

یہ گرودیو کا سچا گیان ہو سکتا ہے یا محض ان کی عقیدت مندی... بہرحال انہوں نے مجھے آتما شکتی کے آخری مرحلے تک پہنچا دیا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ آج میں اپنے جنم دن میں انہیں دل کی گہرائیوں سے یاد کر رہی ہوں۔

آج کے دن تم دونوں مسیحاؤں کو بھی یاد دلا رہی ہوں کہ اس دنیا میں کیسے آئی تھی؟ خدا اپنے خاص بندوں سے کوئی خاص کام لینے کے لیے انہیں دنیا میں بھیجتا ہے۔ گرودیو نے اپنی پوتھی میں لکھا ہے کہ بھگوان نے مجھے بھی کسی خاص مقصد کے لیے اس سنسار میں بھیجا ہے۔ میں دین دھرم کا پرچار کر رہی ہوں۔ لیکن آج دین دھرم سے الگ مجھے ایک آگہی حاصل ہوئی ہے۔

اور آگہی کہتی ہے کہ ایک خاص مقصد کے لیے ہی مقدر نے مجھے تم دونوں تک پہنچایا ہے۔ میں تم دونوں کے لیے دنیا میں آئی ہوں۔''

رحمانی اس کی تحریر کو پڑھتے پڑھتے رُک گیا۔ ربانی سے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہے؟ ہمارے لیے دنیا میں آئی ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''آگے پڑھو۔''

اس نے آگے لکھا تھا۔ ''تم دونوں سے بنتی (التجا) کرتی ہوں کہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے میرے متعلق ایسی کوئی بات معلوم کرو جس کا اشارہ مجھے گیان دھیان سے' آتما شکتی سے اور گرودیو کی پوتھی سے مل رہا ہے۔ یعنی میں کون ہوں؟ کیسے پیدا ہوئی؟ تعجب ہے کہ اپنی پیدائش کے سلسلے میں کوئی آگہی نہیں مل رہی ہے اور نہ میری آتما شکتی کام آ رہی ہے۔''

آخر میں اس نے لکھا تھا۔ ''آج رات دس بجے اپنا ای میل چیک کروں گی۔ سونے سے پہلے مجھ سے دو باتیں کرلیں۔''

دس بج چکے تھے۔ رحمانی نے فوراً رابطہ کیا۔ ''عظیم بدھا کی بیٹی کو ربانی اور رحمانی کا سلام پہنچے۔''

اس کا جواب موصول ہوا۔ ''ایشور تم دونوں کو بھی سلامتی دے۔ میں نے ابھی ابھی کمپیوٹر آن کیا ہے۔''

رحمانی نے لکھا۔ ''ہماری طرف سے جنم دن کی بدھائی ہو۔ آج سارے سنسار میں کنول کے پتے خوشبو لٹا رہے ہوں گے انہیں بھی تمہارے وجود کا تحفہ ملا تھا۔''

ربانی نے لکھا۔ ''تم نے ابھی کہا ہے کہ ہم اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے ایسی کوئی بات معلوم کریں جس کا اشارہ تمہیں گیان دھیان سے' آتما شکتی سے اور گرو دیو کی پوتھی سے مل رہا ہے۔''

رحمانی نے تحریر کے ذریعے پوچھا۔ ''اور تم نے کہا ہے کہ تم ہمارے کام آنے کے لیے دنیا میں آئی ہو۔ پلیز وضاحت کرو' کس طرح ہمارے کام آؤ گی؟''

وہ بولی۔ ''ایک انار دو بیمار۔ ایک تاباں اور دو دیوانے۔ یہ مسئلہ کبھی حل ہونے والا نہیں ہے اور...'' اس کی تحریر ذرا رُک گئی پھر رواں ہوگئی۔ ''اور میں... صرف میں اسے حل کروں گی۔''

انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیسے...؟ نہ ہم میں سے کوئی تاباں کی طلب سے باز آئے گا' نہ تاباں کسی ایک سے محروم ہونا چاہے گی۔''

''میں ابھی کچھ نہیں کہوں گی۔ مجھے جواب دینے کے لیے مجبور نہ کرنا۔ ذرا صبر و تحمل سے انتظار کرو۔'' پھر اس نے لکھا۔ ''تم دونوں میرے لیے دیوتا سمان ہو۔ میری پیدائش میں کوئی بھید ہے تو وہ تم ہی معلوم کر سکتے ہو۔''

رحمانی نے کہا۔ ''یہ معلوم کرنے کے لیے اجنبیت کی دیوار گرانی ہوگی۔ فاصلے مٹانے ہوں گے۔''

''میں مانتی ہوں مگر شاید فاصلے مٹ نہیں سکیں گے۔ اگر مٹ بھی گئے تو میں نظر نہیں آؤں گی۔''

یہ چونکا دینے والی بات تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر رحمانی نے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ نظر کیوں نہیں آؤ گی؟ کیا ہماری طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں' میرا وجود سب کو نظر آتا ہے اور مجھ میں غائب ہو جانے والی شکتی نہیں ہے۔ لیکن مجھے گیان حاصل ہوا ہے کہ ایک خاص مدت تک میں تم دونوں کے سامنے نہیں آسکوں گی۔ تم میری صورت تو کیا میرا سایہ بھی نہیں دیکھ پاؤ گے۔''

ربانی اور رحمانی نے پھر ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھا اور کہا۔ ''یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ شہزادی ہلالہ کا وجود بھی ہم سے چھپا ہوا ہے۔ وہ سامنے نہیں آسکتی۔ یہ بھی رُوبرو نہیں آئے گی۔ یہ قدرتی آنکھ مچولی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

ربانی نے ورشا کو ہلالہ کا حوالہ دیتے ہوئے پوچھا۔ ''صرف ہم دونوں کے سامنے نہیں آسکو گی یا ہلالہ کی طرح تمام مردوں سے پردہ کرتی ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہالہ کی بات اور ہے۔ مجھ پر ایک نامعلوم سی قدرتی پابندی ہے کہ جب تک مجھے مکمل آتما شکتی حاصل نہ ہو تب تک میں تم دونوں کے سامنے نہ آؤں۔''

ایک نے پوچھا۔ ''صرف ہم دونوں سے پردہ کرو گی؟''

وہ بولی۔ ''ہاں... صرف آتما شکتی کی تکمیل تک...''

''ہمارے ذہن میں ایک بہت اہم سوال گونج رہا ہے۔''

''کیسا سوال...؟''

''ہماری زندگی میں جو پہلی تاباں آئی۔ اس کے بعد دوسری تاباں یعنی ہالہ پردے میں ملی۔ تم بھی پردے میں مل رہی ہو۔ کیا تم بھی تاباں کی ہم شکل ہو...؟''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''شاید تمہیں یقین نہیں آئے گا میں نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔''

انہوں نے بے یقینی سے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہی ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتی میری صورت، میرا ناک نقشہ کیسا ہے؟ گرو دیو نے بچپن سے پابندی عائد کی تھی۔ آتما شکتی کا پاٹھ پڑھانے سے پہلے تاکید کی تھی کہ جب تک مکمل شکتی حاصل نہ ہو میں آئینے کے سامنے نہ جاؤں۔ کبھی ٹھہرے ہوئے پانی میں بھی اپنا عکس نہ دیکھوں۔''

وہ ناقابلِ یقین بات کہہ رہی تھی۔ ایسا کبھی دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے آئینہ نہ دیکھنے کی قسم کھانے کے باوجود کبھی بھول سے بھی آئینہ نہ دیکھا ہو۔

یہ تو انسانی فطرت ہے۔ انسان پہلے اپنی صورت پر عاشق ہوتا ہے۔ دنیا کی تمام صورتوں پر اپنی صورت کو ترجیح دیتا ہے پھر جوانی میں کسی دوسری صورت پر عاشق ہوتا ہے۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''گرو دیو کی پوتھی میں یہ لکھا ہے کہ جس دن آتما شکتی مکمل ہوگی، اس دن میں پہلی بار آئینے میں اپنی صورت دیکھوں گی پھر تم دونوں کے رُوبرو آؤں گی۔''

''کیا گرو دو روحان کی پوتھی میں ہمارا ذکر ہے؟''

''تم دونوں کے نام نہیں لکھے ہیں صرف نجات دہندہ لکھا ہے۔ یہ پیش گوئی درج ہے کہ دو نجات دہندہ میری زندگی میں آئیں گے۔ ان کے آنے سے ہی شاید مجھے اپنی پیدائش کا بھید معلوم ہوگا۔''

''اور ہم تمہاری زندگی میں آ گئے ہیں۔''

''اسی لیے کہہ رہی ہوں' تم دونوں ہی مجھے میرے بارے میں بہت کچھ بتا سکو گے۔''

''تمہیں اندازہ ہے کہ آتما شکتی کی تعلیم کب تک مکمل ہوگی؟''

''میرے دھیان میں یہ بات آتی ہے کہ یہ تعلیم کا آخری سال ہے۔ میں اسی سال چند مہینوں میں یا چند ہفتوں میں آتما کی گہرائیوں سے اُبھر آؤں گی۔ تب میری تپسیا پوری ہوگی۔ دیویوں اور دیوتاؤں والی آتما شکتی حاصل ہوگی۔ اس وقت گرو دیو کی یہ بات سچ ہوگی کہ میں دیوی کا اوتار ہوں۔ پھر وہی ہوگا۔''

رحمانی نے بے تابی سے کہا۔ ''خدا جانے وہ دن کب آئے گا۔ تب تک پردہ داری رہے گی۔ صرف تحریر یا آواز کے ذریعے شناسائی رہے گی۔''

''ہاں صرف یہ بات نہیں ہے کہ میں خود دیکھنے کے لیے بے چین ہوں۔ اپنے آپ کو دکھانے کا جذبہ بھی مچلتا ہے کہ دوسرے دیکھیں اور بیان کریں کہ قدرت کی صناعی نے مجھے کتنی خوبصورتی سے تراشا ہے؟''

''آتما شکتی حاصل کرنے کے لیے ایسی پابندی کیوں عائد کی گئی ہے کہ خود کو بھی دیکھنے سے محروم رہو۔''

''تم نے اپنی ذات سے بے حد دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ ابھی بہت کچھ کہنے اور سننے کو رہ گیا ہے۔ بہر حال نیند بھی ضروری ہے ہم پھر بات کریں گے۔''

اس نے دوسرے دن رابطہ کرنے کا وعدہ کیا پھر رحمانی نے کمپیوٹر آف کر دیا۔ لیکن دونوں کے دماغ آن ہو گئے۔ اب نئی اور اُلجھانے والی باتیں سامنے آ رہی تھیں۔

ایک تو یہی ناقابلِ یقین اور عجیب سی بات تھی کہ ورشا نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی تھی۔ کبھی بھول کر بھی کسی آئینے کے سامنے سے نہیں گزری تھی۔ اس نے صرف پوجا پاٹ والی محدود زندگی نہیں گزاری تھی۔ وہ کمپیوٹر جیسے جدید علوم کی بھی حامل تھی اور کمپیوٹر صرف ایک دنیا میں ہی نہیں پوری کائنات میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ عجیب سی بات تھی کہ پوری کائنات کو دیکھنے والی نے اب تک اپنی صورت نہیں دیکھی تھی۔ یہ بات ان دونوں کے حلق سے نہیں اُتر رہی تھی۔ پھر ورشا نے دونوں سے گزارش کی تھی کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے ذریعے اس کی پیدائش کا راز معلوم کریں... وہ جھیل کنول کے پتے پر کہاں سے آ گئی تھی؟

کنول کے پاکیزہ پتے پر پہنچانے کا اشارہ یہی تھا کہ اس کا وجود پاکیزہ ہے اور وہ سچ مچ ایک دیوی کی طرح آسمان سے دھرتی پر اُتاری گئی ہے۔

یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ سوچتے سوچتے جماہی آنے لگتی ہے پھر نیند آ جاتی ہے۔ انہیں بھی معمول کے مطابق نیند آ رہی تھی۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کی سبز خواب آور سی روشنی تھی۔ دھیما دھیما سا خواب آور ماحول پُراسرار اور رومان پرور لگ رہا تھا۔ کسی کے آنے کی آہٹ ملنے والی ہو تو ماحول خود بخود رومان پرور ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

وہ برسوں سے اپنے وقت پر سونے کا عادی تھا۔ دن بھر کی تھکن نے اسے سُلا دیا۔ یا پھر نامعلوم ہاتھوں نے اسے تھپک کر نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔

خواب دیکھنے کے لیے سونا شرط ہے۔ وہ بھی سو گیا۔

ایسے وقت سپنے گیت سناتے ہیں۔ اسے گنگناتی ہوئی مترنم سی آواز سنائی دی۔ ”میں آ گئی ہوں۔ کیوں اس قدر دوڑتے ہو کہ تھک جاتے ہو۔ نیند کے مارے آنکھیں بھی نہیں کھلتیں؟“

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ دروازے پر ہلکی ہلکی سی جھنک رہی تھی۔ ایک خیال، ایک تصور رنگ رہی تھی۔

اس نے سوچا، وہ آ چکی ہے؟ یا محض خیال آیا ہے؟

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ دروازے سے چلتی ہوئی بل کھاتی ہوئی کمرے کے وسط میں آئی۔ اس کے آتے ہی کمرے میں بھینی بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔ اس نے گیروی رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ ماتھے پر ننھی سی بندیا چمک رہی تھی۔ سولہ سنگار نہیں تھا۔ وہ زیورات اور آرائشی سامان سے خالی تھی۔ صرف ایک چولی اور ساڑی میں اس کی سادگی غضب ڈھا رہی تھی۔

اور غضب ڈھانے کے لیے سو بات کی ایک بات یہ تھی کہ وہ تاباں تھی... تاباں...

خواہ پہلی ہو، دوسری ہو یا تیسری ہو۔ وہ ہو بہو تاباں تھی۔

وہ بیڈ پر سے اُتر کر اس کے رُوبرو ہوا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ”ہمارے درمیان فاصلہ ہے گا۔“

وہ بولا۔ ”ہاں جب تک اعتماد قائم نہ ہو فاصلہ رہتا ہے۔ لیکن تم کون ہو؟“

”وہی ہوں جو میری صورت کہتی ہے۔“

”یہ صورت والی اس وقت سلطانہ یاقوت کے محل میں بھی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا محبوب جس نام سے پکارے وہی میرا نام ہے۔“

”تمہارے والدین نے تمہارا کوئی تو نام رکھا ہوگا؟“

”میرے والدین نہیں ہیں اور تمہارے بھی نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو بتاؤ، وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟“

وہ چپ رہا۔ آج تک کسی نے ان دونوں سے نہ ولدیت پوچھی تھی، نہ ہی وہ اپنا شجرہ جانتے تھے۔ اپنے شناختی کارڈز کے مطابق وہ آدم ربانی اور آدم رحمانی کہلاتے تھے۔ اور ان کے پاس اس سوال کا جواب بھی نہیں تھا کہ ربانی اور رحمانی کی حیثیت سے ان کے شناختی کاغذات کیسے بن گئے تھے؟

اور یہ عجیب سی بات تھی کہ وہ خود اپنے متعلق بھی تجسس میں مبتلا نہیں ہوتے تھے کہ اس دنیا میں اچانک کہاں سے آ گئے ہیں؟ اور کیسے آ گئے ہیں؟

اس وقت بھی تیسری تاباں نے کہا۔ ”میں تو نہیں جانتی کہ کہاں سے آئی ہوں۔ کیا تم جانتے ہو، کہاں سے آئے ہو؟“

وہ چپ رہا۔ وہ بولی۔ ”یہ بات سب سے اہم ہے۔ یہ جاننا لازمی ہے کہ ہماری ابتدا، ہماری شروعات کیا ہے؟ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟“

ان مسیحاؤں کی زندگی کے اس موڑ پر ایک عجیب سی بات سامنے آئی۔ مہاتما بدھ کی جگنو بیٹی ورشا کی شروعات بھی گم تھی۔

تیسری تاباں بھی آ کر کہہ رہی تھی کہ اس کی شروعات بھی نامعلوم ہے۔ یہ واضح ہو رہا تھا کہ آنے والی ورشا ہے۔

وہ بولا۔ ”تسلیم کرو، تم ورشا ہو؟“

”ہاں میں ورشا ہوں۔“

”اور تم تاباں کی ہم شکل ہو۔“

”عظیم بدھا کی قسم، میں نہیں جانتی۔ میں نے بھی اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔ یہ جانتی ہوں اس کمرے میں آئینہ نہیں ہے۔ یہاں بھی خود سے چھپی رہوں گی۔“

”ابھی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ تاباں کی ہم شکل ہو۔ میں چشم دید گواہ ہوں۔“

”تمہاری گواہی معتبر ہے۔ میں یقین کرتی ہوں۔ پھر بھی آتما شکتی کی تکمیل تک آئینہ نہیں دیکھوں گی۔“

”میری زبان سے سن کر کیسا لگ رہا ہے کہ تم تاباں

ہو؟''

وہ رقص کے انداز میں گھوم کر بولی۔ ''میں مسرتوں سے بھر گئی ہوں۔ میں نے نہ دیکھتے ہوئے بھی تمہاری آنکھوں سے خود کو دیکھ لیا ہے۔ مجھے درست آگہی ملی تھی۔ میں تم دونوں کا مسئلہ حل کرنے دنیا میں آئی ہوں۔''

''مجھے تو یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آتا۔ اس معاملے میں بڑی پیچیدگیاں ہیں۔''

وہ اعتماد سے بولی۔ ''گرہیں جتنی بھی ہوں' وہ ایک ایک کرکے کھلتی چلی جائیں گی۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں۔''

رحمانی نے پوچھا۔ ''کیا جانتی ہو؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''یہی کہ تم جہاں سے آئے ہو' میں وہیں سے تمہارا پیچھا کرتی آئی ہوں۔''

وہ پھر چپ ہوگئی پھر بولی۔ ''اور ہم دونوں بے شک عالمِ ارواح سے آئے ہیں۔''

''یعنی یہ تمہارا اندازہ ہے۔ ایک مفروضہ ہے کہ میں نے اور ربانی نے کسی ماں کی کوکھ سے جنم نہیں لیا ہے اور تم بھی پیدائش کے بتدریج مرحلوں سے گزر کر نہیں آئی ہو۔ ہم تینوں بلے بلائے اچانک زمین پر آگئے ہیں۔''

''یہ خام خیالی یا مفروضہ نہیں ہے۔ میں جب مراقبے میں رہتی ہوں تو مجھے صاف دکھائی دیتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ایک نامعلوم سی دنیا میں ہوں۔''

''تم مراقبے کے دوران بصارت سے نہیں بصیرت سے دیکھتی ہو پھر وہ دنیا نامعلوم سی کیوں ہے؟ تم نے آس پاس کے ماحول کو دیکھا تو ہوگا؟''

شاید دیکھا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں ہے۔ میں تو صرف تمہیں دیکھتی ہوں۔ اسی لیے باقی سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ پتا نہیں یہ کیسے معلوم تھا کہ ہم بھی اس موجودہ دنیا میں آئیں گے اور اپنی خواہش کے مطابق یہاں بھی ہم ساتھ رہیں گے اور کبھی جدا نہیں ہوں گے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں ہے۔''

''اس لیے کہ تم بے وفا اور ہرجائی ہو۔ اس نامعلوم دنیا میں جسے میں عالمِ ارواح کہتی ہوں' وہاں تم تاباں پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ میں دعا مانگتی تھی کہ تمہارا دل تاباں سے پھر جائے۔ پھر جیسے دعا قبول ہوگئی۔ تاباں اس دنیا میں آنے کے لیے' پیدائشی مرحلوں سے گزرنے کے لیے ایک ماں کی کوکھ میں چلی گئی۔ اس طرح وہ تم سے بچھڑ گئی۔''

اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا قصہ کہانی سنا رہی ہو؟''

''یہ حقیقت ہے۔ تاباں کی روح ایک ماں کی کوکھ سے گزر کر اس دنیا میں آگئی۔ تم اس کے پیچھے قدرتی طور پر پیدائش کے مراحل سے گزر کر نہیں آسکتے تھے۔ کیونکہ میری تمہاری پیدائش غیر قدرتی ہونی تھی اور وہ ہو چکی ہے۔ ہم انسان ہیں لیکن انسانوں سے ذرا مختلف ہیں۔ ہم نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چشم زدن میں دنیا کے دوسرے حصے میں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے کام نمٹا کر واپس آجاتے ہیں۔ ارضی انسان ایک حد تک جسمانی قوت رکھتا ہے۔ ہم فولادی قوتوں کے حامل ہیں۔''

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بیڈ کے سرے پر آکر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ''یہ ہم جانتے ہیں' روح کا جسم اور چہرہ نہیں ہوتا۔ کوئی ناک نقشہ نہیں ہوتا۔ وہاں ہماری تمہاری اور تاباں کی صورتیں نہیں تھیں۔ ہم ایک دوسرے میں روحانی کشش محسوس کرتے تھے۔ یہ روحانی کشش تمہیں تاباں کے پیچھے اور مجھے تمہارے پیچھے لے آئی ہے۔''

وہ زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ''یہاں آکر آج دیکھ رہے ہو کہ میں اسی تاباں کی ہم شکل ہوں' جسے حاصل کرنے اس دنیا میں آئے ہو۔ اب بولو مجھ میں اور اس میں کیا فرق ہے؟''

وہ قریب آکر اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کوئی فرق ہوگا۔ تب بھی خدا کا شکر ادا کروں گا۔ دوسری تاباں کا یہ وجود ہماری ٹیک نامی بحال کرے گا۔ ایک انار اور دو بیمار نہیں ہوں گے۔ ہمیں اپنے اپنے نصیب کی تاباں مل رہی ہے۔''

وہ بڑے جذبے سے ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ''میں تمہیں چھو کر محسوس کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے طلب کرنے والے ہاتھ کو بڑے جذب سے دیکھا پھر کہا۔ ''میں تمہاری ہوں۔ میرے وجود کا ذرہ ذرہ تمہارا ہے۔ لیکن ابھی تشنگی رہنے دو۔''

رحمانی کی نظریں سوالی ہوگئیں۔ ''تشنگی...؟''

وہ بولی۔ ''میں جب مراقبے میں ڈوب جاتی ہوں' تب مجھے آگہی ملتی ہے اور میں اس کے مطابق عمل کرتی ہوں۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگی۔ ''ہمیں اس دنیا میں اپنی پیدائش کا راز معلوم کیے بغیر.... ازدواجی زندگی کی ابتدا نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں فاصلہ رکھنا چاہیے۔ تشنگی رہنے دو۔''

ان کے سامنے کئی سوالات تھے اور جواب ایک سوال کا بھی نہیں تھا۔ وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تاباں نے بیڈ کے سرہانے آکر سر گھما کر اسے دیکھا پھر جھک کر اپنی پیشانی تکیے پر ٹیک دی۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ اس وقت سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید اس نے تکیے کو بوسہ دیا تھا۔

ایسے وقت اذان سنائی دی۔ رحمانی نے ایک ذرا بے چینی محسوس کی پھر یکبارگی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بیڈ پر چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا اور دور مسجد کے مینار سے مؤذن کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ ''آؤ اپنی نماز کے لیے آؤ۔ دنیا کو بھلاؤ۔ آؤ اپنی بہتری کے لیے آؤ۔ بہتری وہی معبود دلاتا ہے۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں... وہ نہیں تھی۔ اس کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو بھی گم ہو گئی تھی۔ کمرا اس کے وجود سے خالی ہو گیا تھا۔

یہ کیا تماشا ہے؟ کیا وہ خواب میں آئی تھی؟

جیسے بھی آئی تھی۔ آکر جا چکی تھی۔ آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا...

وہ بُری طرح اُلجھ گیا۔ اس کے حالات گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے۔

یا حیرت...! حالات پھر بدل گئے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گیا۔ وہ پھر آ گئی تھی۔ اس کے بیڈ پر تھی۔

وہ تڑپ کر آگے بڑھ کر بیڈ پر اوندھے منہ گر پڑا۔ بعض اوقات گرتے پڑتے رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا... وہ تو نہیں تھی۔

مگر تھی۔ تکیے پر کسی کی بند یا چمک رہی تھی۔

☆☆☆

کامران کو رہائی مل گئی۔ اسے تھانے کے لاک اپ سے نکال کر ایک آرام دہ رہائش گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ وہائٹ اسکائی کے حکام عارضی طور پر جھک گئے تھے اور جھکنے سے پہلے آئندہ اسے جھکائے رکھنے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ وہ جلد ہی ان منصوبوں پر عمل کرنے والے تھے۔

کامران کے دونوں باڈی گارڈز کو بھی رہائی مل چکی تھی۔ وہ بھی اسی رہائش گاہ میں آ گئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے لیزا بھی آ گئی۔ اس نے کامران کو بتایا کہ بوڑھا کرنل ووڈ اس کی عزت کو کھلونا بنانے آیا تھا لیکن خود ہی تماشا بن گیا تھا۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ لیزا اس کے سامنے فرش پر گھٹنے ٹیک کر بولی۔ ''تم نے تو کمال کر دیا۔ جب وہ مجھے ہاتھ لگانے میں ناکام ہو کر پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے پھاڑ رہا تھا تب ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم اپنے جادو منتر سے میری عزت بچا رہے ہو۔''

ایسا کہتے وقت اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تم عزت کے رکھوالے ہو۔ میں تمہیں سلام کرتی ہوں۔''

وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ اپنے آنسو پونچھ لو۔''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے رو رہی ہوں کہ ایک کمزور لڑکی ہوں۔ مجھے اغوا کیا گیا۔ بازار میں بیچنے کے لیے لایا گیا۔ تم اس جہاز میں نہ آتے تو میرا کیا بنتا؟ میں اب تک دو کوڑی کی ہو چکی ہوتی۔''

''یہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ اس معبود نے مجھے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ اس لیے میں تمہاری حفاظت کر رہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''جب ہم جہاز میں تھے تو میں نے تمہاری مہربانی سے اپنے والدین کو فون پر اطمینان دلایا تھا کہ میں عزت آبرو کے ساتھ محفوظ ہوں۔ وہ تمہیں دعائیں دے رہے تھے۔''

وہ چپ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت کیا بولنا چاہیے؟ وہ بولی۔ ''ایک بات کہوں؟''

''ہاں۔ کہو۔''

''تم ناراض ہو جاؤ گے۔''

وہ سنجیدگی سے مسکرا کر بولا۔ ''گالی تو نہیں دو گی نا؟''

''وہ بعض باتیں اتنی سچی اور کھری ہوتی ہیں کہ گالی لگتی ہیں۔'' لیزا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھکا کر کہا۔ ''میں بازار میں بِک جاتی اور لٹ جاتی۔ تم نہ بچاتے تو بوڑھا کرنل مجھے برباد کر دیتا۔ میرے محسن! میرے محافظ! ایک داشتہ بھی لوٹ مار کی چیز ہوتی ہے۔''

کامران کے دماغ کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ فوراً ہی یہ بات سمجھ میں آیا کہ وہ لیزا کو پناہ دے کر داشتہ بنانے والا ہے۔ عزت تو وہ بھی لوٹے گا۔ کیا محافظ دوسروں سے جان بچا کر خود جان لیتے ہیں؟ اور عزت لُوٹنا تو جان لینے سے بڑا جرم ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے دوسری طرف گھوم گیا۔ تیزی سے چلتا ہوا بیڈ روم کے دروازے پر آیا۔ پھر بولا۔ ''حالات سے زیادہ تمہاری باتوں نے تھکا دیا ہے... جاؤ، سو جاؤ۔''

اس نے بیڈ روم میں آ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ لائٹ آف کر کے بستر پر گر پڑا۔ وہ اپنی گھر والی کے ساتھ ایک سیدھی سادی سی زندگی گزارتا آیا تھا۔ اب حالات بدل رہے تھے۔ دولت اور شہرت مل رہی تھی۔ وہ سپر پاور پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس لیے ذرا موج مستی کے لیے دل مچلنے لگا تھا۔ مگر لیزا نے اس کی فطری شرافت کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اچانک پتھر آ کر لگے تو تکلیف ہوتی ہی ہے۔ وہ تکلیف سے کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔

☆☆☆

ربانی اور رحمانی اپنے معمول کے مطابق صبح بیدار ہوئے پھر مسجد میں جا کر نماز ادا کی۔ واپسی پر رحمانی نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''وہ آئی تھی۔''

ربانی نے مسکرا کر کہا۔ ''مجھے یقین تھا' آئے گی اور میرا خیال تھا کہ آئے گی تو پھر نہیں جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''ہمارے نصیب سے ایک نہیں تین تاہان آ گئیں لیکن ان میں سے ایک بھی ہمارے نام نہیں ہو رہی ہے۔''

''تم اس کی بات کرو جو رات آئی تھی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ پھر آ کر چلی کیوں گئی؟''

وہ بڑی خستگی سے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''کیا بتاؤں' کیوں چلی گئی؟ پہلے یہی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ وہ سچ مچ آئی تھی۔''

ربانی نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا...؟ کیا وہ پہلی رات کی طرح خواب میں آ کر گئی ہے؟''

''ہاں... مگر...'' رحمانی نے کہا پھر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مٹھی باہر نکالی اور اس کے سامنے کھول دی۔ اس کی ہتھیلی پر ایک گول سی بندیا چمک رہی تھی۔

ربانی نے پوچھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہ اس کے ماتھے کی بندیا ہے۔ جب وہ آئی تھی تو اس کی پیشانی پر چمک رہی تھی۔ اسے میرے تکیے پر چھوڑ گئی ہے۔''

''یوں ثابت ہو رہا ہے کہ وہ حقیقتاً آئی تھی۔ درشا نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تاہان بھول بھلیاں ہے۔ دیکھ لو کہ ہم بھول بھلیوں گزر رہے ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے پھر رحمانی نے کہا۔ ''ہمارا اہم مسئلہ ولدیت کا ہے اور ہم کبھی نہیں سوچتے کہ ہمارے والدین کون ہیں؟''

ربانی نے کہا۔ ''ہاں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہم نوزائیدہ بچوں کی طرح نہیں' ایک دم سے کیسے جوان ہو کر اس دنیا میں آئے ہیں؟''

''ایسا کبھی نہیں ہوتا اور ایسا ہو رہا ہے تو اس کے پیچھے پردہ کوئی بات ہوگی' کوئی بھید ہوگا۔''

''حیرانی تو یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں نہ سوچتے ہیں نہ کبھی تجسس میں مبتلا ہوتے ہیں۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔

دونوں نے سر اٹھا کر چھت کو دیکھا۔ گویا آسمان کو دیکھا اور خاموشی سے پوچھا۔ ''یا اللہ ہم عجوبہ کیوں ہیں؟''

رحمانی نے کہا۔ ''اب لگتا ہے جیسے ہمارے دماغ کو لاک کر دیا گیا ہے۔ تاکہ ہم اپنی صحیح ہسٹری معلوم نہ کر سکیں۔''

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کسی طاقت نے ہمیں سحر زدہ کر دیا ہے؟ اسی لیے اپنے بارے میں صحیح حقائق سے بے خبر رہتے ہیں۔''

''اگر کسی سے سحر زدہ نہیں ہیں تو ہمیں اپنی پیدائش کا راز معلوم کرنا چاہیے۔''

''طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے دوسری مصروفیات کم کریں گے۔ تب اپنے بارے میں کھوج لگا سکیں گے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''سرمد ناؤن کی مصروفیات بڑی حد تک کم ہو گئی ہیں۔ ہمیں دوسری تیسری تاہان نے الجھایا ہوا ہے۔ ان الجھنوں کو تو لازمی سلجھانا ہوگا۔''

''معظم خان' اعظم خان اور روڈنی ویلر جیسے مخالفین سے معرکہ جاری رہے گا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی نہ جانے کب تک مصروف رہنا ہوگا؟''

''ہم نے کامران کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے۔ اس کی حفاظت اور سلامتی کے لیے بار بار اُدھر جانا پڑتا ہے۔ اگر اسے سرمد ناؤن لے آئیں اور اسے اپنی پناہ میں رکھیں تو ہماری مصروفیات خاصی کم ہو جائیں گی۔''

''ہاں۔ یہ فکر اور اندیشہ نہیں رہے گا کہ وہ کبھی ہماری نادانی میں یا ہماری غفلت سے مارا جائے گا۔''

''تو پھر چلیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

وہاں فی الحال کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ سب ہی سکون سے تھے۔ کیونکہ دوست اور دشمن سب ہی تھوڑی دیر پہلے نیند سے بیدار ہوئے تھے۔ نہا دھو کر کھا پی کر تازہ دم ہو رہے تھے اور یہ ثابت کر رہے تھے کہ جب تک آدمی سوتا رہتا ہے تب تک

دنیا میں امن وامان قائم رہتا ہے۔

رحمانی، کامران کی خیریت معلوم کرنے آیا۔ وہ لیزا کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے چائے پی رہا تھا۔ لیزا نے کہا۔ ''کل رات مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں نے تمہاری عمر کا حساب کیا تھا۔ ایک طرح سے تمہیں بڑھاپے کا احساس دلایا تھا۔ تم ناراض ہوگئے ہو؟''

وہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولا۔ ''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں۔''

''پھر خاموش کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟''

''تمہاری کل کی باتوں نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ میں سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ میں کیا ہوں...؟ یہ تو نہیں ہوں جو نظر آرہا ہوں۔''

وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں پتا ہے، میں کوئی عامل، جادوگر نہیں ہوں۔ میں جنتر منتر کچھ نہیں جانتا۔ میں کبھی کسی پر جادو کرہی نہیں سکتا۔''

وہ بے یقینی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''تم کسی پر جادو نہیں کرسکتے۔ پھر یہ سپر پاور کہلانے والے حکمران تمہارے دباؤ میں کیوں ہیں؟ کیوں تمہیں سر پر بٹھا رہے ہیں؟''

''وہ کسی وقت اچانک گرادیں گے۔ کسی دن یہ بھید کھلے گا کہ کوئی مؤکل کوئی جادوگر میرے پاس آتا ہے۔ وہ دیوار پر جو لکھتا ہے، میں اس پر عمل کرکے جادوگر کہلانے لگتا ہوں۔ بہرحال میری اس بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔''

''میں تو بھی یقین نہیں کروں گی۔''

''میں مؤکل کا انتظار کررہا ہوں۔ وہ آئے گا تو اس سے کہوں گا' مجھے تماشا نہ بنایا جائے۔ اگرچہ اس کی مہربانیوں سے لاکھوں روپے کما رہا ہوں۔ آئندہ کروڑوں کما سکتا ہوں لیکن دماغی سکون نہیں ہے۔ ہر وقت اندیشوں میں گھرا رہتا ہوں۔''

''یہ تمہاری عجیب سی پریشانی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔''

''یہ سمجھو کہ میں ایک سیدھا سادہ سا نجومی تھا۔ ایک محبت کرنے والی بیوی کا شوہر اور پیارے پیارے بچوں کا باپ۔ یہاں دولت کماتے ہی بیوی کی محبت اور وفاداری بھول کر تمہیں داشتہ بنانے کا ارادہ کرلیا۔''

وہ ندامت سے بولی۔ ''میں درست سمجھ رہی ہوں۔ میری کل کی بات بُری لگی ہے۔''

''ہاں کل بُری لگی تھی۔ آج اچھی لگ رہی ہے۔ تم نے اپنی عمر بتائی تھی کہ اٹھارہ برس کی ہو۔ میری ایک بیٹی ستائیس سال کی ہے۔ میرے نواسے نواسیاں ہیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ایک اور بیٹی سترہ کی ہوچکی ہے۔ اسے جلد ہی سہاگن بنانا ہے۔'' اس نے بڑی محبت سے بڑے جذبے سے لیزا کو دیکھا پھر کہا۔ ''میری وہ بیٹی کنیز فاطمہ ابھی میرے سامنے بیٹھی ہے۔''

لیزا نے چونک کر اسے دیکھا۔ کامران نے اس کے ہاتھ کو پیار سے تھپتھپایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر وہاں سے اٹھی۔ پھر اس کے پاس آکر فرش پر بیٹھ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اچانک ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

وہ لڑکی جو شیطانی خواہشات کے میلے میں بکنے والی تھی۔ اسے اچانک عزت اور سلامتی مل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کس طرح محافظ فرشتے کا شکریہ ادا کرے؟

کامران نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ''میں تمہارے آنسوؤں میں چھپی مسرتوں کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ آنسو میرے لیے بہت اہم ہیں۔ یہ مجھے میری پیار کرنے والی بیوی کے پاس لے جانے والے ہیں۔''

رحمانی ایک طرف بیٹھا یہ حیا پرور منظر دیکھ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا۔ ''جیو کامران! تم نے دل خوش کردیا ہے۔''

پھر اس نے دیوار پر تحریر پیش کی۔ کامران نے اسے پڑھا۔ وہاں لکھا تھا۔ ''تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم بیوی بچوں کے پاس جاؤ گے اور ایک خوش حال گھریلو زندگی گزارو گے۔ یہ مؤکل ہمیشہ تمہاری بہتری چاہے گا۔''

کامران نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

☆☆☆

ربانی، رو ڈنی ونبر کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ روٹین کے مطابق ناشتا کررہا تھا اور ان سے کہہ رہا تھا۔ ''کامران کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ اس نے جگ کے ذریعے مجھے اپنے ساتھ لپیٹ رکھا ہے۔ یہ کیسی بات ہے کہ اسے کوئی سزا دی جاتی ہے تو وہ سزا مجھے بھی ملتی ہے۔''

بیوی نے ناگواری سے کہا۔ ''آپ اسے گولی مار دیں۔ قصہ ختم ہوجائے گا۔''

''اس کے مرتے ہی تمہارا قصہ بدل جائے گا' تم بیوی سے بیوہ کہلانے لگو گی۔''

بیٹے نے کہا۔ ''ڈیڈ! اس سے دوستی رکھیں پھر اس کی کمزوریوں سے کھیل کر اس سے نجات حاصل کریں۔''

''شاباش! تم میرے بیٹے ہو۔ میری طرح سوچتے ہو۔ میں یہی کرنے والا ہوں۔''

وہ ناشتا کرنے کے بعد اپنے چیمبر میں آیا۔ وہاں اس کے چند مشیر موجودہ حالات پر بحث کر رہے تھے۔ اس نے پی اے کو حکم دیا کہ ہارپر ہوکس سے فون پر رابطہ کرائے۔ ایک مشیر نے کہا۔ ''ہمارے سائنس داں ہارپر ہوکس کو کالے جادو پر بھی عبور حاصل ہے۔ ہمیں امید ہے وہ آتے ہی کامران کے جادو کا ایسا توڑ کریں گے کہ وہ دُم دبا کر یہاں سے بھاگ جائے گا۔''

دوسرے مشیر نے کہا۔ ''وہ بھاگے یا مر جائے۔ ہمارے ویلر صاحب کو اس سے نجات ملنی چاہیے۔''

ویلر نے کہا۔ ''میں نے بھی بہت کچھ سنا ہے۔ اس کے پاس چند ایسی مشینیں ہیں' جن کے ذریعے وہ پاتال میں چھپے جادوگروں تک پہنچ جاتا ہے۔''

مشیر نے کہا۔ ''سائنس کے سامنے جادو ہیچ ہے۔ ہارپر ہوکس آئے گا تو ہم یہ دلچسپ تماشا دیکھیں گے کہ کس طرح سائنسی علوم کے ذریعے پُراسرار علوم کا توڑ ہوگا۔''

اسی وقت پی اے نے انٹرکام پر کہا۔ ''سر! مسٹر ہارپر ہوکس کی کال ہے۔''

ویلر نے فوراً ہی انٹرکام کا بٹن دبایا۔ پھر کہا۔ ''یس مسٹر ہوکس! میں بول رہا ہوں۔ آپ یہاں کب تک آئیں گے۔''

ہوکس نے کہا۔ ''پلیز آپ ٹی وی آن کریں۔ ہم اسکائپ کے ذریعے ایک دوسرے کے رُوبرو رہ کر تفصیلی گفتگو کرسکیں گے۔''

ویلر نے اس کی فرمائش کے مطابق اسکائپ پر رابطہ کیا۔ تب وہ ایک دوسرے کو رُوبرو دیکھنے لگے۔ ہوکس بہت ہی عمر رسیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ ''تھینک یو مسٹر ویلر! میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ بھی مجھے دیکھ رہے ہیں۔ یوں سمجھیں کہ میں وعدے کے مطابق آپ کے پاس آگیا ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں' آپ بنفسِ نفیس یہاں تشریف لائیں۔''

''معذرت چاہتا ہوں۔ میری مصروفیات اچانک ہی بڑھ گئی ہیں۔ میں ابھی یہ لیبارٹری چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکوں گا۔ چونکہ آپ کا کام بھی میری موجودہ مصروفیات کے مطابق ہے۔ اس لیے وقتِ ضرورت آپ سے اسی طرح رابطہ رکھوں گا۔''

''چلیں اسی طرح رابطہ رہے۔ یہ بتائیں کامران کو زیر کرنے اور اسے تابعدار بنائے رکھنے کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں۔''

ہوکس کے پیچھے دیوار پر ایک بڑا سا اسکرین تھا۔ اس پر کامران کی بڑی سی تصویر اُبھر آئی۔ ہوکس نے کہا۔ ''میں نے اپنی ایک ہسٹری... مشین سے معلومات حاصل کی ہیں۔ کل سے اب تک اس کے ساتھ جو ہوتا رہا' وہ یہ ہے کہ...

اسے یہاں آتے ہوئے اغوا کیا گیا۔ وہ اپنے پُراسرار علوم سے خود کو اغوا ہونے سے بچا سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کئی گھنٹوں تک ایک مجبور اور بے بس کمزور سا قیدی بنا رہا۔ جو خطرناک اور زبردست جادوگر ہوتے ہیں' وہ دشمنوں کی گرفت میں آنے کی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ پھر وہ کاسترو کی قید سے نکل کر آپ کے پاس آیا۔ آپ نے بھی اس سے مجرموں جیسا سلوک کیا۔ لیزا اور... بڑی گارڈز کو چھین لیا۔ یہاں بھی اس نے ذلت برداشت کی... کیوں کی؟

کیا وہ ان تمام لمحات میں پُراسرار علوم سے محروم ہوگیا تھا یا وہ بلیک میجک جانتا ہی نہیں ہے...؟

میری ہسٹری... مشین نے اس کا ایک مکالمہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ جو کرتا ہوتا ہے' وہ میرا موکل کر گزرتا ہے۔''

وہ جو اردو زبان میں بولتا تھا' اسے آپ سب منتر سمجھتے تھے۔ اس کا ترجمہ میری مشین نے سنایا ہے۔ وہ منتر نہیں پڑھتا تھا' پریشان ہو کر اپنے موکل کو پکارتا رہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جادو ٹونے کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔ جادو منتر کا ایک لفظ ایک حرف بھی نہیں جانتا ہے۔''

رو ڈالی ویلر نے شدید حیرانی سے ہارپر ہوکس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وہ جادو نہیں جانتا ہے...؟ اگر نہیں جانتا ہے تو کوئی موکل اس کا تابعدار کیسے بن گیا ہے؟''

ہوکس نے کہا۔ ''اگر کوئی موکل اس کا تابعدار ہوتا تو مصیبتوں میں فوراً اس کے کام آتا۔ اسے اغوا ہونے اور تمہارے تہ خانے کے سیل میں جانے کی زحمتوں سے دوچار نہ ہونے دیتا۔''

ویلر نے پوچھا۔ ''یہ کیا معما ہے؟ جب وہ پُراسرار علوم نہیں جانتا ہے تو کوئی موکل اس کی مدد کے لیے آپ ہی آپ کیوں آجاتا ہے؟ پلیز ہمیں سمجھائیں۔''

ہوکس کے پیچھے اسکرین پر ایک عجیب ساخت کی مشین دکھائی دی۔ وہ بولا۔ ''یہ مشین ایک سچا آئینہ ہے۔ یہ جھوٹ کو ظاہر کردیتی ہے۔ اس کے آئینے میں تمام جادو

گروں کے چہرے نظر آجاتے ہیں۔ کامران کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ وہ کوئی وچ ڈاکٹر (جادوگر) نہیں ہے۔ صرف ایک نجومی ہے۔"

ویلر نے کہا۔ "تو پھر اصل جادوگر اس کا مؤکل ہوگا۔ تمہاری اس مشین میں اس مؤکل کی تصویر نظر آنی چاہیے۔"

اصل کمال دکھانے والا ربانی وہاں بیٹھا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے رحمانی کو آواز دی۔ "فوراً یہاں آؤ۔ کامران کا بھید کھل رہا ہے۔ میرا خیال ہے، ہمارے بارے میں بھی کوئی انکشاف ہونے والا ہے۔"

رحمانی نے وہاں پہنچ کر ویلر کے ٹی وی اسکرین پر ہارپر ہوکس کو دیکھا، وہ کہہ رہا تھا۔ "بے شک کامران کے پاس آنے والا مؤکل ہی دراصل جادوگر ہے۔ وہ کامران کو آلۂ کار بنا کر خود کو آپ لوگوں سے چھپا رہا ہے۔"

ویلر نے کہا۔ "تعجب ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے آپ کو ہم سے کیوں چھپا رہا ہے؟"

ایک مشیر نے کہا۔ "آپ کی یہ مشین جادوگروں کو بے نقاب کرتی ہے۔ کیا اس مؤکل کہلانے والے جادوگر کا چہرہ دکھا رہی ہے؟"

ہوکس نے کہا۔ "میں کئی بار کوشش کر چکا ہوں۔ اس مشین کے آئینے میں دو انسانی خاکے اُبھرتے ہیں لیکن ان کی صورت اور جسمانی اعضا نظر نہیں آتے۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "اور وہ دو خاکے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کامران کے پاس ایک نہیں دو مؤکل آتے ہیں۔"

ربانی اور رحمانی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رحمانی نے کہا۔ "یہ تو بڑا ہی باکمال سائنس داں ہے۔ ایک مشین کے ذریعے ہم تک پہنچ رہا ہے۔"

ہوکس کہہ رہا تھا۔ "وہ دونوں مؤکل جادوگر نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو اس مشین کے آئینے میں ان کی صورتیں نظر آجاتیں۔"

ویلر نے کہا۔ "آپ کی باتیں اُلجھا رہی ہیں۔ آپ کہتے ہیں، کامران جادوگر نہیں ہے پھر یہ کہتے ہیں کہ اس کے دو مؤکل بھی جادوگر نہیں ہیں۔ تو پھر کس نے مجھے کار میں پھرتو انکلٹ میں بند کیا تھا۔ کامران کو ہمارے آہنی ریکارڈ روم کی خفیہ فائلوں کے بارے میں کیسے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا یہ سب جادو نہیں ہے؟"

ہوکس نے کہا۔ "وہ دونوں جادوگر نہیں ہیں۔ وہ جو کرشمے دکھا رہے ہیں ان کا تعلق یا تو روحانیت سے ہے یا وہ قدرتی طور پر پُراسرار علوم کے حامل ہو گئے ہیں۔"

ویلر نے کہا۔ "مسٹر ہوکس! جسٹ اے منٹ۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ دو ہیں اور کامران کی پشت پر رہ کر ہماری مخالفت میں کرامات دکھا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ تو صاف ظاہر ہے۔ اب آپ ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ دونوں آپ سے دشمنی کیوں کر رہے ہیں؟"

"میری سمجھ میں آگیا ہے۔ وہ آدم ربانی اور آدم رحمانی ہیں۔ وہ ہندوستان کے حکمرانوں اور ہمارے دشمن ہیں۔ بڑی مکاری سے کامران کو ہمارا عامل کامل بنا کر ہمیں بیوقوف بناتے آرہے ہیں۔"

ہوکس نے کہا۔ "میرا ذہن ان کی طرف نہیں گیا۔ جبکہ میں یہ سن چکا تھا کہ کیمروں کے ذریعے ان کی تصویریں اُتاری نہیں جا سکتیں۔ میری مشین میں بھی اسی لیے ان کے چہرے نظر نہیں آئے کہ وہ ربانی اور رحمانی ہیں۔"

"جی ہاں، وہی ہیں۔ میں پورے یقین سے کہتا ہوں۔ وہ بے نقاب ہو چکے ہیں۔ آپ فوراً ان کے جادو کا توڑ کریں۔"

"آپ بھول رہے ہیں۔ ابھی میں کہہ چکا ہوں کہ وہ جو کر رہے ہیں، وہ جادو نہیں ہے اور جب جادو نہیں ہے تو میں اس معاملے میں کیا کر سکوں گا؟ وہ کوئی اور طرح کی غیر معمولی صلاحیتیں آزما رہے ہیں۔"

ہوکس اپنی جگہ سے اُٹھ کر ایک مشین کے پاس آیا پھر اسے آپریٹ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اسپیس ٹریولر (خلا نورد) مشین ہے۔ میں اس کے ذریعے ستاروں، سیاروں اور خلائی مخلوقات کے بارے میں کھوج لگاتا رہتا ہوں۔"

وہ بڑے فخر سے بولا۔ "مسٹر ویلر! میں بہت ہی حیرت انگیز کامیابی حاصل کرنے والا ہوں۔ مجھے ایک ایسی خلائی مخلوق کا سراغ مل رہا ہے، جو ہم انسانوں جیسی ہے اور ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ دیکھیں۔ میرے خلائی کیمرے نے ایک غیر ارضی مخلوق کو کھینچ لیا ہے۔"

ہوکس نے اس مشین کی اسکرین کو آن کیا۔ ربانی اور رحمانی فوراً ہی اس لیبارٹری میں پہنچ گئے جہاں ہوکس اس مشین کے ذریعے ایک خلائی مخلوق کو پیش کر رہا تھا۔

اسکرین پر ایک انسانی خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس انسان کا چہرہ و دیگر جسمانی اعضا اور لباس وغیرہ نظر نہیں آرہے تھے۔

ہوکس کہہ رہا تھا۔ "مسٹر ویلر! توجہ سے دیکھیں۔ یہ انسانی خاکہ کبھی سمٹ جاتا ہے کبھی پھیل جاتا ہے۔ کبھی

غائب ہو جاتا ہے اور کبھی نمودار ہو جاتا ہے۔"

ربانی اور رحمانی اس مشین کے سامنے ہوکس کے دائیں بائیں کھڑے اس خاکے کو دیکھ رہے تھے۔ ویلر نے کہا۔ "بے شک یہ ایک انسانی خاکہ ہے۔ لیکن صورت نظر نہیں آرہی ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ یقیناً صورت شکل والا ہوگا۔ لیکن یہ بھی ربانی اور رحمانی کی طرح کیمرے کی گرفت میں نہیں آرہا ہے۔"

ویلر ایک دم سے چونک کر صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "کیا وہ انسانی خاکہ ربانی اور رحمانی کی طرح ہے؟"

"ہاں۔ ان دونوں کی تصویریں بھی آج تک کوئی اُتار نہ سکا۔ میں اس کی تصویر اُتارنے میں ناکام رہا ہوں۔"

ویلر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹی وی اسکرین کے پاس آکر اسپیس ٹریولر مشین کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ربانی اور رحمانی اس خلائی انسان کی طرح کیوں ہیں؟ مائی گاڈ...! کیا ان دونوں کا تعلق اس خلائی انسان سے ہے؟"

ہوکس نے اس مشین کو آپریٹ کرتے ہوئے اس خاکے کو مختلف زاویے سے دکھاتے ہوئے کہا۔ "ان دونوں میں اور اس خلائی مخلوق میں بڑی مماثلت ہے۔ یہ کیمرے کی گرفت میں نہیں آتا۔ وہ دونوں بھی اس خاکے کی طرح کبھی غائب ہو جاتے ہیں اور کبھی حاضر ہو جاتے ہیں۔"

"پلیز مسٹر ہوکس! کچھ اور معلوم کریں۔ ابھی تو یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ ربانی اور رحمانی اس خلائی انسان کی طرح ہیں۔ ان تینوں میں ایک جیسی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ پلیز بتائیں یہ مشین اور کیا بتا رہی ہے؟"

"فی الحال اتنی ہی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ میں تحقیق میں مصروف ہوں۔ مجھے امید ہے' آئندہ بہت کچھ معلوم کرسکوں گا۔"

"آپ پہلی فرصت میں معلوم کریں کہ ربانی اور رحمانی کی غیر معمولی صلاحیتوں کا توڑ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ آئندہ ہم کس طرح اپنا بچاؤ کرسکتے ہیں؟"

وہ ان سے بول رہا تھا۔ ربانی اور رحمانی خاموش کھڑے ہوئے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے ہوکس اور مشین کی کارکردگی کو دیکھ رہے تھے۔

وہ مشین واضح طور پر کہہ رہی تھی کہ ان دونوں کا تعلق اس خلائی مخلوق سے ہے اور وہ مخلوق جہاں کی پیداوار ہے وہاں سے ان کی پیدائش کا بھی تعلق ہوگا۔

پچھلی رات تیسری تاباں نے اپنی اور ان کی پیدائش کے سلسلے میں کئی سوالات اُٹھائے تھے۔ اب ان کا جواب ایسے عجیب انداز میں مل رہا تھا کہ وہ حیران ہو رہے تھے۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خلائی انسان کی طرح اس ارضی دنیا کے باہر سے خلا کے کسی حصے سے آئے ہوں گے۔

وہ دونوں بار بار ہوکس میں دلچسپی لینے لگے۔ انہوں نے بڑی دیر تک لیبارٹری میں رہ کر اس کی مصروفیات کو دیکھا۔ اس کی مختلف مشینوں کی کارکردگی کو دیکھا۔ انہیں خود آپریٹ کرنا سیکھا۔ فی الحال یہی معلوم ہوا کہ ان مشینوں نے اب تک اتنا ہی بتایا ہے' جتنا بار بار ہوکس بیان کر چکا ہے۔ آئندہ توقع تھی کہ مزید حیران کن معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔

☆☆☆

ویلر اور ہوکس کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ ویلر اپنے مشیروں سے باتیں کر رہا تھا۔ ایک مشیر نے کہا۔ "کامران کی چھٹی کریں۔ وہ جہاں جانا چاہتا ہے' اُسے جانے دیں۔ اب آپ کو ربانی اور رحمانی سے نمٹنا ہے۔"

دوسرے مشیر نے کہا۔ "یوں بھی آپ کامران کے پیچھے ان ہی دونوں سے نمٹتے آرہے تھے۔"

ویلر نے کہا۔ "ان کی غیر معمولی صلاحیتوں نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔ ان سے کسی طرح سمجھوتا کرنا ہوگا۔" اس نے اپنے پی اے سے کہا۔ "معظم خان کو کال کرو۔"

پی اے نے حکم کی تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی معظم فون پر تھا۔ "ہیلو سر! میں ابھی آپ کو کال کرنے ہی والا تھا۔ کیا کروں' کامران کے موکل نے ذرا اُلجھا دیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے اس سے نمٹ لوں پھر آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔"

"وہ خوش خبری کیا ہے؟ ابھی سناؤ۔"

وہ بولا۔ "کامران آئندہ ہمارے لیے غیر ضروری ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کا موکل اب عمر بھر کے لیے میرا تابعدار بن کر رہنا چاہتا ہے۔"

ویلر نے پوچھا۔ "وہ موکل تمہارا تابعدار کیوں بن کر رہنا چاہتا ہے؟ تابعداری کے پیچھے کوئی تو بات ہوگی؟"

"جی ہاں۔ اس نے تابعداری کی یہ شرط پیش کی ہے کہ میں اسے اپنا داماد بنا لوں۔"

ویلر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس نے پوچھا۔ "سر! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟"

"تمہاری اور اپنی عقل پر رونا آرہا ہے۔ اس لیے

ہنس رہا ہوں۔ ربانی اور رحمانی جو ہمارے بدترین دشمن ہیں، وہی کامران کے مؤکل ہیں۔ وہ ہمیں اُلّو بناتے آرہے تھے اور ہم بنتے چلے آرہے تھے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟"

"وہی کہہ رہا ہوں جو اب تک ہمارے ساتھ ہوتا آیا ہے۔ آدم ربانی اور آدم رحمانی نے کامران کو اپنا آلۂ کار بنا کر اسے ایک بناسپتی عامل جادوگر بنادیا تھا اور خود اس کے مؤکل بن کر ہمیں دھوکا دیتے رہے۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یعنی ہم کامران کے ذریعے ان کے خلاف جو کرتے رہے تھے وہ دراصل اپنے ہی خلاف کرتے آرہے تھے؟ یہ... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"یہی ہوتا رہا ہے۔ ہم ان کے خلاف محاذ آرائی کے پہلے دن جہاں تھے وہیں آج بھی ہیں۔ وہ ہمیں سبز باغ دکھاتے رہے ہیں۔ ہمیں ایک کنوئیں میں ڈال کر سمندر کی سیر کراتے رہے ہیں۔ لعنت ہے کہ ہم دھوکا کھا گئے۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟ مجھے یقین ہے آپ انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ان کی غیر معمولی صلاحیتیں ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گی۔ فی الحال ہم غصہ نہیں دکھا سکتے۔ انہیں چیلنج نہیں کرسکتے۔"

معظم مایوس ہو کر بولا۔ "ہاں۔ ہمارے پاس وہ ہتھیار نہیں ہیں، جو ان کے پاس ہیں۔ پھر بھی جواباً کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"فی الحال سمجھوتا کرنا ہوگا۔ تم انہیں کال کرو۔ ان سے کہو کہ ہم موجودہ حالات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں انہیں کیسے کال کروں؟ ان کے موبائل فون بھی عجیب ہیں۔ ہماری کال وہاں تک نہیں پہنچتی ہے۔"

"فون سے بھی مضبوط ذریعہ تمہارے پاس ہے۔ اپنی بیٹی سے کہو۔ وہ ہم سے رابطہ کرائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی تاباں سے بات کرتا ہوں۔"

معظم نے وطن سے رابطہ ختم کرکے تاباں کو مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ "جی ابّو! فرمایئے؟"

وہ قدرے ناراضی سے بولا۔ "کیا فرماؤں؟ تم ربانی اور رحمانی کے ساتھ مل کر اپنے باپ کو اُلّو بنا رہی تھیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

"کیا تم نہیں جانتی تھیں کہ کامران بلیک میجک نہیں جانتا ہے۔ کوئی مؤکل اس کا تابعدار نہیں ہے۔ وہ دونوں مؤکل بن کر ہمیں دھوکا دے رہے تھے۔"

"ہاں، میں جانتی تھی بلکہ جانتی ہوں۔"

"تم نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ کامران محض ایک بناسپتی جادوگر ہے؟"

"کیا آپ نے مجھے بتایا تھا کہ اس بناسپتی کو کس مقصد کے لیے وہائٹ اسکائی بھیج رہے ہیں؟"

"تم میرے سیاسی معاملات سے نہ دلچسپی لیتی ہو۔ نہ میں بتاتا ہوں۔"

"یہی تو آپ سے غلطی ہوئی۔ آپ بتاتے تو میں بھی آپ کو بتادیتی۔"

"تم صاف کیوں نہیں کہتیں کہ ربانی اور رحمانی کو اپنے باپ پر ترجیح دیتی ہو۔"

"آپ یہی بات ان الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ میں سچ کو جھوٹ پر اور بھلائی کو بُرائی پر ترجیح دیتی ہوں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تم سے سخت ناراض ہوں۔ تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔"

"لو! یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ آپ مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔ اگرچہ آپ ایک ظالم، خود غرض اور مفاد پرست حکمران ہیں لیکن آپ کے سینے میں صرف اور صرف ایک باپ کا دل ہے اور وہ دل صرف میرے لیے دھڑکتا ہے۔"

"اور تمہارا دل صرف ان مسیحاؤں کے لیے دھڑکتا ہے۔"

"ان کی سچائی اور ایمانداری پر بے اختیار پیار آتا ہے۔ آپ ان کے جیسے ہوجائیں پھر مجھ جیسی خوش نصیب بیٹی ان مسیحاؤں سے زیادہ آپ پر فخر کرے گی۔"

"زیادہ نہ بولو۔ میں تم سے نہیں بولوں گا۔ صرف ایک بات کہنے آیا ہوں۔ ان دونوں سے کہو، ہماری فون کال اٹینڈ کریں۔ ہم کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

"ابھی کہتی ہوں۔ ایک ذرا انتظار کریں۔"

اس نے باپ سے رابطہ ختم کرکے ربانی کو کال کی۔ اس نے پوچھا۔ "ہاں بولو، شاہی محل میں خیریت سے ہو؟ ہالانہ کے ساتھ کیسے گزر رہی ہے؟"

"اچھی گزر رہی ہے۔ تم ہالانہ کو اچانک چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کا موڈ آف ہے۔ وہ بظاہر مسکرا کر مجھ سے باتیں کرتی ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی، تم کب آؤ گے؟"

"تم نے کیا کہا ہے؟"

''اسے تسلی دی ہے کہ اپنی معروفیات سے فارغ ہوتے ہی آؤ گے۔ ابھی یہ معلوم ہوا ہے کہ کامران کا بھید کھل گیا ہے۔ اس کی پشت پر تم دونوں ظاہر ہو گئے ہو۔''

''ہاں۔ روڈنی ویلر کا ایک سائنس داں ہمارے بارے میں اور بہت سی معلومات حاصل کر رہا ہے۔ میں فرصت سے آؤں گا تو تمہیں تمام باتیں بتاؤں گا۔''

''لو تم سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی یا روڈنی ویلر کی کال ابھی آئے گی۔ اسے اٹینڈ کرو۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہمارے پاس فون کہاں ہے؟ ہم ہتھیلی کان پر رکھ کر ہائے ہیلو کہتے ہیں۔ ویسے میں جانتا ہوں وہ کیا کہنے والے ہیں۔ بہر حال ان سے باتیں تو کرنی ہوں گی۔''

''اچھی بات ہے۔ ابھی لٹو سے کہتی ہوں۔ وہ انتظار کریں گے۔ ادھر میں تمہارا اور رہانی کا انتظار کروں گی۔ میرا خیال ہے ڈنر کے وقت آؤ گے؟''

''شاید اس سے پہلے ہی آجائیں... اچھا اللہ حافظ۔''

ربانی نے کان سے ہاتھ ہٹا کر رحمانی کو آواز دی۔ ''کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟''

وہ کمرے میں داخل ہو کر بولا۔ ''مسلسل سوچ رہا ہوں۔ ہمارا وجود ہمیں الجھا رہا ہے۔ یہی ایک سوچ حاوی ہو رہی ہے کہ ہوکس ہمیں اس خلائی انسانی خاکے سے منسوب کر رہا ہے اور بڑی حد تک درست لگ رہا ہے۔''

''ہم میں اور اس خلائی مخلوق میں دو باتیں مشترک ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی بھی تصویریں اتاری نہیں جاسکتیں۔ دنیا کا کوئی کیمرا ہماری تصویریں بھی اتار نہیں پاتا ہے اور ہماری طرح وہ خلائی مخلوق بھی کبھی غائب ہو جاتی ہے کبھی حاضر ہو جاتی ہے۔

اس طرح جلد ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہم اس ارضی دنیا کے باشندے نہیں ہیں۔ وہ جو ہوکس کی مشین میں نظر آیا ہے اس کی طرح ہم کسی سیارے سے آئے ہیں۔''

ربانی نے کہا۔ ''یہ سوچ کر عجیب سا لگ رہا ہے کہ ہم اس دنیا کے باشندے نہیں ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ہم اپنی اسی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ اسی مٹی کے حوالے سے خاکی انسان کہلائیں گے۔ ہوکس کی مشین خواہ مخواہ ہمیں بھٹکا رہی ہے۔''

ربانی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنی مشینوں کو کیسے آپریٹ کرتا ہے۔ جب وہ لیبارٹری سے چلا جائے گا تو ہم وہاں جائیں گے اور اس خلائی تحقیقات کرنے والی مشین کو آپریٹ کرتے ہوئے اپنے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

وہ دونوں سر جھکا کر تصور میں ان مشینوں کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆

وہ خیالات سے چونک گئے۔ فون سے رنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ رہانی نے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر رحمانی کو دیکھا پھر کہا۔ ''روڈنی ویلر ہے۔''

اس نے بٹن کو دبایا پھر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔ ہم آدم ربانی اور آدم رحمانی بول رہے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''میں روڈنی ویلر بول رہا ہوں۔''

''ہم جانتے ہیں۔ آگے بولو۔''

وہ بولا۔ ''معظم خان اور اعظم خان کے ذریعے تم سے شناسائی رہی۔ آج پہلی بار فون پر براہ راست گفتگو ہو رہی ہے۔''

وہ ذرا چپ رہا۔ ربانی نے کہا۔ ''آگے بولو۔''

''ہم نے معظم اور اعظم سے تم دونوں کے متعلق جو سنا، اس سے غلط فہمی پیدا ہو گئی اور ہم نے خواہ مخواہ تم سے عداوت مول لی۔ آج سے براہ راست گفتگو ہوتی رہے گی تو تمام گلے شکوے اور مخالفتیں ختم ہو جائیں گی۔''

وہ پھر چپ ہوا۔ ربانی نے کہا۔ ''آگے بولو؟''

ویلر نے کہا۔ ''پلیز'' میں جو کہہ رہا ہوں، اس کا جواب سننا چاہتا ہوں۔''

''تمہاری کوئی بات جواب طلب نہیں ہے۔ میں کس بات کا جواب دوں؟''

''ہم نے تم دونوں سے مخالفتیں مول لیں۔ کیا اس سلسلے میں کچھ نہیں کہو گے؟''

''بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ اعتند کا جواب پتھر سے دے چکے ہیں۔ اسی لیے سوالی بن کر پہلی بار فون پر ہم سے بات کر رہے ہو۔ اب تک تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی ہے۔''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان جو عداوتیں ہیں وہ ختم ہو جائیں۔''

''ہم نے تمہارے گھر آکر کوئی عداوت نہیں کی۔ تم نے کی ہے۔ تم ہی ختم کرو۔''

''ہاں۔۔۔وہ۔۔۔میں یہی کہہ رہا تھا کہ ہمارے درمیان دوستی اور امن و امان کا معاہدہ ہو جائے۔''

''وہ تو پھر سیاسی معاہدہ ہوگا کہ بوستان ہمارا ملک ہے۔ تم ہمارے ملکی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کرو گے۔''

''منظور ہے۔ ہم کبھی مداخلت نہیں کریں گے۔''

''تم نے اربوں روپے معظم اور اعظم کو دے کر ہمارے ملک کو مقروض بنا دیا ہے، یہ اعلان کرو گے کہ تمہارا مقروض ہمارا ملک نہیں ہے، کرپٹ حکمران ہیں۔ تم وہ تمام قرضے ان کرپٹ حکمرانوں سے وصول کرو گے اور یہ اعلان کرو گے کہ آدم ربانی اور آدم رحمانی نے بوستان کو قرضوں کی لعنت سے نجات دلائی ہے۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں وہائٹ اسکائی کے اعلیٰ حکام سے مشورہ کرکے جواب دوں گا۔''

''جب جواب دو گے تب آگے بات ہوگی۔ رابطہ ختم کرنے سے پہلے کہہ دوں کہ لیزا اور کامران کو عزت اور سلامتی سے ان کے گھر پہنچا دو۔ وِش آل۔''

ربانی نے فون بند کرتے ہوئے رحمانی سے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو ہماری سیاسی گرفت مضبوط ہوگی۔ ہم نے سرد ٹاؤن کو بہت ہی خوبصورت اور خوش حال لوگوں کا شہر بنایا ہے۔ یہاں بے روزگاری، مہنگائی اور کرپشن نہیں ہے۔ یہ مثالی شہر اپنی زبان بے زبانی سے کہتا ہے کہ پورا ملک بوستان اسی طرح ترقی یافتہ اور خوش حال ہو سکتا ہے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''اب روڈنی ویلر ہمارے دباؤ میں آرہا ہے۔ وہ معظم اور اعظم کی لگام کھینچے گا۔ سیاسی حالات تبدیل ہوں گے۔ الیکشن ہوں گے تب اللہ کی مرضی سے اگلا الیکشن ہم جیتیں گے۔''

''ہمارے خوابوں کی تعبیر اور دن رات کی جدوجہد کے مثبت نتائج جلد ہی سامنے آئیں گے۔''

رحمانی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہے۔ میرے سر میں تو وہ خلائی مخلوق گھوم رہی ہے جس کی تصویر ہارپر ہوکس کی مشین بھی نہ اتار سکی۔ ہماری بھی تصویریں کوئی نہیں اتار سکتا۔ یہ کیا بھید ہے...؟''

''تم اپنے ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔''

''کیوں نہ الجھاؤں؟ یاد ہے ورشا بھی کہہ رہی تھی کہ اس نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟''

ربانی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا...؟''

''یہی کہ آج تک ورشا کی تصویر بھی اتاری نہیں گئی ہے۔ اگر اتاری جاتی تو وہ بھی بھول چوک سے اپنی صورت دیکھ ہی لیتی۔''

ربانی نے تصور میں خیالی ورشا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا۔ وہ بدھ مت کے پرچار کے لیے دنیا گھومتی رہی ہوگی۔ کہیں بھی کسی نے تو اس کی تصویر اتاری ہوگی۔''

''یہ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے۔ کہیں نہ کہیں انسان کو اپنا عکس ضرور نظر آتا ہے۔''

''ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ اس نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہوگی۔ کیا ہماری طرح کیمرے کی آنکھ اس کی تصویر اتارنے سے بھی قاصر رہتی ہے؟''

یہ ایسی بات تھی کہ دونوں چونک کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے پھر رحمانی نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات ہوتی تو ورشا ہم سے کہتی۔ یہ ہمیں خود سمجھنا چاہیے کہ وہ آتما شکتی حاصل کرنے تک اپنی صورت نہیں دیکھے گی۔ اسی لیے کسی کو تصویر اتارنے کی بھی اجازت نہیں دی ہوگی۔''

''الیکٹرونکس میڈیا اور پرنٹ میڈیا کے فوٹو گرافرز اجازت کے بغیر ہی چھپ کر تصویریں شائع کر دیتے ہیں۔''

''بے شک ایسا کرتے ہیں لیکن ورشا کے ساتھ ایسا ہوتا تو اس کی تصویر کہیں نہ کہیں ضرور شائع ہوتی۔''

''کیوں نا ہم ورشا سے وضاحت طلب کریں؟ چلیں دیکھتے ہیں۔ ابھی اس سے رابطہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟''

وہ دونوں کمپیوٹر کے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ رحمانی نے اسے آپریٹ کیا اور اپنا پیغام لکھا۔ ''کیا ابھی باتیں ہو سکتی ہیں؟''

وہ کمپیوٹر کو دیکھنے لگے۔ ورشا کی طرف سے جواب موصول ہوا۔ ''میں حاضر ہوں۔ تم دونوں خیریت سے ہو؟''

رحمانی نے جواب دیا۔ ''خدا کا شکر ہے۔ ویسے ہم نے بے وقت تمہیں زحمت دی ہے۔''

وہ بولی۔ ''کوئی بات نہیں۔ جہاں اپنائیت ہوتی ہے دل وہاں بے وقت بھی دوڑا چلا آتا ہے۔''

''ورشا! تمہاری یہ بات ذہن میں اٹکی ہوئی ہے کہ تم نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک سوال ہے، کیا کبھی کسی نے تمہاری تصویر نہیں اتاری ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتی۔ اگر کسی نے اتاری ہو تو اس نے مجھے نہیں دکھائی ہے۔''

''شاید اس لیے نہیں دکھائی ہو کہ تم آتما شکتی کی تکمیل تک خود ہی اپنی صورت دیکھنا نہیں چاہتی ہو۔''

وہ بولی۔ ''ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو۔ ویسے میں جب بھی اپنی چار دیواری سے باہر نکلتی ہوں تو گھونگھٹ میں رہتی ہوں۔ میرا آدھے سے زیادہ چہرہ چھپا رہتا ہے۔''

رحمانی نے ورشا کو ہارپر ہوکس کی مشینوں کے بارے میں بتایا کہ ایک مشین کے ذریعے ایک خلائی مخلوق کا خاکہ دیکھا گیا ہے۔ خلائی تحقیقات والا طاقتور کیمرا بھی اس کی تصویر نہ اتار سکا۔ صرف خاکہ ہی اسکرین پر دکھائی دے رہا تھا۔''

رحمانی نے کہا۔ ''دنیا کا کوئی کیمرا ہماری تصویر نہیں بھی نہیں اتار سکتا۔ ہمارے ذہن میں یہ بات آئی کہ شاید تم بھی ہماری طرح ہو۔ شاید کیمرے کی آنکھ تمہاری تصویر اتارنے سے قاصر رہتی ہو۔''

وہ بولی۔ ''میں تو باہر گھونگھٹ میں رہتی ہوں۔ میں نے کسی کو تصویر اتارتے نہیں دیکھا۔ اگر اتاری گئی ہوگی تو تصویر میں صرف گھونگھٹ ہی دیکھنے کو ملا ہوگا۔''

''ورشا! برا مت ماننا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ تم پوری طرح ہم سے متعارف نہیں ہو۔ شاید اپنی کچھ ذاتی باتیں ہم سے چھپا رہی ہو۔''

''میں بھلا کیا چھپاؤں گی؟ مجھ پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ کوئی دلیل ہے؟''

وہ بولا۔ ''میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو اس وقت میرے دل کی دھڑکنوں کے قریب ہے اور وہ مجھے بار بار تمہاری ہی طرف کھینچ رہی ہے۔''

ربانی نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا واقعی تمہارے ساتھ ایسا کچھ ہو رہا ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''ہاں۔ ابھی جیسے ہی ورشا نے رابطہ کیا تھا۔ مجھے یہ تبدیلی محسوس ہونے لگی تھی۔''

ربانی نے پوچھا۔ ''تمہاری دھڑکنوں کے قریب کیا ہے؟''

اُدھر سے ورشا نے بھی پوچھا۔ ''وہ کیسی چیز ہے؟''

رحمانی نے پوچھا۔ ''تمہارے ماتھے کی وہ ننھی سی سرخ بندیا کہاں ہے؟''

کمپیوٹر کی اسکرین پر دوسری طرف کی تحریر نہیں ابھری۔ طویل خاموشی رہی۔ رحمانی نے لکھا۔ ''وہ بندیا میری جیب میں دل کی دھڑکنوں کے قریب ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد تحریر ابھری۔ ''مجھے شما کرو۔ میں ابھی کچھ بول نہیں سکوں گی۔ پھر کسی وقت رابطہ کروں گی۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ ربانی نے کہا۔ ''میرا دھیان ادھر نہیں گیا تھا۔ بدھ بھکشوؤں کا گیروا رنگ... ایک ہندو عورت کی ساڑی... اور ماتھے کی بندیا... تم نے تو خواب میں ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ ورشا ہے اور تاباں کی ہم شکل ہے۔''

''ہاں۔ وہ پہلی بار ہم دونوں کے خوابوں میں آئی پھر دوسری رات صرف میرے خواب میں آئی۔ کیا ہم واقعی خواب دیکھ رہے تھے؟ اگر دیکھ رہے تھے اور وہ خواب میں آئی تھی تو اس کی بندیا میرے کمرے میں کیسے رہ گئی؟''

''وہ کسی شک و شبہے کے بغیر آئی تھی۔ لہٰذا وہ آنے والی ہماری طرح غائب ہوتی ہے اور بند دروازوں سے گزر جاتی ہے۔''

ربانی حیرانی سے رحمانی کا منہ تکنے لگا۔ یہ ایسے حقائق تھے جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ بولا۔ ''یا خدا! کیا ورشا کا تعلق بھی ہماری ارضی دنیا سے نہیں ہے؟ ہارپر ہوکس کا دریافت کیا ہوا خلائی انسان، ورشا اور ہم دونوں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ورشا میں ایک اور غیر معمولی صلاحیت ہے جو ہم میں نہیں ہے اور وہ یہ کہ وہ دوسروں کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔''

''تعجب ہے۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس میں سحر زدہ کرنے والی صلاحیت ہے؟''

''جب وہ دو راتوں میں یہاں آئی تھی تو ہم دراصل خواب نہیں دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہم پر سحر طاری کر دیا تھا۔''

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا۔ ''بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ جب وہ یہاں سے گئی تو ہم خواب سے نہیں جاگے تھے۔ سوتے ہی رہے تھے۔ اس نے جانے کے بعد سحر توڑ دیا تھا۔ ہمیں ایسا ہی لگا جیسے نیند کے بعد آنکھ کھلی ہے۔''

''وہ ہم سے کھیل رہی ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے کہ اس نے اب تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ تاباں کی ہم شکل ہے۔''

''ایک طرف تاباں بن کر یہاں راتوں کو آ چکی ہے۔ دوسری طرف یہ بے تکی بات کہتی ہے کہ اس نے آج تک اپنی صورت نہیں دیکھی ہے۔''

وہ دونوں تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے پھر ایک نے کہا۔ ''ہم نظروں سے اوجھل ہو کر کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن کسی عورت کی تنہائی میں نہیں جاتے۔ کیونکہ یہ اخلاق اور شرم و حیا کے منافی ہے۔''

''لیکن جھوٹے کو اس کے جھوٹ سے اور فریبی کو اس

کے فریب سے مات دی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ جہاں بھی ہے۔ ہم وہاں اچانک پہنچیں گے اور اس کی اصلیت معلوم کریں گے۔''

یہ کہتے ہی وہ بیٹھے بیٹھے گم ہو گئے۔ وجود سے عدم ہو گئے۔ ایک نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔

وہ نہیں جانتے تھے کہ ورشا کہاں ہو گی؟ کسی انسانی آبادی میں ہو گی یا جنگل میں؟ انہوں نے صرف اس کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا اور پہنچ گئے۔

وہ مہاتما بدھ کے ایک بہت بڑے مجسمے کے سامنے آ گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی کو کاٹ کر اسے بڑی مہارت سے تراش کر عظیم بدھا کی صورت بنائی گئی تھی۔ پہاڑی کے دامن میں ہرا بھرا جنگل تھا۔ خوش نما پرندے چہچہا رہے تھے۔ صاف و شفاف بہتے ہوئے چشمے کے قریب ایک مورنی پنکھ پھیلائے ناچ رہی تھی۔ وہ دونوں وہاں پہنچے تو وہ ناچتے ناچتے ٹھٹک گئی۔ اس نے اپنے پر سمیٹ لیے۔ جیسے شرما گئی ہو۔

وہ اِدھر دیکھ رہی تھی جہاں وہ پہنچے ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن جانوروں کی ایک چونکا دینے والی حس ہوتی ہے۔ یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ اسی حس نے مورنی کے ناچتے ہوئے پیروں کو روک دیا تھا۔

وہاں دور تک بھکشو مرد اور عورتیں آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن اس کا سراغ مل رہا تھا۔ اس کے بدن کی مخصوص خوشبو ان کی سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ چغلی کھا رہی تھی کہ وہیں قریب ہی ہے۔

یہ بھید کھل گیا کہ وہ کوئی معمولی نہیں غیر معمولی لڑکی ہے اور ان کی طرح نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ بھی اسپیس ٹریولر مشین کے خلائی انسان سے مماثلت رکھتی ہے۔

کہاں ہے وہ...؟

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ دونوں یوں اچانک ہی آ جائیں گے۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

رحمانی نے کہا۔ ''تم یہاں ہو۔ میرے بولنے سے پہلے تم نے بھی ہماری موجودگی کو سمجھ لیا ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''تم دوبار ہماری رہائش گاہ میں آ چکی ہو۔ تم نے تو ہمارے گھر آ کر ہمیں دیکھ لیا۔ ہم بھی تمہارے گھر آئے ہیں... آؤ۔ سامنے آ جاؤ۔''

جواباً کوئی صدا نہیں تھی۔ صرف اس کے بدن کی خوشبو آ کر ان سے لپٹ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ خوشبو اپنے کم ہونے لگی جیسے دور ہو رہی ہو اور یہی ہوا۔ وہ گم ہو گئی۔

گویا فرار ہو گئی۔ آنے والوں کا نہ استقبال کیا۔ نہ صورت دکھائی، نہ آواز سنائی۔ ایسی کیا بات تھی جس نے اسے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا تھا؟

انہوں نے پھر نادیدہ رہ کر اس کی خوشبو کی سمت پرواز کی اور اس سے کچھ فاصلے پر پہنچ گئے۔ وہ ایک ہرے بھرے جنگل میں آبشار کے قریب تھی۔ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تینوں ہی نادیدہ تھے۔ کوئی کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

پھر اس کی رس بھری آواز سنائی دی۔ ''تم مسلمان ہو۔ تمہیں اللہ اور رسول کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے دیکھنے کی ضد نہ کرو۔ چند گھنٹے اور رہ گئے ہیں۔ میری آتما شکتی کی تپسیا کو پوری ہو جانے دو۔''

رحمانی نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر میں یہیں اسی چٹان پر ملوں گی اور ایک بہت بڑے راز سے پردہ اٹھاؤں گی۔''

''وعدہ...؟''

''وعدہ! عظیم بدھا کی بیٹی اپنا وچن پورا کرے گی۔''

انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کی خوشبو گم ہو گئی۔ آبشار رنگنگنا رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس چٹان تک آ رہے تھے۔ وہاں خوشبو تنہا رہ گئی تھی۔

سلطانہ یاقوت کے محل میں مسرتیں بھی تھیں اور مایوسیاں بھی۔ مسرتیں یوں تھیں کہ وہاں تاباں ربانی اور رحمانی کا وجود تھا۔ ان کے دم قدم سے یقین تھا کہ جلد ہی ماں بیٹی کو خبیث زنگورارا کی شیطانی گرفت سے نجات مل جائے گی اور اس محل سے ہمیشہ کے لیے کالے جادو کی لعنت ختم ہو جائے گی۔

پورے محل میں صرف ہالہ مایوسی کا شکار تھی۔ باقی خوش تھے۔ ربانی اور رحمانی آنے والے تھے اور وہ ربانی کی دیوانی تھی۔ یہ حقیقت اس کا کلیجا نوچ رہی تھی کہ وہ آئے گا تو تاباں کے ساتھ وقت گزارے گا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ مٹھیاں بھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے اندر ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ ہو ہو ہا ہا کی بے ڈھنگی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ تھرکنے لگی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ حبشی اس کے چاروں طرف رقص کر رہے ہیں اور وہ بھی ان کے ساتھ مستی میں رقص کر رہی تھی۔

وہ دروازے پر دستک کی آواز سنتے ہی تھم گئی۔ اس

نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے والدہ محترمہ تھیں۔ اس نے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ سلطانہ یاقوت نے خواب گاہ میں قدم رکھتے ہی اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بیٹی نے منہ پھیر کر بیڈ کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔''

''کیا ہے۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا پھر اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف گھماتے ہوئے بولی۔ ''مجھ سے نظریں ملاؤ۔ تم نے ابھی وہ شیطانی خوراک لی ہے؟''

''میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔''

''میں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ نہ مجھ سے چھپ سکتی ہو، نہ کوئی بات چھپ سکتی ہو۔ تم بند کمرے میں ایب نارمل تھیں۔''

ہالہ بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئی۔ ''ہاں۔ ایب نارمل ہوگئی تھی۔ ان حبشیوں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ وہ سب بالکل اپنے رشتے دار لگ رہے تھے۔''

ماں پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ ''مام! میرے ہاتھوں میں نیزہ تھا۔ میں ناچتے ناچتے نیزے کی انی کو تاباں کے سینے میں اتار دینا چاہتی تھی۔''

سلطانہ یاقوت حیرت سے چیخ پڑی۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو؟ تم زندگی بھر اس کا احسان نہیں چکا سکو گی۔ کس منہ سے اسے مارنے کی بات کر رہی ہو؟ تمہیں شرم سے مر جانا چاہیے۔''

ہالہ نے تڑخ کر کہا۔ ''اور اسے کتنی بے شرمی سے عیش کرنا چاہیے۔ کیا وہ ربانی کو میرے لیے نہیں چھوڑ سکتی، کیا ایک رحمانی سے اس کی ہوس پوری نہیں ہوتی ہے؟''

وہ بیٹی کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''پاگل ہو رہی ہو۔ کیوں اس پر کیچڑ اچھال رہی ہو؟ اس کا احسان تو۔ وہ تمہاری خاطر ربانی کی طلب سے باز آگئی ہے۔''

''مام! ربانی میرے ساتھ اس بیڈ روم میں تھا۔ اچانک مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تاباں کی کشش نے اسے کھینچ لیا تھا۔ وہ نہیں رہے گی تو پھر وہ مجھ میں ہی تاباں کو دیکھتا رہے گا۔''

ماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم تاباں کو ابھی سے اپنی سوکن سمجھتی رہو گی تو میں آج ہی اسے بوستان جانے کا کہہ دوں گی۔ وہ جائے گی تو ربانی بھی چلا جائے گا۔ پھر اپنے محبوب کو کیسے یہاں بلاؤ گی؟ جو بازی رفتہ رفتہ جیتنے والی ہو، کیا اسے حسد و رقابت کے باعث ہار جانا چاہتی ہو؟''

وہ ماں سے لپٹ گئی۔ ''سوری مام! میں نارمل رہوں گی۔ کبھی اس کا برا نہیں چاہوں گی۔ اسے اپنی سگی/ اپنی بہن سمجھتی رہوں گی۔''

ماں نے اسے تھپک کر کہا۔ ''ڈرائنگ روم میں چلو اور اسے بہن کی محبتیں دو۔ کم آن۔''

وہ بولی۔ ''آپ چلیں۔ میں فریش ہو کر آتی ہوں۔''

''ربانی اور رحمانی آنے ہی والے ہیں۔ وہیں ان سے ملو ابھی میک اپ میں ہو۔ کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

وہ واش روم چلی گئی۔ سلطانہ ڈرائنگ روم میں تاباں کے پاس آئی تو ربانی اور رحمانی وہاں آچکے تھے۔ انہوں نے ادب سے اٹھ کر سلطانہ کو سلام کیا۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے بولی۔ ''میرے بچو! میں بہت پریشان ہوں۔ ہالہ رہ رہ کر ایب نارمل ہو جاتی ہے۔ بیٹے! کسی طرح شیطانی عمل کا توڑ کرو۔''

رحمانی نے کہا۔ ''آپ کی پریشانی کہہ رہی ہے کہ وہ ابھی ایب نارمل ہوگئی تھی؟''

''بات یہ ہے کہ ربانی اس کے حواس پر چھا گیا ہے۔ ان حالات میں عورت ہو یا مرد وہ رقابت سے سوچتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی رقیب کوئی سوکن نہ آئے۔''

تاباں نے سلطانہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں سمجھ رہی ہوں۔ وہ مجھے اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھ رہی ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے سمجھاتی رہتی ہوں۔ جادو کا توڑ ہو جانے دو پھر سارے مسائل پیار و محبت سے حل ہو جائیں گے۔''

وہ ربانی اور رحمانی سے بولی۔ ''تم دونوں کسی بھی خاتون کی تنہائی میں چھپ کر نہیں جاتے ہو اور نہ ہی کسی محرم کے ڈھکے چھپے خیالات پڑھتے ہو۔ مگر میں کہتی ہوں، میری بیٹی کے چور خیالات پڑھو۔''

ان دونوں نے سلطانہ یاقوت کو دیکھا، وہ بولی۔ ''میری بیٹی مریضہ ہے۔ میری اجازت سے تم دونوں اس کا علاج کرنے کی خاطر چھپ کر اس کے اندر جا سکتے ہو۔ یہ سراسر نیکی ہوگی۔ تم اس کے اندر کے شیطان کو پکڑ سکو گے۔''

ربانی نے کہا۔ ''آپ درست فرماتی ہیں۔ ہم چور خیالات پڑھ کر ہی شیطانی عمل اور رد عمل کو سمجھ سکیں گے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''آؤ آج ہم اصولوں کے خلاف چلیں اور اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔''

وہ دونوں بیٹھے بیٹھے گم ہو گئے۔ ماں نے بیٹی کے پاس جانے کی اجازت دی تھی لیکن وہ دوسرے ہی لمحے واپس آگئے۔ پھر وہیں صوفوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیے۔

ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ تاباں اور سلطانہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

رحمانی نے ندامت سے کہا۔ ”ہمیں مجبور ہو کر تنہائی کرنے کے لیے بھی کسی دوشیزہ کی تنہائی میں نہیں جانا چاہیے۔“

بات سمجھ میں آگئی۔ یہ پوچھنا مناسب نہیں تھا کہ وہاں جاتے ہی کیا دیکھا؟ کیوں فوراً ہی منہ پھیر کر چلے آئے؟

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر رحمانی نے کہا۔ ”ہم تھوڑی دیر کے لیے دوسرے کمرے میں جا رہے ہیں۔ ہالہ یہاں آئے گی تو ہم بھی آجائیں گے۔“

وہ دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔ ربانی نے کہا۔ ”اچھا ہوا ہم یہاں تنہائی کے لیے آگئے۔ میری حالت عجیب سی ہو رہی ہے۔ بدن گرم ہو رہا ہے۔“

رحمانی نے کہا۔ ”میرا دل بُری طرح دھڑک رہا ہے جو دیکھا ہے، وہ آنکھوں کے سامنے سے نہیں مٹ رہا ہے۔“

”وہ نظارہ میرے دماغ سے بھی نہیں مٹ رہا ہے۔ آنکھیں اب بھی دیکھ رہی ہیں۔

یاخدا...! حسین بدن ایسا ہوتا ہے؟ ایسی کشش ہوتی ہے کہ ابھی تک کھینچ رہی ہے اور خوفِ خدا ہمیں روک رہا ہے۔“

رحمانی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے جکڑ کر کہا۔ ”وہ بدن بے اختیار چھونے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک دم سے دل مچل گیا۔ ہم تھوڑی دیر بعد جاتے تو اچھا ہوتا۔ وہ لباس پہن چکی ہوتی۔“

”ربانی نے کہا۔ ”آج معلوم ہوا کہ عورت پردے میں طلسم ہوشربا ہوتی ہے۔“

اس نے چونکا دینے والا سوال کیا۔ ”ربانی! ہم نے وہاں کسے دیکھا تھا؟ ہالہ کو...؟ یا تاباں کو...؟“

دونوں ہم شکل تھیں۔ اگرچہ ہالہ نے چہرے کو ذرا تبدیل کیا تھا۔ تاہم وہ ہوبہو تاباں تھی۔

رحمانی کے اس سوال نے دل کو دھڑکا دیا کہ انہوں نے ہالہ کے آئینے میں اپنی تاباں کو کھلی کتاب کی طرح دیکھا ہے۔

اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ ان لمحات میں دراصل ہالہ نہیں تاباں ان کے دل و دماغ کو دھڑکا رہی تھی۔ انہوں نے پہلی بار بے پردہ اس کے حسن کو دیکھا تھا اور پاگل ہو رہے تھے۔

دونوں اپنا سر پکڑ کر رہ گئے پھر ربانی نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا میری خاطر تاباں سے دست بردار ہو جاؤ گے۔“

رحمانی نے کہا۔ ”تم نے بھی یہی کہا تھا۔ آج۔ آج سے وہ میرے لیے ضروری ہو گئی ہے۔“

”میں بھی اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔“

”یاخدا...! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم ضدی ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے رقیب بن رہے ہیں۔“

اس دنیا میں پہلا قتل ایک عورت کے لیے ہوا تھا۔ عورت ہی کی خاطر رقابت اور عداوت شروع ہوئی تھی۔ وہ دونوں اب تک ایک دوسرے کے دوست اور جاں نثار تھے۔ اب تک جس تاباں کو دیکھتے آئے تھے، اسے ایک دوسرے کی خاطر چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن آج جس تاباں کو دیکھا تھا، اسے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کے جانی دشمن بھی بن سکتے تھے۔

دونوں کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ دونوں اٹھ کر دروازے پر آئے تو سامنے تاباں اور ہالہ کھڑی تھیں۔ وہ اچانک انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ ابھی تک ذہن بھٹک رہا تھا۔ کیا تصورات کی ستم ظریفی تھی کہ انہیں دیکھنے سے اور بہت کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔

انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”ہم ابھی آنے والے تھے۔“

ربانی نے کہا۔ ”اچانک سیاسی حالات بدل گئے ہیں۔ سپر پاور ہمارے حامی ہو گئے ہیں۔ یونان کی حکومت گرنے والی ہے۔ ہم انشاء اللہ اپنی حکومت بنائیں گے۔“

تاباں نے پوچھا۔ ”تم دونوں ہمیں نہیں دیکھ رہے ہو۔ نظریں کیوں چرا رہے ہو؟“

ہالہ نے کہا۔ ”ہماری صورت اچھی نہیں ہے تو کیا چلے جائیں؟“

ربانی نے کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم کچھ ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔“

”مجھے دیکھ کر؟ میری تنہائی میں چھپ کر آئے تھے۔“

دونوں نے چونک کر اسے دیکھا جیسے چور چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ ”آں۔ ہاں، پہلی بار ہم سے غلطی ہو گئی۔ ہم شرمندہ ہیں۔ ہمیں معاف کر دو۔“

”میں نے رحمانی کو معاف کر دیا۔ تمہیں نہیں کروں گی۔ اپنا مقدمہ میری عدالت میں لاؤ۔ میں تنہائی میں انتظار کروں گی۔“

وہ جواب سنے بغیر جانے لگی، ربانی نے کہا۔ ''ابھی میں ضروری معاملات سے نمٹنے جارہا ہوں۔''

''مجھے تمام معاملات سے زیادہ ضروری سمجھو گے۔ تب ہی معاف کروں گی۔ میں بیڈروم میں جارہی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ ربانی نے تاباں کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''تم نظریں نہیں ملا رہے ہو۔ بات کیا ہے؟''

وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''تاباں...! میں آج ہی تم سے نکاح پڑھوانا چاہتا ہوں۔''

رحمانی نے ترش لہجے سے کہا۔ ''تاباں سے میرا نکاح ہو گا۔ اپنی زبان سے نہ پھرو۔ تم نے تاباں کو میری خاطر چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''لیکن تم نے بھی میری خاطر یہی فیصلہ کیا تھا۔''

''تب کی بات اور تھی۔ اب کی بات اور ہے اور تم سمجھ رہے ہو کہ ہم دونوں کے ارادے اور فیصلے کیوں بدل گئے ہیں؟''

تاباں نے پوچھا۔ ''کیوں بدل گئے ہیں؟''

وہ دونوں جواب نہ دے سکے۔ بات ہی ایسی تھی۔ رحمانی نے کہا۔ ''ربانی...! وہ اپنے بیڈروم میں انتظار کررہی ہے۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایب نارمل ہو جائے۔''

وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ہلالہ کو ناراض کرتا تو وہ اپنا علاج نہ کراتی۔ شیطانی عمل کے خلاف اس سے تعاون نہ کرتی۔ اس نے کہا۔ ''میں ہلالہ کے پاس جارہا ہوں لیکن ہم تینوں کو آج یا کل تک ایک آخری فیصلہ کرلینا چاہیے۔''

تاباں نے کہا۔ ''آخری فیصلہ آسان نہیں ہے۔ تم دونوں میں سے جب تک کوئی ایک دوسری کو منکوحہ نہیں بنائے گا۔ تب تک میں تم میں سے کسی ایک کو قبول کر کے دوسرے کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔''

وہ اپنا فیصلہ سنا کر سلطانہ یاقوت کے پاس چلی گئی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ رحمانی نے کہا۔ ''ہمیں اپنے ذاتی معاملات میں الجھ کر یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم ملک بوستان کی تقدیر بدلنے آئے ہیں۔ اللہ کی کرم نوازی سے کامیاب ہو رہے ہیں۔ ایسے فرائض کی ادائیگی میں ایک ذرا کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ میں وہائٹ اسکائی جارہا ہوں۔ تم ہلالہ سے مل کر وہاں آؤ۔''

ربانی پریشان ہوکر سوچ رہا تھا کہ ہلالہ کے پاس کیسے جائے؟ اس کی تنہائی میں جاتے ہی وہ گزرا ہوا جلوہ نمایاں ہو رہا تھا جسے دیکھتے ہی جذبات میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔

وہ اس کی کمزوری کو سمجھنے کے بعد اسے ہاتھ سے جانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اپنے بدن کو دودھاری تلوار بنا کر اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی گڑبڑا گیا۔

وہ ملبوس تھی لیکن لباس ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا۔ عبا میں بدن چھپ جاتا ہے۔ وہ عبا میں تھی اور عبا ٹرانسپیرنٹ تھا۔ حسین بدن کی تمام کشش باہر چھلک رہی تھی۔ اس حریری پردے کا حاصل یہ تھا کہ کچھ چھپانے کے لیے رہا نہیں تھا۔ ربانی کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ایسا خوبصورت شیطانی جھٹکا تھا کہ وہ چند لمحات تک نظریں نہ ہٹا سکا۔

پھر وہ فوراً ہی منہ پھیر کر جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مم... میں... جج... جارہا ہوں۔'' مگر وہ پیچھے سے آکے اس سے لپٹ گئی۔

اس کے ہوش اُڑ رہے تھے۔ پہلی بار حسین بدن کی رعنائیاں آکر چپک رہی تھیں۔ ایسے جادوئی انداز میں متعارف ہورہی تھیں کہ وہ الگ ہونا اور فرار ہونا بھول گیا تھا۔

بالآخر وہ مرحلہ آگیا جب دونوں کی سانسیں ٹکرائیں اور لب سے لب ملے اور لبوں کی کلیاں کھلیں تو ربانی نے اپنے لعاب دہن میں اس کھٹی اور نسیلی دوا کو محسوس کیا۔ جسے شیطانی شکنجے سے نکالنے آیا تھا، اسی کے جال میں پھنس رہا تھا۔ وہ بڑے پیار سے چارا ڈال رہی تھی اور وہ ایسا سحر زدہ ہو رہا تھا کہ شیطانی خوراک کی طرف دھیان نہیں جارہا تھا۔

کہیں دور سے ڈھول تاشے اور ہو ہو ہاہا کی دھیمی دھیمی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن وہ سننے اور سمجھنے کے احساسات سے محروم ہوگیا۔ زنگورارا کے جادو سے زیادہ وہ طلسمی بدن اس کے حواس پر چھا گیا تھا۔

وہ زنگورارا کی جاگیر تھی۔ اس نے کہا تھا کہ سلطانہ یاقوت اس کے بستر پر نہیں آئے گی تو اس کی بیٹی کو لے آئے گا۔

اس نے ہلالہ کو پیدائش کے پہلے لمحے سے ہی اپنی جاگیر بنا لیا تھا۔ کسی مرد کے سامنے جانے نہیں دیتا تھا۔ اب اتنی مدت کے بعد ربانی اس کی امانت پر ڈاکا ڈال رہا تھا۔ وہ شیطان یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اچانک ہی ایک نیزے کی نوک ربانی کی پشت میں آکر پیوست ہوئی تو وہ یکبارگی ہلالہ کے طلسم سے نکل آیا۔

پہلے وہ جہاں تھا، وہاں اب نہیں تھا۔ ہلالہ کے ساتھ

شیطان کے مجسمے کے نیچے چاروں شانے چت پڑا تھا اور اس مجسمے کے منہ سے رال ٹپکتی ہوئی اس پر اور تاباں کے منہ پر آ رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف رقص کرنے والے حبشی نیزے اچھال رہے تھے۔

ربانی نے ہوش میں آتے ہی کروٹ بدلی تاکہ شیطانی رال منہ پر نہ آئے۔ جتنی آ چکی تھی، اسے تھوک رہا تھا۔ اسے اندر سے نکالنے کے لیے قے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن وہ نہیں نکل رہی تھی۔ وہ اچھی طرح شکنجے میں آ چکا تھا۔

ہلالہ بے حس و حرکت ٹپکتی ہوئی رال کے نیچے پڑی تھی۔ ربانی نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایسے ہی وقت ایک نیزے کی انی اس کے بازو میں آ کر دھنس گئی۔ شیطان کے پجاری نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ ”یہ ہمارے سردار زنگورارا کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ تو نے اسے ہاتھ لگایا ہے۔ تیرے ہاتھ پاؤں کو کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلایا جائے گا۔“

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت سر چکرا رہا تھا۔ شیطانی معجون اور ٹپکنے والی رال اس کے اندر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے جادوئی اثر سے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ پجاری نے حکم دیا۔ ”اسے پکڑ کر شیطان کے آگے جھکاؤ اور اس کی گردن اڑا دو۔“

کئی حبشی اسے پکڑنے کے لیے آئے۔ وہ ایسا بھی کمزور نہیں تھا کہ آسانی سے گرفت میں آ جاتا۔ نیزے اسے زخمی نہیں کر رہے تھے۔ وہ قریب آنے والوں کی پٹائی کرنے لگا۔ جو اس کے قریب آ رہا تھا، اس کے ہاتھ اور اس کی لاتیں کھا کر گر رہا تھا۔

وہ پہلے جیسا پھرتیلا نہیں رہا تھا۔ مشینی انداز میں ہاتھ پاؤں نہیں چل رہے تھے۔ اس کے باوجود درجنوں نیزہ بردار مار کھا کر اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دوسرے حبشی پیچھے ہٹ رہے تھے۔

ایسے وقت گھنٹیاں بجنے لگیں۔ زنگورارا آ رہا تھا۔ کئی حواری اس کے آس پاس تھے اور گھنٹیاں بجا رہے تھے۔

اس نے ربانی سے پوچھا۔ ”اے کون ہے رے تو؟ بڑی دیدہ دلیری سے میرے آدمیوں کو گھائل کر رہا ہے؟“

پھر اس نے زمین پر لیٹی ہوئی ہلالہ کو دیکھا۔ وہ زنگورارا کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ سحر زدہ تھی۔ شیطانی معجون اس کی رگ رگ میں پہنچا ہوا تھا۔ وہ دونوں بانہیں پھیلا کر زنگورارا کے پاس آ گئی پھر اس کے سینے سے لگ کر گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ ربانی نے کہا۔ ”ہلالہ! ہوش میں آؤ۔ اس سے دور رہو۔“

کلوٹے زنگورارا نے ہنستے ہوئے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ ”مرد کا بچہ ہے تو اسے مجھ سے الگ کر دے۔“

ربانی نے ان کے قریب آ کر کہا۔ ”ہلالہ! اسے چھوڑ دو۔ میرے پاس آؤ۔ میں اسے جہنم میں پہنچا کر تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔“

وہ جیسے اس کی آواز نہیں سن رہی تھی۔ زنگورارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے حملہ کیا۔ وہ ہاتھ بھی گرفت میں آ گیا پھر دونوں زور آزمانے لگے۔

زنگورارا نے اپنی کمر سے گن نکال کر اس کا نشانہ لیا پھر گولی چلائی۔ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری چوتھی گولیاں چلاتا گیا لیکن ایک بھی گولی اسے نہیں لگ رہی تھی۔ سب ادھر ادھر جا رہی تھیں۔ پھر کئی حبشی موٹے موٹے ڈنڈے لے کر آ گئے اور اس کے سر پر مارنے لگے۔

کمزوری پھر حاوی ہو گئی تھی۔ اس کا سر اور چہرہ لہو میں تر ہو چکا تھا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ اس شہزور کو زندگی میں پہلی بار معلوم ہوا کہ کمزوری کیا ہوتی ہے۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ وہ زمین سے اٹھنے کے قابل نہیں رہا۔

دشمن نے ہلالہ کو دونوں بازوؤں میں اٹھا کر ایک کاٹیج کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”اسے مار ڈالو، یہ زندہ نہ رہے۔ میری امانت کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ دیکھو میری جان! کس طرح میں نے تمہیں حاصل کر لیا ہے۔ چلو میں برسوں کا قرضہ وصول کروں۔“

ربانی پھر ہوش میں آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ رہا تھا۔ کلام پاک کی آیتیں پڑھنا چاہتا تھا لیکن معجون اور شیطانی رال نے اسے ناپاک کر دیا تھا۔ منہ کی غلاظتوں کے باعث نہ تلاوت کر سکتا تھا، نہ سجدہ کر سکتا تھا۔ ایسے ہی حالات میں شیطان غلبہ حاصل کرتا ہے۔

☆☆☆

سلطانہ یاقوت پریشان ہو گئی۔ اس نے تیزی سے ڈرائنگ روم میں آ کر تاباں سے کہا۔ ”ہلالہ خواب گاہ میں نہیں ہے۔ میں نے پورے محل میں دیکھ لیا ہے۔“

تاباں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”وہ کہاں جائے گی؟ ربانی اس کے پاس گئے تھے۔ شاید وہ جا چکے ہیں۔“

اس نے فوراً ہی ان کے عجیب و غریب ویڈیو فون سے رابطہ

کچھ پھر دیکھا۔ بیل نہیں جا رہی تھی۔ آواز ذرا سی ابھر کر بند ہوگئی تھی۔ اس نے رحمانی سے رابطہ کیا پھر پریشانی ظاہر کی۔ ''ہلالہ محل سے غائب ہوگئی ہے۔ ربانی سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ فوراً ان کی خبر لو۔ وہ کہاں گم ہو گئے ہیں؟''

رحمانی دوسرے ہی لمحے میں ربانی کے پاس پہنچ گیا۔ اپنے دوست کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ اپنے لہو میں ڈوبا ہوا زمین پر پڑا تھا۔ اس نے رحمانی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہلالہ کو بچاؤ۔ وہ اس کاٹیج میں ہے۔''

کاٹیج کے اندر ہلالہ سوکھی گھاس کی سیج پر پڑی تھی۔ زنگورارا اسے بے لباس کرنا چاہتا تھا۔ ایسے وقت اس پر دورہ پڑا تھا۔ وہ ابکائیاں لے رہی تھی۔ وہ شیطانی دوائیں اس کے منہ سے خارج ہو رہی تھیں۔ زنگورارا نے پجاری کو بلا کر پوچھا۔ ''یہ اچانک اسے کیا ہو رہا ہے؟ اسے ٹھیک کرو۔ اس کی ماں میرے ہاتھوں میں آکر پھسل گئی تھی۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

پجاری نے کہا۔ ''ذرا صبر کرو۔ میں منتر پڑھتا ہوں۔ یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

وہ ہلالہ کے سرہانے آکر دونوں ہاتھ اٹھا کر منتر پڑھنے لگا۔ اسی وقت اس کے منہ پر ایک زور کا ہاتھ پڑا۔ سامنے کے دانت ٹوٹ گئے۔ منہ سے خون ابل پڑا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

رحمانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ زنگورارا نے پجاری سے پوچھا۔ ''اسے تجھے کیا ہوا ہے؟''

وہ بولنے کے قابل نہیں رہا تھا، منہ ٹوٹ چکا تھا۔ رحمانی نے ہلالہ کے پاس آکر پوچھا۔ ''یہ تمہارے منہ سے کیسی غلاظتیں نکل رہی ہیں؟ خود کو سنبھالو۔ میں ابھی تمہیں محل میں لے جاؤں گا۔''

زنگورارا حیرانی سے خلا میں گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یہ کون بول رہا ہے؟ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

رحمانی نے اچھل کر اس کے سینے پر لات ماری۔ وہ ہاتھی جیسا ڈیل ڈول رکھنے کے باوجود لات کھا کر پیچھے گیا۔ سینے پر جیسے سو من کا پتھر آ کر لگا تھا۔ سانسیں رکتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگیں۔

پجاری سنبھل رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ٹوٹے ہوئے منہ سے اٹک اٹک کر منتر پڑھ رہا تھا۔ رحمانی نے اس کی گردن کو دبوچ کر کہا۔ ''تو نے ہلالہ کو یہاں لانے کا جو منتر پڑھا تھا، ویسا ہی اسے محل میں پہنچانے کا منتر پڑھنا شروع کر دے۔ کسی بھی کالے جادو کے ذریعے سے ابھی اسے محل میں پہنچا دے۔''

اس کی گردن جیسے آہنی شکنجے میں کسی ہوئی تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیختے ہوئے بولا۔ ''پڑھتا ہوں۔ ابھی پڑھ رہا ہوں۔ گردن چھوڑ دو۔ مجھے منتروں کا جاپ کرنے دو۔''

رحمانی نے چھوڑ دیا۔ وہ جلدی جلدی سانسیں لیتے ہوئے پڑھنے لگا۔ زنگورارا کو یوں لگ رہا تھا کہ سینے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اپنی زبان میں زیرلب کچھ کہہ رہا تھا۔

وہ اس کے زخمی سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا تو گویا وہ پہاڑ تلے آگیا۔ ایک کے بعد دوسری سانس نہ لے سکا۔ ایک جھٹکا کھا کر بے دم ہو گیا۔

اس کا دم نکلتے ہی ہلالہ کے ساتھ کالے جادو کا تعلق ٹوٹ گیا۔ پجاری کے منتر نے بھی کام کیا۔ وہ یکلخت وہاں سے غائب ہوگئی۔ رحمانی نے محل میں پہنچ کر دیکھا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں بیڈ پر پڑی تھی۔ اس کا منہ، چہرہ اور گردن غلاظت سے آلودہ تھے۔ وہ رک رک کر جھٹکے کھاتی ہوئی سانسیں لے رہی تھی۔

رحمانی نے ڈرائنگ روم میں جا کر تاباں اور سلطانہ یاقوت سے کہا۔ ''بیڈ روم میں جائیں۔ ہلالہ کو سنبھالیں۔ بڑی سنگین پوزیشن ہے۔ میں ربانی کے پاس جا رہا ہوں۔''

ربانی شیطانی مجسمے کے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اب کوئی اس پر حملے کرنے والا دشمن نہیں رہا تھا۔ وہ ایک بڑے مٹکے سے پانی نکال کر منہ میں جانے والی غلاظت کو دھو رہا تھا۔

شیطان کا حب پجاری رینگتا ہوا کاٹیج سے باہر آیا۔ وہ پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ چیخ کر یوں کہہ رہا تھا۔ ''اے ہمارے معبود شیطان! ہمارا زنگورارا مارا گیا ہے۔ ہم بے آسرا ہو گئے ہیں۔ ہماری مدد فرما۔''

یہ خبر سنتے ہی تمام حبشی نیزے پھینک کر رونے لگے۔ رحمانی نے ربانی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آیتیں پڑھو۔''

''ناپاک زبان سے کیسے پڑھوں۔''

''روح ناپاک نہیں ہوتی۔ ایمان والوں کا دل سدا پاک رہتا ہے۔ دل ہی دل میں پڑھو۔''

ربانی دل میں پڑھنے لگا اور اٹھنے لگا۔ اس سے پڑھا نہیں جا رہا تھا۔ رحمانی نے کہا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں، تم کمزور ہونے کے باوجود ان لوگوں کو جہنم میں پہنچاتے رہے ہو۔

چلو اس شیطانی مجسمے کو گراؤ۔ آج ان کا قصہ تمام کر ہی دو۔"

ربانی نے زمین پر رینگنے والے پجاری کو دونوں ہاتھوں میں اٹھایا۔ اسے سر سے بلند کیا پھر اسے شیطان کے سامنے پھینک دیا۔ رحمانی نے دوڑ لگاتے ہوئے اچھل کر شیطان کو لات ماری۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دوسری فلائنگ کک ربانی نے لگائی۔ دوسری ٹانگ کے ٹوٹتے ہی وہ قد آور شیطان اوندھے منہ گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ پجاری سمیت کتنے ہی حبشی اس کے نیچے دب کر مر گئے۔ جو بچ گئے وہ بھاگتے چلے گئے۔ کالا جادو وہاں سے ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔

وہ دونوں محل میں آ گئے۔ ربانی پاک و صاف ہونے کے لیے باتھ روم میں چلا گیا۔ ہلالہ کی حالت تشویش ناک تھی۔ معروف اور تجربہ کار ڈاکٹر علاج کرنے آ گئے تھے۔

تاباں اور سلطانہ یاقوت اس کے سرہانے کھڑی آیتیں پڑھ رہی تھیں۔ رحمانی اسے مایوس ہو کر دیکھ رہا تھا۔ تعویذ دوا اس کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی اور اسے سانسیں لینے سے روک رہی تھی۔

آخر سانس رک ہی گئی۔ ماں روتی ہوئی دھاڑیں مارتے ہوئے بیٹی سے لپٹ گئی۔ وہ ماں اس کی پیدائش کے پہلے لمحے سے اس کی سلامتی کے لیے دن رات ایک کرتی رہی۔ لیکن سلامتی کسے ہے؟ کسی کو نہیں...

☆☆☆

وہ ہلالہ کی تدفین ہونے تک سلطانہ یاقوت کے ساتھ رہے۔ دنیا کی ہر غم زدہ ماں صبر کر لیتی ہے۔ اسے بھی رفتہ رفتہ صبر آ جاتا۔ وہ تینوں اس کے محل سے آ گئے۔

شیطان کو مارو تو وہ بظاہر مرتا ہے لیکن اپنی باقیات چھوڑ جاتا ہے۔ ہلالہ ان دونوں کے دماغوں میں اپنے بدن کے بے باک نظارے چھوڑ گئی تھی۔ وہ ہوشربا نظارے ان کے لاشعور میں چھپ گئے تھے۔

فی الحال سیاسی مصروفیات اہم ہو گئی تھیں۔ سپر پاور وہائٹ اسکائی سے سمجھوتا ہو رہا تھا۔ معظم خان اور اعظم خان کی حکومت گرنے والی تھی۔ آئندہ الیکشن میں وہ دونوں بڑی آسانی سے کامیاب ہو کر اقتدار حاصل کر سکتے تھے۔

وہ بوستان کو ایک خوبصورت مثالی ملک بنانے کے سلسلے میں مصروف ہو گئے۔ معظم خان نے ویلر سے شکایت کی۔ "کیا آپ ان دونوں سے دوستی کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں اقتدار سے محروم کرنے والے ہیں؟"

ویلر نے کہا۔ "ان سے دوستی کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم تم سے دشمنی کریں گے۔ فی الحال یہ ہو گا کہ موجودہ حکومت گر جائے گی۔ جلد ہی انتخابات ہوں گے۔ تمہارے مقابلے میں ربانی اور رحمانی ہوں گے۔ وہ سیاسی ہتھکنڈے نہیں جانتے۔ بوستان کے تمام حلقوں میں تمہارا... ووٹ بینک بہت زیادہ ہے۔ سیاسی چالیں چلو۔ ہم سے شکایتیں نہ کرو۔"

روڈنی ویلر حالات سے مجبور ہو کر ان دونوں سے سمجھوتا کر رہا تھا۔ وہ ان کی غیر معمولی جادوئی صلاحیتوں کے باعث کامران سے بندھ گیا تھا۔ اس نجومی کو قید کیا جاتا تھا تو ویلر بھی کسی کار میں یا کسی کمرے میں قیدی بن جاتا تھا۔ کامران کو جو تکلیف پہنچائی جاتی تھی۔ وہی تکلیف ویلر کو پہنچتی تھی۔

ربانی اور رحمانی سے سمجھوتا کرتے ہی اسے عارضی طور پر نجات مل گئی تھی۔ ایسے وقت سائنس داں ہوکس نے اپنی ایک مشین کے ذریعے انکشاف کیا کہ ربانی اور رحمانی زمینی مخلوق نہیں ہیں۔ شاید کسی سیارے سے آئے ہیں۔

مشین کی اسکرین نے دکھایا تھا کہ آسمان کی بلندیوں سے مختلف اوقات میں تین ستارے ٹوٹ کر زمین پر آئے تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی آسمان سے ٹوٹنے والے ستارے زمین کی طرف آتے ہیں اور آتے آتے تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن وہ تین ستارے تحلیل ہو کر گم نہیں ہوئے تھے۔ مجسم ہو گئے تھے۔

ربانی اور رحمانی کے علاوہ ایک اور ستارہ مجسم ہو کر اسکرین پر نظر آتا رہتا تھا پھر جھلک دکھا کر گم ہو جاتا تھا۔

ہوکس نے کہا۔ "یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ تیسرا ستارہ یا تیسری ہستی خود کو ظاہر کیوں نہیں کر رہی ہے؟ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اس ستارے سے کسی طرح رابطہ ہو جائے۔ وہ خود کو ظاہر نہ کرے تو کم از کم اپنی آواز ہی سنائے۔"

ربانی اور رحمانی کے دماغوں میں بھی یہ بات آ رہی تھی کہ اسکرین پر نظر آنے والا خاکہ ان کا مخالف نہ ہو۔ وہ اس ارضی دنیا میں آ گیا ہے۔ ان کی طرح کسی کیمرے اور مشین کی گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ دونوں زمین پر آ کر نہیں چھپ رہے ہیں لیکن وہ چھپ رہا ہے۔ کیوں پُراسرار بن رہا ہے؟

جب ہوکس سونے کے لیے گیا تھا تب وہ دونوں اس کی تجربہ گاہ میں آ گئے تھے۔ مشین کو آن کر کے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

پہلے تو اسکرین پر دھند چھائی رہی۔ سفید باریک ذرات اچھلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ رحمانی نے اس مشین کی ٹائم واچ میں بیس گھنٹے پیچھے کا وقت سیٹ کیا تو وہ مشین بیس گھنٹے پیچھے چلی گئی۔ اب وہ خاکہ متحرک دکھائی دے رہا تھا۔

وہ اسے توجہ سے دیکھنے لگے۔ وہ خاکہ کہیں بیٹھا ہوا تھا، متحرک نہیں تھا پھر اچانک ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھاگتا ہوا اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔

وہ اسکرین چند ساعتوں کے لیے خالی ہو گئی۔ پھر دو خاکے کہیں سے دوڑتے ہوئے آ گئے۔ ربانی نے کہا۔ ''یہ ہم ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ہاں۔ ہم ہی ہوں گے اور ہم وہاں پہنچے ہیں، جہاں وہ تیسرا خاکہ تھا۔''

''اگر یہ ہم ہیں تو یاد کرو۔ ہم بیس گھنٹے پہلے یہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟''

''ہم ورشا کا بھید معلوم کرنے نادیدہ ہو کر اس کی طرف گئے تھے اور اس کی خوشبو کے قریب پہنچ گئے تھے۔''

''اور ہمارے وہاں پہنچتے ہی وہ فرار ہو گئی تھی۔ ہم پھر اس کے پیچھے گئے تھے۔''

وہ بول رہے تھے اور دیکھ رہے تھے۔ اسکرین پر دو خاکے کسی ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں وہ تیسرا خاکہ بیٹھا ہوا تھا۔

رحمانی نے کہا۔ ''تعجب ہے تین خاکے ایک جگہ نظر آ رہے ہیں۔ کیا ہم بیس گھنٹے پہلے تیسرے وجود تک پہنچ گئے تھے؟''

''ہم اس وقت ورشا کے پاس پہنچے تھے۔ وہ ایک آبشار کے قریب ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی تھی۔''

وہ ربانی کے بازو کو جوشیلے انداز میں پکڑ کر بولا۔ ''یہ عظیم بدھا کی بیٹی ورشا ہے۔ ہم بیس گھنٹے پہلے اسی جگہ پہنچا ہوئے تھے۔''

ربانی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کوئی شبہ نہیں ہے۔ رحمانی! یہ... یہ ورشا ہے۔ اور یہ دیکھو ادھر یہ دو خاکے اسکرین سے چلے گئے ہیں۔ ورشا نے ہم سے التجا کی تھی کہ چند گھنٹوں کے بعد اسے مکمل آتما شکتی حاصل ہو جائے گی۔ ہم ابھی روبرو نہ آئیں۔ وہ خود سامنے آئے گی۔''

''یہ بھید کھل گیا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح خلا کے کسی حصے سے ایک ستارے کی طرح ٹوٹ کر آئی ہے۔''

''وہ بھی ہماری طرح یہ پہیلی بوجھنا چاہتی تھی کہ اس دنیا میں کہاں سے آئی ہے؟''

''یہ راز کھل رہا ہے کہ ہم تینوں ارضی باشندے نہیں ہیں۔ خلا کے کسی حصے سے آئے ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''بیس گھنٹے گزر گئے۔ ورشا نے وعدے کے مطابق ہم سے رابطہ نہیں کیا ہے۔''

''تو پھر چلو۔ ہم پھر ایک بار اطلاع دیے بغیر اس کے روبرو جائیں گے۔ دیکھیں تو سہی وہ کیا کر رہی ہے؟''

''رحمانی! ایسا کرو کہ تم جاؤ۔ میں یہاں اسکرین پر دیکھتا رہوں گا کہ تم اس دوسرے خاکے کے ساتھ یعنی ورشا کے ساتھ یہاں دکھائی دے رہے ہو یا نہیں؟''

رحمانی وہاں سے چلا گیا۔ ربانی نے سرچ کا بٹن دبایا تو ایک خاکہ نظر آنے لگا۔ یہ اندازہ تھا کہ وہ رحمانی ہو گا۔

اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہیلو رحمانی! اسکرین پر خاکہ نظر آ رہا ہے۔ یہ تم ہی ہو گے؟''

رحمانی نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''یہ دیکھو میں ایک ہاتھ اٹھا کر فضا میں لہرا رہا ہوں۔''

''ہاں۔ یہ خاکہ بھی یہی کر رہا ہے۔ یہ تم ہی ہو۔ ابھی کہاں پہنچے ہو؟ کیا وہ نظر آ رہی ہے؟''

''میں ابھی عظیم بدھا کے مجسمے کے قریب ہوں۔ یہاں ہم بیس گھنٹے پہلے آئے تھے لیکن وہ نہیں ہے۔ یہاں اس کی مہک بھی نہیں مل رہی ہے۔''

''ہمیں کیا سمجھنا چاہیے؟ کیا وہ پھر ہم سے چھپ رہی ہے یا کسی مصیبت سے دوچار ہو رہی ہے؟''

''ربانی...! اپنے نادیدہ فون کے ذریعے فضا میں کال نشر کرو۔ ہو سکتا ہے تمہاری آواز اس کے کانوں تک پہنچ جائے۔''

اچانک ہی اسپیکر سے اس کی آواز سنائی دی۔ ''میرے لیے پریشان نہ ہوں۔''

ربانی نے کہا۔ ''رحمانی! فوراً آؤ۔ ورشا بول رہی ہے۔''

وہ واپس آ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''اس مشین نے ہم تینوں کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہ ہمارے گوشت پوست کے وجود اور چہروں کو نہیں دکھا سکے گی۔ ہم کسی کیمرے کی گرفت میں نہیں آئیں گے۔''

''تم کہاں ہو؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ چند گھنٹوں بعد ہمارے روبرو آؤ گی؟''

''میں وعدے کے مطابق پندرہ گھنٹے بعد آئی تھی۔ اس وقت ہالہ اپنے بیڈروم میں ربانی کو جذباتی انداز میں

زیب کرچکی تھی۔ وہ شیطانی معجون اس کے اندر منتقل کرچکی تھی۔ دونوں گناہ کے مرتکب ہورہے تھے۔"

وہ بول رہی تھی۔ "میں نے ابھی ابھی آتماشکتی حاصل کی تھی۔ میری پاکیزگی مجھے گناہ گاروں سے دور رہنے کی تاکید کررہی تھی۔ مجھے دور ہی دور سے اس کے کام آنا تھا لیکن اس معجون کی وجہ سے شیطانی قوت اس پر حاوی ہوگئی تھی۔"

پھر وہ بولی۔ "رحمانی! میں تمہیں خبردار کرتی ہوں۔ ربانی سے فاصلہ رکھو۔ اس کا جھوٹا پانی نہ پیو۔ اس کی پلیٹ میں نہ کھاؤ۔ اس کی استعمال کی ہوئی چیز استعمال نہ کرو۔ میرا مشورہ ہے۔ فی الحال تمام دنیاوی معروفیات اور ذمے داریوں کو ترک کرو۔ دن رات عبادت کرو۔ عبادت کی پاکیزگی تمہارے اندر کی غلاظت کو دھو ڈالے گی۔"

ربانی سن رہا تھا اور پریشان ہورہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں تمہارے بیان کو نہیں جھٹلاؤں گا لیکن میں اندر سے صاف ستھرا ہوگیا ہوں۔ کسی طرح کی غلاظت اور گواری محسوس نہیں کررہا ہوں۔ یقین سے کہتا ہوں، کسی طرح کی شیطانی قوت مجھ پر غالب نہیں آرہی ہے۔"

وہ بولی۔ "شیطان کی یہی خوبی ہے کہ وہ انسان کے اندر خود کو ظاہر نہیں کرتا ہے۔ چپ چاپ آدمی کا ہم خیال اور ہمدرد بن کر اس کی سوچ اور اس کے مزاج کو بدلتا رہتا ہے۔"

رحمانی نے کہا۔ "ہر انسان اپنے اندر کی خامیوں کو دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہے۔ خدا کرے تمہارا اعتماد درست ہو اور شیطان تم پر مسلط نہ ہو۔ لیکن ورشا آتماشکتی کے ذریعے تمہارے اندر شیطانی اثرات کو دیکھ رہی ہے۔ تم اس کی بات مان لو۔ دو چار روز صبر و تحمل سے انتظار کرو۔ اگر تمہارا باطن پاک صاف ہوگا تو پھر تمہاری طرف سے کبھی کسی طرح کا منفی ردِعمل ظاہر نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھوں گا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ ابھی تاباں کے پاس جارہا ہوں۔ پچھلے پندرہ گھنٹوں سے اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔"

"میں بھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"جب میں ہو آؤں تب جاؤ۔ اس سے باری باری ملنا مناسب رہے گا۔"

"اچھی بات ہے لیکن تاباں کو پہلے سمجھایا جائے کہ وہ ہم سے پردہ کرے۔ ہمارے سامنے نقاب میں رہے۔"

وہ سرکاری محل کی خواب گاہ میں تھی۔ اجازت لے کے ربانی پندرہ منٹ کے بعد پہنچا تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سامنے تھی لیکن نظر نہیں آرہی تھی۔ سر سے پاؤں تک عبا میں چھپی ہوئی تھی۔ جو رحمانی چاہتا تھا، وہی ہورہا تھا۔

اس نے تعجب سے اعتراض کیا۔ "تاباں...! یہ کیا؟ مجھ سے چھپ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "رحمانی سے بھی چھپتی رہوں گی۔ تم دونوں پردہ نشینی کی وجہ اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔"

اس کا سر جھک گیا۔ اس نے کہا۔ "اب تمہیں دیکھنے کی ایک ہی صورت رہ گئی ہے۔ میں تم سے آج ہی نکاح پڑھواؤں گا۔"

"تم دونوں جو فیصلہ کرو گے، میں مان لوں گی۔"

"میں ابھی جاکر رحمانی سے بات کرتا ہوں۔ آخری فیصلہ یہی ہوگا کہ تم میرے نکاح میں آؤ گی۔"

وہ رحمانی کے پاس آگیا، اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، جاتے ہی آگئے؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "وہ عبا اور نقاب میں چھپی ہوئی ہے۔ ایک ذرا دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کیا مصیبت ہے، پہلے سے زیادہ للچا رہی ہے۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "رحمانی! میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔ تم ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں آج ہی اسے اپنی منکوحہ بنا لینا چاہتا ہوں۔"

رحمانی اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ورشا تاباں کی ہم شکل ہے۔ وہ میری خواب گاہ میں میرے خوابوں میں آتی رہی ہے، مجھے چاہتی ہے۔ میں اسے منکوحہ بناؤں گا۔ تاباں تمہاری ہے۔"

وہ خوش ہوکر بولا۔ "میرے رحمانی...! تم نے بہت ہی الجھے ہوئے مسئلے کو ایک پل میں حل کردیا ہے۔ تاباں آج ہی میری زندگی میں آجائے گی۔"

"آج نہیں ربانی! جلدی نہ کرو۔ کچھ روز انتظار کرو۔"

"کیوں انتظار کروں؟"

"تم آسیب زدہ ہو۔ ورشا نے کہا ہے کہ شیطان ہمارے ہاتھوں مرنے کے باوجود تمہارے اندر زندہ ہے۔"

"وہ جھوٹ کہتی ہے۔"

وہ انتظار کرنے کے مشورے پر جھنجلا گیا تھا، اس نے کہا۔ "میں آج ہی اسے اپنی خواب گاہ میں لے آؤں گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرے ہوتے ہوئے تاباں کو شیطان سے نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ میری ازدواجی

مسرتوں کو ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔"

"میں تمہاری مسرتوں کو ٹال کر کیا کروں گا۔ جبکہ اس کی طلب سے دست بردار ہو رہا ہوں۔"

"میں اندر کی بات سمجھ رہا ہوں۔ تم بظاہر دست بردار ہو رہے ہو، حقیقتاً تاباں پر دل اٹکا ہوا ہے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہے۔ پلیز تم تاباں پر رحم کرو۔ اس کے لیے چند روز تک اپنا جائزہ لیتے رہو۔ جب میں زبان دے رہا ہوں کہ وہ تمہاری ہے تو پھر ہر حال میں تمہاری رہے گی۔"

ربانی نے کہا۔ "یہ تمہارے ناقص خیالات ہیں۔ بہر حال، میں بحث نہیں کروں گا، انتظار کروں گا۔" وہ ناگواری سے منہ بنا کر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

وہ دونوں اس جذبے سے دنیا میں آئے تھے کہ بوستان کو ایک مثالی بستی بنائیں گے۔ ان کا عزم و حوصلہ قائم تھا۔ ان کی جدوجہد رنگ لا رہی تھی۔ ایسے وقت وہ نادیدہ شیطانی چکروں میں پڑ گئے اور اپنے ذاتی معاملات و جذبات میں الجھتے جا رہے تھے۔

اس رات وہ دونوں اپنے اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ ورشا اپنے وعدے کے مطابق آدھی رات کو رحمانی کے پاس آ گئی۔ وہ ہو بہو تاباں تھی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا پھر بے یقینی سے خود ہی اپنے بازو میں زور کی چٹکی لی۔ تکلیف کے احساس نے یقین دلایا کہ وہ سچ مچ آئی ہے۔ خواب نہیں ہے۔

ورشا ہنسنے لگی پھر اس نے پوچھا۔ "یقین ہو گیا؟"

"ہاں۔" وہ بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔

"پلیز ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔"

اس نے کہا۔ "پلیز، مجھے چھو کر یقین کرنے دو۔"

"ہوس کی ابتدا دیکھنے اور چھونے سے ہوتی ہے۔ ہلال نے بے پردہ جھلکیاں دکھا کر تمہاری ہوس کو جگا دیا ہے۔ وہ بھی تاباں کی ہم شکل تھی۔ میں بھی ہوں۔ ہمارے چہرے ہمارے بدن ایک جیسے ہیں۔ وہ بدن تمہیں میری طرف پکار رہا ہے اور تم چھونے کے بہانے مجھے پالینا چاہتے ہو۔"

"کیا میں نے تم سے سچا پیار نہیں پایا ہے؟ تم مجھے چاہتی ہو اسی لیے آئی ہو کہ میں تمہیں حاصل کر لوں؟"

"ہاں، میں تمہیں سوچتی ہوں۔ تمہیں یاد کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھے حاصل کر لو لیکن مجھے پالینے کی منزل تک پہنچنے کا راستہ بہت ہی کٹھن ہے۔"

"کٹھن کیوں ہے؟ کیا رکاوٹیں ہیں؟"

"میں بتاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔ ابھی ربانی اور تاباں کے درمیان جو رکاوٹیں ہیں، ان شیطانی رکاوٹوں سے تمہیں نمٹنا ہے۔"

"تمہاری آتما شکتی کیا کہتی ہے؟"

"تمہیں بڑی مصیبتوں سے گزرنا ہے اور تم پر مصیبتیں لانے والا کوئی دشمن نہیں ہے، دوست ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "دوست یعنی ربانی؟"

ورشا نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یا اللہ...! مجھ پر اور ربانی پر رحم فرما۔ یا میرے اللہ...! وہ دوست ہے۔ دوست ہی رہے۔"

اس وقت ربانی اپنے کمرے میں جاگ رہا تھا۔ نیند اڑ گئی تھی۔ تاباں اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔ وہ آج ہی اس کی منکوحہ بن سکتی تھی۔ آج ہی اس کی خواب گاہ میں آسکتی تھی لیکن رحمانی نے نکاح خوانی کے معاملے کو ٹال دیا تھا۔ اس کی آغوش میں آنے والی تاباں کو دور کر دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے سے نکل کر رحمانی کے دروازے پر آیا۔ اس سے تاباں کے متعلق بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بند دروازے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اندر سے ورشا کی رس بھری آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ دونوں کسی بات پر ہنس رہے تھے۔

ذہن میں بات آئی۔ "اچھا تو مجھے تاباں سے دور کر کے ورشا کے ساتھ موج مستی ہو رہی ہے۔"

وہ نادیدہ ہو کر بند کمرے میں ان کی تنہائی میں آ گیا۔ پھر ورشا کو دیکھتے ہی دم بخود رہ گیا۔ نگاہوں کے سامنے تاباں کھڑی تھی۔ گیروے رنگ کے بلاؤز اور ساڑی میں تھی۔ ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔ اس کا ہندوانی حسن لوٹ رہا تھا۔ اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اگر وہ لمحہ بھر کے لیے بھی رکتا تو تاباں نظر آنے والی سے جا کر لپٹ جاتا۔

وہ فوراً ہی اپنے بیڈ روم میں واپس آ گیا۔ ایک دیوار سے لگ کر خلا میں تکنے لگا۔ ذہن چیخ رہا تھا کہ اس نے ابھی تاباں کو وہاں دیکھا ہے۔ عقل کہہ رہی تھی ورشا کو دیکھ کر آ رہا ہے۔ بہر حال جسے بھی دیکھا تھا وہ حوا کی بیٹی تھی۔ کسی بھی پہلو سے آدم کے بیٹے کو پاگل بنا رہی تھی۔

دل نے کہا۔ "تاباں کے پاس جائے۔ رحمانی بھی تاباں کے ساتھ خوبصورت لمحات گزار رہا ہے۔ مجھے بھی پہنچنا

تاباں کے ساتھ رومانی اور جذباتی لمحات کو انجوائے کرنا چاہیے۔“

دوسرے ہی لمحے وہ محل کے اندر پہنچ گیا۔ وہ حسینہ اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ نیند کی حالت میں اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ بیڈ کے سرے تک پہنچ گیا۔ وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئی۔

وہ اس پر جھک گیا۔ اس کے کان میں دھیمی سی سرگوشی کی۔ ”تا۔۔۔ با۔۔۔ں۔ میں ہوں۔ تمہارے خواب میں آیا ہوں...“

اس کی آنکھ کھل گئی۔ خواب گاہ میں زیرو پاور کی دھیمی سی روشنی تھی۔ وہ خلا میں تکنے لگی۔

پھر دھیمی سی سرگوشی ابھری۔ ”چلو میں خواب میں نہ سہی۔ سچ مچ آجاؤں تو کیا شکایت کرو گی؟“

وہ اس کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر بیٹھ گئی۔ ایک چادر کو اٹھا کر جلدی سے اس میں چھپتے ہوئے بولی۔ ”یا اللہ! تم آئے ہو۔ یہاں نادیدہ ہو اور مجھے دیکھ رہے ہو؟“

”تمہیں تو روز ہی دیکھتا تھا لیکن آج حجاب میں چھپ کر مجھے تڑپا رہی ہو۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ کیوں چادر میں چھپ گئی ہو؟ خدا کے لیے اپنی صورت دکھاؤ۔“

”یہاں سے چلے جاؤ۔ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“

”تم چھپ کر اور تڑپا رہی ہو۔ میں ابھی کسی قاضی کو پکڑ کر لاتا ہوں۔ ابھی میری منکوحہ بن جاؤ۔“

”ازدواجی رشتے کو کھیل نہ بناؤ۔ آدھی رات کے وقت چھپ کر نکاح نہیں پڑھایا جاتا۔“

”تم مجھے ٹال رہی ہو۔“

”نہیں، میں راضی ہوں۔ گواہی کے لیے رحمانی کو بلاؤ۔“

وہ سمجھ گیا کہ تاباں ابھی راضی نہیں ہوگی اور چادر سے باہر نہیں آئے گی، اس نے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں، ایک وعدہ کرو۔

رحمانی کو نہیں بتاؤ گی کہ میں یہاں آیا تھا۔“

”وعدہ کرتی ہوں، یہاں کی باتیں اسے نہیں بتاؤں گی۔“

وہ خدا حافظ کہہ کر وہاں سے آگیا۔ جذباتی حرارت سے بدن پہلے ہی گرم ہو رہا تھا۔ ناکامی و نامرادی کے باعث دماغ بھی گرم ہو گیا۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

غلطیاں کرنے والے صحیح سمت میں سوچنا بھول جاتے ہیں۔ اپنی غلطیوں کو ہی درست سمجھتے رہتے ہیں۔ اس کے دماغ میں یہ خواہش تڑپ رہی تھی کہ وہ ابھی تاباں کو حاصل کر لے۔ کم از کم اس کا ہاتھ ہی پکڑ لے۔

اسی وقت اس کے سینے میں جلن سی محسوس ہوئی۔ رات کو جو کھایا تھا، وہ ہضم نہیں ہوا تھا۔ وہ باتھ روم میں آکر واش بیسن پر جھک گیا۔ اس کے حلق سے وہی کھٹا، کسیلا اور بدمزہ سا پانی نکلا، جو بلانہ کے ذریعے اس کے اندر منتقل ہو گیا تھا۔

وہ پریشان ہو کر کلیاں کرنے لگا۔ زبان اور حلق سے بدمزگی ختم نہیں ہو رہی تھی۔ دور، بہت دور سے ڈھول تاشے کی دھیمی دھیمی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ باتھ روم سے نکل کر ڈگمگاتا ہوا کمرے میں آکر پھر بیڈ پر گر پڑا۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ وہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

تحت الشعور میں چھپی ہوئی خباثت ابھر کر سامنے آنے لگی۔ اس نے اور رحمانی نے شیطان کے جس مجسمے کو توڑ کر اوندھے منہ گرا دیا تھا وہ پھر جڑ گیا تھا۔ پہلے کی طرح سالم ہو کر زمین پر کھڑا تھا۔ اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی۔

تمام حبشی خوشی سے نعرے لگا رہے تھے اور نیزے اچھال اچھال کر رقص کر رہے تھے۔ ربانی شیطان کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے، ماتھے پر ٹیکا لگائے، گیندے کا ہار پہنے سحر زدہ سا بیٹھا تھا۔ پجاری نے مشروب سے بھرا ہوا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر ہونٹوں سے لگا کر پینے لگا۔

ربانی نے پیالے کا آخری گھونٹ پی کر اسے اپنے سر پر مارا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اسی وقت آنکھ کھل گئی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اب تک شیطان کے قدموں میں بیٹھا ہوا ہے۔ فجر کے سناٹے میں اذان ابھرنے لگی۔

وہ اذان کی آواز سنتے ہی بڑے ایمانی جذبے سے جل جلالہ و جل شانہ کہتا تھا۔ اس وقت بھول گیا۔ اذان سن کر بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس کے اندر تاباں پکار رہی تھی۔

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ رحمانی نے کہا۔ ”نماز کے لیے چلو۔“

اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا پھر ناگواری سے منہ بنا کر بولا۔ ”تم چلو، میں آتا ہوں۔“

اس نے نادیدہ ہو کر باہر آ کر دیکھا۔ رحمانی مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اطمینان ہوا کہ وہ راستے کا پتھر نہیں بنے گا۔ اس وقت دل میں نماز نہیں تھی، اس کی دھڑکنوں میں تاباں مچل رہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے وہ تاباں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مصلے پر تھی۔ فجر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ اس نے عبادت کے دوران عجیب سی ناگواری بو محسوس کی۔ ربانی کی قدرتی خوشبو ختم ہو گئی تھی۔ اس لیے یہ خیال نہیں آیا کہ اس کی خواب گاہ میں پھر ربانی آ گیا ہے۔

وہ قریب... قریب سے دیکھ رہا تھا۔ انتظار کر رہا تھا کہ نماز ادا ہو جائے تو اسے ہاتھ لگائے۔ وہ نقاب میں نہیں تھی۔ آئینے کی طرح شفاف اور چاندی کی طرح اجلی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے سوچا۔ اگر اس کے پاس بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو وہ متاثر ہو گی۔ بغیر اجازت آنے پر اعتراض نہیں کرے گی۔

وہ نماز کے بعد دعا مانگ رہی تھی اسی وقت فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ تاباں نے منہ پر ہاتھ پھیر کر فون کو اٹھایا۔ ننھی سی اسکرین کو دیکھا پھر بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں رحمانی! بولو؟“

اس نے پوچھا۔ ”ابھی آ جاؤں؟“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”دس منٹ بعد آؤ۔“

وہ فون بند کر کے مصلے سے اٹھ گئی۔ ربانی نادیدہ تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”یہ رحمانی کباب میں ہڈی بنتے آ رہا ہے۔ میں ظاہر نہیں ہو سکوں گا۔ تاباں کو چھو بھی نہیں سکوں گا۔“

وہ سامنے ہی عبا پہن رہی تھی۔ نقاب میں پوری طرح چھپ جانے والی تھی۔ اگر رحمانی ابھی نہ آتا تو ربانی اسے پردے میں رہنے نہ دیتا۔ اس سے عبا اور نقاب چھین لیتا۔ فی الحال مجبور ہو گیا تھا۔

دس منٹ بعد رحمانی وہاں آ گیا۔ تاباں کو دیکھ کر بولا۔ ”تم پر خدا کی رحمت ہو۔ یہ اچھا ہے کہ مجھ سے بھی پردہ کر رہی ہو۔ کیا ربانی یہاں آیا تھا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں۔ ویسے میں بڑی دیر سے عجیب سی بو محسوس کر رہی ہوں۔“

”میں بھی محسوس کر رہا ہوں لیکن یہ ربانی کہاں گیا ہے؟ آج مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ اس کی طبیعت ناساز ہو گی۔ اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تو۔ وہاں نہیں تھا۔“

تاباں نے کہا۔ ”تعجب ہے، کیا آج اس نے نماز نہیں پڑھی ہے؟“

”یہی تو میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کا ایمان کمزور کیوں ہو گیا ہے۔ اس نے نماز کیوں چھوڑی ہے؟“

تاباں نے پوچھا۔ ”کیا تم اس کے پاس پہنچ نہیں پا رہے ہو؟“

”اس کی خوشبو جہاں ہوتی ہے وہاں پہنچ جاتا ہوں لیکن خوشبو نہیں مل رہی ہے۔ تمہاری خواب گاہ میں یہ عجیب سی بو کیسی ہے؟“

”شاید پورے محل میں ہے۔ چلو باہر چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ دونوں اس کمرے سے باہر آ گئے۔ دوسرے کمرے اور راہداری میں گئے۔ ربانی ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ ناگواری مہک بھی ساتھ چلی آ رہی تھی۔

وہ دونوں خواب گاہ میں آ گئے۔ تاباں نے روم پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے کہا۔ ”ربانی کو کال کرو۔ وہ آخر گیا کہاں ہے؟ تم تو اسے کہیں بھی دیکھ لیتے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”نادیدہ ہونے کے بعد ہم اپنی مرضی سے ایک دوسرے کو دکھائی دیتے ہیں۔ مرضی نہ ہو تو روپوش رہتے ہیں۔“

وہ تاباں کے سامنے نادیدہ ہو گیا۔ بند کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر ایک کوریڈور میں پہنچ کر رک گیا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ وہ ناگواری بو نہیں تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر پہلے کی وہ بو وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ ایک سوال چیخ رہا تھا۔ کیا ربانی وہاں موجود ہے؟ کیا اس کی بو بدل گئی ہے؟

اس نے سوچتی ہوئی اور چبھتی ہوئی نظروں سے تاباں کے کمرے کی طرف دیکھا۔ عقل سمجھا رہی تھی' کچھ توقع کے خلاف ہو رہا ہے۔

ربانی خواب گاہ کے اندر تاباں کے قریب تھا۔ رحمانی کے جاتے ہی گویا مدتوں کے بعد تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ اس پر تڑپا دینے والی بات یہ تھی کہ وہ عبا اور نقاب اتار رہی تھی۔ اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ للچا رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں پکارا۔ ”تاباں...!“

وہ حیرت سے اچھل کر آواز کی سمت گھوم کر چیخ پڑی۔ وہ اس کی مجرمانہ موجودگی سے لرز گئی۔

ربانی نے کہا۔ ''پلیز اعتراض نہ کرنا۔ کوئی شکایت نہ کرنا۔ تم میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہو۔ میں تمہیں دھڑکنوں سے لگانے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ آؤ تاباں...!''

وہ آگے بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''رک جاؤ۔ مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ میں شرم سے مر جاؤں گی۔''

اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا۔ وہ فوراً ہی کترا کر دور جانے لگی لیکن اس نے چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ ایسا صرف ایک ساعت کے لیے ہوا۔ دوسری ہی ساعت میں ربانی کے منہ پر جیسے ہتھوڑا آ کر لگا۔ تاباں پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ آگے رحمانی کھڑا تھا۔

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ تو تمہیں معاف کر دوں گا۔''

ربانی نے اچانک ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری ہے۔ تمہیں ہماری خلوت میں نہیں آنا چاہیے۔ جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

وہ بھی فولادی تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کھا کر رحمانی چکرا گیا۔ وہ تاباں کے سامنے ڈھال بن کر بولا۔ ''تم پر شیطان سوار ہے۔ میں تمہیں نکاح کے بغیر تاباں کو ہاتھ لگانے نہیں دوں گا۔ مجھ سے جتنی دشمنی کرنا ہے کرو لیکن یہاں سے چلو۔''

ربانی نے اچانک اس پر چھلانگ لگائی لیکن وہ ہوشیار تھا۔ فوراً ہی نادیدہ ہو کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ناکام چھلانگ نے اسے اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ رحمانی نے اس کے منہ پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

وہ بھی نادیدہ ہو گیا۔ دونوں گم ہو گئے۔ اب وہ دونوں اپنی مرضی کے بغیر ایک دوسرے کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔

تاباں آنکھیں پھاڑ کر خواب گاہ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی کہ دونوں وہاں ہیں۔ ربانی وہاں سے جانا نہیں چاہے گا اور رحمانی اسے بھگا کر رہے گا۔

ربانی دونوں ہاتھ پھیلائے تاباں کے چاروں طرف اندھے کی طرح رحمانی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ رحمانی بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ربانی تاباں کے آس پاس ہوگا۔ ایسی ہی اندھی تلاش میں وہ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے پھر ٹکراتے ہی ایک دوسرے کو دبوچ لیا تاکہ کوئی پھر کہیں گم نہ ہو جائے۔

ربانی گم رہ کر اسے مات دے کر اپنی ضد منوانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور اس پر حملے بھی کر رہا تھا۔

رحمانی اینٹ کا جواب پتھر سے دے رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو رگید رہے تھے۔ قدرتی طور پر دونوں بلا کے شہزور تھے۔ ربانی کو قدرتی توانائی کے علاوہ شیطانی قوت بھی حاصل ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ رحمانی پر حاوی نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ تھا۔ اس کی مدافعتی قوت بڑھ گئی تھی۔ ربانی اس کی گرفت سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

وہ چشم زدن میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ آنکھ مچولی ختم ہو گئی۔ وہ نظر آنے لگے۔ تب رحمانی نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے الگ ہو گئے۔

فیصلہ اب پہاڑ کی چوٹی پر ہونے والا تھا۔ ربانی نے کہا۔ ''کیوں دشمنی کر رہے ہو؟ یاد کرو ہم کتنے اچھے دوست تھے۔ اپنی ذات سے بڑھ کر ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔''

''اب ہمارے درمیان تمہارے شیطانی ارادے حائل ہو گئے ہیں۔ تم تاباں کو نکاح کے بغیر حاصل کرلینا چاہتے ہو۔''

''چلو پھر ابھی تمہارے سامنے نکاح پڑھواتا ہوں۔''

''جب تک قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھ کر نہیں سناؤ گے۔ تب تک تمہارا نکاح قابلِ قبول نہیں ہوگا۔''

وہ چیخ کر بولا۔ ''میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ تم میرے ہاتھوں سے مرو گے اور ابھی ہزاروں فٹ کی گہری کھائی میں جاؤ گے۔''

یہ کہتے ہی اس نے پھر حملہ کیا پھر ان کی جنگ جاری ہو گئی۔ وہ وقفے وقفے سے بولتے وقت رک جاتے تھے۔ پھر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے تھے۔ ایک اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آ رہا تھا۔ دوسرا اس کے شیطانی دھرم کو ٹھوکروں میں اُڑا رہا تھا۔

صبح سے دوپہر پھر دوپہر سے شام ہو گئی۔ دونوں بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ اپنے اپنے لہو میں نہا رہے تھے۔ تاباں اس دوران میں انہیں کال کرتی رہی اور وہ نادیدہ فون کے ذریعے اسے تسلی دیتے رہے۔

اسے دونوں زخمیوں کی روداد معلوم ہو رہی تھی اور وہ پریشان ہو رہی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ دونوں غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ کوئی کسی سے مات نہیں کھائے گا اور نہ کوئی فاتح بن سکے گا پھر کیا ہوگا؟

کچھ بہتری نظر نہیں آ رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں

بھی دونوں مقابلے پر ڈٹے رہے۔ شیطان کی ضد تھی کہ وہ تاباں کے ساتھ رات گزارے گا اور ایمانِ محکم کہہ رہا تھا کہ وہ حیا والی پر گناہ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دے گا۔

وہ کھانا پینا بھول گئے تھے۔ تھک ہار کر سو جانے والے نہیں تھے۔ انہوں نے دن سے رات پھر رات سے صبح کردی۔ دن کی روشنی میں آرمی کا ایک ہیلی کوپٹر وہاں سے گزر رہا تھا۔ دو افسران نے دوربین کے ذریعے دو افراد کو پہاڑ کی چوٹی پر لڑتے دیکھا۔ ایک نے کہا۔ ''یہ کون ہیں؟ لہو لہان دکھائی دے رہے ہیں۔''

وہ ہیلی کوپٹر ان کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ دوسرے افسر نے کہا۔ ''وہ ایک دوسرے پر حملے کر رہے ہیں۔ اس ویران اور سنسان پہاڑی پر یہ کہاں سے آئے ہیں؟''

ہیلی کوپٹر اس بلندی پر اترنے لگا تو وہ دونوں لڑتے لڑتے رک گئے۔ آرمی کے دو افسران اور کئی سپاہی ہیلی کوپٹر سے اتر کر ان کی طرف آرہے تھے۔ پھر ان کی صورتیں دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔ ایک افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ ''مسٹر آدم ربانی! مسٹر آدم رحمانی! یہ آپ ہیں؟ او گاڈ! آپ دونوں لہولہان ہوگئے ہیں۔ اتنی بلندی پر آکر ایک دوسرے کو زخمی کر رہے ہیں؟''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''ہمیں یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے ہیں۔''

ربانی نے کہا۔ ''ہمارا ایک ذاتی مسئلہ ہے، ہم اسے اپنے طور پر حل کر رہے ہیں۔''

افسر نے تعجب سے کہا۔ ''کیا مسائل اس طرح حل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو عداوت ہے۔ جبکہ آپ دونوں کی دوستی اور اتحاد بے مثال ہے اور آپ دونوں جلد ہی بوستان کو ایک مثالی ملک بنانے والے ہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''انشاء اللہ ہم ضرور بوستان کو صحیح معنوں میں اسلامیہ جمہوریہ بنائیں گے۔ فی الحال آپ ہمارے ذاتی معاملے میں پریشان نہ ہوں۔ ہمیں تنہا چھوڑ دیں۔''

''سوری! خون ریزی ہر حال میں غیر قانونی ہوتی ہے۔ آپ دونوں کو حراست میں لے کر آپس کی دشمنی کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ نادیدہ ہو کر ہم سے نہ چھپیں۔ راضی خوشی ہمارے ساتھ چلیں اور زخموں کی مرہم پٹی ہونے تک ہماری نگرانی میں رہیں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''اگر آپ اس بات کی ضمانت دیں کہ ربانی آپ کی نگرانی میں رہ کر ایک پل کے لیے بھی نادیدہ نہیں ہوگا تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

ربانی نے سوچا۔ ''فی الحال جنگ بندی ہوجائے تو اچھا ہے۔ مرہم پٹی بھی ہوجائے گی اور تاباں تک پہنچنے کی ازسرِنو پلاننگ کرسکوں گا۔''

اس نے افسران سے کہا۔ ''میں آپ کی تحویل میں جسمانی طور پر موجود رہا کروں گا۔ لیکن بارہ گھنٹے کے بعد نادیدہ ہوجاؤں گا۔ آپ ابھی وقت دیکھ لیں۔''

وہ دونوں راضی ہو کر ان کے ساتھ ہیلی کوپٹر میں آکر بیٹھ گئے۔ دارالسلطنت شبیر آباد پہنچ کر ملٹری اسپتال میں داخل ہوگئے۔

آرمی کے ایک افسر نے معظم خان اور اعظم خان کو اطلاع دی کہ ربانی اور رحمانی ایک پہاڑ کی چوٹی پر کن حالات میں پائے گئے ہیں۔ یہ خوش کرنے والی اطلاع تھی کہ وہ دوست تھے اب ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ ناقابلِ شکست مخالفین کا اتحاد ٹوٹ گیا ہے۔

انہوں نے اپنے ان داتا روڈنی ویلر کو یہ خوش خبری سنائی۔ اس وقت سائنس دان ہوکس اپنی مشین سے حاصل ہونے والی معلومات پہنچا رہا تھا۔

معلومات یہ تھی کہ چوبیس گھنٹے پہلے وہ دو خاکے اسکرین پر دکھائی دیے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کہاں تھے؟ پورا ایک دن اور پوری ایک رات لڑتے رہے۔ پھر اسکرین پر ایک ہیلی کوپٹر دکھائی دیا۔ اس میں سے کئی خاکے باہر آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ لڑنے والے دو خاکے ان کے ساتھ کہیں چلے گئے۔

ادھر بوستان کی آرمی نے یہ رپورٹ پیش کی تھی کہ ربانی اور رحمانی میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے ہیں۔ ادھر اس رپورٹ سے ثابت ہوگیا کہ مشین پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ربانی اور رحمانی کو پیش کرتی رہی ہے۔

ویلر نے معظم خان سے کہا۔ ''یہ سنہری موقع ہے۔ فوراً ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ معلوم کرو کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہوگئے ہیں؟ جتنی جلدی ہوسکے ان کی کمزوریاں معلوم کرو۔''

معظم نے تاباں کے پاس آکر پوچھا۔ ''بیٹی! یہ ربانی اور رحمانی اچانک ایک دوسرے کے دشمن کیوں ہوگئے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''برتن ایک جگہ رہیں تو کبھی ٹکرا جاتے ہیں،

تشویش کی بات نہیں ہے۔''

''مگر ابو! معمولی نہیں ہے۔ وہ دونوں زخموں سے چور ہوکر اسپتال میں پڑے ہیں۔ پلیز مجھ سے نہ چھپاؤ۔ حقیقت کیا ہے، مجھے بتاؤ۔''

''ابو! ان کی ایسی کوئی کمزوری نہیں ہے جس سے فائدہ اٹھا کر آپ اپنی حکومت کو گرنے سے بچائیں گے۔''

''میری حکومت کے گرنے سے پہلے وہ دونوں گر چکے ہیں۔ ایسے وقت باپ کے کام آؤ۔ کسی ایک سے میری دوستی کراؤ۔''

''آگ اور پانی میں دوستی نہیں ہوتی۔ سوری! آپ مجھ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاسکیں گے۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''میں نادان نہیں ہوں۔ یہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ وہ تمہاری خاطر آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک ہی تمہیں اپنی ملکیت بنانا چاہتا ہے اور دوسرا تم سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔''

وہ بیٹی سے ناراض ہوکر چلا گیا۔ ویلر کے نمائندے اسپتال میں ربانی اور رحمانی سے ملاقات کررہے تھے۔ ان سے پوچھ رہے تھے کہ وہ ایک جان دو قالب تھے۔ اب ان کی آپس کی دشمنی سب کو حیران کررہی ہے۔

رحمانی نے کہا۔ ''آپ حضرات کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم کل تک پھر دوست بن جائیں گے۔''

وہ بٹ اسکائی کے سفیر نے سمجھ لیا کہ ربانی کو شیشے میں اتارا جاسکتا ہے، رحمانی ہاتھ نہیں آئے گا۔ سفیر نے ویلر اور ربانی کے درمیان ٹیلی فونک رابطہ کرادیا۔

ویلر نے فون پر کہا۔ ''ربانی صاحب! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ رحمانی نے آپ جیسے پہاڑ کو اسپتال پہنچا دیا ہے؟''

وہ تن کر بولا۔ ''میں نے بھی اسے اسی اسپتال میں پہنچایا ہے۔ باقی دادے میں کسی سے ذاتی معاملات پر گفتگو نہیں کروں گا۔''

''بے شک، بے شک میں آپ سے کسی بھی ذاتی معاملے کو چھیڑنے کی حماقت نہیں کروں گا۔ میں تو شروع سے آپ کا فین ہوں۔ آپ زخمی ہیں۔ آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ اب سے آٹھ گھنٹے بعد میں اس اسپتال سے چلا جاؤں گا۔ پھر کسی وقت بھی آپ سے ملاقات کے لیے آجاؤں گا۔''

''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ مجھ سے ملنے آئیں گے۔ میرے ملک کے عوام آپ کی آمد پر جشن منائیں گے۔''

''نہیں، ایسی رسمی خوشیاں نہ منائیں۔ میں نادیدہ ہوکر خاموشی سے آؤں گا۔ بوستن میں آئندہ انتخابات کے سلسلے میں اہم باتیں کروں گا پھر چلا جاؤں گا۔''

''یو آر موسٹ ویلکم مسٹر ربانی!'' کچھ دیر بعد اس نے فون پر رحمانی سے کہا۔ ''مسٹر رحمانی! میں یہ سن کر حیران ہوں کہ ربانی نے آپ جیسے پہاڑ کو زخموں سے چور کردیا ہے، یقین نہیں آرہا ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''یقین کرلیں۔ بڑے بڑے پہاڑ زلزلوں کے ایک ہی جھٹکے سے ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں۔ میں بھی زخموں سے چور ہوگیا ہوں۔ میں انسان ہوں۔ سپرمین نہیں ہوں۔''

''آپ ہمارے لیے سپرمین ہیں۔ میں شروع سے آپ کا فین ہوں۔ آپ کی عیادت کے لیے آج ہی وہاں آنا چاہتا ہوں۔''

''پلیز یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔ میں کل کسی وقت خود ہی وہاں آکر اہم سیاسی معاملات پر گفتگو کروں گا۔''

اس نے خوشی کا اظہار کیا۔ ''یو آر موسٹ ویلکم مسٹر رحمانی!''

اسے ان دونوں کا یہ اہم منصوبہ سمجھ میں آگیا تھا کہ آئندہ انتخابات میں وہ دو الگ الگ محاذ بنا کر اپنے ووٹ کو تقسیم کرنے کی حماقت کرنے والے ہیں۔ معظم خان اور اعظم خان کے لیے واقعی سنہری موقع تھا۔ وہ اپنے متحدہ ووٹ بینک کے ذریعے ان سے بازی لے جاسکتے تھے۔

تابندہ ربانی اور رحمانی کا مضبوط مثلث ٹوٹ چکا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے فون پر رحمانی سے کہا۔ ''میں سہمی ہوئی ہوں۔ وہ آٹھ گھنٹے بعد اسپتال سے نادیدہ ہوکر میرے پاس ضرور آئے گا۔''

وہ بولا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں اس سے غافل نہیں رہوں گا۔ وہ جب بھی تمہارے پاس آئے گا، تو میں اس کی گردن پر سوار ہوجاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ربانی نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ ''میں کب سے انتظار کررہا ہوں۔ تم اس کے ساتھ جینے ہونے میں لگی ہوئی تھیں؟''

''تم نے جینے ہونے کے قابل کہاں رکھا ہے؟

دہشت زدہ کر رہا ہے۔ میں تمہاری ہوں۔ تمہاری ہی رہوں گی لیکن تم شیطانی نجلت سے حاصل کرنے کی غلطی کر رہے ہو۔ کتنے نیک اور ذہین تھے۔ آج اپنی سستی خواہش اور ہوس کو نہیں سمجھ رہے ہو۔"

وہ بولا۔ "میں ایک سیدھی سی بات جانتا ہوں۔ ابھی نکاح پڑھواؤ ابھی میری ہو جاؤ۔ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ رحمانی سے دوستی ہو جائے گی۔ ورنہ..."

تاباں نے کہا۔ "ورنہ تم اسے ختم کر دو گے۔ وہ بھی کہتا ہے کہ تمہیں ختم کر سکتا ہے۔ لیکن وہ تمہیں نہیں، تمہارے اندر کے شیطان کو ختم کرے گا۔"

ربانی! دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو۔ وہ مجبور ہو کر تم سے لڑ رہا ہے۔ ورنہ تمہاری بہتری چاہتا ہے۔"

"میرے سامنے اس کا قصیدہ نہ پڑھو۔ ورنہ ابھی آجاؤں گا۔"

وہ ڈر کے خاموش ہو گئی۔

وہ بولا۔ "میں نے آرمی افسران کو زبان دی ہے۔ اگلے ساڑھے سات گھنٹے تک ان کی نگرانی میں رہوں گا۔ اس کے بعد دیکھنا کہ کیا ہونے والا ہے؟"

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

"کہاں جائے؟ کیسے ربانی سے خود کو چھپائے؟"

اس پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ وہ ربانی سے نہیں، اس کے اندر کے شیطان سے گھبرا رہی تھی۔ ان دونوں کی طرح نادیدہ ہو جانا چاہتی تھی یا گناہ کی زد میں آنے سے پہلے مر جانا چاہتی تھی۔

وہ شکست خوردہ سی ہو کر فرش پر بیٹھ گئی پھر دوزانو ہو کر سجدے میں چلی گئی۔

صرف وہی معبود حالات کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ دن کو رات میں اور رات کو دن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہی محافظ ہے۔ خود حفاظت کرنے نہیں آتا لیکن حفاظتی ذرائع پیدا کر دیتا ہے۔

اس نے سجدے سے سر اٹھا کر دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے دائیں طرح سر گھمایا تو یکبارگی چونک گئی۔ اس کے پاس دوسری تاباں بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ قبلہ رو دوزانو تھی۔ وہ عظیم بدھا کے آسن کے مطابق بیٹھی ہوئی تھی۔ گیروے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں بدن کی گوری رنگت جھلک جھلک کر رہی تھی۔

تاباں نے حیرانی سے پوچھا۔ "ورشا...؟ تم ورشا ہو؟"

وہ تاباں کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ "ہاں، ورشا ہوں۔ پہلی بار تمہارے سامنے آئی ہوں۔"

"ربانی اور رحمانی تمہارے بارے میں بولتے رہتے ہیں۔ تم نے آتما شکتی حاصل کی ہے۔ ان دونوں کی طرح غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل ہو۔"

اس نے ورشا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "میں بہت خوش ہوں مجھ سے ملنے آئی ہو۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "میں رحمانی کے لیے پریشان ہوں۔ وہ چوبیس گھنٹوں تک تمہاری حفاظت کرنے کے لیے جنگ لڑتا رہا ہے۔ میری آتما شکتی کہتی ہے۔ ربانی اس سے کم نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے شکست نہیں کھائیں گے اور کوئی کسی پر غالب نہیں آسکے گا۔ یہ جنگ نہ رکی تو دونوں ہی مارے جائیں گے۔"

تاباں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یا اللہ...! میں کیا کروں؟ یہ خونیں کھیل میرے لیے جاری ہے۔ میں مر جاؤں گی تو کھیل ختم ہو جائے گا۔"

"تم ایمان والی ہو۔ خودکشی حرام ہے اس لیے تم نہیں مرو گی۔"

"درست کہتی ہو۔ ایمان مجھے روکتا ہے اور شیطان مر جانے پر مجبور کر رہا ہے۔"

"نہیں تاباں! تمہیں نقصان پہنچے گا تو رحمانی صدمے سے ٹوٹ جائے گا۔ میں اپنے رحمانی کو ٹوٹنے نہیں دوں گی اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔"

تاباں نے پوچھا۔ "کہاں...؟"

"جہاں ربانی پہنچ نہیں سکے گا۔ تمہیں ڈھونڈتا رہ جائے گا۔ اس طرح رحمانی کو اطمینان ہو گا۔ ان دونوں کے درمیان خون ریزی رک جائے گی۔ صرف سرد جنگ رہے گی۔ تمہارا ربانی اور میرا رحمانی دونوں سلامت رہیں گے۔"

تاباں نے خوش ہو کر اس کے گلے لگتے ہوئے کہا۔ "ابھی میں نے سجدہ کیا، ابھی میرا رب مہربان ہو گیا۔ تمہیں میری سلامتی کے لیے یہاں بھیج دیا۔ مجھے چھپا لو ورشا! میرے ربانی سے نہیں، شیطان مردود سے چھپا لو۔"

وہ چپ ہو گئی۔ یکلخت ورشا کے ساتھ نادیدہ ہو گئی۔

☆☆☆

اچھی شہرت رکھنے والے سیاست داں اور فوج کے اعلیٰ افسران اسپتال میں آگئے تھے۔ ربانی اور رحمانی کے ساتھ ایک کامن روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے

چہرے اور ہاتھ پاؤں جہاں تک نظر آ رہے تھے۔ وہاں مرہم پٹی دکھائی دے رہی تھی۔ لباس کے اندر بھی گہرے زخم تھے۔ اس کے باوجود وہ بڑی صحت مندی اور توانائی سے چلتے ہوئے کامن روم میں آئے تھے۔

رحمانی نے فوج کے افسران اور سیاست داں سے کہا۔ ''ہم چند گھنٹوں میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ تمام زخم اندر سے بھرتے جا رہے ہیں۔ اگلے چند گھنٹوں میں ایک زخم کا بھی نشان نہیں رہے گا پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

ربانی نے کہا۔ ''یہ اچھا ہے کہ اسپتال میں ہم سب کو یکجا ہو کر باتیں کرنے کا موقع مل رہا ہے۔''

ایک سیاست داں نے کہا۔ ''آپ دونوں ہمارے لیے بہت ضروری ہیں۔ اگلے الیکشن میں اپنے ملک بوستان کی تقدیر سنوارنے کے لیے ہم آپ کے شانہ بشانہ جدوجہد کرتے رہیں گے۔ ہماری کامیابی یقینی ہے لیکن آپ دونوں میں پھوٹ پڑ جائے گی تو ہم کسی ایک علاقے سے بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکیں گے۔''

ربانی نے کہا۔ ''پھوٹ تو پڑ گئی ہے۔ اب میری سیاسی پارٹی میں رحمانی نہیں رہے گا۔ یہ اپنی پارٹی بنا کر الیکشن لڑے گا۔''

رحمانی نے کہا۔ ''میں آپ تمام حضرات کی موجودگی میں ربانی سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے ذاتی معاملے کو سیاست سے الگ رکھے۔ ہمیں بوستان میں اسلامی جمہوریت قائم کرنے کے لیے متحد رہنا ہوگا۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اور اسلامی آئین نافذ کرنے کے لیے ہمارا اتحاد لازمی ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''میں رحمانی کی بات مانتا ہوں۔ اگر آپ حضرات کے سامنے رحمانی بھی میری ایک بات مان لے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے اتحاد کو نہیں توڑ سکے گی۔''

فوج کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''بہت بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے مسٹر رحمانی کو آپ کی بات مان لینی چاہیے۔''

ایک سیاست داں نے پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

ربانی نے کہا۔ ''بات بالکل اتنی سی ہے۔ ناخن برابر بھی نہیں ہے۔ میں معظم خان کی صاحبزادی تاباں سے آج ہی نکاح پڑھوانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بدترین رقیب بن گیا ہے۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''تعجب ہے۔ اتنی سی بات پر اپنے ملک بوستان کی ترقی و خوشحالی کو داؤ پر لگایا جا رہا ہے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''مسٹر رحمانی! اگر تاباں ربانی سے راضی ہے تو آپ کو رقیب نہیں بننا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''بخدا میں رقیب نہیں ہوں۔ دل و جان سے چاہتا ہوں کہ یہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں لیکن آج نہیں...''

ربانی نے کہا۔ ''آج نہیں.. کل نہیں.. پرسوں بھی نہیں۔ اس سے پوچھا جائے، یہ میری فوری شادی خانہ آبادی کے خلاف کیوں ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''اس لیے کہ یہ اندر سے بیمار ہے۔ جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں۔ ہم دونوں قدرتی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ کسی کے اندر کی باتیں بھی جان لیتے ہیں۔ میں ایسی ہی صلاحیت کے ذریعے ربانی کو اندر سے بیمار دیکھ رہا ہوں۔ یہ بیماری تاباں کو نقصان پہنچائے گی۔ جب تک اس کا علاج نہیں ہوگا تب تک...''

وہ گرجتے ہوئے بولا۔ ''یہ بکواس کر رہا ہے۔ آپ میرا میڈیکل چیک اپ کرائیں۔ مجھے کوئی خطرناک مرض تو کیا، عام سی بیماری بھی نہیں ہے۔''

''یہ جسمانی نہیں۔ روحانی طور پر بیمار ہے۔ آپ حضرات مانیں یا نہ مانیں۔ اس کے مثبت خیالات منفی ہو گئے ہیں۔ یہ انسان سے رفتہ رفتہ شیطان بنتا جا رہا ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''شیطان تم ہو۔ میرے خلاف زہر اگل رہے ہو۔ کیا آپ حضرات کی عقل تسلیم کرتی ہے کہ میں اب انسان نہیں رہا ہوں؟ کیا یہ بچوں جیسی مضحکہ خیز بات ذہن میں آتی ہے کہ ابھی آپ کے سامنے آدم ربانی نہیں، کوئی شیطان بھیس بدل کر موجود ہے؟''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''مسٹر رحمانی! آپ مسٹر ربانی پر جو الزام عائد کر رہے ہیں، اسے صرف جادو ٹونا کرنے والے ہی تسلیم کریں گے۔ تعلیم یافتہ اور باشعور افراد کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔''

رحمانی پریشان ہو کر تمام حاضرین کو دیکھ رہا تھا۔ سب ہی ربانی کی حمایت میں بول رہے تھے۔ اس کے اندر کی شیطانی خباثت کو نہ کوئی سمجھ سکتا تھا، نہ تسلیم کر سکتا تھا۔

وہاں اس چھوٹی سی عدالت میں فیصلہ سنایا جا رہا تھا کہ رحمانی سراسر غلطی پر ہے۔ ابھی وہ ربانی سے ہاتھ ملائے گا تو تمام نفرتیں اور عداوتیں ختم ہو جائیں گی۔

ایسے وقت ورشا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''تمہاری نیک نیتی کو کوئی نہیں سمجھے گا۔ تم ربانی کے رقیب

اور دشمن کہلاتے رہو گے۔"

وہ بولا۔ "میں بری طرح الجھ گیا ہوں۔"

"میں تمہاری الجھن کو سلجھانے آئی ہوں۔ تمہارا نیک مقصد یہ ہے کہ تاباں اس وقت تک ربانی سے دور رہے جب تک کہ اس کے اندر سے وہ مجنون اور شیطانی غلاظت ختم نہ ہو جائے۔"

"ہاں۔ اس وقت تک تاباں کو اس سے دور رکھنا ہو گا۔"

"تو پھر مطمئن ہو جاؤ، میں نے دور کر دیا ہے۔ ربانی اس کے سائے تک بھی پہنچ نہیں پائے گا۔"

اس نے حیرانی سے سر گھما کر دیکھا۔ وہ قریب ہی کھڑی تھی۔ کسی کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف وہی دیکھ سکتا تھا۔

وہ پھر جھک گئی۔ اس کے کان میں بولی۔ "میں کسی وقت تنہائی میں آؤں گی پھر باتیں ہوں گی۔ فی الحال میری آتما شکتی پر بھروسا کرو۔ ربانی بھی تاباں تک پہنچ نہیں پائے گا۔"

وہ اتنا کہہ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "مسٹر رحمانی! آپ کو اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنا چاہیے۔"

وہ جیسے شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ "میں تسلیم کروں گا لیکن ربانی پہلے تاباں سے یہ پوچھ کر آئے کہ وہ آپ حضرات کے فیصلے کو تسلیم کر رہی ہے یا نہیں؟ وہ مان لے گی تو میں بھی مان لوں گا۔"

ربانی نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ ضرور تسلیم کرے گی، میں ابھی جا کر پوچھتا ہوں۔"

وہ چشم زدن میں وہاں سے غائب ہو گیا۔ سیدھا سرکاری محل میں آ گیا۔ تاباں کی خواب گاہ میں پہنچا تو وہ نظر نہیں آئی۔ اس نے واش روم کی طرف دیکھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا سا تھا۔ دل نے کہا۔ "وہ دروازے کے پیچھے ہے۔"

اس نے ہولے سے پکارا۔ "تاباں...!"

اسے جواب نہیں ملا، وہ بولا۔ "دو باتیں کرنے آیا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا۔"

اس نے تمام محل میں تلاش کر لیا مگر تاباں کہیں نہ ملی۔

وہ محل سے باہر کھلی فضا میں آ کر لمبی سانسیں لینے لگا۔ کسی بھی سمت سے اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ غصے سے پلٹ کر اسپتال کے کامن روم میں آیا پھر رحمانی کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ "کہاں ہے وہ؟ تم نے اسے کہاں چھپایا ہے؟"

رحمانی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ تاباں اپنے محل میں ہو گی۔"

"وہاں نہیں ہے۔ تم معصوم بنو۔"

تمام حاضرین ان دونوں کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ربانی کہہ رہا تھا۔ "جب تم نے دیکھا کہ یہاں تمہاری مرضی کے خلاف فیصلہ ہو رہا ہے تو تم نے تاباں کو مجھ سے دور کر دیا۔ اسے ایسی جگہ چھپایا ہے، جہاں میں پہنچ نہیں پا رہا ہوں۔"

رحمانی نے حاضرین کی سمت دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "آپ حضرات دیکھ رہے ہیں، میں یہاں سے کہیں نہیں گیا۔ افسران گواہ ہیں کہ میں مسلسل ان کی نگرانی میں ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔"

وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر کہہ رہا تھا۔ "آپ حضرات نہ جادو ٹونا کو مانتے ہیں، نہ ہی میں کالا جادو جانتا ہوں۔ آپ فرمائیں میں یہاں بیٹھے ہی بیٹھے تاباں کو کہاں لے جا کر چھپا سکتا ہوں؟"

سب نے کہا۔ "بے شک آپ یہاں تھے۔ پلیز مسٹر ربانی! آپ رحمانی پر کھوکھلا الزام نہ لگائیں۔"

رحمانی نے کہا۔ "یہ میرے خلاف بکواس کرتا رہے گا۔ مجھے تاباں کی تلاش میں جانا ہے اس لیے آرمی کی کسٹڈی سے نکل رہا ہوں۔"

ربانی نے کہا۔ "میں بھی جا رہا ہوں۔"

آرمی کے اعلیٰ افسر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا۔ "جسٹ اے منٹ! آپ دونوں ساتھ جائیں گے۔ وہ نہیں ملے گی تو پھر لڑیں گے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے رہیں گے۔"

ربانی نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں، لڑائی نہیں ہو گی لیکن وہ اسے ملے گی اور مجھ سے چھپے گی تو میں دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ چلا گیا۔ اسی وقت رحمانی بھی اس اجلاس سے غائب ہو گیا۔ وہ دونوں نادیدہ ہو کر ایک دوسرے کو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اپنی مرضی ہو تو دکھائی دینے لگتے تھے۔ سیکڑوں ہزاروں میل دور رہ کر جب چاہیں ایک دوسرے سے بول سکتے تھے۔

فی الحال ایک دوسرے کی بو سے معلوم کر لیتے تھے کہ کون کہاں ہے؟ اور رحمانی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہی کہیں ہے۔ وہ ورشا کے پاس پہنچ کر یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ اس نے تاباں کو کہاں چھپایا ہے؟

مگر وہ ورشا کے پاس جاتا تو ربانی بھی وہاں پہنچ جاتا پھر نادیدہ رہ کر ان کی باتیں سنتا رہتا۔ وہ صبر کر رہا تھا۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ پوری طرح محفوظ ہے۔

ربانی نادان نہیں تھا۔ اس کی تلاش میں ناکام ہونے کے بعد اب ورشا کی طرف خیال جا رہا تھا۔

اب وہ ورشا کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن اس کی بھی مہک نہیں مل رہی تھی۔ وہ عظیم بدھا کے قد آور مجسمے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ اس مجسمے کے پیٹ میں رہتی تھی۔ اس نے وہاں جا کر دیکھا۔ اس پیٹ میں درجنوں بھکشو رہائش پذیر تھے۔ وہ نہیں تھی۔

پھر وہ اس آبشار کے قریب گیا جہاں وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر گیان دھیان میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ورشا وہاں بھی نہیں تھی۔ ربانی پھر رحمانی کی بُو کے قریب آ گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ رحمانی کے پیچھے رہ کر ہی ورشا تک پہنچ سکے گا۔

دیکھا جائے تو دونوں کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ بوستان کے معاملات پر برائے نام توجہ دے رہے تھے پھر اپنے ذاتی اور جذباتی مسائل میں الجھ رہے تھے۔

تاباں محل سے اچانک گم ہو گئی تھی۔ ماں باپ پریشان تھے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے پورے ملک میں اسے تلاش کر رہے تھے۔ رحمانی کے بارے میں یہ رائے قائم کی جا رہی تھی کہ اسی نے تاباں کو ربانی سے دور کیا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ وہ کہاں ہو گی؟

ماں مطمئن تھی کہ بیٹی جہاں بھی ہے، عزت آبرو کی سلامتی کے ساتھ محفوظ ہے۔

رحمانی گہری نیند میں تھا، اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ ورشا کے آنے سے آہٹ نہیں ہوئی تھی پھر بھی جیسے دل پر دستک ہوئی اور آنکھوں کے در کھل گئے، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس نے فوراً ہی گہری سانسیں لیتے ہوئے ربانی کی مہک کو محسوس کرنا چاہا۔ ورشا نے کہا۔ ''وہ نہیں ہے، میں اسے دیکھ کر آ رہی ہوں، وہ گہری نیند میں ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ، تاباں کہاں ہے؟ اسے کیسے چھپایا ہے کہ ربانی اسے ڈھونڈ نہیں پا رہا ہے؟''

''میں نے اسے روحانی حصار میں رکھا ہے۔ شیطانی قوت اس کا سراغ نہیں لگا سکے گی۔''

''تم پر خدا کی رحمت ہو۔ تم تاباں کے ساتھ بہت بڑی نیکی کر رہی ہو۔ میں اپنے رب سے دعا مانگتا ہوں۔ کوئی ایسا راستہ ملے کہ میں ربانی کے اندر پہنچ کر اس کے اندر کے شیطان کو مار سکوں۔''

وہ بولی۔ ''بہت مشکل ہے۔ شیطان کو مارو تو مرتا ہے پھر نئے بھیس میں پیدا ہو جاتا ہے۔''

''میں تاباں کے لیے فکر مند ہوں۔ وہ کب تک حصار میں رہ کر زندگی گزارے گی؟ کسی کھلی فضا میں جانے کے لیے ترستی رہے گی۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ وہ جب بھی کہیں جانا چاہے گی، میری آتما اسے اپنے اندر سمو لے گی۔ میں اسے پوری دنیا کی سیر کرا سکتی ہوں۔ تمہارے پاس بھی لا سکتی ہوں۔''

''ابھی ربانی گہری نیند میں ہے۔ تاباں کو یہاں لے آؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔''

''پہلے ربانی کے پاس جا کر اس کی خبر لوں گی۔ اس کی نیند سے اندازہ کروں گی کہ وہ اور کتنی دیر تک سوتا رہے گا پھر تاباں کو یہاں لاؤں گی۔''

وہ ذرا جذباتی سا ہو کر بولا۔ ''ورشا! میں خوش نصیب ہوں۔ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو۔ میری فکر اور پریشانیاں دور کرنے کے لیے تاباں کو تحفظ فراہم کر رہی ہو۔ آؤ، آج مجھے چھو لینے دو۔ تمہیں کسی حد تک پا لینے کو دل چاہ رہا ہے۔''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''ہمارے درمیان یہ فاصلہ رہے گا۔ ابھی تمہیں بھی ایک آزمائش سے گزرنا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟ کیسی آزمائش سے گزرنا ہو گا؟''

''یہی کہ مجھ سے دور دور رہنا ہو گا۔ مجھے چھو لینے اور پا لینے کی تمنا کرو گے تو مایوسی ہو گی۔''

وہ بے تابی سے ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ''ایسی تڑپانے والی باتیں نہ کرو۔ میں ابھی تمہیں سینے سے لگا لوں گا۔''

''میں خود تمہاری دھڑکنوں میں سما جانا چاہتی ہوں لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہو گی۔''

''ایسی کیا بات ہے؟ آرزو ابھی پوری ہو گی۔''

وہ یکلخت اس کے بالکل ہی قریب آ گیا پھر اس نے بازو پھیلا کر اسے آغوش میں لینا چاہا۔ کچھ ہاتھ نہ آیا، وہ گم ہو گئی۔

وہ بھی نادیدہ ہو کر بولا۔ ''ورشا! کیوں اچانک گم ہو گئی ہو؟''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''تم نہ ہوتی تو مجھے پکڑ لیتے اور ہم ہوس کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے۔ جبکہ ہمارے مقدر میں ایسا کچھ نہیں ہے۔''

''ہمارے مقدر میں کیا ہے؟ جو تمہیں معلوم ہے مجھے بتاؤ۔''

''بتاؤں گی۔ پہلے تاباں کو یہاں نے آؤں۔ اسے دیکھو باتیں کرو مطمئن ہو جاؤ پھر ہم اپنی باتیں کریں گے۔''

وہ وہاں سے آگئی۔ ربانی کے کمرے میں پہنچ گئی۔ تاباں کو حصار کے اندر سے باہر لانا تھا۔ اس سے پہلے یقین کرلینا چاہتی تھی کہ وہ دیر تک گہری نیند میں رہے گا۔

اس کی آتما نیند کی گہرائی اور خواب کی گرفت کو سمجھنے کے لیے ربانی کے اندر پہنچ گئی۔ وہ خواب کی رنگین دنیا میں تھا۔ کئی حسینائیں اس کے آس پاس حسن و شباب کے جلوے دکھا رہی تھیں۔ اس کے ذہن میں ہلالہ کا بدن نقش ہو گیا تھا اور ہلالہ' تاباں کا دوسرا روپ تھی۔ وہ حسیناؤں کے ہجوم میں تاباں کو ڈھونڈ رہا تھا۔

ایک بونا شیطان ٹرے لیے اس کے سامنے آیا اور بولا۔ ''پیو اور جیو۔ جو نہ ملے اس کا ماتم نہ کرو۔ جو دستیاب ہو اسے تاباں بنالو۔ وہ جو ہاتھ نہیں آرہی ہے، ایک دن ضرور ہاتھ لگے گی۔''

ربانی نے اسے گھور کر دیکھا پھر شراب کی ٹرے کو ایک ہاتھ مار کر گراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے صرف تاباں کا نشہ ہے۔ میرے اطراف حسیناؤں کا میلہ نہ لگاؤ۔ اس حسین بلا کو لاؤ۔ نہ لاسکو تو اس کا سراغ لگاؤ۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

ایک اور بونا شیطان اس غلیظ معجون کی پیالی ایک ٹرے میں لے کر آیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس کی ایک خوراک تمہاری مرادیں پوری کرے گی۔''

اس نے پیالی کو اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ آنکھیں بند کرلیں پھر کھولیں تو رنگین نظارے گم ہو گئے۔ وہ شیطان کے اپنی قد آور مجسمے کے سامنے کھڑا تھا۔ معجون کی گھٹی کسیلی ڈکار آئی تو مجسمے کے آگے سر جھکا کر دوزانو ہو گیا۔

اس کے اندر ایک بھدی سی آواز ابھری۔ ''تو ابھی اسے پالے گا۔ اسے دیکھے گا اور اس پر جھپٹ کر اسے اپنے شکنجے میں لے سکے گا۔ جا رحمانی کے پاس... وہ آنے والی ہے۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ''میں اُدھر جاؤں گا تو وہ میری بُو سے معلوم کرلیں گے کہ وہاں موجود ہوں۔ رحمانی پھر میرے مقابلے پر آئے گا تو وہ گم ہو جائے گی۔''

آواز آئی۔ ''میں تھوڑی دیر کے لیے تیرے اندر سے اپنی مہک نکال دوں گا۔ کوئی تیری موجودگی کو سمجھ نہیں پائے گا۔''

ربانی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً ہی بستر سے اچھل کر کھڑا ہوا پھر نادیدہ ہو کر رحمانی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ورشا کی آتما ربانی کے اندر سے نکل آئی تھی۔ اسے اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ رحمانی کو بدلتے ہوئے حالات سے آگاہ کرتی۔

اس وقت رحمانی ایک صوفے پر نیم دراز تھا۔ ورشا اور تاباں کا انتظار کررہا تھا اور ربانی ایک طرف کھڑا سوچ رہا تھا۔ ''یہ تنہا ہے۔ تاباں نہیں ہے لیکن بہت خوش نظر آرہا ہے۔ مجھے خواب میں آگہی ملی ہے۔ تاباں کو یہاں ہونا چاہیے۔ یہ جاگ رہا ہے۔ شاید اسی کا انتظار کررہا ہے۔ وہ آنے والی ہے۔''

ورشا کو ربانی کی مہک نہیں مل رہی تھی لیکن سمجھ رہی تھی کہ وہ موجود ہے۔ اس نے سوچا' رحمانی کو بھی اس کی موجودگی کا علم ہونا چاہیے۔ اسے دشمن سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔

اس نے اپنی شکتی سے ایک ناگواری بو پیدا کی۔ رحمانی صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے دماغ میں چبھتا ہوا سوال پیدا ہوا۔ اچانک یہ بو کیسے آرہی ہے؟

اس نے غصے سے خلا میں تکتے ہوئے کہا۔ ''ربانی! تم یہاں آکر چھپنا چاہتے ہو۔ مجھے تمہاری بو مل رہی ہے۔ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟ میں نہیں جانتا' تاباں کہاں ہے؟ پلیز یہاں سے جاؤ۔''

ربانی نے مایوس ہو کر سوچا۔ ''کیا وہ شیطانی خواب جھوٹا تھا؟ کیا شیطان نے میری بو ختم نہیں کی ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''تمہارے چپ رہنے سے میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ تم یہاں موجود ہو۔''

وہ بولا۔ ''ہاں میں موجود ہوں۔ مجھے شیطانی قوت سے معلوم ہوا ہے' تاباں یہاں آنے والی ہے۔''

''تمہاری شیطانی قوت سراسر بکواس ہے۔ نہ وہ یہاں آنے والی تھی، نہ کبھی آئے گی۔''

''ہاں، اب نہیں آئے گی۔ میں آگیا ہوں۔ تم نے اسے آنے سے روک دیا ہے۔''

''جب میں جانتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے تو اسے کس طرح آنے سے روکوں گا؟''

''جھوٹ مت بولو۔ جہاں اسے چھپایا ہے' وہاں سے وہ آنے والی تھی۔''

''تو پھر دن رات یہاں بیٹھے رہو۔ میں سونے جارہا ہوں۔''

وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ ربانی نے

کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ میں جا رہا ہوں مگر یہاں آتا رہوں گا۔''

وہ وہاں سے دور اپنی رہائش گاہ میں آ گیا۔ ورشا اسے دیکھ رہی تھی۔ رحمانی کے پاس آ کر بولی۔ ''وہ اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گیا ہے پھر کسی وقت آ سکتا ہے۔ تاباں کو یہاں لانا مناسب نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر کسی وقت اس سے ملاقات ہوگی۔ ابھی ہم اپنی باتیں کریں۔ تم نے یہ کہہ کر الجھا دیا ہے کہ مجھے تمہاری محبت میں آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔''

''ہاں۔ اس سلسلے میں بہت کچھ کہنا ہے لیکن ابھی یہاں رہ کر بات نہیں کر سکوں گی۔ ربانی کسی بھی وقت اچانک ہی آ کر ہماری باتیں سنتا رہے گا۔ میں پھر کسی وقت آؤں گی۔''

وہ چلی گئی۔ ورشا' تاباں' ربانی اور رحمانی کے حالات نے انہیں تنہا کر دیا تھا۔ ایک دشمنی کے باعث دور ہو گیا تھا۔ باقی تین دوستی کے باوجود ایک دوسرے سے مل نہیں پا رہے تھے۔ چوری چھپے مل کر بچھڑتے رہتے تھے۔ عجیب مایوس کن حالات سے گزر رہے تھے۔

☆☆☆

اب ربانی قبلہ رو ہو کر دوزانو ہو کر سجدہ نہیں کرتا تھا۔ جدھر سجدہ کرنا ہے ادھر ٹانگیں پھیلا کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بیٹھ جاتا تھا اور بڑی عقیدت سے کہتا۔ ''میں ایمان والوں کے خلاف شیطان مہربان کی پناہ مانگتا ہوں۔''

تاباں سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اپنا فیصلہ رحمانی کے ذریعے اسے سنا دے۔ اس سے کہہ دے کہ وہ دین ایمان کی طرف لوٹ آئے گا جب وہ روپوشی ترک کر کے ظاہر ہو جائے گی۔

اس نے رحمانی کے پاس آ کر پوچھا۔ ''میں سمجھوتا کرنے آیا ہوں۔ کیا تمہارے اندر رقابت نہیں ہے؟ کیا دل سے چاہتے ہو کہ تاباں میری شریک حیات بن جائے؟''

اس نے کہا۔ ''خدا گواہ ہے' میں ورشا کو شریکِ حیات بناؤں گا۔ تاباں صرف تمہاری ہے۔''

''میں ایمان کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ' کتنے عرصے بعد اسے اپنی منکوحہ بنا سکوں گا؟''

''جب اللہ کا نام تمہاری زبان پر آئے گا۔ تم قرآن مجید کی کوئی آیت پڑھو گے اور نماز قائم کرو گے۔''

''میں قسم کھا کر کہتا ہوں' یہ شرائط پوری کروں گا۔ پہلے تاباں کو پردۂ راز سے باہر لاؤ۔''

''سوری! پہلے نماز قائم کرو۔''

''تم ہماری یہ باتیں تاباں تک پہنچاؤ۔ مجھ سے دو بات کراؤ پھر وہ جو کہے گی وہی کروں گا۔''

''تم قسم کھا رہے ہو۔ میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یقین کرو' تاباں سے میرا رابطہ نہیں ہے۔ وہ جب سے گم ہوئی ہے' میں نے اس کی آواز بھی نہیں سنی ہے۔''

''پھر اتنے مطمئن کیوں ہو؟ اسے تلاش کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

''میرا دل کہتا ہے' وہ کہیں عزت و آبرو سے زندہ ہے۔''

''ورشا سے کہو' ہم پہلے کی طرح متحد ہو کر پیار و محبت سے رہیں گے۔ وہ ایک بار مجھ سے ملاقات کرے۔''

''خدا کرے ہم پہلے کی طرح پورے اعتماد سے متحد ہو جائیں۔ میں ابھی ورشا سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

انہیں رس بھری آواز کا ترنم سنائی دیا۔ ''میں موجود ہوں۔ سن رہی ہوں۔ ربانی! اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی کہ تم شیطان پر تھوک کر واپس آؤ گے۔ بولو مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تم سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم رحمانی کی موجودگی نہیں چاہتے... کیوں؟''

''کوئی سوال نہ کرو۔ رحمانی بھی اعتراض نہ کرے۔ پلیز میری رہائش گاہ میں آؤ۔ میں جا رہا ہوں۔''

ربانی اپنی رہائش گاہ کے بیڈ روم میں آ کر ٹہل رہا تھا۔ اسے ورشا کی آواز سنائی دی۔ ''میں آ گئی ہوں۔''

وہ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔ ''روبرو آؤ۔ پہلے بھی آ چکی ہو۔''

وہ نمودار ہو گئی۔ ربانی نے یکلخت لمبی سانس کھینچی۔ نگاہوں کے سامنے تاباں گیروے رنگ کے لباس میں کھڑی تھی۔ دل و دماغ میں چیخیں بجا رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی چیخ رہا تھا۔ یہ ورشا نہیں ہے۔ سر سے پاؤں تک دیکھ تیری تاباں ہے۔ یقین نہ ہو تو چل چھو کر دیکھ لے۔

وہ بے اختیار بولا۔ ''تاباں...!''

وہ بولی۔ ''میں ورشا ہوں۔''

''لیکن وہی حسن' وہی روپ' وہی بدن ہے صرف لباس بدلنے سے' ماتھے پر بندیا لگانے سے تاباں کی صورت اور اس کا وجود بدل نہیں جائے گا۔ تم میرے لیے تاباں ہو۔''

"چلو میں وہی ہوں۔ یہی سمجھو کہ روپوش ہو گئی تھی۔ سامنے آ گئی ہوں۔ بولو کہ مجھے حاصل کرنے کے لیے کیا کرو گے؟"

"تمہیں ابھی اپنی شریکِ حیات بناؤں گا۔ مجھے ایک ذرا چھو لینے دو پھر جو ہوگی، وہ کروں گا۔"

"رحمانی تم سے کہہ چکا ہے، پہلے اللہ کا نام زبان پر لاؤ گے۔ یقین دلاؤ گے کہ ایمان والے ہو۔"

وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "میں مانتا ہوں تم تاباں نہیں ہو، میں اس سے براہِ راست مل کر بات کروں گا۔"

ورشا نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا میں نے اسے کہیں چھپایا ہے؟ جہاں چھپایا ہے، وہاں کیا شیطانی صلاحیتوں سے پہنچ پا رہے ہو؟ اگر نہیں تو مان لو کہ آتما شکتی یعنی روحانی قوتوں کے آگے شیطان بے بس ہو جاتا ہے۔"

"مانتا ہوں۔ تاباں تک پہنچنے کے لیے سبھی باتیں مان لوں گا۔ پلیز اسے میرے سامنے لاؤ۔"

"اسے سامنے نہیں لاؤں گی۔ تم صرف آواز سنو گے۔"

"کیا وہ ابھی اس حصار سے باہر آ کر مجھ سے باتیں کرے گی؟"

"وہ باہر آئے گی۔ اسے کوئی چھو نہیں سکے گا۔ میں اسے اپنی آتما کے اندر چھپا کر لاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ گم ہو گئی پھر دوسرے ہی لمحے میں نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "تم دیکھو گے میں چپ رہوں گی۔ تاباں میرے اندر ہے۔ سنو وہ بول رہی ہے۔"

ربانی نے دیکھا۔ اس کے ہونٹ چپ تھے اور تاباں کی جانی پہچانی آواز ابھر رہی تھی۔ "ربانی..! میں بول رہی ہوں۔"

وہ ورشا کو یوں دیکھنے لگا جیسے اس کے اندر ڈوب کر تاباں تک پہنچنا چاہتا ہو۔ اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "تاباں! مجھ سے کیوں چھپ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "اس لیے کہ تم دین ایمان سے منہ چھپا رہے ہو۔"

"مجھے غلط نہ سمجھو۔ میں ایمان والا ہوں۔"

"تو پھر کلمہ توحید پڑھو۔"

وہ چپ رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "پڑھوں گا۔ تنہائی میں دعا کیا کروں گا اور پڑھوں گا۔"

"پہلے ایمان لاؤ پھر کوئی بات کرو۔ تعجب ہے ربانی...! تم مسلمان ہو۔ نام کے ہی سہی کلمہ تو یاد ہے پھر پڑھتے کیوں نہیں؟"

"ابھی پڑھو تو سامنے آ جاؤ گی۔"

ورشا نے کہا۔ "جب پورا یقین ہو جائے گا کہ شیطانی شکنجے سے نکل آئے ہو تو میں اسے ابھی لے آؤں گی۔"

تاباں نے کہا۔ "پڑھو۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔"

اس نے خود پر جبر کیا۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر کھولا تو 'ما' کی آواز نکلی۔ "ما... الا..."

تاباں نے کہا۔ "ما نہیں لا کہو۔"

اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "لا الہ۔ محمد۔ رسول..."

اس نے الا اللہ نہیں کہا۔ آخر میں بھی اللہ کا نام زبان پر نہیں آیا۔ شیطان کو کلمہ منظور نہیں تھا۔ شیطان کی منظوری نامنظوری سے کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقتاً شیطانی معجون اور رال کی غلاظت کے باعث اللہ کا پاک نام ادا نہیں ہو رہا تھا۔ ایک طرح سے وہ مجبور تھا۔ قابلِ رحم تھا۔

انسان غلطیاں کرتا ہے، تب ہی سزا کے طور پر مجبور، بے بس اور کمزور ہو کر شیطان کے زیرِ اثر آ جاتا ہے۔

تاباں نے کہا۔ "تم سمجھ رہے ہو۔ بولو اللہ کا نام تمہاری زبان سے تمہارے حلق سے اور تمہارے دل سے کیوں نہیں نکل رہا ہے؟"

وہ بولا۔ "کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نام لیا جائے۔ اس نام کے بغیر بھی زندگی گزرتی رہے گی۔"

وہ بولی۔ "کافر کی زندگی ایمان والی کے ساتھ نہیں گزرے گی۔ میرا خیال دماغ سے نکال دو۔"

وہاں رحمانی آ گیا۔ اس نے کہا۔ "یہ تسلیم کر لو کہ تم اندر سے خبیث ہو۔ یہ ارادہ، یہ عزم کرو کہ اپنی رگ رگ سے غلاظت کو خارج کر دو گے، تب ہی اللہ کا پاک نام لے سکو گے۔"

تاباں نے کہا۔ "اگر دل میں یہ ٹھان لیا ہے کہ اللہ کے بغیر زندگی گزارو گے تو صاف ظاہر ہے، تمہاری زندگی شیطان کے سائے میں گزرتی رہے گی۔ لوٹ آؤ۔ ورنہ آج کے بعد میری آواز بھی نہیں سن سکو گے۔"

وہ غصے سے بولا۔ "مجھے چیلنج نہ کرو۔ تمہارا وجود، تمہارا بدن میرے نیے ہے۔ میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ دنیا کے چپے چپے پر جا کر معلوم کروں گا کہ تمہیں کس ملک میں کس علاقے میں ورشا نے چھپایا ہے۔ میں اس کی بنائی ہوئی ریکھا کو توڑ کر تمہیں لے آؤں گا۔"

ورشا نے کہا۔ "تم چیلنج کرتے رہو۔ میں تاباں کو لے جا رہی ہوں۔ یہ تمہیں کہیں نہیں، صرف ایمان کے

راستے پر ملے گی۔''

ربانی نے اسے روکنے کے لیے اچانک اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ جہاں تھی وہاں پہنچا پھر اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ گرفت میں آ تو گئی لیکن وہ جسمانی وجود نہیں تھا۔

وہ محض آتما تھی۔ روح تھی۔ ایک نور تھا۔ ربانی کے دونوں بازو اس نور سے گزرتے ہوئے اپنے ہی سینے سے لگ گئے۔ وہ ہنستی ہوئی پیچھے ہٹ گئی پھر بولی۔ ''آؤ، مجھے پکڑلو۔ میرے اندر تابان موجود ہے۔ مجھے گرفت میں لے کر اسے بھی گرفتار کرسکو گے۔''

وہ بے بسی سے بولا۔ ''جاؤ، چلی جاؤ۔ میں جلد ہی تابان تک پہنچ کر تمہاری ریکھا شکتی کو توڑ کر اسے لے جاؤں گا۔''

ورشا نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے ساتھ تابان بھی چلی گئی۔ ربانی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''رحمانی! تم موجود ہو۔''

وہ بولا۔ ''میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔ لوٹ آؤ ربانی! تم کسی دشمنی کسی چیلنج کے بغیر تابان کو محبت سے حاصل کرسکو گے۔ میری ایک بات مان لو۔''

''ماننے والی بات ضرور مانوں گا۔''

''آبِ زم زم سے کلیاں کیا کرو۔ اس پاکیزہ پانی کو حلق سے اتارتے رہو۔ اندر کی غلاظت دھلتی رہے گی۔ زبان کے پاک ہوتے ہی اللہ کا پاک نام لے سکو گے۔''

''میں آبِ زم زم کو نہیں مانتا۔''

''نہ مانو۔ صرف اسے پیتے رہو اور کلیاں کرتے رہو۔ اس آبِ پاکیزہ سے تمہیں فائدہ نہیں ہوگا تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، میں سوچوں گا۔ جاؤ یہاں سے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''ہمیں بوستان کے معاملات میں متفق اور متحد رہنا ہے۔ میں ویلر سے مذاکرات کے لیے جارہا ہوں، پلیز میرے ساتھ چلو۔''

اس نے اعتراض نہیں کیا۔ دونوں وہائٹ اسکائی کے کیپٹل ٹاؤن میں پہنچ گئے۔ وہائٹ اسمبلی میں تمام سیاست داں موجود تھے۔ ویلر کہہ رہا تھا۔ ''ربانی اور رحمانی نے چھ گھنٹے پہلے کہا تھا کہ وہ مجھ سے ملاقات کرنے آئیں گے اور ایک دوسرے سے الگ رہ کر اہم معاملات پر گفتگو کریں گے۔''

اسی وقت وہ دونوں وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے رحمانی کی آواز سنی۔ ''ہم آگئے ہیں۔''

سب نے چونک کر انہیں حیرانی سے دیکھا۔ پھر ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ ویلر نے کہا۔ ''یہ دیکھ کر خوشی ہورہی ہے کہ آپ دونوں پہلے کی طرح ایک ساتھ ہیں۔''

ربانی نے کہا۔ ''ہم ساتھ آئے ہیں لیکن ہماری اپنی اپنی سیاسی پارٹی ہوگی۔ ہم دونوں اپنے اقتدار کی جنگ لڑیں گے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''مجھے اقتدار حاصل کرنے کا شوق نہیں ہے۔ ہمیں بوستان کو اسلامی جمہوریہ بنانا ہے۔''

ربانی نے کہا۔ ''اسلامی حکامات میں انتہا پسندی ہے۔ یہ قوانین غیر مسلموں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ میں سیاست سے مذہب کو دور رکھوں گا اور وہائٹ اسکائی کے موجودہ حکمرانوں سے دوستی اور باہمی تعاون کے معاہدے کروں گا۔''

اس بات پر اسمبلی کے تمام ممبران تالیاں بجانے لگے۔ رحمانی نے کہا۔ ''میں ربانی سے متفق نہیں ہوں۔ میں وہائٹ اسکائی سے ایسے محتاط معاہدے کروں گا جس کے نتیجے میں میرے ملک اور میری قوم کا سر نہ جھکے۔ ہمارا ملک قرض کے بوجھ تلے نہیں رہے گا۔ پچھلے قرضے پچھلے حکمرانوں سے وصول کیے جائیں گے۔ بوستان کا ہر باشندہ فخر سے کہے گا کہ وہ اپنے ملک کی تعمیر کسی بیساکھی کے بغیر اپنے حوصلوں سے کررہا ہے۔ ہم کسی ملک سے بھی کچھ نہیں مانگیں گے۔ ان شاء اللہ مانگنے والوں کو دیا کریں گے۔''

اس بات پر حاضرین نے تالیاں نہیں بجائیں۔ خاموش بیٹھے رہے۔ وہ ربانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہماری محبتوں کا مثلث بہت مضبوط تھا۔ تم اسے توڑ رہے ہو اور میں اسے قائم رکھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اب تم سیاست میں مخالفت کرتے ہوئے پورے ملک اور پوری قوم کو نقصان پہنچانا چاہتے ہو اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔''

ورشا ان حالات کو دیکھ رہی تھی اور رحمانی کی مشکلات کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم دونوں ہی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہو۔ کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔''

رحمانی نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہمارے کام آنے کا وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ تم تابان کو ربانی کے شر سے بچا رہی ہو۔ وہ اس کی بو کو پانے اور اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہورہا ہے۔ تم میرے لیے کیا کرسکتی ہو؟''

''میں نے تمہاری بو کو بھی ختم کردیا ہے۔ اس طرح

تمہیں ایک برتری حاصل ہوگئی ہے۔ وہ کسی مرحلے پر بھی تمہاری موجودگی کو محسوس نہیں کر پائے گا۔"

"خدا کا شکر ہے۔ تنی ہی برتری کافی ہے۔"

وہ دونوں آبشار کے قریب چٹان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ "ورشا ایک طویل تھکا دینے والی جنگ شروع ہوئی۔ اس سے پہلے میری ہوجاؤ۔ تم نے یہ کہہ کر الجھا دیا ہے کہ ہمیں محبت میں آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔ کیسی آزمائشیں ہیں؟"

وہ بولی۔ "ہمارے نصیب میں قربت نہیں ہے۔ فاصلے ہیں۔ ابھی ہم قریب ہیں لیکن میرا ہاتھ تھامنا چاہو گے تو میں چھونے بھی نہیں دوں گی۔"

"یہ ظلم کیوں کرو گی؟"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "مرد و عورت جذبات کے مراحل میں ایک دوسرے کے اندر سما جاتے ہیں۔ تم میرے وجود میں نہیں اتر سکو گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی۔"

وہ اسے حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ سمجھ رہا تھا اور کچھ سمجھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم نے مجھے الجھا دیا ہے۔"

"کوئی الجھن نہیں ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ میں ایک ادھوری عورت ہوں۔ ایک مکمل عورت تک پہنچنے والا کوئی راستہ میرے وجود میں نہیں ہے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے۔"

ورشا کی زبان سے یہ ایسا انکشاف تھا جسے سنتے ہی وہ دم بخود رہ گیا۔ آتش شکمی میں مہارت حاصل کرنے والی دوشیزہ کی زندگی کا یہ ایسا راز تھا جسے سنتے ہی وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ "میرے دل و دماغ پر میرے حواس پر چھا جانے کے بعد مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔ تم دو کے درمیان ایک تاباں کا مسئلہ حل کرنے آئی تھیں۔ میں تمہاری خاطر تاباں سے دست بردار ہوگیا۔ اب تم دور ہو جاؤ گی۔ فاصلہ رکھو گی تو میری ازدواجی زندگی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟"

"رحمانی! میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ تمہاری دھڑکنوں سے لگ کر رہنے کو دل مچلتا ہے۔ لیکن قدرتی حالات سے مجبور ہوگئی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"تمہیں آگہی ملتی ہے۔ پیش آنے والی بہت سی باتیں جان لیتی ہو۔ ہمارے بارے میں بتاؤ، ہم کس گھاٹ اتریں گے؟"

اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر کہا۔ "جس گھاٹ اترو گے وہاں میں نہیں ہوں۔ وہاں..."

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "وہاں تاباں ہے۔"

"ورشا...! وہ ربانی کو چاہتی ہے۔"

"نہیں۔ آج بھی دونوں کو چاہتی ہے۔ میں اس کے اندر ڈوب کر دیکھتی ہوں۔ جب سے وہ شیطانی شکنجے میں ہے اور تم دین کے راستے پر جہاد کر رہے ہو۔ اس کا ایمان واپس لانا چاہتے ہو تب سے تاباں کو تمہاری انسانیت اور شرافت تمہاری طرف مائل کر رہی ہے اور وہ ابھی اس تبدیلی کو شعوری طور پر نہیں سمجھ رہی ہے۔"

"اور ربانی کا مستقبل کیا ہے؟"

"نامعلوم۔ فی الحال کچھ نہیں مل رہی ہے۔"

ورشا نے یہ انکشاف کیا تھا کہ تاباں رحمانی کی طرف جھک رہی ہے اور جو کافر ہے وہ دل کے تجیے سے نکل چکا ہے۔ شاید ہی وہ دین کی طرف واپس آسکے۔

اس انکشاف سے رحمانی کے اندر تازہ ہوا کا جھونکا آیا۔ تاباں پھر اس کے اندر کروٹیں لینے لگی۔ ایک کھوئی ہوئی چیز اسے پکار رہی تھی۔

☆☆☆

ہر انسان اپنے اندر بولتا ہے۔ کسی بھی اہم معاملے پر اپنے آپ سے مشورے کرتا ہے۔ کسی کے اندر ایمان زیادہ بولتا ہے۔ کسی کے اندر بے ایمانی چیختی رہتی ہے۔ ربانی کے اندر ابلیس چیختا رہتا تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا اور شیطان سے ہم کلام تھا۔ وہ شیطانی مشیر کہہ رہا تھا۔ "رحمانی کو کمزور کرنے اور اس کی کمر توڑنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ تاباں کو اپنے شکنجے میں لایا جائے... یہ معلوم کیا جائے کہ اسے زمین کے کس حصے میں پہنچ کر حصار بندی کی گئی ہے؟"

ربانی نے کہا۔ "یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے پوری دنیا کے ایک ایک حصے میں جانا ہوگا اور میں جارہا ہوں۔ اس میں بہت وقت لگے گا لیکن کہیں تو وہ جادوئی حصار مجھے روکے گا۔ مجھے معلوم ہوجائے گا کہ تاباں کو وہیں چھپایا گیا ہے۔"

شیطانی مشیر نے کہا۔ "میرے سیکڑوں پجاری اور چیلے ابھی اسے تلاش کرنے نکلیں گے۔ آج ہی تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ آج ہی تم اس کے قریب پہنچو گے۔"

وہ مطمئن ہوگیا۔ سیکڑوں پجاری اور چیلے تاباں کی

تلاش میں جا رہے تھے۔ وہ رحمانی کی مصروفیات پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے دشمن کی مہک کو گرفت میں لے کر اس کے قریب پہنچنا چاہا تو پریشان ہو گیا۔ اس کی بو نہیں مل رہی تھی۔

دوسری طرف رحمانی محب وطن سیاست دانوں اور صحافیوں سے ملاقات کر رہا تھا۔ ان کے ذریعے پریس اور الیکٹرونک میڈیا کو چند احکامات صادر کیے۔ یہ خبر نشر کی گئی کہ اسی لمحے سے کسی کے بھی گھر میں چھوٹا بڑا اسلحہ نہ رہے۔ چوری ڈکیتی کا مال جن مکانوں میں دکانوں اور گوداموں اور فیکٹریوں میں چھپا کر رکھا جائے گا، وہاں کے مکینوں اور مالکان کو مقدمہ چلائے بغیر آن دی اسپاٹ گولی مار دی جائے گی۔

خبریں نشر کی جا رہی تھیں۔ بریکنگ نیوز کے ذریعے بھی وارننگ دی جا رہی تھی۔ مجرمانہ زندگی گزارنے والے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ بات مضحکہ خیز تھی کہ ایک رحمانی کروڑوں باشندوں کے اندر جھانک کر انہیں مجرم ثابت کر سکے گا۔

رحمانی نے کہا۔ ”ناظرین! میں نئی حکومت قائم کرنے سے پہلے اپنے ملک کو ہر طرح کے جرائم کی لعنت سے پاک کر رہا ہوں۔ یہ میرا پہلا قدم ہے۔ سنگین جرائم کے مرتکب ہونے والوں کو سزائے موت دوں گا۔ انہیں معافی نہیں ملے گی۔

لوگوں کی جان و مال کے لیے پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا ہے لیکن پولیس ہی ایسے مجرموں کی سرپرستی کرتی ہے اور ان کی پرورش کرتے ہوئے اندھی کمائی حاصل کرتی ہے۔“

اس نے سرعام ان تھانیداروں کو گن کے نشانے پر لے کر کہا۔ ”کوئی عدالت نہیں، کوئی مقدمہ، کوئی پیشی نہیں۔ جاؤ اپنے رب کے سامنے پیش ہو جاؤ۔“

اس نے دو تھانیداروں کو گولی ماری تو دوسرے تھانیداروں اور سپاہیوں نے اس پر اچانک ہی گولیاں چلائیں۔ وہ تو سامنے ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ حملہ کرنے والوں نے جیسے ہوا میں گولیاں چلائی تھیں۔ وہ نادیدہ ہو گیا تھا۔

لوگ کہہ رہے تھے یہی ہونا چاہیے۔ جو اپنے خلاف ثبوت اور گواہ نہیں چھوڑتے وہ قانون کی گرفت میں بھی نہیں آتے۔ انہیں آدم رحمانی کی عدالت سے سزا ملنی چاہیے۔ مجرمانہ ذہن رکھنے والے سرمایہ دار، وڈیرے اور سیاست داں چیخ رہے تھے کہ رحمانی قانون کو ہاتھ میں لے رہا ہے۔ اسے روکا جائے۔

اسے نہ ہتھیار روک سکتے تھے، نہ آرمی روک سکتی تھی۔ مجرموں کے باہمی تعلقات کے باعث وہ ایک اسلحہ فروش سے دوسرے اسلحہ کے اسمگلروں تک پہنچتا رہا۔ ایک ہی دن میں کئی اسلحہ فروش اور ان کے سرپرست پولیس افسران مارے گئے۔

ایک ہی دن میں یہ یقین ہو گیا کہ روزانہ دو چار دس مجرموں کو سزائے موت ملتی رہے گی تو بوستان جرائم سے پاک ہو جائے گا۔ اور ایسا بھی ہو نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ اصلاح کے راستے پر رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ رحمانی کو صرف ربانی کے شیطانی ارادے ہی روک سکتے تھے۔

ربانی کو اطلاع مل رہی تھی۔ وہ ٹی وی چینل کے ذریعے دیکھ رہا تھا۔ رحمانی اسلامی نظام قائم کرنے سے پہلے مجرموں اور گناہ گاروں کا صفایا کر رہا ہے۔

وہ اسکرین پر اسے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ شیطان کی پرستش کرنے لگا تھا۔ اسے مخاطب کر کے اس سے مدد مانگنے لگا تھا۔ وہ شیطان سے کہہ رہا تھا۔ ”میں تیرا پرستار ہوں۔ میری شکست تیری شکست، میری ذلت تیری ذلت ہے۔ مجھے عزت اور برتری دے۔ میرے جسم کی بو کو ختم کر دے۔ پھر وہ دشمن بھی میری طرف سے اندھا ہو جائے گا۔ نہ مجھے تلاش کر سکے گا نہ مجھ پر حملہ کر سکے گا۔ کوئی ایسی صورت پیدا کر دے کہ میں اسے ڈھونڈ کر اس کے راستے کی رکاوٹیں بنتا رہوں۔“

اسے آواز سنائی دی۔ ”خوشبو لطیف سی ہوتی ہے۔ دور تک پھیلتی ہے۔ بدبو کثیف اور گاڑھی ہوتی ہے ایک جگہ ٹھہر جاتی ہے۔ یہ تیرے اندر جم گئی ہے۔ تیرے اندر سے میری رال اور معجون کی بو کبھی ختم نہیں ہو گی۔ میں تیرے اطراف حصار باندھ رہا ہوں۔ وہ تجھے چھونا بھی چاہے گا تو قریب آتے ہی اس کا ہاتھ رک جائے گا۔ ایک ان دیکھی دیوار اسے روک لے گی۔

وہ کرپٹ لوگوں کی مدد کرے گا۔ اس کی دی ہوئی سزائے موت سے انہیں بچاتا رہے گا تو تیرے چاہنے والوں کی اور میری پوجا کرنے والوں کی تعداد بڑھتی رہے گی۔ اس ملک میں فرجی اور جعلی ووٹرز زیادہ ہیں۔ بوستان میں تیری حکمرانی ہوگی۔“

ٹی وی اسکرین پر رحمانی کہہ رہا تھا۔ ”آج میں نے پندرہ گھنٹوں میں تین شہروں کے مجرموں کو سزائیں دی ہیں۔ آئندہ کسی شہر کسی علاقے کا ایک بھی مجرم مجھ سے چھپ کر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ جو زندگی سلامتی چاہتے ہیں، وہ

مجرمانہ زندگی گزارنے سے توبہ کریں۔ میں ان کے اندر کا حال معلوم کروں گا۔ وہ سچے دل سے توبہ کریں گے اور پُرامن شہری کی طرح شریفانہ زندگی گزاریں گے تو انہیں معاف کردوں گا۔ سزائے موت نہیں دوں گا۔"

اسکرین پر اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کیمرے اسے دکھانے سے قاصر تھے۔ البتہ نیوز روم کا عملہ اسے موجود دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی ربانی وہاں پہنچ کر بولا۔ "ناظرین کرام! آپ کا یہ ربانی نیوز چینل میں حاضر ہوگیا ہے۔ یہاں نیوز روم میں سب ہی مجھے رحمانی کے رُو برو دیکھ رہے ہیں۔"

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ربانی نے کہا۔ "آج رحمانی نے ہمارے ملکی قوانین کو ہاتھ میں لیا ہے اور ہماری عدالتوں کی اور حکمرانوں کی توہین کی ہے۔ مجھے افسوس ہے، میں دیر سے آیا ہوں مگر آگیا ہوں۔ اب میں اسے قانون سے کھیلنے اور عدالتی فیصلوں کے بغیر کسی کی جان لینے کی آزادی نہیں دوں گا۔"

رحمانی نے کہا۔ "ربانی! ہمارے ملک سے جرائم کی لعنت ختم کرنے دو۔ بوستان کی بہتری کے لیے میرا ساتھ دو۔"

"میں بوستان کی عدالت کا اور قانون کے محافظوں کا ساتھ دوں گا۔ تم فرعون بن کر بے گناہوں کی زندگیوں سے نہ کھیلو۔"

"میں فرعون نہیں موسیٰ ہوں۔ یہاں قانون کے محافظ ہی مجرموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ عدالتیں وہی فیصلے سناتی ہیں، جو کرپٹ حکمران چاہتے ہیں۔ تم ان کی حمایت کرو گے تو جرائم میں اضافہ ہوگا۔ ایسے میں میری مخالفت تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

یہ کہتے ہی وہ نادیدہ ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ رحمانی سنبھلتا اس کے منہ پر تابڑ توڑ تین گھونسے پڑے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ہتھوڑے پڑے۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی تھی۔ منہ سے لہو اُبل آیا تھا۔ چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی۔ اس میں نادیدہ ہو جانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ربانی نے اس کے سر پر ایک ٹھوکر ماری تو دماغ ہل کر رہ گیا۔ اس نے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر فرش پر اٹھا کر بٹھایا۔ پھر گھوم کر ایک کک ماری تو سینے کی ہڈی جیسے چیخ گئی۔

وہ نادیدہ ہو کر چھپنے اور فرار ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ روحانی کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اسے ختم کرسکتا تھا۔ رحمانی نے اس پر سبقت لے جاتے وقت جان نہیں لی تھی۔ لیکن ربانی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے حلق پر پاؤں رکھ کر اس پر کھڑا ہو کر سانسیں روک دینا چاہتا تھا۔

جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ اس کا پاؤں رحمانی کے حلق تک پہنچنے سے پہلے ہی رک گیا۔ اس نے پھر پاؤں کو پوری قوت سے آگے بڑھایا پھر رک گیا۔

کوئی نادیدہ رکاوٹ تھی۔ اس نے جھک کر اس کا گلا دبوچنے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ وہ ہاتھ بھی رک گئے۔ وہ جھنجلا کر اٹھتے ہوئے خلا میں تکتے ہوئے چیخ کر بولا۔ "ذلیل عورت! تو اسے بچا رہی ہے۔ اپنی آتماشکتی کے ساتھ دفع ہو جا۔ میرے راستے میں نہ آ..."

نیوز روم کا پورا اسٹاف چپ چاپ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ رحمانی ایک لاش کی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر اسپتال پہنچاتا۔ وہ ربانی سے سہمے ہوئے تھے اور وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کسی عورت کو غصہ دکھا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "تم یہاں سے نکل جاؤ گی تو میں اسے اسپتال تک پہنچنے نہیں دوں گا۔ یہاں کسی ڈاکٹر کو قریب نہیں آنے دوں گا۔ تم دیکھو گی ابھی اس کا دم نکل جائے گا۔"

وہ چپ تھی، نہ بول رہی تھی، نہ اپنی موجودگی ظاہر کر رہی تھی۔ اسے جو کرنا تھا، چپ چاپ کر رہی تھی۔ ربانی نے دو چار منٹ کے بعد ہی دیکھا۔ رحمانی کے چہرے اور گردن سے لہو صاف ہو گیا تھا۔ جہاں چہرے کی جلد پھٹ گئی تھی وہاں کسی دوا کا لیپ چڑھا ہوا تھا۔ وہ چیخ کر بولا۔ "اے! تو کیا کر رہی ہے؟"

اس نے رحمانی کے منہ پر زوردار ٹھوکر مارنی چاہی لیکن وہ لات وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ آتماشکتی کی بندش نے اسے پھر روک دیا۔ وہ بُری طرح جھنجلا گیا۔ اِدھر اُدھر رحمانی کے اطراف جا کر اس پر حملے کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ وہ پریشان ہوگیا۔ رحمانی نے پانچ منٹ کے بعد ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

وہ چاروں شانے چت پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ جوڑ کا توڑ تھا۔ سیر پر سوا سیر تھا۔ واپس آرہا تھا۔

اس نے شیطان کو پکارا۔ "کہاں ہے تو؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے ابھی اسے مار ہی ڈالا تھا۔ یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والا تھا لیکن نہیں ہو رہا ہے۔ اسے زندگی کی طرف نہ

لوٹنے دے۔ جو رکاوٹ ہے اسے دور کر دے۔ مجھے اس کے پاس پہنچنے دے۔ اب بھی وقت ہے۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔"

اسی لمحے رہانی کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے سامنے رحمانی یکلخت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھتے ہی نادیدہ ہو گیا۔

رحمانی کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ اسے نو مل رہی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا قریب آیا۔ اندازہ ہو گیا کہ وہ ہاتھ چلائے گا تو اس کے منہ پہ پڑے گا۔ ایک بار جسے کی زد میں آجائے تو پھر تیزی سے اور مسلسل سے حملے کرے گا۔ اسے بھاگنے نہیں دے گا۔

لیکن جو سوچا تھا' وہ نہ ہو سکا۔ رحمانی کا گھونسا اس کے منہ کے قریب آ کر رک گیا۔ شیطانی بندش نے اسے روک دیا تھا۔

رہانی نے محسوس کیا' کوئی چیز قریب آ گئی ہے۔ اس نے چشم زدن میں جگہ بدل دی۔ اس سے دور ہو گیا لیکن اپنی بُو کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ رحمانی نے اسے سونگھتے ہوئے نادیدہ لیکن نادیدہ رکاوٹ سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔

رہانی اسے گرتے ہوئے دیکھ لیتا تو جوابی حملہ کرتا۔ وہ جگہ بدل کر سوچ رہا تھا۔ کیا کرے؟ میدان میں دشمن نظر نہ آئے اور اس کی اپنی موجودگی پکڑی جائے تو پھر شامت آ جائے گی۔ اسے پھر اسپتال پہنچایا جائے گا۔

وہ اپنی رہائش گاہ میں آ گیا لیکن نادیدہ رہا۔ اسے رحمانی کی آواز سنائی دی۔ "تمہیں بھی جاؤ' میں تمہارے سر پر مسلط ہو جاؤں گا۔ فی الحال شیطانی حصار میں محفوظ ہو۔ لیکن کب تک؟ شیطانی عمل دیرپا نہیں ہوتا۔ میں کالے جادو کا توڑ کروں گا۔ ورشا کوشش کر رہی ہوگی۔ چلو دو چار گھنٹے کی چھٹی کرتے ہیں۔ میں نیند پوری کرنے جا رہا ہوں۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

کسی سے دشمنی کرنے والے اور کسی کی دشمنی سے بچنے والے بھی ایک دوسرے سے غافل نہیں رہتے لیکن نیند کی حالت میں غافل رہنا ہی پڑتا ہے۔ نہ سونا چاہو' تب بھی نیند غالب آ جاتی ہے۔

ویسے وہ تینوں اپنے طور پر مطمئن تھے۔ انہیں غفلت کے دوران کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ وہ اپنے اپنے حصار میں محفوظ تھے۔ انہیں ایک چیونٹی بھی کاٹنے کو نہیں آ سکتی تھی۔

ورشا کو تماشگی حاصل کرنے کے بعد وقتاً فوقتاً آگہی حاصل ہوتی رہتی تھی۔ اس رات کے پچھلے پہر بھی آگہی ایک خواب کی صورت میں آئی۔

وہ ایک عالم نامعلوم میں تھی۔ وہاں عجیب و غریب گنبد نما اور مثلث نما مکانات بنے ہوئے تھے۔ لوگ رہانی اور رحمانی کی طرح صحت مند اور قد آور تھے۔ خواتین تاباں اور ورشا کی طرح حسین تھیں۔ وہ سب کاروبار زندگی میں مصروف تھے اور عربی بول رہے تھے۔

وہ بول چال میں اور طرز رہائش میں انسانوں سے مختلف تھے اور متحرک رہنے کے دوران بھی وقتِ ضرورت نادیدہ ہو جاتے تھے۔ کہیں گم ہو جاتے تھے۔ پھر کسی دوسرے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتے تھے۔

وہ سب دین دار تھے اور عبادت کے اوقات میں نمازیں پڑھتے تھے۔ ویسے دن اور رات' دھوپ اور چھاؤں اور آگ اور پانی کا تضاد کہاں نہیں ہوتا؟ وہاں بھی تھا۔ وہاں بھی بے نمازی اور شرپسند تھے۔ شیطان وہاں بھی بدکاروں کے اندر موجود رہا کرتا تھا۔

خواب گرش آگہی تماشا دکھا رہی تھی۔

رہانی اور رحمانی نظر آ رہے تھے۔ وہ آپس میں پڑوسی تھے اور بہت ہی محبت کرنے والے جاں نثار دوست تھے۔ وہاں کی معاشی اور معاشرتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ دونوں ذہین اور شہ زور تھے لیکن بھی کسی اہم معاملے میں یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ رحمانی زیادہ ذہین اور نیک سیرت ہے۔ رہانی کے عمل سے انجانے میں خود غرضی جھلکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ رحمانی کا بہترین دوست تھا۔

پھر ان کی زندگی میں ایک حسین سی جیسی آئی۔ وہ ورشا تھی۔ اس کا نام بنت قائمہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی دونوں اس پر عاشق ہو گئے۔

رہانی نے کہا۔ "یہ میرے دل کو بھا گئی ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"

رحمانی نے کہا۔ "میرا دل بھی اسے مانگ رہا ہے۔ ہم دوستوں کے درمیان رقابت نہیں ہونی چاہیے۔ عورت کی ہوس سر پر سوار ہو جائے تو مرد تہذیب اور شرافت کو بھول جاتا ہے۔ اللہ مجھے ہوس پرستی سے بچائے۔ میں بنت قائمہ کی طلب سے باز آ رہا ہوں۔ تم اسے اپنی منکوحہ بناؤ۔"

رہانی نے خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا پھر بنت قائمہ کے لیے پیغام بھیجا۔ اس کے والدین نے کہا۔ "تمہیں داماد بنا کر ہمیں خوشی ہوگی لیکن بچی راضی نہیں ہے۔"

رہانی نے کہا۔ "کیوں راضی نہیں ہے؟ یہ میری

توہین ہے۔ کیا وہ رحمانی سے راضی ہے؟"

اس کے والدین نے جواب دیا۔ "نہیں۔ وہ کہتی ہے، کبھی شادی نہیں کرے گی۔"

اس نے بنت قائمہ کے پاس آ کر پوچھا۔ "مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیوں شادی سے انکار کر رہی ہو؟"

"مجھ میں کمی ہے اس لیے انکار کر رہی ہوں۔ شادی ازدواجی زندگی کے معاملات میں مجھ سے نہ بولو۔"

"سچ بولو۔ کیا رحمانی سے شادی کرو گی؟"

"نہیں۔ میں تمام عمر تنہا رہوں گی۔"

"میں نہیں مانتا۔ ایک حسین دوشیزہ تمام عمر تنہا نہیں رہ سکتی۔ اسے لوٹنے والے آجاتے ہیں۔"

"مجھے بچانے والا اللہ ہے۔"

تب ربانی پر شیطان مسلط ہوا۔ وہ اس کے پُرکشش وجود کو دیکھ رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا۔ "مجھ سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

اس نے رحمانی کو دل کی بات نہیں بتائی۔ اپنی بدنیتی چھپالی۔ اس نے کہا۔ "رحمانی! ہم بنت قائمہ کے فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ میں بھی اس کی طلب سے باز آرہا ہوں۔"

وہ پوری قوم غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ وہ سب بہ وقت ضرورت غائب ہو جاتے تھے۔ کوئی بھی بیمار نہیں ہوتا تھا۔ جو زخمی ہوتا اس کے زخم تھوڑی دیر میں بھر جاتے تھے۔ ان کے پاس ایسی دوائیں تھیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ دیتی تھیں۔

اس قوم کا سردار ان سے بھی زیادہ طلسمی صلاحیتوں اور قوتوں کا حامل تھا۔ اس کے دل میں خوف خدا تھا۔ وہ دینی احکامات پر سختی سے عمل کرتا تھا اور عمل کراتا تھا۔ منکروں کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ ربانی منکر ہو چلا تھا اور اس کی نظروں میں آگیا تھا۔

اس نے ربانی کو طلب کیا۔ پھر کہا۔ "تم شیطانی گرفت میں ہو تمہارے ارادے ناپاک ہیں۔ میں تمہیں پہلی اور آخری بار تاکید کر رہا ہوں۔ بنت قائمہ کو ہاتھ بھی نہ لگانا۔ قریب بھی نہ جانا۔ وہ پاکیزہ ہستی ہے۔ اسے کوئی ناپاک نہیں کر سکے گا۔"

اس نے سردار کے سامنے سر جھکا لیا مگر دل بنت قائمہ کی طرف ہی جھکا رہا۔ اس نے رحمانی کو یقین دلایا تھا کہ وہ اس حسین دوشیزہ کو دل سے نکال چکا ہے۔ جبکہ دل میں شیطان اچھل رہا تھا۔ کسی طلب سے روکو تو وہ طلب اور شدت سے پکارتی ہے۔

دوسرے ہی دن ہوس نے ایسا تڑپایا کہ وہ چوری چھپے اس کی خلوت میں پہنچ گیا اور ایسے وقت پہنچا، جب وہ غسل کر رہی تھی۔ وہ نظارہ تو پاگل کر دینے والا تھا۔

وہ دیوانہ وار جھپٹ پڑا۔ شعلوں کی طرح اس سے لپٹ گیا۔ اس حیا والی پر اچانک ایسی افتاد آپڑی تھی کہ دم بخود رہ گئی۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ شرم والیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوسری سانس نہ لے سکی۔ اس کی گرفت میں سرد پڑ گئی۔ اس پر ایسی ہوس غالب آئی تھی کہ وہ بدن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ گدھ مردار سے ہی بھوک مٹاتا ہے۔ لیکن.....

لیکن وہ بوکھلا گیا۔ بھوک مٹانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ وہ چمگادڑ کی طرح ادھر سے اُدھر بھٹک رہا تھا۔ بدن کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ رہا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں تھی۔ قدرتی طور پر تیسری مخلوق تھی۔

وہ فوراً ہی وہاں سے فرار ہو گیا۔ نادیدہ ہو کر چھپنے کے کئی راستے تھے لیکن سردار سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جا کر گم ہو جائے۔ اس واردات کی اطلاع وہاں تک پہنچی نہیں تھی۔ سردار اسے معاف کرنے والا نہیں تھا۔ سزائے موت لازمی تھی۔

وہ رحمانی کے پاس آ کر بولا۔ "مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔ سردار مجھے بڑی اذیت ناک سزائیں دے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "ایسی کیا بھول ہو گئی ہے؟"

"تم سنو گے تو نفرت کرو گے۔ دوستی بھول جاؤ گے۔"

وہ بولا۔ "دوستی آزمائشوں سے گزر کر ہی مستحکم ہوتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ دوستی ہر حال میں قائم رہے گی۔"

اس نے کہا۔ "میرے دوست! مجھ پر ہوس غالب آگئی تھی۔ میں بنت قائمہ کی خلوت میں چلا گیا تھا۔"

وہ بے یقینی سے بولا۔ "یہ کیسی بے حیائی کی بات کہہ رہے ہو؟"

"میں کیا کروں؟ مجھ پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ بہت پچھتا رہا ہوں۔ وہ حیا والی مجھے دیکھتے ہی مر گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔"

رحمانی حیرت زدہ سا اس کا منہ تک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ربانی! تمہارا گناہ ناقابل معافی ہے۔ سردار تمہیں

اذیت ناک سزائیں دے گا۔ میں تمہارے لیے کیا کروں؟"

"سردار تمہاری قدر کرتا ہے۔ اس نے تمہیں معزز شہری کا درجہ دیا ہے۔ تم اس کے ایک اعلیٰ درباری بھی ہو۔ میرے لیے اس کے قدموں میں گر جاؤ۔"

"تم اس سے چھپ نہیں سکو گے۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں تمہارے بچاؤ کے لیے جو کر سکتا ہوں' وہ کروں گا۔"

وہ دونوں اسی لمحے... سردار کے رُوبرو آکر جھک گئے۔ سردار نے کہا۔ "ہمیں معلوم تھا کہ آ رہے ہو۔ رحمانی! کیا سوچ کر اس کی سفارش کرنے آئے ہو؟ یہ شیطان مردود کے زیرِ اثر رہتا ہے۔ اس نے گناہ کبیرہ کیا ہے۔ بنت قائمہ ایک ذہین عالمہ تھی۔ روحانیت کی طالبہ تھی۔ بے حیائی اس کے لیے سم قاتل تھی اور اس مردود نے اسے قتل کر دیا۔"

رحمانی نے کہا۔ "بے شک اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے۔ وہ روحانی علوم کی روشنی سے معمور ہو رہی تھی۔ اس نے یکلخت اسے بجھا دیا ہے۔ مجھ ناچیز کی عقل کہتی ہے کہ بجھے ہوئے چراغ کو پھر روشن کیا جا سکتا ہے۔ جو نور بنت قائمہ کے اندر تھا' اسے ربانی کے اندر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آپ اسے سزائے موت دیں گے۔ یہ مر جائے گا۔ اسے زندگی دیں گے۔ سخت نگرانی میں اس کی اصلاح کریں گے تو یہ بنت قائمہ کے تمام روحانی مراحل سے گزرتا رہے گا۔ ہماری قوم کو ایک سچا مستند عالم ملے گا۔"

سردار نے کہا۔ "جس پر شیطان مسلط ہو جائے' وہ پھر دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔ ایک مستند عالم بن ہی نہیں سکتا۔"

"آپ سے التجا ہے۔ اسے دینی علوم حاصل کرنے کے ابتدائی مرحلے میں آزمائیں۔ اگر یہ امتحانات میں کامیاب ہوتا رہے تو اسے روحانی علوم کی طرف جانے کی زندگی دی جائے۔"

"تم ایک تعمیری مشورہ دے رہے ہو۔ بے شک اسے آزمایا جائے گا۔"

سردار کے حکم سے اس کے سپاہی ربانی کو وہاں سے لے گئے۔ وہ ایک نامعلوم مدت کے لیے رحمانی سے بچھڑ گیا۔ اتنا تو ہوا کہ جان کی امان مل گئی۔ وہ آئندہ بھی سانسیں لیتے رہنے کے لیے شیطان سے لڑنے والا تھا۔ اس کی سلامتی دین سے وابستہ ہو گئی تھی۔

سردار روحانی علوم کا حامل تھا۔ اس رات اسے آگہی ملی کہ بنت قائمہ کی روح بھٹک رہی ہے۔ طبعی عمر کے مطابق اس کی زندگی کے چالیس برس باقی تھے۔ وہ بیس برس میں ہی اپنے جسم سے جدا ہو گئی تھی۔

یہ قدرتی معاملات ہوتے ہیں اور معلومات اس حد تک ہیں کہ ہر ذی نفس کے جسم میں آنے سے پہلے روحیں عالم ارواح میں رہتی ہیں پھر بعد از موت برزخ میں چلی جاتی ہیں۔

سردار کو جو آگہی مل رہی تھی' وہ غلط ہو سکتی تھی۔ حقیقت سے بعید ہو سکتی تھی۔ اس نے ذہن کی اسکرین پر دیکھا۔ بنت قائمہ کی روح ایک ماں بننے والی کے رحم میں پہنچ گئی تھی اور وہ ماں آدم زادوں کی دنیا میں کہیں رہتی تھی۔

یہ آگہی تھی کہ وہ ارضی دنیا میں جا کر پھر روحانی قوتیں (آتما شکتی) حاصل کرے گی۔ وہ آخری معلومات تھیں۔ اس کے بعد سردار کو اس کے بارے میں پھر کبھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

ربانی کو برسوں تک سخت نگرانی میں رکھا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ شیطان کے اثر سے نکل گیا ہے۔ دینی علوم حاصل کر رہا ہے۔ لیکن بنت قائمہ کی طرح روحانی علوم حاصل نہ کر سکا۔ اس کے باوجود سزائے موت ٹل گئی تھی۔

سردار نے کہا۔ "اب اس شرط پر معافی ملے گی کہ تم انسانوں کی دنیا میں جاؤ گے۔ وہاں دینِ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرو گے یا کسی ملک میں اسلامی نظام قائم کرو گے۔"

اس قوم کے افراد ارضی دنیا میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ رحمانی نے کہا۔ "آپ مجھے بھی اجازت دیں۔ میں ربانی کے ساتھ جاؤں گا۔ ہم دن رات ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے عادی ہیں۔ وہاں بھی ساتھ رہ کر اپنے دین کے تقاضے پورے کریں گے۔"

اسے بھی اجازت مل گئی۔ سردار نے اپنے دستور کے مطابق ان کی یادداشت چھین لی تاکہ وہ دوسری دنیا میں کسی کو نہ بتا سکیں کہ وہ کون ہیں اور کسی عالمِ نامعلوم سے آئے ہیں۔

☆☆☆

ورشا کی آنکھ کھل گئی۔ خواب تمام ہو گیا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ رات جانے والی تھی اور کسی دم صبح ہونے والی تھی۔ صبح سے پہلے ہی اس کا دماغ روشن ہو گیا۔ آگہی نے گم شدہ یادوں کے دریچے کھول دیے

تھے۔ وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑے سوچ رہی تھی، کیا میں بنت قائمہ ہوں؟

میں کس دنیا میں تھی اور وہ کون لوگ تھے؟

ان کا مذہب ان کی طرز رہائش اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ جنات تھے۔

رحمانی' ربانی اور میری یادداشت شاید کبھی بحال نہیں ہوگی۔ ہم اس ارضی دنیا میں یہ معلومات فراہم نہیں کر سکیں گے کہ جنات آسمان کے کس حصے میں' کس ستارے اور سیارے میں رہتے ہیں۔

ماہرین فلکیات اور سائنس دانوں کے مطابق خلا سے آنے والی مخلوق کو ایلین کہا جاتا ہے۔ کیا جسے ایلین کہا جا رہا ہے وہی جنات ہیں؟

کیا میں رحمانی اور ربانی ایلین ہیں؟

ایلین یا جنات جو بھی تھے، اب ارضی باشندے ہیں اور یہیں رہیں گے۔ لیکن آگہی نے ہلچل مچا دی تھی۔ یہ انکشاف کیا ہے کہ ہم آدم زاد نہیں ہیں۔ ہم خاک سے نہیں آگ سے بنے ہیں اور ہم کئی پہلوؤں سے غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل رہیں گے۔

وہ سوچ رہی تھی۔ صبح کی روشنی پھیل گئی۔ ایسے وقت رحمانی نے پوچھا۔ ''کیا جاگ رہی ہو؟''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ہاں، آجاؤ۔''

وہ آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''بیڈ پر ہو۔ کیا ابھی بیدار ہوئی ہو؟''

''رات کے آخری پہر سے جاگ رہی ہوں۔ سپنے میں ایسی آگہی ملی ہے کہ سنو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔''

وہ اس کے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا، اس نے کہا۔ ''ہم آدم زاد نہیں ہیں۔ ہم خاک سے نہیں، آگ سے بنے ہیں۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟''

خواب کی اسکرین پر جو دیکھا تھا، اسے تفصیل سے بیان کرنے لگی۔ وہ حیرانی سے اور دلچسپی سے سن رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم نے میرے اور ربانی کے ہم شکل کو دیکھا۔ کیا ان کے نام بھی یہی تھے؟''

''ہاں۔ یہی نام تھے۔ تم دونوں میں وہی پہلی جیسی محبت اور دوستی تھی اور ربانی آج کی طرح خود غرض اور شر پسند تھا۔''

''تم نے اپنے آپ کو دیکھا۔ تمہارا نام بنت قائمہ تھا؟''

''ہاں۔ وہ بنت قائمہ میری اور تابان کی ہم شکل تھی۔ پوری آگہی میں تاباں نظر نہیں آئی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس ارضی دنیا کی حوا زادی ہے۔

میں پاکیزہ ہستی سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ قدرتی طور پر وہی تھی جو آج بھی ہوں۔ کوئی مجھ سے جسمانی رشتہ قائم نہیں کر سکتا۔ میں ہوس کی آلودگی سے پاک رہا کروں گی۔ میں وہاں روحانی قوت حاصل کرنے کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ ربانی کی شیطانی مداخلت نے میری جان لے لی۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ میں ورشا کے روپ میں وہی آتما شکتی حاصل کر چکی ہوں جو اُس جہان میں ادھوری رہ گئی تھی۔ یہاں آکر مکمل ہوگئی ہوں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا آگہی سے یہ معلوم ہوا کہ تم کنول کے بچے پر کیسے پہنچ گئی تھیں؟''

''نہیں ایسی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ شاید کبھی آگہی ملے گی تو معلوم ہو سکے گی۔''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''ربانی ابتدا ہی سے گمراہ تھا۔ تم نے وہاں بھی اسے سزائے موت سے بچایا تھا۔ یہاں بھی کئی بار اسے ہلاک کر سکتے تھے لیکن اسے ایمان کی طرف آنے کے لیے ڈھیل دیتے آرہے ہو۔''

''وہ مجھے مار ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اب اگر ٹکرائے گا تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' رحمانی بولا۔ ''ورشا تم پھر ایک بار اسے سمجھاؤ۔ سیدھا سا آسان سا طریقہ ہے۔ وہ آب زم زم سے زبان' حلق اور دل کو آلودگیوں سے پاک کر سکتا ہے۔''

''لیکن شیطان اسے روکتا ہے۔ وہ آب زم زم کی پاکیزگی کو کبھی منہ نہیں لگنے دے گا۔ ایک ہی راستہ ہے کہ پاکیزگی جبراً اس کے اندر گھس جائے۔ تب شیطانی غلاظتیں ہڑبڑا کر باہر آجائیں گی۔''

''کوئی جبراً اس کے اندر کی صفائی نہیں کر سکے گا۔ وہ پیدا ہوا تھا تب اس کے کانوں میں اذان سنائی گئی تھی۔ مرے گا تو کلمہ نصیب نہیں ہوگا۔''

''ہمیں دیکھنا چاہیے وہ کیا کر رہا ہے؟''

''ہاں اس پر نظر رکھنا چاہیے۔ میں ایک گھنٹے کے بعد فریش ہو کر آؤں گی پھر اُدھر جائیں گے۔''

رحمانی اپنی رہائش گاہ میں آگیا۔ ایک عرصے بعد اسے اپنے گم شدہ ماضی کے متعلق معلومات حاصل ہوئی تھی۔ وہ ایک ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ۔ وہ کہاں پیدا ہوا تھا؟ جوان ہونے تک وہاں کیسی زندگی

گزاری تھی؟ اور کیسے اس نامعلوم جہاں سے ارضی دنیا میں آیا تھا لیکن کوشش کے باوجود پچھلی زندگی کی چیزیں اور باتیں یاد نہیں آرہی تھیں۔

☆☆☆

رحمانی شیطان کے قدآور مجسمے کے سامنے بیٹھا تھا۔ ان کے چاروں طرف سیاہی مائل دھواں پھیلا ہوا تھا۔ وہ شیطان سے ہم کلام تھا۔

"اے اہرمن (بدی کے دیوتا)! میں تیرے کھینچے ہوئے حصار کے اندر محفوظ ہوں۔ رحمانی مجھے چھو نہیں سکتا ہے۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے میں ناکام ہوتا رہے گا۔

لیکن میں بھی تو اس پر حملہ کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ تیرے حصار سے باہر ہاتھ نکالوں گا تو وہ ہاتھ رحمانی کی گرفت میں آجائے گا۔

ان حالات میں وہ بوستان سے مجرموں اور گناہ گاروں کا خاتمہ کرتا رہے گا۔ میں حصار سے نکل کر اسے روک نہیں سکوں گا۔ وہ پورے ملک میں نیک نامی اور شہرت حاصل کر کے اپنی حکومت قائم کرے گا۔"

اسے آواز سنائی دی۔ "کالے جادو کے اثرات دیرپا نہیں ہوتے۔ تو جس حصار میں تھا وہ کمزور ہوگیا ہے۔ اسے قائم رکھنے کے لیے منتروں کا جاپ کرنا ہوگا۔"

اس آواز نے دو طرح کے منتر بتائے پھر کہا۔ "چل شروع ہوجا۔ وہ دشمن کسی وقت بھی آسکتا ہے۔"

وہ رحمانی سے محفوظ رہنے کے لیے فوراً ہی پڑھنے لگا۔ شیطان کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔ "اسے اچھی طرح یاد رکھنا کہ میرا لعاب دہن اور معجون جب تک تیرے اندر رہے گا تو زندہ رہے گا۔ اگر آب زم زم کو منہ لگائے گا تو میں تیرے اندر نہیں رہ سکوں گا۔ جیسے ہی تیرے وجود سے باہر نکلوں گا، تیرا دم نکل جائے گا۔ یاد رکھ کوئی تعویذ گھول کر تجھے پلا سکتا ہے۔ خبردار! کوئی قرآنی لفظ کسی بہانے تیرے اندر نہ جائے۔ ورشا سے ہوشیار رہنا، اس سے دور رہنا۔ کبھی قریب نہ آنے دینا۔ وہ کوئی ایسی چال چل سکتی ہے جو ابھی میرے علم میں بھی نہیں ہے۔"

"میں بہت محتاط رہوں گا۔ ورشا سے ہمیشہ فاصلہ رکھوں گا جب تک تاباں ہاتھ نہ آئے۔ اس سے رابطہ رکھنا ضروری ہے۔ پتا نہیں اس نے تاباں کو کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

ایسے وقت ورشا اور رحمانی وہاں آگئے۔ شیطان نے کہا۔ "خاموش رہو وہ آگئے ہیں۔ تجھے نظر نہیں آئیں گے اور نہ ہی ان کی بو ملے گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ خلا میں تکتے ہوئے بولا۔

"کیوں آئے ہو؟"

رحمانی نے کہا۔ "دشمن پر نظر رکھنی ہی پڑتی ہے اور تمہاری دشمنی بڑھتی جارہی ہے۔ تم شیطان کے قدموں میں رہنے لگے ہو۔ تمہیں یہاں دیکھ کر تم سے اور زیادہ نفرت ہورہی ہے۔"

"نفرت سے جو کہنا ہے کہتے رہو میں جارہا ہوں۔"

وہ شبیر آباد کی رہائش گاہ میں آگیا۔ وہ ذرا دیر تک چپ رہا پھر بولا۔ "کیا میرے پیچھے آئے ہو؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ رحمانی خاموش تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ "تم یہاں ہو۔ میں تمہاری بو نہیں پارہا ہوں۔ تم میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔ مضبوط حصار میں ہوں۔ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔"

اسے ورشا کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں۔ وہ نہیں ہے۔ مجرموں اور گناہ گاروں کو سزا دینے گیا ہے۔ تم دیکھو گے چند ہی دنوں میں بوستان جرائم سے پاک ہوجائے گا۔ اور سن لو کہ جب تک وہ مصروف رہے گا میں تمہاری نگرانی کرتی رہوں گی۔ اس کے اہم معاملات میں مداخلت نہیں کرنے دوں گی۔"

"چیلنج نہ کرو۔ تم رحمانی کے مقابلے میں مجھے کیسے روکو گی؟"

"اسے روکنے کے لیے تمہیں حصار سے نکلنا ہوگا۔ میں نکلنے نہیں دوں گی۔ عقل سے سوچو۔ رحمانی تمہاری ذات کی سمت حملے کرتا رہے گا۔ تم اسے منہ پر گرا کر اندھے بن کر پھر اسپتال جاؤ گے لیکن نہیں۔ اس بار وہ تمہیں ہلاک کردے گا۔ تمہارا آخری وقت آگیا ہے۔"

"میں تر نوالہ نہیں ہوں۔ اس کے حلق میں ہڈی کی طرح اٹک جاؤں گا۔ ابھی مجبور ہوں۔ انتظار کررہا ہوں۔ بہت جلد اس کی کمزوری میرے ہاتھ آنے والی ہے۔"

"یہ بھول جاؤ کہ تاباں کو اس کی کمزوری بنا سکو گے۔ جب تک وہ میری پناہ میں ہے، تب تک اس کا سایہ بھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ ایک ہی شرط پر بات کرے گی۔ پہلے آب زم زم سے اپنا باطن صاف کرو۔"

''جب اسے حاصل کرلوں گا تو وہ میری صفائی کرنا بھول جائے گی۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ تم مجھ سے دشمنی نہ کرو۔''

''دشمنی تو تم مجھ سے کرتے آئے ہو۔ میں اپنی اور تمہاری پچھلی زندگی کے بارے میں جانتی ہوں۔ ہم کون تھے؟ کہاں رہتے تھے؟ اور اس دنیا میں کیسے آئے ہیں؟''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی؟''

''ہاں۔ میں، تم اور رحمانی آدم زاد نہیں ہیں، جنات ہیں۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا ہے؟''

''مجھے اپنی آتمز شکتی سے بہت کچھ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ مجھے آگہی ملی ہے۔''

وہ بولا۔ ''میری عقل کہتی ہے کہ ہم جیسی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ اس کے پیشِ نظر جنات ہی ہو سکتے ہیں۔ تمہاری آگہی نے کیا بتایا ہے؟''

''آگہی نے ہم تینوں کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ تم وہاں بھی مسلمان ہونے کے باوجود منکر تھے۔ تم نے میری جان لی تھی۔''

وہ تمام واقعات بتانے لگی۔ اس نے سننے کے بعد کہا۔ ''میں نے تمہیں ہلاک نہیں کیا تھا۔ تم خود ہی حیا سے مرگئی تھیں۔''

ورشا نے پوچھا۔ ''کیا ایک حیا والی غیر مرد کو خلوت میں برداشت کرتی ہے؟''

''ضرور کرتی ہے۔ ہالہ نے مجھے برداشت کیا تھا۔''

''اس کا نتیجہ دیکھو شیطان تم پر مسلط ہو گیا ہے۔''

''تو کیا فرق پڑا ہے۔ میں عیش و عشرت سے زندگی گزار رہا ہوں۔ جس حسینہ کو چاہوں اپنی تنہائی میں لے آتا ہوں۔''

''تم نیک نامی اور شرافت سے گئے۔ ذلت کا ایک ذرا احساس نہیں ہے۔ شیطان تمہیں یہ سوچنے نہیں دیتا کہ رحمانی کی نیک نامی اور شہرت کے سامنے تم خاک ہو رہے ہو۔ جانور پرندے اور درندے دین ایمان نہیں جانتے۔ صرف انسان کے اندر ایمان ہوتا ہے اور تم اس سے محروم ہو کر جانوروں کی طرح زندگی کی میعاد پوری کر رہے ہو۔ میں خواہ مخواہ بول رہی ہوں۔ ایسی ایمان پرور باتیں منکر سنتے ہیں لیکن سمجھنا نہیں چاہتے۔''

''اتنا تو سمجھ گیا ہوں کہ مجھے اپنا قتل بھی ہوا ہی لیے میرے خلاف رحمانی کے کلیجے سے لگی رہتی ہو۔''

''رحمانی نے مجھے کبھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ ہم بے حیا نہیں ہیں۔ میں جا رہی ہوں لیکن آتی جاتی رہوں گی۔ دیکھتی رہوں گی کہ رحمانی کے خلاف کیا کرنے والے ہو۔''

وہ خلا میں تکنے لگا۔ خاموشی کہہ رہی تھی وہ جا چکی ہے پھر شیطان نے کہا۔ ''ہاں۔ وہ نہیں ہے۔''

وہ اطمینان کی سانس لے کر ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔ ''ان دونوں سے عارضی طور پر پیچھا چھوٹا ہے۔ ورشا پھر مسلط ہو جائے گی اور رحمانی آزادی سے نیکیاں اور شہرت کماتا رہے گا۔ میں اسے روکنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔ ورشا نے ذلت کا احساس دلایا ہے۔ میں پہلی بار رحمانی کے آگے خود کو کمتر اور ذلیل سمجھ رہا ہوں۔

میری پہلی جیسی قوت اور برتری کہاں چلی گئی؟ اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ میری غیر معمولی صلاحیتیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ میں ورشا اور رحمانی کی بو سونگھنے کے قابل نہیں رہا ہوں۔

میں رحمانی کی طرح آہنی روبوٹ ہوں لیکن اس سے مات کھا جاتا ہوں۔ اب بھی یہی اندیشہ ہے۔ اس سے مقابلہ کروں گا تو اس کی غیر معمولی صلاحیتیں مجھ پر حاوی ہو جائیں گی اور میں تجھ سے مدد مانگتا رہ جاؤں گا۔''

شیطان نے کہا۔ ''جب تک جنگ جاری رہتی ہے، تب تک کبھی جیت کبھی ہار ہوتی رہتی ہے۔ یہ نہ بھولو کہ تم بھی اس پر حاوی ہوتے رہے ہو۔ جب تاباں کو اپنے شکنجے میں لے آؤ گے تو رحمانی اس کی خاطر تم سے کمزور پڑ جائے گا۔''

وہ مایوس ہو رہا تھا۔ شیطان اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کے ایک چیلے نے اطلاع دی کہ تاباں کا سراغ مل رہا ہے۔

ربانی یکلخت اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چیلا کہہ رہا تھا کہ وہ قطب جنوبی کے ایک ملک میں تھا۔ وہاں ایک جنگل سے گزر رہا تھا کہ اچانک چلتے چلتے کسی نادیدہ چیز سے ٹکرا گیا۔ آگے جانے کا راستہ رک گیا تھا۔ اس نے وہاں سے دائیں سمت ہٹ کر آگے جانا چاہا تو اُدھر بھی رکاوٹ تھی۔ کئی سمتیں بدلنے کے بعد یقین ہو گیا کہ جادوئی بندش ہے ادھر سے راستہ بند ہے۔

وہ ایک سمت بہت دور تک چلتا ہوا دائرے کی صورت میں پھر اسی جگہ آ گیا، یہ تصدیق ہو گئی کہ طلسمی حصار باندھا گیا ہے۔ اس حصار کے اندر دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ وہاں مٹی کے دو مکانات بنے ہوئے تھے۔ گھنے جنگل اور

بکرے گھاس چر رہے تھے۔ کوئی مرد نظر نہیں آیا۔ ایک مکان کے اندر ایک عورت کی جھلک دکھائی دی تھی۔

ربانی نے تڑپ کر کہا۔ ”وہ تاباں ہے۔ فوراً وہاں چلو۔“

وہ دوسرے ہی لمحے اس چیلے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ شیطان نے کہا۔ ”ورشا اور رحمانی کو ابھی یہ معلوم نہ ہو کہ تم اپنی منزل تک پہنچ گئے ہو۔ وہ تمہاری بو سونگھ کر ادھر آجائیں گے۔ فوراً واپس جاؤ۔ پہلے حصار توڑنے کی تدبیر کی جانے گی۔“

اس نے کہا۔ ”میرے اندر بے چینی بھر گئی ہے۔ میں ایک بار تاباں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین تو ہو کہ وہ ملنے ہی والی ہے۔“

ان دو مکانوں میں تین عورتیں تھیں۔ وہ باہر آتی جاتی دکھائی دیں۔ انہوں نے گھاگھرا اور چولی پہنی ہوئی تھی۔ وہ تینوں مکانات سے باہر گھومتی پھرتی آتی تھیں۔ پھر کوئی کام نمٹا کر اندر چلی جاتی تھیں۔ ان میں سے کوئی ایک تاباں ہو گی۔

وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آکر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ گھاگھرا اور چولی نہیں پہنتی تھی۔ ورشا نے اس کا لباس اور حلیہ بدل دیا ہو گا۔ اسے مکان سے باہر گھومنے میں نکلنے کی تاکید کی ہوگی۔

اس نے بوستان سے تقریباً چھ ہزار میل دور اسے پہنچایا تھا اور مطمئن ہو گئی تھی کہ ربانی وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا۔

وہ معشوق کے دروازے تک آگیا تھا۔ دروازہ نادیدہ تھا۔ وہ چابی سے نہیں، معلوم منتروں کو پڑھنے سے کھلتا تھا یا پھر ورشا ہی کھول سکتی تھی۔ یا اگر تاباں چاہتی تو اپنی مرضی سے حصار توڑ کر آسکتی تھی۔ اس کی رضامندی سے آشناؤں کی لائی ہوئی رکاوٹ دور ہو جاتی۔

پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔ فی الحال شیطان اور اس کے چیلے اس حصار کے اطراف بھٹک رہے تھے۔ کوئی ایسا موثر منتر نہیں تھا جو رکاوٹ کو توڑ دیتا۔ وہ ورشا کو خبر ہونے سے پہلے تاباں کو وہاں سے نکال لانا چاہتے تھے۔

شیطان نے کہا۔ ”ایک ہی راستہ ہے، میں زمین کے اندر سرنگ بنا کر تمہیں تاباں تک پہنچاؤں گا۔“

اور کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ربانی کے ساتھ اس رکاوٹ تک آیا پھر اچھل کر قریب زمین میں دھنس گیا۔ ربانی اس کے کاندھے پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ دھنستا ہوا گہرائی میں جانے لگا۔ پھر انہوں نے سمت بدلی۔ اوپر جہاں رکاوٹ تھی۔ ٹھیک اسی جگہ پہنچ کر نیچے سے گزر گئے۔ حصار کے اندر پہنچ گئے لیکن زمین کی تہ اور تاریکی میں تھے۔

وہ دونوں جس سمت جارہے تھے، اُدھر سرنگ بنتی جارہی تھی۔ وہ اندازے کے مطابق ان دو مکانات کے نیچے آگئے پھر شیطان ربانی کے کاندھے پر چڑھ کر اوپر کی طرف جانے لگا۔ یوں سخت پتھریلی زمین ان کی گزرگاہ بنتی گئی۔ وہ زمین کی تہ سے ابھر کر اوپر آگئے۔

وہ جس اندازے سے چلے تھے، اس کے مطابق کسی مکان کے اندر پہنچنا تھا لیکن باہر تھے۔ ان مکانات کے پچھلے حصے سے بہت دور پہنچے تھے..... یہ اطمینان ہوا کہ حصار کے اندر پہنچ گئے ہیں لیکن اطمینان عارضی تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے مکانات کی طرف جانے لگے تو نادیدہ رکاوٹ سے ٹکرا کر گر پڑے۔

وہ ابھی تک حصار کے باہر تھے۔ زمین کی تہ میں بھٹک کر پھر حصار سے نکل آئے تھے۔

شیطان نے کہا۔ ”ہم سے اندازے کی غلطی ہوئی۔ ہم مکانات سے دور نکل آئے ہیں۔ اب ہم تہ میں جا کر یہاں سے چند قدم جائیں گے پھر اوپر آئیں گے تو رکاوٹ پار کر چکے ہوں گے۔“

ربانی پھر شیطان کے کاندھے پر سوار ہو کر زمین کے اندر گیا۔ انہوں نے حساب کیا کہ حصار کے اندر دس قدم تک آگئے ہیں۔ اس کے بعد باہر نکل آئے۔ وہ مکانات ان سے کافی فاصلے پر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

دن کی روشنی میں دنیا دکھائی دے رہی تھی لیکن نادیدہ رکاوٹیں نظر نہیں آسکتی تھیں۔ انہوں نے اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولنے کے لیے ہاتھوں کو بڑھایا تو رکاوٹ کو چھو کر رک گئے۔

یہ سمجھ میں آگیا کہ وہ سرنگ بنا کر بھی زمین کی تہ میں جا کر بھی حصار کے باہر ہی رہیں گے۔

ایسے وقت ورشا اور رحمانی وہاں آگئے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ربانی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟

وہ ایک جگہ کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ شیطان نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ربانی سے سرگوشی میں کہا۔ ”انہیں خبر ہو گئی ہے۔ وہ دونوں آگئے ہیں۔ تجھے دیکھ رہے ہیں۔“

ربانی نے پریشان ہو کر ایک سمت دیکھا، وہ نادیدہ تھے۔ اس کی بو پا کر آئے تھے۔ ورشا نے حیرانی سے کہا۔ ”یہ

کون سی جگہ ہے؟ یہ ربانی یہاں کیا کررہا ہے؟''

رحمانی نے کہا۔ ''اس ویرانے میں دو، وہ دو مکان نظر آرہے ہیں۔ ایسی جگہ کون رہتا ہے؟''

وہ دونوں حیران ہورہے تھے۔ یعنی درشا کا اس جگہ سے اور وہاں کے طلسمی حصار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تاباں وہاں نہیں تھی۔

وہ بولی۔ ''چلو دیکھتے ہیں۔ ان مکانوں میں کون ہیں؟''

وہ دونوں آگے بڑھے۔ پھر نادیدہ حصار سے ٹکرا کر رک گئے۔ حیرت سے دیدے پھیلا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ رحمانی نے کہا۔ ''یا خدا یہاں کسی نے کالا جادو یا روحانی عمل کیا ہے۔''

درشا نے کہا۔ ''کیا ربانی کے شیطان نے کیا ہے؟ یہ ربانی یہاں کیوں آیا ہے؟''

وہ دونوں اس کے سامنے نمودار ہوگئے۔ درشا نے پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

وہ سینہ تان کر بولا۔ ''تم دیکھ رہی ہو، میں تاباں کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ جلد ہی تمہارے اس حصار کو توڑ دوں گا۔''

یہ سنتے ہی درشا ہنس پڑی۔ رحمانی بھی ہنستے ہوئے بولا۔ ''اچھا تو تم یہاں سے تاباں کو لے جانے آئے ہو اور دور کھڑے ہو۔ اسے آواز تو دو۔ ہوسکتا ہے، وہ دوڑی چلی آئے۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''تم مذاق اُڑا رہے ہو۔ سمجھتے ہو، اس حصار کے اندر نہیں جاسکوں گا۔ اسے چھو بھی نہیں سکوں گا۔ میں جلد ہی تمہاری خوش فہمی ختم کردوں گا۔''

درشا نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس مکان میں تاباں کو دیکھا ہے؟''

''وہاں تین عورتیں ہیں۔ تم نے انہیں گھونگھٹ میں رہنے کی تاکید کی ہے۔ میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ کوئی بات نہیں یہاں تک آتو گیا ہوں۔''

رحمانی نے کہا۔ ''چلو میں وعدہ کرتا ہوں۔ تم تاباں کو یہاں سے لے جاؤ گے تو میں راستہ نہیں روکوں گا۔''

''میں بھی رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ ہم یہاں سے جارہے ہیں۔''

وہ دونوں سرمد ٹاؤن کی رہائش گاہ میں آگئے۔ رحمانی نے کہا۔ ''درشا! وہاں کس نے حصار بندی کی ہوگی؟ وہ کون ہوگا؟ اس نے زمین کے اس حصے کو ممنوعہ کیوں بنادیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہماری دنیا میں بڑے بڑے عامل کامل ہیں۔ وہاں پتا نہیں کس نے تین عورتوں کو ان مکانات میں رکھا ہے۔ کسی کا اپنا کوئی پُراسرار معاملہ ہوگا۔''

''آج رات اس ممنوعہ علاقے اور حصار بندی کرنے والے کا دھیان کروں گی تو شاید گیان حاصل ہوگا۔ ابھی میں تاباں کے پاس جارہی ہوں۔''

وہ چلی گئی۔ رحمانی ملکی اور سیاسی معاملات میں مصروف ہوگیا۔ جرائم کے خلاف اس کی حکمت عملی سے جھوٹ فریب اور مکاری ختم ہورہی تھی۔ آئندہ الیکشن کے بغیر وہ عوام کی بھرپور حمایت سے نئی اسلامی حکومت قائم کرنے والا تھا۔

اور ربانی صحیح ڈگر سے ہٹ گیا تھا۔ تاباں کی طلب نے اسے جکڑ لیا تھا۔ دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ رحمانی تاباں کی سلامتی کی خاطر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔

اس ممنوعہ علاقے میں پہنچ کر یقین ہوگیا تھا کہ تاباں کو آج کل میں حاصل کرلے گا۔

پہلی کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ وہ زیر زمین سرنگ بنا کر بھی وہاں تک پہنچ نہیں پایا تھا۔ وہ منزل کے قریب آکر واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے وہیں حصار کے قریب ایک خیمہ تان کر رہ گیا۔

شیطان طرح طرح سے اس حصار کو توڑنے کی کوششیں کررہا تھا۔ شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے ربانی نے دیکھا۔ ایک مکان کا دروازہ کھلا۔ وہاں سے جو حسینہ باہر آئی، اسے دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ وہ تاباں تھی، گھاگھرا چولی اور گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ اس کے بدن پر سلطنت یاقوت کی شہزادی کا شاہانہ لباس تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ بلالہ ہے۔

ربانی بھول گیا کہ وہ مرچکی ہے۔ وہ اس کے خلوت میں رہ چکا تھا۔ اس کے بدن سے آشنا تھا۔ وہ بدن پھر نظر آرہا تھا۔ اسے دور سے پکار رہا تھا۔ آؤ، گیا وقت پھر آرہا ہے۔ جسے ایک بار پایا تھا وہ پھر پائی جانے والی ہے۔

اس نے تڑپ کر پکارا۔ ''بلالہ...! مجھے دیکھو، میں تمہارا ربانی ہوں۔ یہاں آؤ۔ مجھے اندر آنے دو یا تم باہر آؤ۔''

وہ گائے اور بیلوں کے پاس جاکر ان کے آگے چارہ ڈال رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر دور ربانی کی طرف دیکھا پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

وہ حصار کی دیوار پر ہاتھ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''چپ کیوں ہو؟ مجھ سے بات کرو۔ اتنا ہی بتادو کہ تمہیں کس نے قید کیا ہے؟''

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ اس مکان کا دروازہ پھر کھلا۔ پھر ایک تاباں نظر آئی۔ وہ گیروے رنگ کی ساڑی اور بلاؤز میں تھی۔ اس کے ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔

وہ غصے سے چیخ کر بولا۔ ''اے تم ورشا ہو۔ تم نے ہالہ کو یہاں قید کیا ہے۔ تاباں کو بھی یہاں چھپایا ہے۔ مجھ سے دشمنی نہ کرو۔ مجھے اندر آنے دو۔''

ورشا نے دور سے اسے دیکھا۔ پھر ایک گائے کے پاس جاکر دودھ دوہنے بیٹھ گئی۔ وہ اسے باتیں سنانا چاہتا تھا پھر چپ ہوگیا۔ اسی وقت دوسرے مکان کا دروازہ کھلا۔ وہ یکلخت تڑپ گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر تاباں نظر آرہی تھی۔

شلوار قمیص اور دوپٹا کہہ رہا تھا کہ وہ تاباں ہے۔ کیسا عجب تماشا تھا۔ جسے حاصل کرنے کے لیے شیطان کے زیر اثر آگیا تھا اور رحمانی جیسے دوست کو دشمن بنا چکا تھا' وہ کئی دنوں تک روپوش رہنے کے بعد دکھائی دے رہی تھی۔

وہ حلق کی پوری قوت سے چیخ پڑا۔ ''تاباں...! مجھے دیکھو میں آیا ہوں۔ میرے پیار کی دیوانگی کو سمجھو۔ میرے پاس آؤ۔ اس نادیدہ قید خانے سے باہر آجاؤ۔ میں ورشا سے نمٹ لوں گا تم آجاؤ۔''

شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ وہ تینوں اب واضح نہیں تھیں۔ سایہ سایہ سا لگ رہی تھیں۔ تاباں ایک جھولے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس جھولے کی رسیاں جیسے آسمان سے لٹک رہی تھیں۔ جھولا اسے جھلاتا ہوا ربانی کی طرف لارہا تھا۔ پھر دور لے جارہا تھا۔ وہ دوسری بار جھولتی ہوئی قریب آئی تو سورج ڈوب گیا۔ وہ رات کی تاریکی میں گم ہوگئی۔

ایسی گہری تاریکی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی اپنی رہائش گاہ میں آکر بڑی سی چارجر لائٹ لے کر پھر وہاں پہنچ گیا۔ روشنی میں دور تک دیکھنے لگا۔ وہ تینوں جاچکی تھیں۔ ان مکانات کے دروازے بند ہوگئے تھے۔

وہ تڑپ کر شیطان سے بولا۔ ''مجھے کسی طرح اس مکان میں پہنچاؤ۔ کیا تم ورشا کی آتما شکتی کا توڑ نہیں کرسکتے؟''

''کوشش کررہا ہوں۔ ورشا کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ یہ دیکھتا رہوں گا کہ وہ اپنی پُراسرار قوتیں کس طرح کام میں لارہی ہے۔ اس کی کوئی کمزوری ضرور ہمارے ہاتھ آئے گی۔''

آدھی رات ہونے والی تھی۔ ورشا آبشار کے قریب چٹان پر بیٹھی تھی۔ عظیم بدھا کا آسن جمائے دھیان میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شیطان وہاں پہنچ کر ذرا دور بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

سوچنے لگا۔ کب تک یونہی بیٹھا رہوں گا؟ اگر یہ عام سی عورت ہوتی تو اس کے اندر پہنچ کر معلوم کرلیتا کہ یہ دھیان لگا کر کہاں پہنچ رہی ہے؟

وہ اپنی ذات میں گم ہوگئی تھی۔ دھیان میں ڈوب کر پھر بنت قائمہ کی دنیا میں پہنچ گئی۔ سردار کے روبرو بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔ تم نے ورشا کی زندگی پاکر روحانیت کے تمام مراحل طے کیے ہیں اور رحمانی کے ساتھ نیکیاں کررہی ہو۔ ربانی کی سزائے موت اس شرط پر ٹال دی گئی تھی کہ وہ ارضی دنیا میں جاکر دین و ایمان کے مطابق زندگی گزارے گا لیکن وہ شیطان کی پناہ میں رہنے لگا ہے۔

رحمانی عنقریب سیاسی کامیابیاں حاصل کرکے اسلامی نظام قائم کرنے والا ہے۔ ربانی کو روکا نہ گیا تو وہ اس کی تمام نیکیوں پر پانی پھیر دے گا۔ وہ اپنی بداعمالیوں سے ثابت کرچکا ہے کہ قابلِ معافی نہیں ہے۔ اب اسے سزائے موت ملنی چاہیے۔

وہ یہاں ہماری دنیا میں تمہاری موت کا سبب بنا تھا۔ تم وہاں ارضی دنیا میں اس کی موت کا سبب بننے والی ہو۔ تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ وہاں میں نے حصار باندھا ہے اور تینوں تاباں کو پہنچایا ہے۔ ان تینوں کا ٹھوس وجود نہیں ہے، وہ ربانی کی آنکھوں کا فریب ہیں۔

وہ تاباں کے حسین پیرہن کو نہیں' حسین صورت کو چاہتا ہے۔ خیالوں میں ہالہ کے بدن کو دیکھتا ہے اور تاباں کے لیے للچاتا ہے۔ تم تینوں ہم شکل ہو۔ تینوں کے لیے اس کی ہوس بھڑکتی رہی ہے۔ ابھی وہ ان سے فریب کھانے والا ہے۔ وہ اسے آخری بار شیطانی ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی۔

بنت قائمہ! یہ تیرے لیے آگئی ہے۔ جا وہاں جا... تو حصار کے اندر جاسکے گی۔ اب وہاں دو ہوں گی۔ تیرا وجود تیسرا اور ٹھوس ہوگا۔''

وہ آبشار کے قریب چٹان پر پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شیطان دیکھ رہا تھا۔ وہ دھیان سے واپس آگئی تھی۔ چند لمحوں تک ساکت بیٹھی رہی پھر اچانک نادیدہ ہوگئی۔

وہ بھی غائب ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جہاں جاکر جسمانی طور پر حاضر ہوگی' وہاں وہ بھی پہنچ جائے گا۔

ربانی حصار کے پاس خیمے کے اندر تھا۔ شیطان نے کہا۔ ''میں ورشا کے پیچھے پڑ گیا ہوں۔ ابھی وہ دھیان میں

بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک گم ہوگئی ہے۔ اب جہاں بھی پہنچی ہو گی میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

ایسے ہی وقت حصار کے اندر وہ مکانات روشن ہو گئے۔ انہوں نے خیمے سے باہر آکر دیکھا۔ صرف وہ مکانات ہی نہیں' حصار کے اندر دور تک روشنی پھیل گئی تھی۔

مکان کے ایک کمرے میں تاریکی تھی۔ وہاں ورشا کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی دور ربانی کو دیکھ رہی تھی۔ شیطان نظر نہیں آرہا تھا۔

اور وہ شیطان کو نظر نہیں آرہی تھی۔ جب تک حصار کے اندر رہتی اسے دکھائی نہ دیتی۔ ربانی نے کہا۔ "یہ حد بندی اچانک روشن ہوگئی ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔"

وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ وہ حصار بندی ورشا نے کی ہے۔ وہی کچھ کررہی ہے۔ شیطان نے کہا۔ "ابھی وہ اچانک میری نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ یقیناً اپنے حصار میں آئی ہے' اسی لیے مجھے دکھائی نہیں دے رہی ہے۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ دونوں مکانات کا ایک ایک دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ تاباں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہلالہ اپنے شاہانہ لباس سے اور تاباں شلوار قمیص اور دوپٹے سے پہچانی جارہی تھی۔

انہوں نے دروازے سے باہر آکر دور کھڑے ہوئے ربانی کو دیکھا۔ پھر دونوں نے اپنی بانہیں اس کی طرف پھیلائیں۔ تاباں نے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا محبوب ہے۔ جب یہ ہماری دنیا میں آیا تو میں ہی اس کی زندگی میں پہلے آئی تھی۔"

ہلالہ بھی اس کی طرف بانہیں پھیلا کر بولی۔ "تم صرف اس کی پسند تھیں۔ بس کی زندگی میں تو میں آئی تھی۔ میں نے اسے وصال کے رنگین و سنگین لمحات دیے تھے۔ بولو ربانی! تم مجھے یہاں سے لے جاؤ گے یا تاباں کو؟"

وہ دونوں بالکل قریب آگئی تھیں۔ اگر رکاوٹ نہ ہوتی تو وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ لیتا۔ اس کے سامنے دو تھیں۔ ایک تو حاصل ہو چکی تھی۔ ہوس اسے پکار رہی تھی جو ملی نہیں تھی۔ وہ تاباں کو شدتِ شوق سے دیکھ رہا تھا۔

تاباں نے پوچھا۔ "کیا تم مجھے اپنی منکوحہ نہیں بناؤ گے؟"

وہ فوراً بولا۔ "ابھی نکاح میں لاؤں گا۔ باہر آجاؤ۔"

تاباں کے ایک ہاتھ میں بھری ہوئی بوتل تھی۔ اس کی طرف بڑھا کر بولی۔ "یہ آبِ زم زم ہے۔ اسے پیو اور کلیاں بھی کرو پھر زبان پر اسمِ اعظم لاؤ۔ میں باہر آجاؤں گی۔"

وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ہلالہ ہنسنے لگی' کہنے لگی۔ "ربانی! یہ تمہیں مہنگی پڑے گی۔ میری قدر کرو۔"

تاباں نے منہ پھیر کر کہا۔ "میں جارہی ہوں۔ آج کے بعد تم میری ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکو گے۔"

"رک جاؤ تاباں!" وہ پریشان ہوگیا۔ وہ صرف اس لیے ضروری نہیں تھی کہ ہوس مجبور کررہی تھی۔ ربانی اسے شکنجے میں رکھ کر رحمانی کو اپنے مقابلے میں کمزور بنا سکتا تھا۔

وہ بولی۔ "ابھی تم نے میری بات نہ مانی تو کل میں رحمانی کی منکوحہ بن جاؤں گی۔ وہ تم سے زیادہ میرا دیوانہ ہے' میری خاطر تم سے پھر دوستی کرسکتا ہے۔ وہ چاہے گا تو تمہاری نیک نامی اور شہرت تمہیں واپس مل جائے گی۔ وہ تمہاری ہر بات مانے گا۔"

ربانی بھی چاہتا تھا۔ رحمانی کو تاباں کے ذریعے ہی زیر کرسکتا تھا۔ شیطان نے کہا۔ "خبردار! اس پانی کو منہ نہ لگانا۔ میرا لعابِ دہن تیرے اندر سے نکل جائے گا تو اندر سے خالی اور کھوکھلا ہوکر مر جائے گا۔"

تاباں اس سے دور ہورہی تھی۔ مکان کی طرف جارہی تھی۔ ہلالہ نے کہا۔ "تاباں کو حاصل کرکے مجھ سے بھی دوستی رکھو گے تو بھی تمہارے کام آؤں گی۔ میرے باہر آتے ہی تمہارے اندر آنے کا راستہ کھل جائے گا۔"

وہ فوراً بولا۔ "تم سے تمام عمر دوستی رکھوں گا' مجھے اندر آنے دو۔"

ہلالہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ حصار سے باہر آیا۔ ربانی نے اسے تھام لیا پھر ہلالہ نے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اندر آگیا۔ اس نے آواز دی۔ "تاباں رک جاؤ۔"

وہ اسے حصار کے اندر دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ مکان میں چھپنے کے لیے بھاگنے لگی۔ ربانی نے ایک چھلانگ میں.... اسے دبوچ لیا۔ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اب تو رحمانی کا باپ بھی تمہیں چھین کر نہیں لے جاسکے گا۔ تم ہمارے شیطانی حصار میں رہوگی۔"

وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے تڑپنے لگی۔ نازک سا بدن ایک روبوٹ کی ایک چٹکی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اسے کاندھے پر لاد کر ہلالہ کے پاس آیا پھر اس کا ہاتھ تھام کر حصار سے باہر نکل گیا۔

وہ اپنے ساتھ اسے نادیدہ بنا کر وہاں سے نہیں لے جاسکتا تھا۔ شیطان نے اپنی قوت سے تاباں کو نادیدہ بنا دیا۔ وہ اپنے قد آور مجسمے کے سامنے اسے پہنچانا چاہتا تھا۔ ایسے

وقت اسے معلوم ہوا کہ تاباں اس کے فیصلے کے خلاف کسی اور سمت ربانی کے ساتھ جا رہی ہے۔

چند لمحوں کے بعد ہی وہ ایک خوبصورت سی جھیل کے کنارے پہنچ کر نمودار ہو گئے۔ یہ وہی جھیل تھی جہاں نوزائدہ ورشا کنول کے ایک پتے پر پائی گئی تھی۔

ربانی نے کہا۔ ”یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔ میں اسے اپنی چار دیواری میں لے کر اس کے وجود کو اپنے نام کرنا چاہتا ہوں پھر یہ میرے سوا کسی کی آرزو نہیں کرے گی۔“

شیطان نے کہا۔ ”یہاں ویرانی اور سناٹا ہے۔ کوئی مداخلت کرنے نہیں آئے گا۔ ورنہ کرزرحمانی آ جائے گا۔“

اس نے جلدی کی۔ اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ تاباں ایک خواہش تھی جو کسی بھی جھکنڈے سے پوری نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ وہ اس کے بازوؤں میں تھی لیکن اس کا ٹھوس وجود نہیں تھا۔ وہ شیشے کی طرح ٹرانسپیرنٹ ہو گئی تھی۔

وہ اچھل کر پیچھے گیا۔ غصے سے بولا۔ ”تم ورشا ہو۔“

”میں تاباں ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“

”یاد کرو۔ میں پہلے بھی ورشا کے اندر رہ کر آئی تھی۔ اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ چپ کھڑی ہے۔ ہونٹ نہیں ہل رہے ہیں۔ میں بول رہی ہوں۔“

اسے رحمانی کی آواز سنائی دی۔ ”تاباں درست کہہ رہی ہے۔“

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر رحمانی ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، کہہ رہا تھا۔ ”یہ یقین ہو چکا ہے کہ تو پاکیزگی اور ایمان کی طرف نہیں لوٹے گا۔ اس لیے تجھ سے آخری بار ہم نمٹنے آئے ہیں۔“

ربانی نے کہا۔ ”تو پھر تیرا بھی آخری وقت آ گیا ہے۔ میں تجھے تاباں کے لیے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔“

”نہ میں تیرے مقابل پر آؤں گا نہ تو مجھے ہاتھ لگا سکے گا۔“

ورشا کے ہونٹ ہلے۔ اس نے کہا۔ ”میں تجھے تاباں اور رحمانی کے قریب جانے نہیں دوں گی۔ بلا اپنے شیطان کو اور دیکھ کہ روحانی قوت کیا ہوتی ہے۔ لے تیرے سامنے تاباں آ رہی ہے۔“

وہ رحمانی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ربانی نے دیکھا جب وہ اپنی جگہ سے ہٹی تو وہاں رحمانی کے ساتھ تاباں دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ربانی اس کی طرف لپکا۔ ایک ہی چھلانگ میں سامنے پہنچتے ہی اسے دبوچ لینا چاہا تو نادیدہ رکاوٹ نے اسے روک دیا۔

کوئی ناکامی سی ناکامی تھی۔ ایک عرصے سے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اب وہ نظر آئی تھی تو اسے اٹھا کر لے آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ورشا کو لے آیا ہے۔

ورشا اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے اندر کی صفائی آج ہو گی۔ تم آب زم زم سے انکار کرو گے تو میری آتما کی پاکیزگی تمہارے اندر پہنچے گی۔ تمہاری غلاظتیں دور کرے گی لیکن طہارت حاصل کرتے ہی تمہاری آتما میری آتما کے ساتھ چلی جائے گی۔ آج کا دن اپنی زندگی کا آخری دن نہ بناؤ۔“

شیطان نے چیخ کر کہا۔ ”اسے اس کے ارادے خطرناک ہیں۔ یہ تجھے مار ڈالے گی۔ اسے قریب نہ آنے دے۔“

ورشا نے دوسرے ہی لمحے میں اس سے لگ کر گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ اس نے دور کرنا چاہا۔ وہ اس کے بازوؤں کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے دور کر سکتا تھا۔ نازک سی بانہوں کو توڑ سکتا تھا لیکن آتما کی گرفت سے نہیں نکل سکتا تھا۔

وہ بول رہی تھی۔ ”میرے قاتل! میں جو حیا سے مر گئی تھی، آج بے حیائی سے آ گئی ہوں۔ ان لمحات کے بعد جی نہیں سکوں گی۔

تاباں...! رحمانی...! خوش رہو۔ سلامت رہو۔“

دوسرے ہی لمحے اس کا وجود گم ہو گیا۔ مختصر سا اجلا سا دھواں بن کر ربانی کے نتھنوں میں داخل ہو گیا۔ وہ پاک روح تھی۔ یکبارگی ربانی کے پورے وجود کو زبردست جھٹکا لگا۔ منہ سے اور ناک سے قے ہونے لگی۔ غلاظتیں پچکاری کی طرح نکلنے لگیں۔

وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ اتنی شدت سے خارج ہو رہی تھیں کہ کانوں اور آنکھوں سے بھی نکل رہی تھیں۔

وہ اوندھے منہ پڑا تھا اور اندر سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ آخر تاپاکی ڈھل گئی۔ ایک مصفا آواز اندر سے ابھری۔

”اللہ...!“

پھر دائمی خاموشی چھا گئی۔

تاباں، رحمانی کے بازو کو تھام کر رو پڑی۔

”ورشا...!“

”اے حیا والی...!
بہت روئیں گے تجھے یاد کرکے...“

خود کردہ

سکندر علیم

نہایت آسان طریقے سے مشکل دور کرنے کا دلچسپ ماجرا... باریک بینی اور احتیاط پسندی سے مرتب دیے گئے منصوبے نے شاندار کامیابی حاصل کر لی تھی مگر عین وقت پر مات سے ہمکنار ہونا پڑا...

سراغ رسی سے آراستہ ایک مختصر دلچسپ تحریر...

پولیس سراغ رساں کیرول، سمتھ اسٹور کی مالکہ ایلس میتھ وزا کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی جو اپنے نقصان کی فہرست بنانے میں مصروف تھی۔

”اگر تم میرے سوالات کے جوابات دینے پر توجہ دو تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔“ پولیس سراغ رساں کیرول نے ایلس سے کہا۔ ”میرے سوالات پیچیدہ نہیں ہوں گے۔“

”میں معذرت چاہتی ہوں، سراغ رساں۔ ٹی

الوقت تو میں جتنی جلدی ممکن ہو سکتا ہے اپنی بیمے کی رقم حاصل کرنا چاہتی ہوں تاکہ میں اپنے سپلائرز کو ادائیگی کرسکوں۔" اسٹور کی مالکہ ایلس نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

یہ اسٹور دنیا بھر کے ہینڈی کرافٹ آئٹمز کی فروخت کے حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ بات سراغ رساں کیرول نے خاص طور پر نوٹ کرلی تھی۔ یہاں پر مختلف ملکوں کے دستکاری کے منفرد نمونے موجود تھے جو بڑے قرینے سے طاقوں میں سجے ہوئے تھے۔

"میں واضح کردوں کہ جب تک انشورنس کمپنی کو میری رپورٹ نہیں ملے گی، وہ تمہارے بیمے کے کلیم کو پروسس نہیں کریں گے۔" سراغ رساں کیرول نے صاف صاف کہہ دیا۔

یہ سنتے ہی ایلس کے قدم رک گئے۔ "اوکے! میں بات مان لیتی ہوں۔ اب تم مزید اور کیا جاننا چاہتی ہو؟"

"تم دوبارہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے مجھے اس ماسک پہنے ہوئے شخص کے بارے میں بتاؤ جس نے تمہیں عقبی کمرے میں بند کردیا تھا؟" سراغ رساں کیرول نے کہا۔

"جیسا کہ میں بتا چکی ہوں اس کا قد درمیانہ تھا۔ جسامت کے لحاظ سے وہ نہ تو دبلا پتلا تھا اور نہ ہی اسے تنومند کہہ سکتے ہیں۔ اس کے جسم پر نیلی جینز اور دھاری دار قمیص تھی۔ پیروں میں نرم تلے کے کرمچ کے جوتے تھے اور اس نے سر پر ماسک پہنا ہوا تھا۔"

"اس نے تم سے کن و عن کیا کہا تھا؟"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں عقبی کمرے میں چلی جاؤں۔ اور یہ کہ اگر میں نے اس کے ساتھ تعاون کیا تو وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچائے گا۔ اور وہ دس منٹ میں یہاں سے چلا جائے گا۔ وہ صرف نقد رقم اور ایسی اشیا لینا چاہتا تھا جو آسانی سے فروخت ہو جائیں۔" یہ کہہ کر اسٹور کی مالکہ ایلس نے ہلکا سا تلخ قہقہہ لگایا۔ "آسانی سے فروخت..... اسے بھلا کیا پتا کہ کسی شے کو فروخت کرنے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ کسی اسٹور کا مالک تو نہیں ہے۔"

"کیا اس کی آواز جانی پہچانی تھی؟"

"مجھے اس کی آواز میں کوئی منفرد بات سنائی نہیں دی تھی۔ یہ یاد ہے کہ ماسک پہننے کی وجہ سے اس کی آواز گھٹی گھٹی سی ہو رہی تھی.... اگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی آواز پہچان لی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ آواز بدل کر بول رہا ہو۔"

سراغ رساں کیرول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "تم نے گزشتہ چھ ماہ کے دوران اپنے کسی ملازم کو برخاست تو نہیں کیا؟"

"چھ ہفتے قبل میں نے میٹ ولسن نامی ملازم کو فارغ کردیا تھا کیونکہ میں اس کے بڑھتے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ میں نے اسے آئندہ ملازمت کے لیے ایک زبردست حوالہ دے دیا تھا۔" ایلس نے بتایا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ اس نے کسی دوسری جگہ کام تلاش کرلیا؟" کیرول نے پوچھا۔

"کسی نے یہاں اس کی ملازمت کے دورانیے اور اس کے رویے کے بارے میں جاننے یا اس کے بیان کو چیک کرنے کے لیے کبھی مجھے فون نہیں کیا۔"

اس کا مطلب تو کچھ بھی نہیں ہوا، سراغ رساں کیرول نے سوچا۔

"جب تم نے اسے فارغ کیا تھا تو کیا وہ غصے میں آ گیا تھا؟"

"یقیناً وہ خوش تو نہیں ہوا تھا۔"

"کیا وہ شخص میٹ ولسن ہو سکتا ہے جس نے آج تمہارے اسٹور کو لوٹا ہے؟"

"میرا خیال ہے۔ گو میں اس پر یقین تو نہیں کرسکتی۔ میٹ ولسن نے میرے پاس لگ بھگ ایک سال تک کام کیا ہے اور اس نے مجھے کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔" ایلس نے بتایا۔

سراغ رساں کیرول نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کیا فی الوقت کوئی ایسا فرد ہے جو تم سے ناخوش ہو؟"

"مجھے ایسا کوئی فرد یاد نہیں آرہا جو میرے ساتھ اس قسم کی کوئی حرکت کرسکتا ہے۔ فون پر مجھ پر چیخنا چلانا ایک الگ بات ہے اور ڈکیتی کی مسلح واردات سرانجام دینا قطعی الگ معاملہ ہے۔"

"فون پر کون تم پر چیخا چلایا تھا؟"

"میرا سابقہ شوہر۔ لیکن وہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ بچوں کو پروان چڑھانے کے معاملے میں ہم دونوں کی سوچ اور طریقِ کار یکسر مختلف تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر اب وہ میرا سابقہ شوہر ہے۔" ایلس نے جواب دیا۔

"کیا وہ اسی علاقے میں رہتا ہے؟"

"اس کی رہائش چند ٹاؤن کے قطعے پر ہے۔"

پھر سراغ کیرول کے کہنے پر ایلس نے اس کا پورا نام اور مکمل پتا بتا دیا۔

''بس ایک سوال اور۔ کیا تم نے اسٹور میں کسی کو یونہی فارغ منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کوئی خریداری نہ کی ہو اور ڈکیتی کی نیت سے جائزہ لینا اس کا مقصد رہا ہو؟''

''گزشتہ ہفتے ایک فرد ایسا دکھائی دیا تھا جس کی حرکات و سکنات مجھے مشکوک محسوس ہوئی تھیں۔ میں اس کے منڈلانے کا باریک بینی سے جائزہ لیتی رہی تھی لیکن اس نے کوئی چیز خریدنے میں دلچسپی نہیں لی۔ وہ لگ بھگ بیس منٹ تک یہاں رہا تھا لیکن صرف چیزوں کا جائزہ لیتا رہا۔''

''کیا تم نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا؟''

ایلس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟''

''ہوں، غالباً قامت درمیانی تھی۔ آنکھیں بھی شاید براؤن تھیں۔ یہ گزشتہ ہفتے کی بات ہے۔ البتہ جو بات عجیب تھی، وہ یہ احساس تھا کہ مجھے جھرجھری سی آ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا سبب کیا تھا بس ایک احساس جو وجود میں رینگ رہا تھا۔''

''اس کے جسم پر کوئی ٹیٹو وغیرہ نمایاں تھا؟''

ایلس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''چبھنے والی نظریں؟ بالوں کا کوئی منفرد انداز؟''

''ہاں ایک بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ کھبا تھا۔ وہ جو بھی شے اٹھا کر اس کا جائزہ لیتا تھا، وہ بائیں ہاتھ سے اٹھاتا تھا۔'' ایلس نے بتایا۔ پھر دوسرے لمحے اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور وہ تقریباً چیختے ہوئے بولی ''ہاں، اور وہ ڈکیت بھی کھبا تھا! جب وہ کیش رجسٹر میں سے نقدی سمیٹ رہا تھا۔ تو تب بھی اس کا بایاں ہاتھ چل رہا تھا۔''

''یہ تو تم نے بڑی کارآمد بات بتائی ہے۔'' سراغ رساں کیرول نے کہا۔ ''اور اس روز جب وہ تمہارے اسٹور میں آیا تھا تو اس سے پہلے کبھی تم نے اسے نہیں دیکھا تھا؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایسا ہی ہے۔''

''او کے ایلس، فی الوقت مجھے یہی معلومات درکار تھیں۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گی۔'' سراغ رساں کیرول نے کہا۔

''کیا تمہارے خیال میں تم اس شخص کو تلاش کر لو گی؟''

''اوہ! مجھے یقین ہے کہ میں نہ صرف اس شخص کو تلاش کرلوں گی بلکہ اسے حراست میں بھی لے لوں گی۔'' سراغ رساں کیرول نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اور پھر سراغ رساں کیرول نے اسٹور کی مالکہ ایلس مینڈوزا کو اپنے ہی اسٹور میں فرضی ڈکیتی کے جرم میں حراست میں لے لیا۔

جس یقین کی بنا پر کیرول نے ایلس کو حراست میں لیا تھا، وہ خود ایلس کا بیان تھا جو روانی میں باتوں باتوں کے دوران میں یہ کہہ گئی تھی کہ جب وہ چور کیش رجسٹر میں سے نقدی نکال رہا تھا تو تب بھی اس کا بایاں ہاتھ چل رہا تھا اور وہ کھبا تھا۔ جبکہ ایلس پہلے یہ بات کہہ چکی تھی کہ چور نے اسے عقبی کمرے میں بند کر دیا تھا۔ بھلا بند کمرے کے اندر سے اس نے چور کو باہر کیش رجسٹر سے نقدی نکالتے ہوئے کس طرح دیکھ لیا تھا؟

ایلس کو اپنے جرم کا اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بیمے کی رقم کے حصول کے لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا کیونکہ اس کا کاروبار مندا چل رہا تھا اور اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔

مشکل فن

گاہک (حجام سے) ''بال تراشنے سے پہلے میری ہدایات غور سے سن لو دائیں طرف سے بال یوں کاٹو کہ کھوپڑی نظر آنے لگے۔ بائیں طرف کے بال چھوڑ دینا تاکہ میں اپنا بایاں کان ڈھانپ سکوں۔ ماتھے سے 4 چار انچ اوپر ذرا دائیں طرف چاندی کے روپے کے برابر گنج بنا دینا سر کے درمیان بالوں کی ایک لٹ چھوڑ دینا جو میری ناک تک پہنچے سر کی پچھلی جانب بالوں کی سیڑھی بنا دینا کیونکہ میرا چھوٹا بیٹا بھی پسند کرتا ہے۔''

حجام۔ ''معاف کیجیے گا میں اس طرح کے بال نہیں بنا سکتا۔''

گاہک حیران ہو کر۔ ''وہ کیوں؟ پچھلی دفعہ تو تم نے اسی طرح کے میرے بال کاٹے تھے۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کا تعاون

چہرہ شناس

مریم کے خان

زندگی میں آنے والی بزرگ ہستیاں شجرِ سایہ دار کے مانند ہوتی ہیں... جو ان کے حلقۂ حصار میں آجاتا ہے... اس کی زندگی میں دھوپ کے باوجود چھاؤں طاری رہتی ہے... کشیدہ اور دل گرفتگی کا غبار آندھیوں کی دھول کی صورت یکایک آتا ہے اور چلا بھی جاتا ہے... مگر اس کے اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔ چھوٹے بچے کی نفسیاتی اور ذہنی صورتِ حال بھی اسی طرح کی ہوتی ہے... وہ اپنے بچپن میں جو دیکھتا ہے... اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن و دل میں محفوظ کر لیتا ہے...

اس لڑکی کا فسانہ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ چہرہ شناس ہے

جولی کارلین جب ڈینور سے نکلی تو موسم خراب تھا اور مزید خرابی کی پیش گوئی تھی۔ مگر اسے امید تھی کہ وہ کرسمس نائٹ سے پہلے اپنے آبائی گھر میں ہوگی۔ جہاں اب صرف اس کی ماں ایملی کارلین رہتی تھی۔

چوبیس دسمبر کی شام اس نے آف کیا اور فوری روانہ ہوگئی۔ اس نے سامان صبح ڈیوٹی پر آتے ہوئے گاڑی کی ڈگی میں رکھ لیا تھا اور اس میں سب کے لیے تحفے بھی تھے۔ اسے امید تھی کہ وہ اگر نو بجے ہائی وے تک پہنچ گئی تو رات بارہ سے پہلے کیسپر پہنچ جائے گی مگر موسم کی خرابی کی اطلاع نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وائیومنگ میں شدید برف باری جاری تھی اور ہائی وے صاف رکھنے والا عملہ چوبیس گھنٹے کام کر رہا تھا۔ اس کے باوجود متعدد مقامات پر ہائی وے بند تھی اور گاڑیوں میں سفر کرنے والوں کو سرد موسم میں سڑک کھلنے کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے ڈینور سے چی اینے تک ہائی وے صاف تھی۔ جولی نے تیز ڈرائیو کی تھی اور رات آٹھ بجے تک وہ چی اینے کے پاس ایک گیس اسٹیشن تک تھی۔ اس نے یہاں سے گیس بھروائی اور پھر ڈنر کا سوچا۔

گیس اسٹیشن کے ساتھ کیفے تھا مگر اسے یہاں کا کھانا پسند نہیں تھا۔ چی اینے سے آگے ایک اچھا ریستوران تھا اور جولی ہمیشہ یہیں سے کھاتی تھی۔ یہ جگہ مزید کوئی پچاس کلومیٹرز کی دوری پر تھی۔ جولی کا خیال تھا کہ وہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے گی مگر غیر متوقع طور پر چی اینے سے نکلنے کے بعد اسے سڑک اتنی صاف نہیں ملی۔ اس پر نرم اور گیلی سے کیچڑ بناتی برف ملی تھی جس پر گاڑی کے ٹائر سلپ ہو رہے تھے۔ اسے محتاط ڈرائیونگ کرنا پڑی تھی جب وہ ریستوران تک پہنچی تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ تشویشناک بات ریستوران کے باہر موجود گاڑیوں کی بڑی تعداد تھی۔ اس موسم میں ایسا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ آگے ہائی وے کسی وجہ سے بند ہو۔ اس نے مسلسل ریڈیو لگا... رکھا تھا اور اس میں ہائی وے بچیس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

جولی تقریباً پچیس برس کی لیکن چہرے سے اسکول گرل نظر آتی تھی۔ دل کش نقوش اور متناسب جسامت کی وجہ سے اسے خوب صورت کہا جا سکتا تھا۔ خاص طور سے اس کی سرمئی نیلگوں آنکھیں دیکھنے والوں کو متاثر کرتی تھیں۔ جولی نے سردی کی مناسبت سے مکمل لباس پہن رکھا تھا۔ البتہ ڈرائیونگ کے دوران اس نے بھاری جیکٹ اتار دی تھی۔ ایک تو اسے الجھن ہوتی تھی دوسرے گاڑی میں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہیٹر گاڑی کو اندر سے گرم رکھے ہوئے تھا۔ اس موسم میں ہیٹر کے بغیر سفر کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔ باہر درجہ حرارت منفی سات اور آٹھ تھا اور اس میں مزید کمی کی پیش گوئی تھی۔ جولی نے کار پارکنگ میں روکی۔ اس نے اپنا مفلر اور ٹوپی لی اور جیکٹ اٹھاتے ہوئے نیچے اتر آئی۔ گرم کار سے یخ فضا میں آنے پر وہ ایک لمحے کو لرز اٹھی تھی۔ پھر جلدی سے جیکٹ پہنتے ہوئے وہ ریستوران کی

طرف بھی۔

ریستوران زیادہ بڑا نہیں تھا کیونکہ یہاں سے کم لوگ ہی گزرتے تھے اور اس وقت تو آف سیزن تھا۔ دروازے پر ہی بورڈ لگا ہوا تھا کہ کرسمس کی وجہ سے ریستوران رات بارہ بجے بند کر دیا جائے گا اور پھر دو دن بعد کھلے گا۔ اندر آنے پر جولی نے سکون کا سانس لیا۔ ریستوران بھرا ہوا تھا اور سوائے کاؤنٹر اسٹولز کے کوئی جگہ خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ موسم کی وجہ سے ہی ریستوران بھرا ہوا تھا۔ جولی اسٹول پر بیٹھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ ایک کونے میں دو افراد کے لیے میز تھی اور اس پر ایک نوجوان لڑکا موجود تھا۔ وہ سر جھکائے اسپگیٹی کھانے میں مصروف تھا۔ جولی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ایک میز کی طرف بڑھ گئی جس پر دو عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کی توجہ کھانے سے زیادہ آپس کی گفتگو پر تھی۔ جولی نے ان کے پاس پہنچ کر کہا۔ ”معاف کرنا کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں، کوئی میز خالی نہیں...“

”سوری ہم بات کر رہے ہیں۔“ ایک عورت نے اس کی بات کاٹ کر رکھائی سے جواب دیا اور پھر دوسری عورت سے گفتگو میں محو ہو گئی۔ جولی نے گہری سانس لی اور کاؤنٹر کی طرف بڑھی تھی کہ میز پر اکیلے بیٹھے لڑکے نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھایا۔ جولی رکی اور پھر اس کی طرف بڑھ گئی۔ لڑکا خوش شکل اور دوستانہ تاثرات کا حامل نرم رو دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے نزدیک آنے پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”سوری میں نے تم کو اشارہ کیا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ ان عورتوں نے انکار کر دیا ہے اور تمہیں سیٹ کی ضرورت ہے۔“

”سوری کی ضرورت نہیں ہے۔“ جولی مسکرائی۔

”مجھے واقعی سیٹ کی اشد ضرورت ہے۔“

لڑکا خوش ہو گیا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”پلیز... مجھے جان کہتے ہیں۔“

”جولی۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا جو نوجوان نے گرم جوشی سے تھام لیا اور کچھ دیر تھامے رکھا۔ جولی نے بیٹھتے ہوئے ویٹرس کو اشارہ کیا اور جان سے کہا۔ ”میں شکر گزار ہوں، لمبی ڈرائیو کے بعد میرا اسٹول پر بیٹھنے کا ارادہ نہیں تھا۔“

”ہونا بھی نہیں چاہیے۔“ جان نے اس کی تائید کی۔

”تم کہاں سے آرہی ہو؟“

”ڈینور سے۔“ جولی نے جیکٹ کی زپ نیچے کر لی۔ ریستوران اندر سے خاصا گرم تھا اور لوگ بھی خاصے تھے اس سے بھی اندر کا ماحول گرم ہو گیا تھا۔ ”کیسپر جا رہی ہوں اور تم؟“

”مجھے تھنڈر بیسن نیشنل پارک کے پاس ایک جگہ جانا ہے۔“ جان نے بتایا۔ ”وہاں میرا آبائی گھر ہے اور میری ماں وہاں میرا انتظار کر رہی ہے لیکن فی الحال میں کہیں نہیں جا رہا۔“

جولی وجہ پوچھنا چاہتی تھی کہ ویٹرس آ گئی۔ جولی نے اس سے دستیاب ڈشوں کا پوچھا اور پھر اپنی پسند کا ڈنر نوٹ کرانے لگی۔ نوعمر ویٹرس نے کہا۔ ”اس میں کچھ وقت لگے گا۔ آج رش بہت ہے اور ایرک اکیلا ہی لگا ہوا ہے۔ اس وقت تک کے لیے کچھ لے آؤں؟“

”ڈنر میری طرف سے۔“ جان نے کہا۔

”ارے نہیں۔“ جولی بولی۔

”پلیز۔“ جان نے کہا اور ویٹرس کو اشارہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ جولی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔

”تم نے زحمت کی لیکن میں شکر گزار ہوں۔“

یہاں بار نہیں تھا مگر ٹن اور بوتلوں میں شرابیں دستیاب تھیں۔ ویٹرس اس کے لیے ٹن لے آئی۔ جولی نے ٹن کھولا اور اس سے پوچھا۔ ”تم کہیں کیوں نہیں جا رہے ہو؟“

”دو میل پہلے میری کار خراب ہو گئی ہے۔ میں نے ایک گیس اسٹیشن والے سے کہہ دیا ہے وہ کار لے جائے گا اور ٹھیک بھی کرے گا مگر اب مجھے گھر جانا ہے اور تم دیکھ رہی ہو کہ تمام پبلک ٹرانسپورٹ بند ہو چکی ہے۔ کیب سروس بھی بند ہو گئی ہے۔“

جولی نے سر ہلایا۔ ”کرسمس کے موقع پر ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”میں پولیس سے لفٹ لے کر یہاں پہنچا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں آگے نہ جانے کیسے جاؤں گا۔ پولیس ہر جگہ لفٹ نہیں دیتی ہے۔“

جولی خاموش رہی۔ جب تک بیئر کا ٹن ختم ہوا اس کا ڈنر آ گیا تھا۔ جان نے ڈنر مکمل کر لیا تھا۔ اس نے اپنے لیے کافی منگوائی۔ جان نے جدید فیشن کا اور مہنگا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا سن گلاس بھی قیمتی تھا اور وہ یقیناً کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ جولی نے پوچھا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟“

”میں یونیورسٹی میں ہوں۔“ اس نے شعبے کا نام لیے بغیر کہا۔ ”میرا دوسرا سال ہے۔“

”کس یونیورسٹی میں؟“

”جی اپنے یونیورسٹی میں۔“ جان نے جواب دیا۔ ”وہیں ہاسٹل میں رہتا ہوں اور پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا ہوں۔“

”تب تم لیٹ نکلے ہو، یونیورسٹی تو بیس تاریخ سے بند ہو چکی ہے۔“

”ہاں مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے تھے اور ان کے چکر میں لیٹ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں کرسمس کی رات سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گا مگر اب...“ اس نے مایوس انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ”یہاں پھر بھی کچھ ٹریفک ہے جہاں میں جا رہا ہوں وہاں مشکل سے کوئی گاڑی اس وقت گھر سے باہر نکلے گی۔ خیر چھوڑو، تم کیا کرتی ہو؟“

”جاب۔“ جولی نے جواب دیا۔

”رئیلی۔“ جان نے بے یقینی سے کہا۔ ”میں تو سمجھا کہ تم بھی اسکول یا کالج اسٹوڈنٹ ہو۔ چہرے سے تم بہت کم عمر اور معصوم لگتی ہو۔“

جولی مسکرائی۔ ”میری ماما کہتی ہیں کہ چہرہ انسان کی شخصیت غلط بتاتا ہے۔“

جان ہنسا۔ ”ساری ماما ایک جیسی بات کرتی ہیں، میری ماما بھی یہی کہتی ہیں کہ انسان کا چہرہ دھوکا دیتا ہے جیسا وہ نظر آتا ہے، وہ اس کے الٹ ہو۔“

”مگر میں اس سے متفق نہیں ہوں۔“ جولی بولی۔ ”میرا ذاتی تجربہ ہے اکثر انسان وہی ہوتا ہے جو اس کا چہرہ بتاتا ہے۔“

جان نے سر ہلایا۔ ”میرا تجربہ زیادہ نہیں ہے مگر میں کسی حد تک تم سے متفق ہوں۔ اکثر لوگ ویسے ہی نکلتے ہیں جیسے کہ وہ چہرے سے نظر آتے ہیں۔“

وہ جس جگہ بیٹھے تھے یہاں سے شیشے کے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا اور آسمان سے روئی کے گالے جیسے برف کے ٹکڑے تیز ہوا کے ساتھ گرنے لگے تھے۔ جولی پریشان ہوگئی۔ پیش گوئی کے مطابق موسم مزید خراب ہورہا تھا۔ یہ بات وہاں رکنے والے مسافروں نے بھی محسوس کرلی تھی اور وہ جلد رخصت ہونے لگے۔ جب تک جولی نے ڈنر ختم کیا نصف لوگ جا چکے تھے اور باقی بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ بھی روانہ ہوجائے۔ ایسا نہ ہو کہ موسم زیادہ ہی خراب ہو اور وہ یہاں پھنس کر رہ جائے۔ جیسا کہ دروازے پر نوٹس لگا ہوا تھا کہ ریستوران بھی بارہ بجے بند ہوجائے گا۔ جان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید اس کا خیال بھانپ لیا۔ ''جلد بازی مت کرو، ابھی تمہارے پاس ڈیڑھ گھنٹا ہے۔''

''لیکن مجھے ابھی ڈیڑھ سو کلو میٹرز کا سفر اور کرنا ہے۔ موسم زیادہ خراب ہوگیا تو میں پھنس جاؤں گی۔''

''تمہاری مرضی۔'' جان نے بل ادا کرنے کے لیے پرس نکالا۔ اس کا پرس بھی قیمتی لیدر کا تھا۔ اس نے سو ڈالرز کا ایک نوٹ پلیٹ کے نیچے رکھا جو یقیناً بل کی اصل رقم سے خاصا زیادہ تھا۔ جولی نے ویٹریس کو اشارہ کیا اور اس سے بل میں ایک پیک کافی شامل کرنے کو کہا۔ اس کا ارادہ کافی راستے میں پینے کا تھا۔ چند منٹ میں وہ بل اور پیک کافی لے آئی۔ جولی نے بل اور ٹپ کی رقم دی اور کھڑی ہوگئی۔ اس نے جان کی طرف دیکھا۔

''شکریہ تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرا۔''

وہ مسکرایا۔ ''شکریہ تو مجھے کہنا چاہیے کہ تم نے کمپنی دی۔''

جولی اگلا سوال کرتے ہوئے ہچکچائی۔ ''اب تم کیا کرو گے؟''

جان نے شانہ اچکایا۔ ''کیا کہہ سکتا ہوں، ہوسکتا ہے پیدل چل پڑوں، راستے میں کوئی لفٹ دے دے یا پٹرول پولیس مہربان ہوجائے۔ کل تک میں گھر پہنچ ہی جاؤں گا۔''

''اوکے بائے، گڈ لک۔'' جولی نے کہا اور کافی پیک کا شاپر پکڑ کر باہر آئی۔ ہوا میں بہت تیزی اور کاٹ آگئی تھی۔ موٹی اونی جیکٹ سے گزر کر جسم کو لگ رہی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی کار تک آئی اور اندر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا تھا کہ اسے شیشے کے پار ریستوران میں جان دکھائی دیا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جولی کو دیکھتے پا کر اس نے ہاتھ سے بائے کا اشارہ کیا۔ جولی نے ہاتھ اوپر کیا تھا مگر پھر وہ رک گئی۔ اس نے کافی پیک کار کے اندر رکھا اور واپس ریستوران میں آئی۔ جان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ جولی نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں تم کو تھنڈر بیسن نیشنل پارک کی طرف جانے والے کٹ پر اتار دوں گی۔''

جان ہچکچایا۔ ''تم کو زحمت ہوگی۔''

''نہیں ہوگی میں اسی جگہ سے گزروں گی۔''

جان خوش ہوگیا۔ ''تب میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔''

وہ کھڑا ہوا تو جولی نے دیکھا کہ اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''تم بغیر سامان کے گھر جا رہے ہو؟''

''نہیں سامان کار میں ہے۔ میں اسے لے کر سفر نہیں کرسکتا تھا اس لیے مجبوراً ڈکی میں چھوڑنا پڑا۔ ویسے مجھے ضرورت نہیں ہے گھر میں میرے لیے سب ہے۔''

''ہاں مائیں بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں۔'' جولی نے کہا اور باہر آئی۔ جان نے لیدر جیکٹ پہنی ہوئی تھی اور یہ خاصی گرم تھی۔ اس کے پیروں میں اچھے لیدر اور فر سے بنے ہوئے جوتے تھے۔ یہ تمام چیزیں نئی تھیں۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے کار میں گھسے۔ جولی نے اپنی جیکٹ اتار کر پچھلی سیٹ پر ڈالی اور کار اسٹارٹ کرتے ہی ہیٹر بھی آن کردیا۔ ویسے تو کار اندر سے گرم ہی ہو رہی تھی مگر چند بار جو دروازے کھلے تو باہر کی خنکی بھی اندر آگئی اور ہیٹر آن ہونے کے چند منٹ بعد جاکر اندر کا درجۂ حرارت خوشگوار ہوا۔ جان نارمل تھا مگر گرم جرسی اور پینٹ میں جولی کانپ رہی تھی۔ ہائی وے پر آنے کے بعد اس نے سکون محسوس کیا۔ یہاں ہوا تیز تھی کار کے انجن کو باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ وہ موسم کے حوالے سے پریشان تھی۔ جان نے اسے تسلی دی۔ ''ہوا تیز ہے اس لیے برف زیادہ نہیں گرے گی۔''

''مگر یہ ونڈ اسکرین پر جمے گی۔'' جولی نے وائپر آن کرتے ہوئے کہا اور اپنا کافی پیک ختم کیا۔ ''سوری، مجھے خیال نہیں رہا کہ تم بھی ساتھ ہو گے ورنہ ایک پیک اور لے لیتی۔''

''کوئی بات نہیں۔'' جان مسکرایا۔ ''میں خود کو گرم کرنے کا سامان ساتھ رکھتا ہوں۔'' اس نے جیکٹ کی جیب تھپتھپائی۔

''الکوحل۔'' جولی نے کہا۔ ''تم انڈر ایج ہو؟''

''نہیں اس سال اپریل میں، میں اٹھارہ کا ہو گیا ہوں۔'' جان نے تردید کی۔ ''لیکن سچی بات ہے میں پندرہ سال کی عمر سے پی رہا ہوں۔ البتہ عادی میں بھی نہیں رہا۔''

''اچھی بات ہے۔'' جولی نے سرسری انداز میں کہا۔ ''آدمی کو اصول اور قوانین کی پابندی کرنی چاہیے۔''

''ہاں مگر آج کل کون کرتا ہے۔ تم بار میں جاؤ تو وہاں بارہ تیرہ سال کے بچوں کو بھی شراب فروخت کی جاتی ہے۔''

''لوگ قانون شکنی کرتے ہیں مگر اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتی ہے۔'' جولی نے کہا اور اسے پہلی بار بے چینی سی محسوس ہوئی تھی۔ اسے لگا کہ اس کی بے چینی کا تعلق جان سے ہے۔ شاید اس نے اسے لفٹ دے کر جلد بازی کی تھی۔ اسے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ جان نے جس طرح سے قانون اور اصول کے بارے میں بات کی تھی اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر اب تو اس نے لفٹ دے دی تھی۔

جان نے اس کی طرف دیکھا۔

''واقعی؟'' اس کا لہجہ کسی قدر استہزائیہ تھا۔

''ہاں، یہ ایک جنرل بات ہے۔'' جولی نے کہا۔ ''اخلاقیات...''

''یہ سب پرانی اور فرسودہ باتیں ہیں۔'' جان نے بات کاٹ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے رفتار کم کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس پیچھے آ جائے۔''

''ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ لوگ اب قانون کی زیادہ پروا نہیں کرتے ہیں۔''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''میں نے کہا تھا مگر ذاتی طور پر میں کم سے کم ٹریفک قوانین کی پابندی پسند کرتا ہوں، خاص طور سے جب پولیس کے پیچھے آنے کا خطرہ ہو۔''

جولی کے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ جان کے قانون کے بارے میں خیالات اچھے نہیں تھے مگر ساتھ ہی وہ پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آخر کیوں؟ اس نے رفتار ساٹھ رکھی تھی جو ہائی وے کے لحاظ سے تو مناسب تھی مگر موسم کے لحاظ سے زیادہ تھی۔ واقعی پولیس پیچھے آسکتی تھی۔ اسے ٹکٹ دینے نہیں بلکہ خبردار کرنے کہ وہ خطرناک رفتار سے ڈرائیو کر رہی ہے۔ اس نے رفتار کم کر کے پچاس کر لی۔ شاید اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اس جگہ پہنچ جائیں جہاں اسے جان کو اتارنا تھا۔ اس رفتار سے وہ دو گھنٹے سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہوا کی رفتار کے ساتھ ہی اڑتی برف کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ ڈرائیورز کے لیے اچھی بات نہیں تھی۔ اسے رفتار مزید کم کرنا پڑی اور کم رفتار کا مطلب تھا کہ وہ زیادہ دیر ہائی وے پر سفر سے باہر رہے گی۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو شاید اسے اتنی فکر نہ ہوتی مگر اب جان کے ساتھ وہ زیادہ دیر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد اس سے الگ ہو جائے۔

اس نے توجہ ہٹانے کے لیے ریڈیو آن کر لیا۔ اتفاق سے اس وقت موسم کا احوال آ رہا تھا۔ خبر اچھی نہیں تھی۔ شمال سے ایک بڑا برفانی طوفان امریکا کی وسطی ریاستوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے اثرات نزدیکی ریاستوں تک پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ تو جولی کو ونڈ اسکرین کے پار نظر بھی آ رہا تھا۔ موسم کے حال کے بعد نیوز کاسٹر دوسری خبروں کی تفصیل دینے لگا۔ ہائی وے ای پر جو جگہ اپنے ساتھ سے گزرتی تھی اور ہائی وے پچیس کو کراس کرتی تھی۔ جگہ اپنے سے دو میل پہلے مشرق میں کسی نامعلوم فرد نے ایک نوجوان انگز نذر برک کو چاقوؤں کے وار کر کے قتل کر دیا۔ واردات شام کے وقت چھ بجے ہوئی اور قاتل نے نوجوان کو مارنے کے بعد اسے لوٹا بھی کیونکہ مقتول کے پاس سے اس کا پرس، موبائل اور دوسری تمام چیزیں غائب ہیں۔ امکان ہے کہ قاتل اس کا کریڈٹ کارڈ یا دوسری چیزیں استعمال کر سکتا ہے۔ پولیس نے عوام سے اپیل کی تھی کہ اگر وہ اس بارے میں کچھ جانتے ہوں تو پولیس سے رابطہ کریں۔ ابھی خبر جاری تھی کہ جان نے ہاتھ بڑھا کر چینل بدل دیا اور ایک میوزک چینل لگا دیا۔

''چینل کیوں بدلا ہے؟'' جولی کسی قدر تیز لہجے میں بولی۔ اسے غصہ آ گیا۔

''مجھے نیوز پسند نہیں ہیں۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ اس وقت وہ ریستوران والے نوجوان کے مقابلے میں خاصا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک طرح کی برتری اور جارحیت تھی۔ جولی نے ایک نظر اسے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو بند کر دیا۔ اس پر جان نے کوئی ردعمل نہیں

دیا۔ جولی نے کچھ دیر بعد کہا۔

''اس قتل کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے قاتل اسے لوٹنا چاہتا ہوگا مگر اس کی مزاحمت پر مشتعل ہو کر قاتل نے اسے مار دیا۔''

''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاتل کی نظر میں ایک انسانی جان کی قیمت چند ڈالرز یا ایک موبائل فون سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

جان نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ''صرف قاتل نہیں آج کل لوگوں کا رویہ یہی ہو گیا ہے۔ اگر مقتول کو دولت سے پیار نہ ہوتا تو وہ اس کا مطالبہ مان لیتا اور اپنی جان بچا لیتا۔''

''ممکن ہے قاتل پھر بھی اسے مار دیتا۔'' جولی نے اصرار کیا۔ ''بعض لوگ تفریحاً بھی قتل کرتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے کہ ایسا بھی ہوا ہو۔ تم نے ٹھیک کہا، بعض لوگ تفریحاً بھی قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔''

''اور چاقو سے قتل؟'' جولی نے کہا۔ ''سب سے نزدیکی تعلق نہیں بنتا قاتل اور مقتول کے درمیان؟''

''نزدیکی تعلق؟''

''ہاں قاتل خود چاقو مقتول کے جسم میں اتارتا ہے۔ وہ اسے پکڑتا ہے۔ اس کا خون قاتل کے ہاتھ اور ممکنہ طور پر لباس پر آتا ہے۔ وہ اس کی اذیت اور جذبات کو براہ راست دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ دوسرے کسی طریقے سے قتل کرتے ہوئے قاتل مقتول اتنے قریب نہیں آتے ہیں۔''

''گلا گھونٹ کر قتل کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''ہاں اس میں بھی قاتل مقتول کا قریبی تعلق بنتا ہے۔'' جولی نے اعتراف کیا۔ ''مگر چاقو سے قتل آسان اور فوری ہوتا ہے۔ گلا گھونٹ کر بہت کم قتل کرتے ہیں اور عام طور سے ایسا اشتعال میں ہوتا ہے۔ نفسیاتی قاتل اور سیریل کلرز اکثر چاقو یا دھار والے آلات سے قتل کرنا پسند کرتے ہیں۔''

جان اب اسے زیادہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ''ایسا لگتا ہے تمہیں قتل کے موضوع سے خاص دلچسپی ہے؟''

''بہت زیادہ تو نہیں مگر اتفاق سے خبر اس کی آئی تو میں نے بات کر لی۔'' جولی نے کہا۔ ''مجھے اس نوجوان کے قاتل کا خیال آ رہا ہے۔ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟''

جان نے جواب نہیں دیا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک ناہموار پہاڑی علاقے سے گزر رہے تھے، یہاں سڑک سیدھی نہیں تھی بلکہ بار بار گھوم رہی تھی اور جولی کو توجہ سے ڈرائیو کرنی پڑ رہی تھی۔ ذرا آگے ایک گیس اسٹیشن تھا۔ جولی سوچ رہی تھی کہ وہ کھلا ہوگا یا نہیں۔ اگر وہ کھلا ہوگا تو وہ وہاں سے گیس بھروائے گی۔ اگرچہ اسے خاص ضرورت نہیں تھی، ٹینک اس وقت بھی تین چوتھائی بھرا ہوا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں تھا کہ ممکن ہے جان وہاں اتر جائے اور اسے موقع مل جائے۔ ایک چھوٹی پہاڑی کے گرد سے گھوم کر وہ سیدھی ہائی وے پر آئے تو دور روشنیوں میں جگمگاتا ہوا گیس اسٹیشن نظر آ گیا۔ جولی نے نزدیک آنے پر اچانک کار گیس اسٹیشن کی طرف موڑی تو جان چونکا اور اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

''یہاں کیوں رک رہی ہو؟''

''میں سوچ رہی ہوں ٹینک فل کرا لوں۔ کرسمس کی چھٹیوں میں مشکل سے کوئی گیس اسٹیشن کھلا ملے گا۔''

''میرا خیال ہے ضرورت نہیں ہے، کار واپس ہائی وے پر لے لو۔'' جان نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا مگر اتنی دیر میں جولی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کار گیس اسٹیشن میں داخل کر چکی تھی۔ اس نے جان کی بات کا جواب بھی نہیں دیا اور ایک پمپ کے پاس کار روک کر اس نے عقب سے اپنی جیکٹ اٹھائی اور نیچے اترنے لگی تھی کہ جان نے کہا۔ ''تم رکو باہر سردی بہت ہے، میں گیس بھرتا ہوں، چابی دو۔''

جولی نے ایک نظر اس کے پھیلے ہاتھ کو دیکھا اور چابی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ نیچے اتر گیا۔ انجن بند ہونے سے گاڑی کا درجہ حرارت تیزی سے گرنے لگا تھا۔ جان نے چابی سے ٹینک کا ڈھکن کھولا اور پمپ سے پائپ نکال کر اس میں لگایا۔ گیس اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تین پمپ تھے اور پیچھے عمارت تھی، اس میں اسٹور بھی تھا۔ یہاں رکنے والے خریداری بھی کر سکتے تھے۔ جولی شیشے کے پیچھے سے اسٹور اور گیس اسٹیشن کے مالک یا ملازم کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنے سامنے لگے پمپ انڈیکیٹر پر دیکھ رہا تھا کہ کتنا ایندھن گاڑی میں جا رہا ہے۔ چند منٹ میں ٹینک بھر گیا اور جان نے پائپ واپس پمپ سے لگا کر ٹینک کا ڈھکن بند کیا اور اسٹور کی طرف جانے لگا۔ جولی نے شیشہ نیچے کر کے اس سے کہا۔ ''ادائیگی میں کروں گی۔''

''یہ میری طرف سے ہوگی۔'' جان نے مڑے بغیر جواب دیا اور اندر چلا گیا۔ چابی اس کے پاس ہی تھی۔ جولی کے پاس ایک اضافی چابی تھی جو گاڑی میں ایک جگہ چھپی

ہوئی تھی۔ سب کی طرح وہ بھی اضافی چابی رکھتی تھی کہ کسی ہنگامی موقع پر کام آئے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا آج وہ موقع آ گیا تھا؟ اس کے اندر کشمکش سی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی حساس ہو رہی ہے۔ کشمکش بڑھی تو بالآخر اس نے فیصلہ کیا اور نیچے اتر آئی۔ اضافی چابی ایک بہت طاقتور ... مقناطیس کی مدد سے ڈکی کے نیچے ایک جگہ چھپی ہوئی تھی۔

جولی نے اسٹور میں دیکھا تو شیشے کے پیچھے اسے مالک یا اسٹور کیپر نظر نہیں آیا۔ وہ پیچھے آئی اور جھک کر ڈکی کے نیچے ہاتھ پھیر رہی تھی کہ اسٹور کا دروازہ کھلا اور جان باہر آیا۔ جولی جلدی سے سیدھی ہو گئی اور ٹائر کو ٹھوکر مارنے لگی۔ جان پاس آیا۔ "کیا ہوا؟"

"مجھے لگا کہ ٹائر میں ہوا کم ہے اور کار اس طرف سے بیٹھی ہوئی ہے لیکن ٹائر ٹھیک ہے شاید یہاں فرش ہموار نہیں ہے۔"

جان نے غور سے کار اور فرش کو دیکھا۔ "مجھے تو دونوں ٹھیک لگ رہے ہیں۔ خیر آؤ بیٹھو۔ ابھی طویل سفر ہے۔"

مجبوراً جولی کار میں آئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ ایک منٹ پہلے فیصلہ کر لیتی تو اس وقت ہائی وے پر سفر کر رہی ہوتی۔ تاخیر نے اسے ناکام کر دیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر جان کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "کیا؟"

"چابی۔ میں گاڑی کیسے اسٹارٹ کروں؟"

"اوہ سوری۔" اس نے جیب سے چابی نکال کر دی جو ہلکی سی نم ہو رہی تھی۔ جولی نے کار اسٹارٹ کی اور پوچھا۔ "پیسوں کی کتنی ادائیگی کی؟"

"اسے بھول جاؤ، سمجھ لو یہ اس سفر میں میری طرف سے شیئر ہے۔"

"اس کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن تمہارا شکریہ۔"

وہ اس وقت ہائی وے سکس پر تھنڈر بیسن ... سے کوئی سو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھے۔ جولی کا اندازہ تھا کہ کار کی رفتار چالیس کلومیٹرز فی گھنٹے سے زیادہ نہیں تھی گویا انہیں اس جگہ تک پہنچنے میں کم سے کم دو ڈھائی گھنٹے ضرور لگتے۔ موسم مزید خراب ہوا تھا۔ اب برف کے اڑتے گالوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور اسی وجہ سے حدِ نظر بھی محدود تھی ...

جان نے اچانک کہا۔ "لگتا ہے تم جلد از جلد منزل پر پہنچنا چاہتی ہو۔"

"اس موسم اور سردی میں یہ کوئی ان ہونی خواہش ہے؟" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"نہیں لیکن ایسے موسم میں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ میری ماں کہتی ہے کہ دیر سے پہنچنا کبھی نہ پہنچنے کے مقابلے میں یقیناً بہتر ہے۔"

"تمہاری ماں یقیناً ایک عقل مند عورت ہے۔"

جان کا چہرہ تن گیا۔ "شاید..."

جولی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "تم متفق نہیں لگتے ہو۔"

"کہہ سکتی ہو۔" جان کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "وہ صرف باتیں ہی عقل مندی کی کرتی تھی۔"

"تھی؟" جولی چونک گئی۔ "تم نے تو کہا تھا کہ وہ گھر میں انتظار کر رہی ہے۔"

"انتظار تو کر رہی ہے۔ مگر اب وہ باتیں نہیں کرتی ہے۔" جان کا لہجہ پھر عجیب سا ہو گیا۔ اس بار جولی کو لگا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی ہو۔ غیرارادی طور پر اس نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ تیز ہوا کو چیرتی اور اڑتے برف کے گالوں سے ٹکراتی کار ہائی وے پر خطرناک رفتار سے دوڑنے لگی۔ جان نے کہا۔ "رفتار کم کرو۔"

"میں اچھی ڈرائیور ہوں، تم فکر مت کرو کار بے قابو نہیں ہوگی۔"

"اس موسم میں یہ زیادہ ہے پولیس پیچھے آ سکتی ہے۔ جلدی کے چکر میں تم مزید تاخیر کا شکار نہ ہو جاؤ۔" جان نے بہ ظاہر نارمل انداز میں کہا مگر جولی کو محسوس ہوا کہ اس کے اندر کہیں پولیس کا خوف تھا۔ کوئی وجہ تھی جو وہ پولیس کے پیچھے آنے کے خیال سے ڈر رہا تھا۔ جولی نے رفتار کم نہیں کی البتہ وہ پوری توجہ سے ڈرائیو کر رہی تھی اور اس کا ایک پاؤں بریک پر بالکل تیار تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ جان مضطرب ہو رہا تھا۔ اس کی بے چینی اس کے مسلسل پہلو بدلنے سے ظاہر تھی۔ اچانک وہ چیخ اٹھا۔ "رفتار کم کرو۔"

جولی نے بنا گھبرائے بریک ہلکا سا دبایا اور کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ اس نے حیرت سے جان کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیا ہوا ہے، تم اتنا نروس کیوں ہو رہے ہو؟"

"دیکھو میرے ساتھ کھیلنے سے گریز کرو۔" جان نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم میرے بارے میں نہیں جانتی ہو۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی ہوں لیکن یہ بات بتانے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

جان اسے گھور رہا تھا پھر رفتہ رفتہ اس کے تاثرات نرم پڑنے لگے اور اس کے چہرے کی دلکشی لوٹ آئی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ "مجھے تیز رفتاری سے خوف آتا ہے۔ ایک بار کار چلاتے ہوئے میرا بہت برا

ڈبمیلیڈینٹ ہو چکا ہے۔ تب سے مجھے کسی ایسی کار میں بیٹھتے ہوئے بھی خوف آتا ہے جو زیادہ رفتار سے چل رہی ہو۔"

"اوہ اچھا۔" جولی نے صرف اتنا کہا مگر اسے جان کی بتائی ہوئی بات پر ایک فیصد بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے رفتار اب چالیس اور پینتالیس کے درمیان کر دی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ماں کو کال کرے۔ وہ اسے اشارتاً بتا سکتی تھی کہ اس وقت کار میں اس کے ساتھ ایک مشکوک فرد ہے۔ ماں سمجھ جاتی تو پولیس کو کال کر سکتی تھی۔ اس نے موبائل نکالا تو جان بولا۔

"کسے کال کر رہی ہو؟"

"اپنی مام کو۔" جولی نے جواب دیا۔ "اسے بتا رہی ہوں کہ مجھے آنے میں تاخیر ہو جائے گی۔"

"میرا ذکر مت کرنا۔"

"کیوں؟"

"تمہاری مام شاید پریشان ہو جائے یہ سن کر کہ اس کی بیٹی نے ایک اجنبی کو لفٹ دی ہے، تم جانتی ہو مائیں ایسی باتوں سے کتنی جلدی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

جولی نے سر ہلایا اور کال ملانے لگی۔ مگر موسم کی خرابی اور کمزور سگنل کی وجہ سے کال مل نہیں رہی تھی۔ کئی بار ناکام کوشش کے بعد اس نے موبائل واپس رکھ لیا۔ جان مسلسل اسے دیکھ رہا تھا اور جولی کو لگا کہ کال نہ ہونے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ جولی آنے والے سنگ میل دیکھ رہی تھی اور اسے پتا چلا کہ وہ تھنڈر بیسن نیشنل پارک کی طرف جانے والی سڑک سے ستر کلومیٹرز دور تھے۔ یعنی ابھی ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا سفر باقی تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اطمینان سے گھر کی طرف جا سکتی تھی۔ خاموشی سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی، اس نے کچھ دیر بعد جان سے پوچھا۔ "گھر میں تمہاری پوری فیملی ہے؟"

"نہیں صرف مام ہے۔ میں اس کا ایک ہی بیٹا ہوں۔"

"تب اس نے تمہاری پرورش بہت توجہ اور محبت سے کی ہوگی۔"

"ہاں کچھ زیادہ ہی توجہ سے کی تھی۔" جان نے تمسخری انداز میں کہا۔ "وہ صبح سے شام تک صرف میرے ساتھ ہی رہتی تھی۔"

"تم نے اسکول کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟"

"اپنے علاقے سے۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"تمہارا پسندیدہ مضمون کون سا تھا؟"

"میتھس۔" جان بولا لیکن اس کے انداز میں یقین نہیں تھا۔ جولی نے جان لیا کہ اسے تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی ورنہ اس کا کوئی نہ کوئی پسندیدہ مضمون تو ہوتا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اس صورت میں یونیورسٹی کیسے پہنچ گیا؟ طوفان اب ایک ہی جگہ رک گیا تھا نہ اس کی شدت بڑھ رہی تھی اور نہ کم ہو رہی تھی۔ جولی نے کہا۔

"اگر موسم ایسا ہی رہا تو ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم اس کٹ تک پہنچ جائیں گے جہاں سے تم اپنے گھر کی طرف جا سکو گے۔"

"میرا گھر کوئی تیس کلومیٹرز اندر ہے۔" جان نے کہا۔ "اس موسم میں، میں اتنی دور کیسے جا سکوں گا؟"

جولی نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے کہہ رہا ہے وہ اسے گھر تک چھوڑ دے اور جولی کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملے میں آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا ورنہ اس کا ذکر نہ کرتا۔ جولی نے کچھ دیر بعد کہا۔ "میری مام میری آمد کا وقت سینڈ گن کر گزار رہی ہوں۔ میں جلد از جلد ان کے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔"

"کسی کو انتظار کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے۔" جان نے سرد لہجے میں کہا۔ "جو دس گھنٹے انتظار کر سکتا ہے وہ مزید دو ڈھائی گھنٹے اور انتظار کر سکتا ہے۔"

"میں اپنی مام کو انتظار کرانا نہیں چاہتی۔" جولی نے اس بار مضبوط لہجے میں کہا۔ اس نے گویا جان پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے گھر تک چھوڑنے نہیں جا سکتی اور وہ اسے کٹ پر اتار دے گی۔ اس کے جواب پر جان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سامنے دیکھنے لگا...... اب وہ منزل سے کوئی پچاس کلومیٹرز دور تھے۔ خوش قسمتی سے اس حصے میں طوفان کی شدت کم ہو گئی تھی، وہ اس وقت ایک وادی سے گزر رہے تھے اور نشیبی علاقہ ہونے کی وجہ سے طوفان کا زور کم ہو گیا تھا۔ جولی نے رفتار بڑھا دی اور جان نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے ایک بار بھی سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی اور وہ تیز رفتار ڈرائیونگ سے خوفزدہ بھی تھا۔ جولی رفتار بڑھا کر ساٹھ کلومیٹرز فی گھنٹا سے اوپر لے آئی۔ یہاں ہائی وے پر تازہ گرنے والی برف جم رہی تھی اور ہائی وے کسی قدر پھسلواں ہو رہی تھی مگر چوڑی سڑک اور آس پاس کوئی اور گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے جولی تیز رفتاری کا خطرہ مول لے رہی تھی۔ کئی مواقع پر رفتار ستر سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔

ہائی وے پیچیں اب ایک چھوٹے پہاڑی رینج کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف گھوم رہی تھی۔ جولی اس علاقے

سے اچھی طرح واقف تھی کیونکہ یہاں اس کے باپ میٹ کا ایک شکاری کیبن تھا جس کے پاس ایک خاصی بڑی جھیل بھی تھی۔ جھیل ہائی وے پچیس کے دائیں طرف تھی اور گرمیوں میں اس میں ٹراؤٹ کی بہتات ہوتی تھی اور وہ مچھلی کا شکار کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ اب وہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں سے جان نے اپنے گھر کی طرف جانا تھا۔ جولی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہاری منزل قریب آگئی ہے۔''

اس نے گویا جولی کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور بولا۔ ''میری منزل ابھی دور ہے۔''

''تم جوان آدمی ہو ہمت کر سکتے ہو۔'' جولی نے نرمی سے کہا۔ ''پھر تمہیں کوئی لفٹ دینے والا مل سکتا ہے، تم پولیس سے مدد لے سکتے ہو۔''

پولیس کے نام پر جان ساکت ہو گیا۔ اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس جگہ طوفان کی شدت کم ہو رہی ہے۔ ہوا کی تندی میں کمی آگئی تھی اور اڑتے گالوں کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی۔ جولی نے پھر کہا۔ ''طوفان کی شدت میں بھی کمی آگئی ہے۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موسم بہتر ہوا ہے باہر درجہ حرارت اس وقت بھی منفی میں ہے۔'' جان نے کار میں لگے تھرمامیٹر پر نظر ڈالی جو باہر کا درجہ حرارت منفی نو بتا رہا تھا اور یہ خاصا زیادہ تھا۔ جولی جانتی تھی کہ کھلی فضا میں جانے والا آدمی بیمار ہو سکتا تھا اور اتنا طویل سفر پیدل طے کرنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں تھا لیکن وہ جان کی طرف سے مشکوک ہو گئی تھی ورنہ شاید وہ اسے اس کے گھر تک چھوڑنے کو بھی تیار ہو جاتی۔ اس نے بدستور نرمی سے کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں، تمہارے لیے اس سے زیادہ نہیں کر سکتی۔''

جان نے اپنا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر زیر لب کہا۔ ''تب مجھے اپنے لیے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔''

ہائی وے کے کٹ پر ایک چھوٹا سا قصبہ ڈوف لاس آباد تھا۔ کٹ کے پاس روک کر جولی نے اس سے کہا۔ ''یہاں سے شاید تمہیں کوئی کیب مل جائے یا پھر کوئی جا رہا ہو تو تمہیں لفٹ دے دے۔''

''یہ صنعتی قصبہ ہے اور اس وقت یہاں کی اسی فیصد آبادی اپنے اپنے علاقوں میں کرسمس منانے جا چکی ہوگی۔ جو لوگ ہیں وہ گھروں میں دبکے ہوئے ہیں۔ گاڑی چلاؤ ہمیں آگے جانا ہے۔''

''میں نے تمہیں بتایا تھا...'' جولی نے کہنا چاہا مگر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ جان کا ہاتھ بہت سرعت سے جیکٹ سے باہر آیا اور اس میں دبا ہوا چاقو جولی کی گردن سے لگ گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔

''گاڑی چلاؤ۔''

بلیڈ کی نوک اس کی گردن میں بری طرح چبھ رہی تھی۔ جولی سمجھ گئی کہ اس نے گاڑی آگے نہیں بڑھائی تو یہ شخص اس کی گردن کاٹ دے گا۔ چاقو چھوٹے بلیڈ کا مگر بہت شارپ تھا۔ بالکل کسی استرے کی طرح... مجبوراً اس نے گاڑی آگے بڑھائی اور ہائی وے کے اوپر سے گزرتے فلائی اوور پر لے آئی۔ ایک منٹ بعد وہ ڈوف لاس کی آبادی سے گزر رہے تھے اور روشنیوں کی وجہ سے جان نے چاقو نیچے کر لیا تھا مگر وہ اب جولی کی پسلی سے لگا ہوا تھا جہاں دو انچ کے فاصلے پر اس کا دل تھا۔ جان نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کی تو وہ بلا دریغ اسے مار دے گا۔

جولی نے پوچھا۔ ''اس کے بعد تم بچ جاؤ گے؟''

جان کے چہرے پر سفاک تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ ''میں نے کبھی کسی کو قتل کرتے ہوئے نہیں سوچا کہ آگے کیا ہوگا؟''

وہ ڈوف لاس سے تقریباً باہر نکل آئے تھے۔ ''اس لڑکے کو بھی تم نے قتل کیا ہے؟''

جان نے سر ہلایا۔ ''ہاں وہ رقم اور موبائل دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ گاڑی اور یونیورسٹی والی بات بھی غلط ہے؟''

''آدمی کو اپنے مطلب کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم اب مجھے بھی قتل کر دو گے۔'' یہ جملہ جولی نے دل میں کہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے اس مصیبت سے چھٹکارے کا طریقہ سوچ رہا تھا۔ وہ دوبارہ ہائی وے پر آ گئے تھے اور اب یہ ہائی وے بانسٹھ تھی اور تھنڈر رسین نیشنل پارک یہاں سے کوئی چالیس کلومیٹرز آگے تھا مگر جان کا گھر یہاں سے تیس کلومیٹرز دور تھا۔ یہ سارا علاقہ تقریباً ویران تھا اور کہیں کہیں اکا دکا چھوٹی اور غیر منظم آبادیاں تھیں جہاں مشکوک قسم کے اور آدم بیزار لوگ رہتے تھے۔ جولی اس علاقے سے بھی واقف تھی اور وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ جان اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا مگر جب وہ ہائی وے کے ویرانے پر آئے تو وہ ڈھیلا پڑ گیا اور اس نے چاقو ہٹا

لیا۔ یہ چھوٹی سڑک تھی بلکہ سنگل روڈ تھی البتہ اس کی چوڑائی عام سڑکوں سے زیادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف سرو کی بیلٹ کے درخت شروع ہو جاتے تھے۔ یہ زیادہ بڑے درخت تو نہیں تھے مگر ان کی وجہ سے اس علاقے کا تاثر جنگل والا تھا۔ جان نے اس سے کہا۔

”اب رفتار بڑھاؤ۔“

اس نے رفتار تیز کر دی۔ خاصا سوچنے کے باوجود اس کے ذہن میں ایسی کوئی تدبیر نہیں آئی تھی جو اسے اس معصوم صورت قاتل سے محفوظ رکھ سکتی۔ جان اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے، تم بور ہو رہی ہو۔“

اس نے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ریڈیو آن کر دیا اور نیوز چینل ٹیون کیا۔ اس پر خبریں آ رہی تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”یہ مسلسل دوسرا قتل ہے جو چاقو سے کیا گیا ہے اور پولیس کا خیال ہے کہ اس میں ایک ہی شخص ملوث ہے۔ چاقو کا استعمال بہت مہارت سے کیا گیا اور تمام وار موت کے گھاٹ اتارنے والے تھے۔“

”دوسرا قتل۔“ جولی کا سانس رک گیا اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ دیکھا جس پر چابی سے نمی لگی تھی۔ اسے کچھ نظر نہیں آیا تو اس نے اندر کی لائٹ آن کی اور تب اسے اپنے ہاتھ پر ہلکی سی سرخی نظر آئی، اس سے خون کی مہک آ رہی تھی۔ چابی پر یقیناً خون لگا تھا اور یہ خون کس کا تھا؟ اس نے جان کی طرف دیکھا اور دہشت زدہ لہجے میں بولی۔ ”تم نے شاپ کیپر کو بھی قتل کر دیا؟“

جان نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ ”اس نے بھی وہی حماقت کی تھی اور رقم دینے کے بجائے جان دینا پسند کی مگر رقم میں نے پھر بھی لے لی۔“

جان نے جیکٹ سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر دکھائی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہی تھی۔ ”پولیس کا خیال ہے کہ قاتل... جس نے گیس اسٹیشن کے ملازم کو قتل کیا، وہ اسی لوٹا ہے، ہائی وے پچیس پر تیز سفر کر رہا ہے یا پھر وہ آس پاس کسی دوسری سڑک پر جا چکا ہے۔ پولیس نے آس پاس کی تمام پٹرولنگ پولیس کو خبردار کر دیا ہے۔“

”تم پاگل ہو یا جنونی قاتل؟“ جولی نے بہ مشکل کہا۔ ”تم نے صرف رقم کی خاطر دو قتل کر دیے۔“

”میں نے رقم کی خاطر کتنے قتل کیے، آج تک ان کا حساب نہیں رکھا۔“

اب جولی کو یقین آ گیا کہ وہ ایک جنونی قاتل کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور وہ اسے بھی قتل کر دے گا۔ اپنے ذہنی انتشار پر قابو پانے کے لیے وہ گہری سانسیں لینے لگی۔ اس مشق سے اسے بہتر محسوس ہوا تھا۔ پھر اسے ایک خیال آیا اور اس نے بتدریج کار کی رفتار بڑھانا شروع کی۔ اس وقت کار ساٹھ کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی۔ جان کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے کہا۔ ”کیا تمہاری ماں جانتی ہے کہ اس کا بیٹا ایک قاتل ہے؟“

”لازمی بات ہے۔“

”تب اس نے تمہیں کچھ نہیں کہا؟“

جان مسکرایا۔ ”وہ مجھے کچھ نہیں کہتی میں جو کرتا رہوں وہ اس پر خاموش رہتی ہے۔“

”کیا تمہاری ماں بھی نفسیاتی مریض ہے۔“

”نہیں لیکن مجھے نفسیاتی مریض اسی نے بنایا ہے۔“

جان نے کہا۔ ”میں چھوٹا تھا جب میرا باپ میری ماں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ بہت زیادہ پیتی تھی اور اس کی پروا نہیں کرتی تھی۔ باپ کے بعد میں اس کے پاس رہ گیا اور میں اس کے لیے بوجھ تھا۔ مگر اس کا بیٹا تھا اس لیے وہ مجھے خود سے جدا نہیں کر سکتی تھی، اس نے یہ کیا کہ مجھے گھر میں قید کر دیا۔ وہ مجھے کھانے کو کم دیتی تھی اور مارتی زیادہ تھی۔ سارے گھر کا کام میں کرتا تھا اور میرے نام پر آنے والا سرکاری وظیفہ وہ شراب پینے میں ختم کر دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے مہینے کی آخری تاریخوں میں مجھے فاقے بھی کرنا پڑتے تھے اور مجھے چوری کی عادت بھی ان ہی دنوں پڑی۔ میں آس پاس کے گھروں اور ٹریلرز میں گھس کر کھانے پینے کا سامان چراتا تھا اور کبھی موقع ملتا تو نقد رقم اور قیمتی چیز بھی اٹھا لاتا تھا۔“

جان اسے مکمل کر بتا رہا تھا یعنی وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جولی پولیس یا کسی اور کو یہ سب بتانے کے لیے زندہ نہیں رہے گی۔ جولی نے غیر محسوس انداز میں اپنی سیٹ بیلٹ کا ہک چیک کیا اور بولی۔ ”تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہاری ماں نے تمہیں جرائم پیشہ بنایا؟“

”صرف جرائم پیشہ نہیں۔“ جان نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”اس نے مجھے دوہری شخصیت کا مالک بھی بنایا کیونکہ وہ اپنے کرتوتوں کا جواز مذہب اور اخلاقی اصولوں کا وعظ کر کے پیش کرتی تھی۔ جب مجھے بھوک لگتی تو وہ لیکچر دیتی۔ انسان کو دنیا کی حرص نہیں کرنی چاہیے لیکن جب میں چوری کر کے کچھ کھانے کو لاتا تو وہ جھپٹ کر اس کا بیشتر حصہ کھا جاتی اور آنے والے رزق کو خدا کی طرف سے منسوب کرتی

تھی۔ چوری کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ تین وقت کے فاقے کے بعد چوری کرنا گناہ یا جرم نہیں ہوتا ہے۔"

اب جولی کسی حد تک سمجھ رہی تھی کہ جان کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ کیوں ایک انسان سے قاتل درندہ بن گیا تھا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مظلوم تھا۔ اس کی چالاکی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے بے شمار تعداد میں لوگوں کو قتل کیا اور آج تک پکڑا نہیں گیا۔ جولی نے رفتہ رفتہ کار کی اسپیڈ ستر سے اوپر پہنچا دی تھی۔ جان کو ذرا تاخیر سے احساس ہوا۔ اس نے چونک کر کہا۔ "تم نے رفتار زیادہ ہی تیز کر دی ہے۔ اسے کم کرو۔"

مگر جولی نے کم کرنے کے بجائے رفتار مزید بڑھا دی۔ "تم نے پہلے کہا تھا کہ میں رفتار تیز کروں۔"

"اب میں کہہ رہا ہوں کہ کم کرو۔" وہ درشت لہجے میں بولا اور چاقو اس کی گردن سے لگا دیا۔ "ورنہ میں تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔"

جولی نے ایکسی لیٹر دبا دیا تو کار برف زدہ سڑک پر لہرانے لگی۔ "اس صورت میں کیا تم بچ جاؤ گے؟"

جان کے چہرے پر خوف نمودار ہوا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "کار روکو۔"

جولی اب تک ہمت کر رہی تھی اور اس نے جوابی چیخ کے ساتھ کہا۔ "سامنے دیکھو۔"

جولی نے اچانک کار کا رخ سڑک سے درختوں کی طرف کر دیا تھا۔ پلک جھپکنے میں کار سڑک سے اتر کر کچے میں ایک چھوٹے درخت سے ٹکرا کے رک گئی۔ درخت گر گیا تھا۔ جولی ایک جھٹکے سے آگے گئی اور سیٹ بیلٹ نے اسے روکا مگر اس کا سر حرکت میں تھا، وہ نیچے جھکا اور اسٹیئرنگ اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ جولی کو چکر آ گیا۔ اس کے کانوں نے ونڈ شیلڈ ٹوٹنے کی آواز سنی اور پھر اسے ہوش نہیں رہا مگر بے پناہ سرد تیز ہوا اسے جلد ہوش میں لے آئی۔ کار کا انجن رک گیا تھا اور ونڈ شیلڈ ٹوٹنے سے بہت سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ جان کا نصف دھڑ ٹوٹ جانے والے ونڈ شیلڈ سے باہر کار کے بونٹ پر تھا۔ درحقیقت ونڈ شیلڈ اس کے ٹکرانے سے ٹوٹی تھی۔ سیٹ بیلٹ نہ باندھنے کی وجہ سے وہ تصادم کے بعد اچھل کر ونڈ شیلڈ سے جا ٹکرایا تھا۔ اس کا جسم ساکت تھا اور بہ ظاہر وہ مر گیا تھا۔ تصادم کی وجہ سے کار کی سیٹوں... اور انجن کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس تصادم میں اسے کتنی چوٹیں آئی تھیں مگر اسے سوائے سر کے اور کہیں درد نہیں تھا اور نہ ہی کہیں سے خون نکل رہا تھا۔

جولی نے ذہن پر بہت زور دیا تو یہ حل سمجھ میں آیا۔ اس میں خطرہ تھا وہ شدید زخمی ہو سکتی تھی اور مر بھی سکتی تھی۔ مگر اس کے سوا اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور اگر وہ کہیں رک جاتے تو اس کے بعد اس کا بچنا محال تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی تدبیر کامیاب رہی۔ وہ بچ گئی۔ اس نے بہ مشکل سیٹ بیلٹ کھولی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر تصادم نے اسے جام کر دیا تھا۔ اس نے اپنی جیکٹ اتاری اور اسے بائیں بازو پر لپیٹتے ہوئے کہنی پوری قوت سے کھڑکی کے شیشے پر ماری اور وہ ٹوٹ گیا۔ جولی نے کرچیاں صاف کیں اور جیکٹ باہر پھینکتے ہوئے خود بھی کھڑکی کے راستے باہر آ گئی۔ نیچے برف کا ڈھیر تھا اس لیے اسے گرتے ہوئے چوٹ نہیں آئی مگر بے پناہ سردی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ جلدی سے جیکٹ پہن لے۔ ہائی وے مکمل طور پر تاریکی میں تھی اور اس کی گاڑی کی روشنیاں بھی بند ہو گئی تھیں۔

جیکٹ کی زپ گلے تک بند کر کے اسے موبائل فون کا خیال آیا اور اس نے اپنی پتلون کی جیب ٹٹولی مگر اس کا موبائل اس میں نہیں تھا۔ شاید تصادم میں وہ کار کے اندر گر گیا تھا۔ اس نے کار کی طرف دیکھا۔ وہ دوبارہ اندر جانے کے خیال سے ہچکچا رہی تھی۔ مگر اسے موبائل کی اشد ضرورت تھی اسی کی مدد سے وہ پولیس کو کال کر سکتی تھی۔ مجبوراً اس نے کھڑکی سے اندر جسم کر کے پہلے سیٹ ٹٹولی۔ مگر موبائل اس پر نہیں تھا وہ یقیناً نیچے گر گیا تھا۔ اس نے جسم مزید اندر کیا۔ جیکٹ کی وجہ سے وہ پھنس رہی تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح اس کا نصف جسم اندر چلا گیا۔ اس کا سر سیٹ کے پاس تھا اور ہاتھ اب اندر تک جا رہے تھے۔ وہ فرش ٹٹول رہی تھی۔ مگر موبائل نہیں مل رہا تھا۔ اس نے سسکی لی اور زیر لب بولی۔ "پلیز... پلیز۔"

اسی لمحے جان کا اندر موجود ہاتھ حرکت میں آیا اور اس نے جولی کی جیکٹ شانے سے پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے چیخ ماری اور تیزی سے پیچھے گئی مگر جیکٹ کی وجہ سے اسے نکلنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ جان اب اسے پکڑنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ خود کو ونڈ اسکرین سے اندر بھی کھینچ رہا تھا۔ جولی غلط سمجھی تھی کہ وہ مر گیا تھا۔ وہ صرف بے ہوش تھا اور جس طرح سے وہ اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اس سے لگ رہا تھا کہ اس کا دم خم بھی برقرار تھا۔ جولی نے کسی نہ کسی طرح خود کو باہر کھینچا تو جان کا ہاتھ اس کے ساتھ ہی اس کے شانے پر کھنچا آیا، وہ نیچے گری تو اس کا ہاتھ الگ ہوا تھا۔ جان نے غرا کر

اسے گالی دی۔ "کتیا تو کیا سمجھتی ہے، میں مر گیا تھا۔"

جان نے خود کو واپس اندر کھینچ لیا اور اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس کی طرف کا دوروازہ بھی جام ہو گیا تھا۔ پھر وہ جولی کی طرف والی کھڑکی کی سمت آنے لگا تو وہ بھاگی۔ اس کا رخ ہائی وے کی طرف تھا اور وہیں سے اسے مدد مل سکتی تھی۔ ہوا بہت تیز تھی اور سامنے سے آتی ہوا میں کاٹ کے ساتھ ساتھ برف کے باریک ذرّے تھے جو پتھر کی طرح چہرے پر لگ رہے تھے۔ اس کے لیے آنکھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ مگر آنکھیں بند کر کے کیسے آگے جاتی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور انگلیوں کی جھریوں سے دیکھ رہی تھی۔ تب اسے دور درختوں کے درمیان روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ جگہ ہائی وے سے ہٹ کر تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے اپنی کار نظر نہیں آئی۔۔۔۔ وہ دور نکل آئی تھی اور تاریکی بھی تھی۔ اسے ڈر لگا کہ اس تاریکی میں کہیں جان بھی موجود تھا اور وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

جولی نے سوچا اور مکان کی طرف بڑھی۔ ہوا اسے پیچھے دھکیل رہی تھی اور اسے آگے بڑھنے کے لیے زور لگانا پڑ رہا تھا۔ ہائی وے سے اتر کر وہ درختوں میں آئی تو اسے کسی قدر بہتر محسوس ہوا، یہاں ہوا اور اس کی کاٹ خاصی کم تھی۔ مگر یہاں سے اب وہ روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی جسے دیکھ کر وہ اس کی طرف آئی تھی۔ اس نے اندازے سے سفر جاری رکھا۔ یہاں درخت گھنے اور ان کے تنے پاس پاس تھے۔ تاریکی کی وجہ سے اسے ٹٹول کر اور احتیاط سے قدم رکھ کر چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ شاید دو سو گز چلی ہوگی کہ اسے روشنی پھر دکھائی دی۔ جولی خوش ہو گئی۔ روشنی کا مطلب تھا کہ وہاں بجلی تھی اور شاید فون یا موبائل فون مل جاتا اور وہ پولیس کو کال کر سکتی۔ وہ روشنی کو نظر میں رکھ کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے وہ آگے جا رہی تھی، مکان کی ساخت واضح ہو رہی تھی۔

یہ لکڑی کا بنا ہوا خاصا بڑا مکان تھا۔ اس کے چاروں طرف برآمدہ تھا اور سامنے والے برآمدے میں تیز روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ اسے اس موسم میں بھی تقریباً نصف کلومیٹر دور سے دکھائی دی تھی۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے نکلی۔ مکان اور درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں گرمیوں میں بڑھی ہوئی گھاس اور جھاڑیاں تھیں مگر اس وقت ان پر برف چھائی ہوئی تھی۔ مکان کی حالت اچھی نہیں تھی جگہ جگہ سے اس کا رنگ اترا ہوا تھا اور لکڑی بھی خستہ حال ہو رہی تھی۔ مگر یہ دو

منزلہ تھا اور خاصے بڑے رقبے پر تھا۔ اگر یہاں روشنی نہ ہو رہی ہوتی تو جولی سمجھتی کہ یہاں کوئی نہیں رہتا اور مکان خالی ہے۔ ایک طرف کھمبے سے بجلی کا تار اور اس کے ساتھ ہی فون کا تار بھی مکان تک آ رہا تھا۔ جولی خوش ہو گئی اور سر جھکائے تیز قدموں سے مکان تک آئی۔ اس نے سب سے پہلے باہر جلنے والا بلب بند کر دیا۔ اس کا بٹن بھی باہر ہی تھا۔ اسے خوف تھا کہ جیسے اس نے مکان کی روشنی دیکھ لی ہے، اسی طرح جان بھی نہ دیکھ لے اور یہاں آجائے۔

پھر اس نے سامنے والا دروازہ بجایا۔ یہاں کال بیل کا بٹن نہیں تھا۔ اس نے بہت زور سے ہاتھ مارے تھے کہ ہاتھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اسے خوف تھا کہ اندر موجود لوگ طوفان کے شور میں اس کی آواز ہی نہ سن سکیں۔ کئی بار دروازہ بجانے پر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو جولی نے دائیں بائیں موجود کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر جھانکا۔ جہاں سے پردہ ہٹا ہوا تھا اسے تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اگر اندر کوئی تھا بھی تو اس نے لائٹیں بند کی ہوئی تھیں۔ جولی برآمدے کے ساتھ گھومتی ہوئی دائیں طرف آئی۔ اس طرف کئی کھڑکیاں تھیں مگر دروازہ کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ مکان کے عقبی حصے میں آئی۔ یہاں برآمدہ نہیں تھا مگر ایک دروازہ تھا اور یہ کچن کا دروازہ تھا۔ جولی نے اس کے شیشے سے اندر جھانکا تو اسے نیم تاریکی دکھائی دی۔ کچن تاریک تھا مگر اندر کہیں سے روشنی آ رہی تھی۔ اس نے دروازہ بجایا اور اس بار بھی جواب نہیں ملا تو اس نے ہینڈل گھما کر دیکھا۔

اسے حیرت ہوئی جب دروازہ کھل گیا۔ یہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ جولی اندر آئی اور دروازہ بند کر لیا۔ بجلی روشنی بتا رہی تھی کہ اندر کوئی تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے ٹریس پاس کا مرتکب نہ قرار دیا جائے۔ مگر اب وہ اندر آ ہی گئی تھی۔ اس نے حفظ ماتقدم بلند آواز سے کہا۔ ”ہیلو یہاں کوئی ہے، میں بہت دیر سے دروازہ بجا رہی تھی مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں کچن کا دروازہ کھلا پا کر اندر آئی ہوں۔ ہیلو کوئی ہے یہاں پر! مجھے مدد کی ضرورت ہے۔“

مگر اس بار بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ کچن میں بہت بدبو اور گندگی تھی۔ سنک برتنوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کچن سے نکلی تو اس نے خود کو ایک لاؤنج میں پایا۔ یہاں ایک پیڈسٹل لیمپ آن تھا۔ بھاری صوفہ سیٹ تھے اور فرش پر قالین تھا۔ ایک طرف دیوار پر ریک تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ لگے بٹنوں پر ہاتھ مارا تو لاؤنج میں لگا ہوا مرکزی فانوس روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی باہر گیلری تک جا رہی تھی۔ اس نے جھانک کر دیکھا گیلری کے سرے پر داخلی دروازہ تھا اور اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں اوپری منزل پر جا رہی تھیں۔ وہ باہر آئی اور اس نے پھر آواز دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سیڑھیوں کے نیچے موجود دروازہ کھولا تو وہ تہ خانہ ثابت ہوا۔ لاؤنج سے آگے نشست گاہ تھی اور اس کا کھلا آرچ نما دروازہ دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی تھی کہ باہر موجود بلب یک دم آن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی پر ایک سایہ نظر آیا۔

جولی سیڑھیوں کے پاس تھی۔ وہ بہت تیزی سے واپس آئی اس نے تہ خانے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اسے خفیف سا کھلا رکھا کہ اسے آنے والا دکھائی دے۔ دروازہ کھلا اور جان اندر آیا۔ جولی کا سانس رک گیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ آنے والا جان ہوگا۔ وہ احتیاطاً اس جگہ چھپ گئی تھی۔ جان نے اندر آتے ہی گیلری کی روشنی آن کر لی اور پھر دروازے کو لاک کرتے ہوئے بلند آواز سے بولا۔ ”جولی مجھے معلوم ہے تم یہاں آئی ہو۔ سامنے برآمدے میں تمہارے قدموں کے نشانات ہیں اور تم یقیناً کچن والے دروازے سے اندر آئی ہو۔ مگر بدقسمتی سے تم نہیں جانتیں کہ یہ مکان میرا ہے۔ سنا تم نے۔“ اس نے آخری جملہ چیخ کر کہا۔ ”یہ میری جگہ ہے اور یہاں وہی ہوتا ہے جو میں چاہتا ہوں۔“

جان کا چہرہ خون سے بھرا ہوا تھا مگر وہ جس طرح کھڑا تھا اور اسے دھمکیاں دے رہا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بالکل ٹھیک تھا اور اس حادثے میں اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ مگر جب وہ آگے آیا تو اس کے پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا۔ جولی نے بہت آہستگی سے دروازہ بند کر لیا۔ جان بول رہا تھا۔ ”تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گی، یہاں سے نکلنے کے صرف دو راستے ہیں، ایک میں لاک کر چکا ہوں اور دوسرا لاک کرنے جا رہا ہوں۔ یہاں تمام کھڑکیوں پر آہنی ریک ہینڈل لگا ہے۔ تم اسے ہتھوڑے سے بھی نہیں توڑ سکتیں۔“

جان تہ خانے کے دروازے کے پاس سے گزر کر کچن کی طرف گیا تھا اس دوران میں جولی نے سوچ لیا تھا کہ وہ تہ خانے میں محفوظ نہیں تھی یہاں وہ آسانی سے پکڑی جاتی۔ جان کے جاتے ہی وہ باہر آئی اور دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اوپری منزل پر آ گئی۔ اوپری منزل بھی تقریباً نچلے فلور جتنی بڑی تھی۔ یہاں ایک گیلری کے دونوں

طرف کمرے تھے اور درمیان میں یہ گیلری دائیں بائیں مڑ رہی تھی۔ جولی باری باری دروازے چیک کرنے لگی مگر وہ سب لاک تھے۔ وہ دائیں طرف والی گیلری میں آئی جس کے آخر میں ایک دروازہ تھا۔ اس نے اسے کھولا تو وہ کھل گیا اور فوراً ہی اندر سے بدبو کا بھبکا آیا تھا۔ جولی کو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔ بدبو ایسی تھی جیسے کوئی چیز سڑ گئی ہو۔ اسی لمحے اسے سیڑھیوں پر قدم رکھنے کی آواز آئی۔ اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

وہ منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور دروازہ آہستہ سے بند کر دیا۔ اندر تاریکی تھی اور کھڑکی سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ جولی ہاتھ سے چیزوں کو ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر اسے الماری کا ہینڈل ملا۔ جولی نے الماری کھولی اور اندر سے ٹٹولا تو اس کا نچلا حصہ خالی تھا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور اس میں بیٹھ کر پٹ بند کر دیا۔ یہ جالی دار پٹ تھا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور جان اندر آیا۔ اس نے کمرے کی روشنی آن کی تو پٹ کی جالیوں سے جولی کو باہر کا منظر دکھائی دیا اور تب اس نے پہلی بار دیکھا۔ کونے میں ایک راکنگ چیئر پر کوئی باریک چادر سر سے پاؤں تک لپیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جان نے کرسی کی طرف دیکھا اور بولا۔

”ہائے مام، یہاں کوئی آیا تو نہیں ہے۔“

جولی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کمرے میں جان کی ماں ہوگی۔ کرسی کمرے کے تاریک ترین گوشے میں تھی اس لیے جولی اسے دیکھ نہیں سکی۔ مگر جان کے سوال پر چیئر یا اس پر لپٹی عورت میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ جان نے ماں کو مخاطب ضرور کیا تھا مگر وہ درحقیقت اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس کی نظریں کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ اس کا گھر تھا اور وہ جانتا تھا کہ کوئی اجنبی فرد کہاں گھس سکتا ہے اور کہاں چھپ سکتا ہے۔ پھر اس کی نظریں گھومتی ہوئی آ کر الماری پر تک گئیں۔ جان الماری کی طرف بڑھا تو جولی کی جان پر بن آئی۔ جان کے ہاتھ میں...... ریزر کی طرح تیز چاقو تھا۔ وہ دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”جولی ڈیئر تم کہاں ہو؟... یقین کرو تم مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتیں۔“

اس نے الماری کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کا پٹ کھولتا، نیچے سے ایک عجیب سی آواز آئی جیسے کوئی بلب پھٹا ہو اور پھر لائٹ غائب ہو گئی۔ اسی لمحے جان نے پٹ کھولا اور اوپر کی طرف ہاتھ مارا۔ وہ چاقو والا ہاتھ اندھا دھند گھما رہا تھا۔ جولی چاقو کی زد سے بچنے کے لیے نیچے جھکی اس کے باوجود اس کی دھار اس کے رخسار کو چھو گئی تھی۔ اذیت کی ایک تیز لہر اٹھی اور نہ جانے کیسے اس نے اپنی آواز پر قابو پایا۔ جان پیچھے ہٹا تو جولی نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھا۔ خون نکل رہا تھا۔ جان نے زور سے دروازہ بند کیا اور غرایا۔ ”لعنت ہو۔“

اس نے اپنا موبائل نکالا اور اس کی لائٹ آن کر کے باہر جانے لگا۔ اس نے جس طرح ہاتھ گھمایا تھا اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ اگر جولی اندر ہوتی تو لازمی اس کا نشانہ بن جاتی۔ وہ جاتے ہوئے دروازہ بند کر گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس نے جولی کا رخسار کاٹ دیا تھا۔ شاید وہ اسے کوئی کپڑا سمجھا ہوگا۔ اس کے جانے کے چند لمحے بعد جولی نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ تکلیف کی شدت میں رفتہ رفتہ کمی آ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی جولی کے اندر غصہ ابھر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹایا مزید روشنی آنے لگی۔ باہر کا بلب جل رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ اس طور کی بجلی میں کوئی مسئلہ ہوا تھا۔ جان اسے ہی دیکھنے گیا تھا۔ جولی نے کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت سے کپڑا ہٹا کر نہیں دیکھا اسے معلوم تھا کہ وہ صرف ایک لاش ہے اور بدبو اسی سے اٹھ رہی تھی۔ جان نے نہ جانے کب سے اس کی لاش کو یونہی رکھا ہوا تھا اور وہ شاید ڈھانچا ہو چکی تھی۔

جولی کو ایک مہلت ملی تھی کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے اور اپنی جان بچا لے۔ اس نے کھڑکی کا پٹ کھولنے کی کوشش کی تو وہ فکس نکلا۔ جولی نے ایک کپڑا ہاتھ پر لپیٹ کر شیشے پر مکا مارا اور اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ کوئی اور چیز نہیں آزما سکتی تھی جس سے آواز پیدا ہو۔ مگر اسے جان کا کہنا درست لگا تھا کہ تمام کھڑکیوں کے شیشے نہ ٹوٹنے والے تھے۔ جولی نے کمرے میں کوئی ایسی چیز تلاش کرنا چاہی جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے مگر وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ جولی باہر آئی۔ پورا فلور تاریک تھا اور اسے ٹٹول کر سیڑھیوں سے نیچے آنا پڑا تھا۔ گیلری میں باہر سے آتی روشنی تھی اور یہاں کی تمام روشنیاں بھی بند تھیں۔ جان کہیں نظر نہیں آیا۔ مگر تہ خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ یقیناً وہاں موجود بجلی کے سوئچ وغیرہ دیکھنے گیا ہوا تھا۔ جولی نے اب تک جتنا گھر دیکھا تھا اسے کہیں فون نظر نہیں آیا اب نشست گاہ ایسی جگہ تھی جہاں فون ہو سکتا تھا۔

جان کی طرف سے اطمینان کے بعد وہ دبے قدموں نشست گاہ میں آئی اور فوراً ہی اسے ایک ریک کے ساتھ

شو کیس پر رکھا ہوا فون نظر آیا۔ یہ پرانے دور کا فون تھا مگر آج بھی کام کرتا تھا۔ جولی نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور پھر مایوسی سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی.... فون ڈیڈ تھا۔ اس نے تار چیک کیا۔ تار لگا ہوا تھا اس کا مطلب تھا کہ فون یا تو پیچھے سے بند تھا یا پھر موسم نے لائن منقطع کر دی تھی۔

جولی.... مایوس ہو کر پلٹنے والی تھی کہ عقب سے جان کی آواز آئی اور جولی اچھل پڑی۔ وہ نشست گاہ کی آرچ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے میں فون کو کام کے قابل چھوڑ سکتا ہوں۔ جب میں مکان کی طرف آیا اور میں نے برآمدے کا بلب بند دیکھا تب ہی میں سمجھ گیا تھا اور میں نے تار باہر سے ہی کاٹ دیا۔''

جولی اس کی طرف مڑی اور لرزتی آواز میں کہا۔

''میرے پاس مت آنا۔''

''مجبوری ہے ڈیئر۔'' اس نے چاقو بلیڈ سے پکڑ کر ہلایا۔ ''اسے خون کی طلب ہے۔''

''تم پاگل ہو نفسیاتی مریض ہو۔'' جولی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ عیاری سے ہنسا۔ ''میں پاگل ہوں اور یہ سب پاگل پن میں کرتا ہوں۔ مجھے لوگوں کو مارنے اور ان کے جسم کو چاقو سے کاٹنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ جب ان کے جسم سے خون اور منہ سے چیخیں نکلتی ہیں تو میرا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔''

''یہ سب تم اس لیے کرتے ہو کہ تمہاری ماں نے بھی تمہارے ساتھ برا سلوک کیا تھا؟''

''ہاں میں زندگی کے پورے سترہ سال اس پاگل عورت کے شکنجے میں رہا اور کوئی مجھے اس سے چھڑانے نہیں آیا۔ پڑوسیوں، پولیس اور اس معاشرے کے نام نہاد انسانی حقوق کا درد رکھنے والوں نے جنہیں ساری دنیا کے لوگوں کا درد ہوتا ہے، کبھی میری ماں سے آ کر نہیں پوچھا کہ وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرتی ہے؟'' جان کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''مجھے جو لوگوں نے دیا، میں وہی ان کو واپس کر رہا ہوں۔''

جولی نے گفتگو جاری رکھی۔ ''اصل قصوروار تمہاری ماں تھی اور تم نے اس سے بدلہ لے لیا۔''

جان چونکا۔ ''تو تم نے اسے دیکھ لیا۔ اس کا مطلب ہے تم وہاں گئی تھیں۔''

''ہاں میں نے اسے دیکھا۔'' جولی نے کہا۔ وہ ذرا پیچھے ہو کر ایک صوفے کے پیچھے آ گئی تھی۔ ''تم نے سب سے پہلے اپنی ماں کو قتل کیا؟''

''ہاں۔'' اس نے بلا جھجک اعتراف کر لیا۔ ''جب میں چھوٹا تھا تو مجبور تھا مگر جب میں اس قابل ہوا کہ خود زندہ رہ سکوں تو میں نے سب سے پہلے اسے قتل کیا اور اسی چاقو سے کیا تھا۔''

جان آگے بڑھا۔ جولی نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے صوفے کی پشت پر پاؤں رکھا اور جیسے ہی جان نزدیک آیا اس نے پوری قوت سے بھاری صوفہ الٹ دیا۔ جان کے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھا۔ صوفے کا پچھلا حصہ الٹ کر اس کے گھٹنوں سے ٹکرایا اور زور سے جان کو گراتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی تھی کیونکہ اس ضرب نے اس کے دونوں گھٹنے توڑ دیے تھے۔ وہ زمین پر گرا ہوا تھا اور صوفہ اب بھی اس کے پیروں پر تھا۔ وہ چیختے دہاڑتے کے ساتھ ساتھ جولی کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ جولی نے صوفے کو اس کے پیروں پر مزید دباتے ہوئے کہا۔ ''اب تم کو پتا چلا کہ تکلیف کسے کہتے ہیں۔''

وہ رونے کے انداز میں ہنسا۔ ''میں یہ سب پہلے ہی بھگت چکا ہوں۔''

''نہیں تم جب تک زندہ رہو گے، بھگتتے رہو گے۔'' جولی نے کہا۔ جان کے ہاتھ میں چاقو موجود تھا۔ ''مجھے موبائل دو تاکہ میں پولیس اور ایمبولینس کو طلب کروں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' جان نے خود پر قابو پا لیا۔ ''ماں ٹھیک کہتی تھی، چہرے دھوکا دیتے ہیں۔ میں تمہیں آسان شکار سمجھا تھا اور تم نے الٹا مجھے شکار کر لیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی سخت جان نکلو گی۔''

''تم نے ٹھیک کہا مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں پولیس آفیسر ہوں۔ جیسے تمہیں دیکھ کر کوئی سوچ نہیں سکتا کہ تم ایک عادی قاتل ہو۔''

جان حیران ہوا پھر اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کی مائیں ٹھیک کہتی تھیں۔''

''مجھے موبائل دو۔'' جولی نے پھر کہا۔

''یہ زحمت تمہیں خود کرنا پڑے گی۔'' جان بولا اور اچانک چاقو اپنی گردن پر پھیر لیا۔ خون کا فوارہ اچھل کر ہوا میں بلند ہوا اور پھر نیچے گرنے لگا۔ جولی نے منہ پھیر لیا۔ چند منٹ بعد وہ پولیس کو کال کر رہی تھی اور باہر جاری طوفان کی شدت میں کمی آ رہی تھی۔

شکار

سلیم انور

ایک شکاری کو سامنے دیکھ کر شکار بدک ہی جاتا ہے... مصیبت میں بدحواس اور پریشان ہو جانا گویا دوسری مصیبت کو دعوت دینا ہے... وہ بھی اپنے روبرو ایک درندہ صفت کو دیکھ کر حواس کھو بیٹھا تھا...

ماضی کی ایک غلطی جسے وہ دوہرانا نہیں چاہتا تھا... جرم کا لامتناہی سلسلہ

جب فرینک روز نے دریا کے کنارے وہ لاش دیکھی تو فوری طور پر گھبرا گیا اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے پوری زندگی میں اتنی خوف زدہ کر دینے والی کوئی شے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اب نہ چاہنے کے باوجود وہ اس لاش کا گواہ تھا۔

اس کی گھبراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔ اسے احساس تھا کہ لاش کے پاس اس کی موجودگی سوالات کو جنم دے گی۔ اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور بیشتر امکان یہی ہے کہ اس

کے بارے میں مکمل تحقیقات اور چھان بین بھی ہوگی اور پھر اس کے پریشان کن ماضی کی روشنی میں وہ لوگ اسے یقینی طور پر مجرم قرار دے دیں گے۔

فرینک روز ایک ایمان دار شخص تھا لیکن ایک وقت تھا جب وہ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث رہا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ اس لاش کے حوالے سے پکڑا جاسکتا ہے، فرینک نے اس علاقے سے فوری طور پر بھاگ نکلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھاگ چکا تھا اگر اس متجسس پولیس افسر سے سامنا نہ ہوتا۔

جونہی فرینک نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا تو اس کا چہرہ اچانک روشنی میں نہا گیا۔ اس کی آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں اور چند لمحوں تک اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

''اے، کون ہو تم؟'' تاریک تھامے شخص نے پوچھا۔

''اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس شخص کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

''اوہ کچھ نہیں بس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔'' فرینک نے روشنی سے آنکھیں بچاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا سامنا کسی پولیس افسر سے ہو گیا ہے۔

''واقعی؟'' لہجہ طنزیہ تھا۔

''آفیسر، اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے تو میں اس الزام کی تردید کرتا ہوں۔'' فرینک نے قدرے دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''تم نے جرم ہی نہیں کیا بلکہ تم اسے چھپا بھی رہے ہو۔'' پولیس افسر نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی کل کا بچہ ہوں، یہ بتاؤ کہ لاش یہاں کیسے آئی؟''

''لاش... کیسی لاش؟''

''وہ جو تمہارے قدموں کے پاس پڑی ہے۔'' پولیس افسر نے ترش لہجے میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ... یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''واقعی؟'' پولیس افسر نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

''واقعی مجھے نہیں معلوم۔ تمہیں میری بات پر یقین کرنا ہوگا آفیسر۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔ اب اگر تم مجھے پوری تفصیل بیان کرنے اور وضاحت پیش کرنے کی اجازت دو تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بات پوری طرح واضح ہو جائے گی۔'' فرینک نے یقین دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میرے ذہن میں اس سے زیادہ بہتر آئیڈیا ہے۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم پولیس اسٹیشن چلے چلیں؟''

''آفیسر، تم ایک بااخلاق شخص لگ رہے ہو اور اخلاقیات کا تقاضا بھی ہوگا کہ تم مجھے پولیس اسٹیشن نہ لے جاؤ۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہا ہوں لیکن بات یہ ہے کہ میں ایک بار پھر اس مرحلے سے گزرنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے یہ سب کچھ دوبارہ برداشت نہیں ہوگا۔'' فرینک نے کراہتے ہوئے کہا۔

''کیا برداشت نہیں ہوگا؟''

''میرے بھائی بات دراصل یہ ہے کہ میں ناقابلِ برداشت حد تک ذہنی دباؤ کا شکار رہا ہوں۔ میں جب بھی آئینہ دیکھتا ہوں تو مجھے ایک بوڑھے شخص کا عکس نظر آتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اپنے بہترین دوست کے قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی... نہیں ٹھہرو، میں اپنے الفاظ میں واپس لیتا ہوں۔ وہ میرا بہترین دوست نہیں تھا۔ اس لیے کہ دوست ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولتے۔ یہ رنج و غم سے بھرپور دنیا ہے... اس میں تکلیف اور دل شکنی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن یہ سب کیا ہے... دنیا کدھر جا رہی ہے؟ ہمیں جتنا زیادہ سننے کو ملتا ہے ہم اتنا ہی کم سنتے ہیں۔ میں اب چاق و چوبند نہیں رہا لیکن مجھ پر جو کچھ بیت چکی ہے تو مجھے حیرانی ہے کہ میں پاگل کیوں نہیں ہو گیا۔'' یہ کہہ کر فرینک نے ایک قہقہہ لگایا۔

''سنو، اگر تم برا نہ مانو تو سیدھی طرح مطلب کی بات پر آجاؤ۔'' پولیس آفیسر نے قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہ، میں بھول گیا تھا کہ تم پولیس والوں کو انتظار کروانا بالکل پسند نہیں ہے۔ بہرحال میرا خیال تھا کہ وہ میری مالی اور اخلاقی مدد کر رہا ہے اور چند ماہ تک اس نے میری اخلاقی اور مالی مدد بھی کی۔ بات یہ تھی کہ وہ میری بیوی کو ضرورت سے زیادہ پسند کرنے لگا تھا۔

جب میں گھر سے نکل جاتا تو وہ عقبی دروازے سے چوری چھپے اندر آجاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں لاعلم رہوں گا، وہ یقیناً ایک چالاک اور اسمارٹ شخص تھا اور اس کی اس خصوصیت کو میں تسلیم کرتا ہوں۔'' فرینک نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

''تو تم نے اسے قتل کر دیا، ہیں؟''

''ہاں، میں نے اسے قتل کر دیا اور اس جرم کی سزا بھی

کاٹ لی۔اب جب میں نے تمہیں پوری بات بتادی ہے تو پھر یقیناً تم سمجھ سکتے ہو کہ میں نے تم سے اس لاش کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہا۔ تم جو چاہو میں کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن ... مجھے واپس وہاں نہ بھیجنا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا میں بھگت چکا ہوں۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی کہ وہی کچھ ایک بار پھر بھگت سکوں۔'' فرینک نے یہ کہہ کر ایک سرد آہ بھری اور اس کے جسم نے ایک جھرجھری سی لی۔

''واؤ تم یقیناً ایک وحشی قاتل ہو، ہے نا؟ تمہاری داستان دل کو چھو لینے والی ہے لیکن بہ طور ایک پولیس آفیسر مجھے اپنا فرض سرانجام دینا ضروری ہے جو چاہے کتنا ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہو۔ اب تم میرے پیچھے چل پڑو۔''

''کیا تم مجھے میرے حقوق پڑھ کر سناتے جارہے ہو؟''

''حقوق؟ کیسے حقوق؟''

''او مائی گاڈ۔'' فرینک نے بے ساختہ اپنا سر تھام لیا۔ ''تو تم پولیس آفیسر نہیں ہو، ہے نا؟''

اس شخص نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''یقیناً تم پولیس آفیسر نہیں ہو۔'' فرینک نے قدرے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے کہ اگر تم پولیس آفیسر ہوتے تو تم مجھے میرے حقوق لازمی پڑھ کر سناتے۔ تم مجھے میرے حقوق سنائے بغیر قانونی طور پر حراست میں نہیں لے سکتے ... اب بتاؤ تم کون ہو اور تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا خیال تھا تمہیں مجھ پر شبہ نہیں ہوسکا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم جس طرح بوکھلا گئے تھے اور سٹپٹائے دکھائی دے رہے تھے تو میں نے سوچا کہ تمہارے ساتھ ایک چھوٹا سا کھیل کھیل لیا جائے... یہ کہ میں پولیس آفیسر بن جاؤں اور تم ایک مجرم...''

''لیکن کیوں؟'' فرینک سے رہا نہ گیا۔

''شاید تمہیں معلوم نہیں، قتل کرنا بھی ایک فن ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی تصویر کو پینٹ کرنا۔ اس میں صبر اور مہارت درکار ہوتی ہے۔'' اس شخص کا لہجہ معنی خیز تھا۔ فرینک ایک لمحے کے لیے کچھ سمجھ نہیں پایا۔

''اب جبکہ تم میرے ہاتھوں کی مہارت دیکھ چکے ہو تو پھر یہ لازم ہو چکا ہے کہ میری اس مہارت اور فن کے بارے میں کسی بھی فرد کو بھی کچھ نہ بتاسکو۔'' اس شخص نے زمین پر پڑی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اب تم میرا اگلا شکار بننا پسند کرو گے؟''

فرینک پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی، اس نے بھاگنا چاہا لیکن اس کی ٹانگوں میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔

''تم وحشی... جنونی... مجھ سے دور رہو۔'' فرینک بہ مشکل کہہ پایا۔

یہ سن کر اس شخص نے ایک ہذیانی قہقہہ بلند کیا اور بولا۔ ''شکار ہونے سے پہلے سب یہی کہتے ہیں۔''

اور پھر وہ خنجر ہاتھ میں لیے فرینک پر جھپٹ پڑا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 14

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

زہرہ بانو (بیگم صاحبہ)... اپنی یہ خوف ناک داستان ..... سنانے کے بعد خاموش ہو گئیں۔ ان کی آواز بھرا گئی، دلکش آنکھوں میں نمی چمکنے لگی اور پل کے پل چہرہ اشکبار ہو گیا جیسے بھادوں مینہ برس پڑا ہو۔

کسی کا محبوب اپنے چاہنے والے سے اس قدر بھیانک انجام کے بعد بچھڑ جائے تو اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیات ہوتی ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر بیتی ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں بیگم صاحبہ کے اس جانکاہ اور دل سوز دکھ کو سمجھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ دل کی گہرائیوں سے محسوس بھی کررہا تھا کیونکہ محبت میں نے بھی تو کی تھی، میں بھی تو اسی دشتِ الفت کا راہی تھا۔ عابدہ کو بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی مجھ سے جدا ہی تھی، سات سمندر پار... میری یادوں کی بھٹی میں سلگ رہی تھی، تپ رہی تھی، ہم دونوں ہی سرمد بابا کے احسانات کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔

بیگم صاحبہ اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ وہ ہولے ہولے سسک بھی رہی تھیں، آج شاید ان کے دردناک ماضی کا دکھ ہرا ہو گیا تھا۔ ایسے میں مجھے ان پر بے حد ترس آیا اور ان سے بے اختیار ایک ہمدردانہ سی انسیت محسوس ہونے لگی۔ وہ روئے جارہی تھیں۔ مجھے بھی دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے ان کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ان کا چہرہ اور ان کی آنکھیں ہنوز بھیگی بھیگی سی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اشک رواں کی یہ نہر آنکھوں سے نہیں خونِ دل سے بہہ نکلی ہو۔ میں جب ان سے مخاطب ہوا تو خود میری آواز بھی مرتعش سی محسوس ہوئی تھی۔

"بیگم صاحبہ! مجھے تو آج پتا چلا کہ آپ اندر سے کس قدر دکھی ہیں، غمِ الفت انسان کو ادھ موا کر ڈالتا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ... کہ میں نے اپنے تجسس کی خاطر آپ کے غم کو ہرا کر دیا۔"

میری بات سن کر بیگم صاحبہ کے دلنشین لبوں پر بڑی کرب آمیز مسکراہٹ ابھری پھر انہوں نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا جو ہنوز ان کے شانے پر تھا۔ وہ اسے ہونے سے تھپک کر بولیں۔

"میرا یہ غم... کبھی پرانا نہیں ہوسکتا شہزی! نہ ہی گزرتے وقت کی دھول اسے دبا سکتی ہے۔"

میں نے بہت دھیرے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا کیونکہ میں محسوس کررہا تھا کہ ان کے شانے پر از راہِ ہمدردی رکھے ہوئے میرے ہاتھ پر ان کا مرمریں ہاتھ ہولے ہولے مسلا جارہا تھا اور مجھے اپنے وجود میں ایک بار پھر سنسنی کا سا احساس ہونے لگا تھا۔ ہاتھوں کی یہ رگڑ مجھے چقماق پتھر کی سی لگی تھی جسے آپس میں رگڑا جائے تو یکدم آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ "چقماق" دلوں میں آگ بھڑکاتی میں نے ہاتھ پرے ہٹا لیا۔

وہ پھر عجیب سے لہجے میں بولیں۔ "شہزی! تم تیتق شاہ کو دیکھنا چاہو گے؟" میں ان کی اس انہونی سی بات پر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئیں پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا، ان کی صراحی دار گوری گردن کے گرد ایک سونے کی چین تھی، جس کا لاکٹ ان کے گریبان کے اندر کہیں "اٹھکیلی" کررہا تھا۔ لاکٹ نکال کر انہوں نے اسے کھولا پھر ایک سرے کو اپنے ہاتھ کی مٹھی سے ڈھانپ کر لاکٹ کے دوسرے اندرونی سرے کو میری آنکھوں کے سامنے کردیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا گول سادہ آئینہ تھا۔ اس میں میری اپنی صورت متحرک تھی۔ میں مسکرا کر بولا۔

"بیگم صاحبہ! یہ.... یہ.... تو محض آئینہ ہے۔ اس میں تو میری صورت نظر آرہی ہے؟"

میری بات سن کر ان کے لبوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ لاکٹ کا دوسرا حصہ میری جانب کرتے ہوئے اسی لہجے میں بولیں۔

"لو شہزی! اب... یہ آئینہ دیکھو ذرا..."

میں دنگ رہ گیا۔ وہ آئینہ تو نہ تھا مگر اس میں کسی کی تصویر تھی، بلکہ کسی کی کہاں وہ تو میری اپنی تصویر تھی۔

"یہ..... یہ... تو میری تصویر ہے بیگم صاحبہ..."

"نہیں شہزی! یہ تیتق شاہ کی تصویر ہے۔ وہ تمہارا ہم شکل ہے... تم بھول گئے جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو تمہیں دیکھ کر یکلخت میری حالت غیر ہو گئی تھی اور مجھ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی؟"

میں ورطۂ حیرت میں جتلا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں پہلی بار اول خیر کے ساتھ بیگم ولا آیا تھا اور بیگم صاحبہ سے پہلی بار میرا سامنا ہوا تھا تو ان کی حالت مجھے دیکھتے ہی اچانک غیر ہونے لگی تھی اور اس بات نے مجھے آج تک ایک عجیب قسم کے تجسس میں جتلا کر رکھا تھا۔ آج اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا۔

القصہ مختصر... زہرہ بانو نے آج بڑے کھلے کھلے انداز میں اپنی کتھا سنائی تھی، اس میں اول خیر اور ارشد کا ذکر کہیں

نہیں تھا۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ یہ دونوں بہت بعد میں ان کے گروہ میں شامل ہوئے تھے، نیز... اپنی داستان کے آخری حصے میں بیگم صاحبہ نے یہ بھی بتایا کہ تیتق شاہ کے ہلاک ہو جانے کے بعد اسے اس کے گاؤں کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا تھا جبکہ کھیل دادا نے چار قاتلوں میں سے دو کو ہلاک کر ڈالا تھا اور باقی دو کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان کے چہروں سے ڈھاٹے ہٹانے کے بعد اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ تیتق شاہ کا قتل چودھری ممتاز نے ہی کروایا تھا بلکہ وہ تو دونوں کو مروا دینا چاہتا تھا مگر خوش قسمتی سے زہرہ بانو اس سفاک اور خونی حملے میں بال بال بچ گئی تھیں۔

کھیل دادا ان دونوں قاتلوں کو ممتاز خان کے آدمیوں کی حیثیت سے پہچان گیا تھا اور انہیں پولیس کے حوالے کر کے اقبالِ جرم بھی کروا لیا تھا لیکن پھر اچانک ایک روز ان دونوں قاتلوں کو جیل میں زہر دے کر مروا دیا گیا اور بیشتر کیسوں کی طرح یہ کیس بھی قانون کے انبار میں دب کر داخلِ دفتر کر دیا گیا پھر اس روز سے باقاعدہ بیگم صاحبہ اور ممتاز خان کے درمیان جنگ کا آغاز ہو گیا۔

بیگم صاحبہ کی اس داستان میں مجھے ایک بات پر حیرت ہوئی تھی جس کا میں نے اظہار بھی کر دیا۔

''بیگم صاحبہ! ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی کہ آپ کے علم میں پہلے سے یہ بات تھی کہ کھیل دادا آپ کو پسند کرتا ہے؟''

یہ سوال میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ سے بولیں۔ ''ہاں، میں جانتی تھی، لیکن دانستہ لاتعلق رہتی تھی اس حقیقت سے... نہیں چاہتی تھی کہ اس حساس موضوع کو چھیڑوں کیونکہ عورت ایک ہی بار کسی سے محبت کرتی ہے جو مجھے صرف تیتق شاہ سے تھی اور یہ حقیقت کھیل دادا بھی جانتا تھا مگر آفرین ہے اس آدمی پر اس نے آج تک میرے سامنے اپنے اظہارِ دل کی جرأت نہیں کی، سمجھدار تھا۔ حقیقت جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا مگر باوصف اس کے اس نے عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ حتیٰ کہ تیتق شاہ کے معاملے میں اس سے چھپی ہوئی رقابت کے باوجود کئی مواقع پر اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی زندگی بچائی تھی اور میرے حوالے سے وہ اس کی عزت بھی کرنے لگا تھا۔''

''بے شک آفرین ہے کھیل دادا پر اس کی اعلیٰ ظرفی پر۔'' میں نے بھی کھیل دادا کے اس قابلِ لحاظ عمل پر متاثر ہو کے کہا۔

باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ رات کب سر پہ آئی اور کب رات کے آخری پہر میں ڈھل بھی گئی۔

ہم دونوں گم صم اور دم بخود ہیولوں کی طرح ریتیلے کراڑے پر بیٹھے تھے کہ اچانک مجھے اپنے کان کی لو میں ہلکی سی تپش محسوس ہوئی۔ میں بری طرح چونکا اور جھٹ سے اپنی ایک انگلی کان کی طرف لے گیا اور دھیرے سے... ''شہزی اسپیکنگ'' کہا۔

ناگہاں۔ دوسری جانب سے میں ثریا ہی کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا مگر خلافِ توقع ایک اجنبی مردانہ آواز سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

''یس! کامران از ہیئر، کیا تم شہزاد احمد خان ہی بول رہے ہو، اوور۔'' اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ کئی اندیشناک خدشات سے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جانے کیوں جی نہیں پار رہا تھا کہ کیا بات کروں؟ میں تو ثریا کے بولنے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ تاہم اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں شہزاد احمد ہی بول رہا ہوں مگر تم کون ہو؟ اور ثریا کدھر ہے... اوور۔''

دوسری جانب سے وہی اجنبی آواز ابھری۔ ''میں ثریا ہی کا ساتھی ہوں۔ وہ ایک نرغے کا شکار ہو گئی۔ تمہیں لینے کے لیے اسے آنا تھا مگر تنظیم کے ایک ضروری مشن پر اسے جانا پڑ گیا۔ اب میں تمہیں پک کروں گا کدھر ہو تم؟ اوور۔''

مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں نہیں بلکہ میرے دماغ میں ان گنت چیونٹیاں گھس گئی ہوں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا میرے لیے... مجھ سے کئی پل تک کوئی جواب ہی نہ بن پڑا کہ اسے کیا جواب دوں؟ ایک خیال ذہن میں آتا تھا کہ ممکن ہے کامران نامی یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہو، وہ سچ ہو۔ ثریا کو اچانک کوئی اہم مشن آن پڑا ہو مگر ثریا کو مجھے بتانا چاہیے تھا یا شاید اسے اس کا موقع نہ مل سکا ہو۔ کئی الجھن آمیز لاتعلق سوالات ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کیونکہ ثریا خود مجھ سے ایک مدد کے سلسلے میں ملنا چاہتی تھی، نہ صرف یہ بلکہ وہ تنہا نہ تھی اس کے ''ہم خیال'' ساتھی بھی ''ویکٹرم'' میں اس کے ساتھ شامل تھے، وہ ان کے خفیہ اغراض و مقاصد سے مجھے آگاہ کرنے والی تھی، ایک ہولناک خیال یہ بھی آتا تھا کہ کہیں بدقسمتی سے ثریا کا راز فاش تو نہیں ہو گیا تھا۔ کہیں وہ بے چاری کسی مصیبت کا شکار تو نہیں ہو گئی تھی۔ ایسے ہی وقت میں گویا پل کے پل میرے

ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آیا اور پھر میں پورے اعتماد سے بات کرنے لگا۔ اسے میں نے اپنی نہر کنارے موجودگی کے بارے میں بھی بتا دیا اور چند دوسری نشانیاں اسے بتا دیں۔

''کیا ہوا؟ کون تھا؟ ثریا نہیں تھی؟'' رابطہ منقطع ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری لی۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کو ساری بات بتا دی۔ ان کے چہرے پر بھی الجھن آمیز تشویش کے آثار نمودار ہو گئے پھر وہ جیسے خودکلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔ ''مجھے تو دال میں کالا لگتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے گومگو۔۔۔ انداز میں کہا۔

''شہزی! تمہارے ذہن میں کیا لائحہ عمل ہے؟ مجھے تو کوئی خطرناک گڑبڑ لگ رہی ہے لیکن تم نے تو انہیں میرا مطلب ہے کامران کو اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں بھی بتا دیا ہے؟''

میرے ذہن میں جو لائحہ عمل تھا وہ ابھی بیگم صاحبہ کو بتانے کا وقت نہ تھا۔ تاہم بولا۔ ''ہمیں یہ جگہ فوراً چھوڑنا ہو گی اور کسی اور جگہ گھات لگانا پڑے گی، آیئے بیگم صاحبہ۔'' کہتے ہوئے میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہم دونوں تاریکی میں آگے بڑھنے لگے اور کراڑے کے سرے پر پہنچ کر دوسری طرف نیچے ڈھلان میں اترنے لگے۔ سامنے ٹیلے تھے جیسے عجیب ہیولوں کی طرح نظر آ رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے کئی پُراسرار بلائیں کوہان نکالے دم سادھے بیٹھی ہوں۔ ایسے ہی ایک ٹیلے کے قریب آ کر ہم بیٹھ گئے۔ میرا ذہن عجیب مخمصے کا شکار تھا۔ شکوک و شبہات اپنی جگہ مگر کامران کی بات معقول بھی لگتی تھی، ورنہ کامران کو بھلا ثریا کے منصوبے اور میرے بارے میں کیا پتا تھا؟ کیا خبر وہ واقعی ہماری مدد کے لیے ہی پہنچ رہا ہو۔ بہرطور، دونوں ہی باتیں تھیں۔ تاہم میں نے اس الجھی ہوئی اور متوقع مخدوش صورتِ حال کو بےنقاب کرنے کے لیے اپنے تئیں جو سوچ رکھا تھا، اس پر عمل کرنے کا میں فیصلہ تو کر ہی چکا تھا۔

اندیشناک لمحات کے متوقع خدشات تلے وقت دھیرے دھیرے دل کو دھڑکاتا گزرتا رہا۔ میں بھی اردگرد کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی عمل کے دوران جب میں آخری بار ایک نسبتاً اونچے ٹیلے پر چڑھ کر گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا تو اچانک میری نظر سیدھے ہاتھ کی سمت پر ٹھہری گئی۔ یہ وہ سمت تھی جہاں سے ہم چلے تھے اور یہاں پہنچے تھے وہاں ایک روشنی سی دکھائی دی۔ روشنی متحرک تھی۔ یقیناً یہ کسی گاڑی کی ہو سکتی تھی۔ تو کیا کامران مجھے لینے کے لیے، ہماری مدد کے لیے یہاں پہنچ رہا تھا؟ کیونکہ متوقع گاڑی کا رخ نہر کی طرف ہی تھا پھر ٹھیک اسی وقت جب میں کچھ سوچ کر ٹیلے سے نیچے اترنے کا ارادہ کر رہا تھا دفعتاً ہی میری نظر بائیں جانب پڑی۔ یہ آبادی کی طرف والا علاقہ تھا جس کے بارے میں میرا محتاط اندازہ تھا کہ دشمن ہماری تلاش میں بھٹک کر ادھر جا نکلے تھے۔ اب اسی سمت سے مجھے ایک سے زائد روشنیاں متحرک دکھائی دیں اور پھر جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری سی دوڑ گئی۔ یقیناً کوئی گہری سازش چلی گئی تھی۔۔۔ آبادی کی سمت سے ممتاز خان اور اس کے کارندے ہی ہو سکتے تھے جبکہ دوسری طرف کامران بھی ہمدرد کی صورت میں دشمن ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس نے ہماری تلاش میں سرگرداں ممتاز خان کو بھی ہمارے سلسلے میں آگاہ کر دیا ہو یا تو پھر یہ کچھ نہ تھا؟ مگر نہیں۔۔۔ بہت کچھ تھا۔ آنکل مجھے ماروالی بات ہو گئی تھی، وقت کم تھا، میں تیزی سے نیچے اترا، بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑا اور سمت بدل کر ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں آ گیا۔ بیگم صاحبہ بھی اس نئی صورتِ حال سے پریشان سی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا۔

''بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے ہم پہلے سے بھی زیادہ خطرے میں گھر چکے ہیں مگر اللہ مالک ہے، اس نے اب تک مدد کی ہے آگے بھی وہی ہماری دستگیری کرے گا۔ آپ یہاں رکیں، میں ذرا حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

''نن۔ نہیں۔۔۔ تم کہیں مت جاؤ، ہم یہیں سے ہی بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' بیگم صاحبہ میرا ہاتھ تھام کر تشویش زدہ لہجے میں بولیں تو میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''بیگم صاحبہ! ہم اس وقت چومکھی جنگ کا شکار ہیں۔ یہ موقع فرار کا نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسا کریں میں آپ کو انشاء اللہ بحفاظت لے جاؤں گا۔'' میں نے مستحکم اور پُرعزم لہجے میں کہا اور ہولے سے تشفی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔

ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں مجھے یقین تھا کہ مخالف سمتوں سے آنے والے دشمنوں کا وہ مقام اتصال ہو گا، وہاں گھات لگا کر ان کی متوقع نقل و حرکت دیکھنے کے لیے

دبک کر بیٹھ گیا۔

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ گھمسان کا رن پڑنے اور آگ اور بارود کی بو آتی مجھے محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ میری جھکی ہوئی نظروں کے سامنے تاریکی میں مذکورہ مقام پر دشمنوں کے دونوں گروپ آپس میں مل گئے تھے، اب ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، میرا اور ان کا فاصلہ بمشکل تیس چالیس گز ہی تھا۔ میں نے کار سے ایک نوجوان کو دو مسلح آدمیوں کی معیت میں اترتے دیکھا تھا جس کے بارے میں قوی امکان تھا کہ یہی کامران تھا جس نے ثریا کے حوالے سے مجھے بلف کرنے کی سعی چاہی تھی جبکہ ممتاز خان ابھی اسی پجارو جیپ سے اترا تھا جس پر ہم نے اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے عقب میں ایک بغیر ہڈ والی جیپ بھی تھی اور ایک کار۔

کل ملا کر ان کی تعداد بارہ تیرہ سے کم نہ تھی، ان میں کچھ مسلح تھے، کچھ نہیں۔ یقیناً ان کے ہتھیار زیرِ ستر ہوں گے۔ میں نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بغور دیکھا۔ ممتاز خان اس نوجوان سے خاصی برہمی سے مخاطب تھا۔

”یہاں ہم دو بار جھک مار کے جا چکے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔ اس نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔“

”لل... لیکن باس...“ نوجوان نے کچھ کہنا چاہا مگر ممتاز نے غصیلے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

”تم گدھے ہو، لگتے ہی نہیں کہ تم اسپیکٹرم کے ایک ٹاپ ایجنٹ ہو۔ تمہیں چاہیے تھا، شہزی سے براہِ راست بات کرنے کے بجائے اس ذلیل عورت سے ہی رابطہ کرواتے، شہزی تمہاری سوچ سے بھی زیادہ مکار اور چالاک ہے۔ تمہاری آواز سنتے ہی وہ بدک گیا ہوگا۔“

اس پر اس نوجوان نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا ارادہ یہی تھا مگر...“

ممتاز خان اس کی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا، بولا۔

”ثریا کی غداری کے بارے میں کسے علم ہوا تھا؟“

ممتاز خان کے اس سوال پر میری سماعتیں دھڑک اٹھیں... جس مذکورہ نوجوان کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کامران تھا جوابا سودبانہ لہجے میں بولا۔ ”چیف کو ثریا پر سب سے پہلے شبہ ہوا تھا۔“

”چیف... کون چیف؟ مسٹر ترک کی بات تو نہیں

...ہے ہو تم؟“

”حیرت ہے باس۔ آپ کے علم میں نہیں کہ ماسٹر اتھارٹیز نے وزیر جان کو اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف مقرر کر دیا ہے اور اس کا آفس اسٹیشن فور میں قائم کر دیا ہے۔“ کامران نے شاید ممتاز کے طنز کا جواب دیا تھا۔ وہ ایک ٹاپ ایجنٹ تھا جبکہ ممتاز خان کی اسپیکٹرم میں حیثیت کیٹسا KATSA کی تھی جو یقیناً ٹاپ ایجنٹس اس کے انڈر میں نہیں تھے۔ (ثریا سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق)

میں نے دیکھا کامران کے اس انکشاف پر ممتاز خان کا چہرہ ہی نہیں آواز بھی بجھ گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خود ”اسٹیشن چیف“ کے عہدے کا متمنی تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تو کامران بولا۔

”میں ایک بار پھر شہزی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے کان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میرے کان میں ہلکی حرارت محسوس ہوئی، میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں اس سے کیا بات کروں؟ اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا بات کرنے کا... یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ ثریا کا راز فاش ہو چکا ہے اور اس کا سبب وزیر جان ہی تھا۔ نہ جانے اسے کس طرح ثریا پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس پر غداری کا الزام بھی ثابت ہو گیا تھا۔ مجھے ثریا کے بارے میں تشویش ہونے لگی۔ ثریا سے مجھے بہت کچھ پوچھنا تھا نہ صرف یہ بلکہ اسے بھی مجھے بہت کچھ بتانا تھا کہ اسپیکٹرم نامی اس بین الاقوامی خفیہ تنظیم کے مقاصد کیا تھے؟ وغیرہ۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے مدد بھی چاہتی تھی مگر افسوس اس کا نہ علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ پاور سیکرٹ سروس کا ایک بے قاعدہ ایجنٹ ہی سہی مگر رینجرز فورس کے سربراہ میجر ریاض باجوہ کی باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں جن کے مطابق وطنِ عزیز کو کچھ اندرونی و بیرونی سازشوں کا سامنا تھا اور ایک پر خفیہ طور پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا میرا ثریا سے مل کر اسپیکٹرم کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا ازبس ضروری تھا۔

میرے کان میں حرارت بھی ہوئی تھی اور......

میں نے بالآخر کامران کی کال اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر میں موصول کرلی۔

”یس! ہوز دیئر؟“ میں نے دانستہ انجان بن کر پوچھا اور اوور کہا۔

دوسری جانب سے اس نوجوان کی آواز اُبھری۔

''یس مسٹر شہزی! تم کہاں ہو اس وقت؟ ہم تمہاری تلاش میں نہر والی جگہ پر پہنچ چکے ہیں مگر تم یہاں نہیں ہو، اوور۔''

اس کی بات سن کر میں مسکرایا۔ پھر اس کی مکاری کے جواب میں بولا۔ ''میں کچھ دیر پہلے ادھر ہی تھا لیکن وہاں دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے آن پہنچے تھے۔ اب میں اس جگہ نہیں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہیں کال کر کے بتاتا ہوں۔ اس وقت میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ جب تک وہ ٹل نہیں جاتا میں اپنی کمین گاہ سے نہیں نکل سکتا۔ تم ایک کام کرو، اپنے کیشا ایجنٹ ممتاز خان کو کسی طرح یہاں سے بھگانے کی کوشش کرو، اوور۔''

''اس کی تم فکر مت کرو شہزی، تم مجھے اپنی ویئر اباؤٹ کے بارے میں بتاؤ، میں ابھی وہاں تمہیں لینے پہنچ جاتا ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو، ورنہ تمہاری وجہ سے میں بھی اپنے لوگوں کی نظروں میں آجاؤں گا، اوور۔''

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ اُبھری۔ ''کامران! ٹھیک ہے پھر میں تمہیں بتائے دیتا ہوں مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اگر گاڑی میں ہو اور تمہارے ساتھ اور ساتھی بھی ہوں تو گاڑی ذرا دور چھوڑ کے تم تنہا اصل مقام کی طرف بڑھنا، اس طرح میں تمہیں اکیلا دیکھ کر دور سے ہی پہچان لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ایک آبادی کی سمت کا ایک غلط پتا بتادیا اس کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ واپس اسی ٹیلے کے قریب آگیا جہاں سے میں نہ صرف انہیں دیکھ سکتا تھا بلکہ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو بھی سن سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کامران، ممتاز خان سے کہہ رہا تھا۔

''اس نے اپنی ویئر اباؤٹ کے بارے میں مجھے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم موت کا ہرکارہ بنے اسے ڈھونڈ رہے ہو۔'' باقی اس نے وہی کچھ کہا جو میں اس سے کہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا ممتاز خان فوراً حرکت میں آتے ہوئے بولا۔

''ہم ابھی اسے وہاں جا کر جا لیتے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''نہیں باس، وہ بدک جائے گا اور بھاگ کر کہیں چھپ جائے گا۔'' کامران نے اختلاف کیا۔ ''میں اس وقت ماسٹر چیف مسٹر آرک کے آرڈرز کو فالو کر رہا ہوں۔ انہوں نے ''شہزی ٹریپ'' کا یہ مشن مکمل طور پر میری صوابدید پر چھوڑا ہے۔''

''تو کیا اب تم مجھ پر حکم چلاؤ گے؟'' ممتاز خان اپنی روایتی اکڑفوں دکھانے لگا مگر فوراً حالات کی نزاکت اور شاید ماسٹر چیف مسٹر آرک کے ذکر پر ڈھیلا پڑتے ہوئے بولا۔ ''اٹس او کے! کیا پلان ہے تمہارا۔''

ٹاپ ایجنٹ کامران پُرمتانت لہجے میں بولا۔ ''شہزی کو بلف کرنے کی خاطر پہلے میں وہی کروں گا جو اس نے کہا ہے۔ یہاں سے روانہ ہونے کے بیس منٹ بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرے پیچھے آنا۔ ٹریپ کامیاب ہوتے ہی میں واچ ٹرانسمیٹر پر خفیہ کاشن دوں گا اس کے بعد آپ لوگ شکار کے گرد گھیرا ڈال دینا۔ اول میں خود ہی اسے قابو کر لوں گا۔'' اس نے مجھے قابو کرنے کے لیے جس غرور اور اطمینان کا اظہار کیا تھا اس نے میرے پورے وجود میں جوش بھر دیا تھا اور پھر میں زیرِلب یہ بڑبڑاتے ہوئے پیچھے کی سی پھرتی کے ساتھ پلٹا۔

''یہ وقت بتائے گا کامران کہ تم مجھے قابو کرتے ہو یا میں۔''

بیگم صاحب کے پاس پہنچ کر میں نے انہیں ساتھ لیا اور تاریکی میں تیز تیز چلتے ہوئے موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرتا گیا۔ وہ تفکر آمیز لہجے میں بولیں۔ ''شہزی! تم خطرے سے کھیلنے لگے ہو، وہ سب معمولی لوگ نہیں ہیں۔ تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! خطرے سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر خیر کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں اور میری کامیابی کی دعا کریں۔''

چند منٹوں بعد ہی میں اس راستے پر آن پہنچا جہاں متوقع طور پر کامران کو رکنا تھا۔ اس کے بعد کار سے اتر کر اکیلا آگے بڑھنا تھا... یہ نہر سے تقریباً پچاس گز دور کا علاقہ تھا اور یہاں سے آبادی کی طرف داخلے کا کچا تنگ سا راستہ جاتا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا وہ فوری کرنے اور نمٹانے کا متقاضی تھا۔ بصورتِ دیگر ممتاز خان بھی اگر طے شدہ پروگرام کے مطابق وہاں اپنے مسلح آدمیوں سمیت پہنچتا تو صورتِ حال گمبھیر ہو جاتی۔

میں نے کار کے مقابلتاً طویل راستے کے بجائے درمیانی اور شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا اور بیگم صاحب کو بھی اپنے ساتھ تقریباً دوڑاتا ہوا وہاں تک پہنچا۔

بیگم صاحب کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر وہ بہت ہمت و حوصلے سے کام لے رہی تھیں۔ مقررہ مقام پر پہنچ کر ہم رک

گئے۔ یہاں کیکر کے درخت اور جھنڈ دار خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، میرے ذہن میں کامران کو ٹریپ کرنے کا جو منصوبہ تھا، میں اس کے مطابق ٹھیک وقت پر ٹھیک جگہ قدم بڑھا رہا تھا۔

''شہزی! اپنا خیال رکھنا۔'' بیگم صاحبہ کو ایک تاریک جھنڈ کے قریب چھوڑ کر جانے لگا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولیں۔ ''ایسے میں مجھے ان کے لہجے میں گہری حسرت و یاس بچی محسوس ہوئی۔ ''تم خالی ہاتھ ہو، تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں۔ تم کس طرح...''

''بیگم صاحبہ۔'' میں نے ان کی بات کاٹ کر سرگوشی آواز میں کہا۔ ''میرا حوصلہ اور میرا عزم ہی میرے ہتھیار ہیں پھر اللہ میرے ساتھ ہے اور وہی میرے لیے کافی ہے۔ آپ چوکس رہیں... چلتا ہوں۔''

کہتے ہوئے میں تیزی سے عقب میں بڑھ گیا۔ وقت اور حالات کا تقاضا تھا جو کچھ کرنا ہے فوری کرنا ہے۔ جلد ہی مجھے سامنے روشنی نظر آ گئی۔ دل دھڑکا اور میں یکلخت مزید جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا۔ میری نظریں سامنے متحرک روشنی پر جمی ہوئی تھیں جو لحہ بہ لحہ قریب آ رہی تھی۔ کار میں کامران اپنے دو تربیت یافتہ ایجنٹ ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ میں جانتا تھا میرا مقابلہ کسی ساعت یا عام قسم کے دشمنوں سے نہیں ہے لیکن جوش و جذبہ اور شر کے خلاف خیر کی جنگ لڑنے کا عزم صمیم بھلا کب طاقت کے تفاوت کو خاطر میں لاتا ہے۔

کار قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے شکار پر جھپٹنے کے لیے جیسے اپنی سانس تک روک لی۔ میں نے جھنڈ کے تاریک گوشے سے دیکھا۔ کار کا انجن بند کر دیا گیا تھا پھر دروازے کھلے۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں، کار سے کامران اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ برآمد ہوا۔ میرا ان سے درمیانی فاصلہ فقط اتنا ہی تھا جتنا ایک چیتے کا اپنے شکار سے دوری پر ہوتا ہے۔

ظاہراً ان کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔

کامران نے دھیمے لہجے میں چند سیکنڈ ان سے کچھ کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ دونوں ساتھی اس کی کار کے قریب ہی کھڑے رہ گئے۔ کامران تاریکی میں آگے بڑھ گیا جیسے ہی وہ تاریکی میں اوجھل ہوا میں چیتے کی طرح جھاڑیوں سے نکلا۔ دونوں کا رخ اس جانب تھا جہاں کامران گیا تھا۔ عقب میں ابھر کے میں نے ایک زوردار لات ایک کی کمر کے اس حصے پر رسید کر دی جو ریڑھ کی ہڈی کا آخری اور نسبتاً کمزور حصہ کہلاتا ہے۔ ضرب زوردار تھی، لگتے ہی میرے شکار کا جسم ایک زوردار جھٹکے سے کمان کی صورت عقب میں خم ہوا اور وہ کار سے ٹکرا کر لڑھک گیا۔ دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما تو میرے آہنی ہاتھ کا دایاں گھونسا ہتھوڑے کی طرح اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ اس وقت بقا کا جذبہ کسی جنون کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔ گھونسا کھا کر دوسرا کار کے بونٹ پر جا پڑا۔ پہلے والے کی نچلی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ سرکنے کے باعث وہ حرکت کرنے سے قاصر تھا مگر میں مرحلہ وار لڑائی میں باری باری دونوں کی طرف متوجہ تھا اور گویا ایک بجلی کی لہر سی تھی جو میرے پورے وجود کو مشل پارہ بنائے ہوئے تھی۔ پہلے مضروب نے کار سے ٹکرا کے نیچے لڑھکنے کے بعد پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا مگر قبل اس کے فائر کرتا میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر لات مار دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کار کی باڈی سے ٹکرایا اور اچھلا تو میں نے فضا میں ہی اسے جھپٹ لیا۔ پہلے والے کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوسرے کی طرف لپکا اس کا منہ خون سے بھرا ہوا تھا اور سنبھل کے وہ بھی ہتھیار نکالنے کی ٹوہ میں تھا کہ میں نے اس کے چہرے کی طرف پستول کر کے ٹریگر دبا دیا۔ رات کے پُرہول اور دم گھونٹ دینے والے سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور دوسرے کا چہرہ خون ناک چھیچھڑی میں تبدیل ہو گیا۔ پہلے والا کار کے عقب میں سرکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا بھی میں نے کام تمام کر دیا۔ پھر تیزی سے جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آگے لپکا۔

میری توقع کے عین مطابق کامران ہاتھ میں پستول لیے واپس دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک کارروائی مجھے اپنے سے طاقتور دشمنوں پر غلبہ عطا کر رہی تھی۔ میری اگلی کارروائی نسبتاً سہل ثابت ہوئی۔ میں گھات میں تھا اور میرا دشمن مات میں... کامران کی بدحواسی بتا رہی تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ اردگرد سے غافل ہو کے پستول ہاتھ میں لیے واپس اپنے ساتھیوں کی جانب لوٹ رہا تھا اور راہ میں عقب سے میں نے اس پر جست لگا دی۔ وہ گرا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تاریک جھاڑیوں میں کہیں سرک گیا۔ میں نے خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اس پر پستول تان لیا۔ کار کی مقدور بھر ہیڈ لائٹس کی روشنی وہاں تک پڑ رہی تھی، وہ مجھے دیکھ کر جیسے یک دم سکتے میں

آ گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور ممتاز خان کسی بھی وقت اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچ سکتا تھا۔ کامران نے مجھے زیر کرنے کی جو چال چلی تھی اس میں وہ خود پھنس گیا تھا۔

"میرے سر پر اس وقت خون سوار ہے اور میں تمہارے دونوں ساتھیوں کو خون میں نہلا چکا ہوں۔" میں نے وحشیانہ غراہٹ سے کہا۔ "وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، کار کی طرف بڑھو۔"

"دیکھو... تم..." اس نے کچھ کہنا چاہا۔ اور اسی وقت میرے پستول کی نال سے شعلہ چمکا۔ گولی کامران کے دائیں بازو میں پیوست ہو گئی۔ میں نے دہشت ناک لہجے میں کہا۔ "بس! اب آخری موقع ہے وقت ضائع کرنے کی کوئی چالاکی نہیں کرو گے تم... کار کی طرف بڑھو۔"

وہ میرے لہجے کی تند گرج سے میرے خونی عزائم کا ادراک کر کے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھے کار کی جانب بڑھا تو اسی وقت مجھے قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ ایک لمحے میری توجہ اس جانب مبذول ہوئی اور بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہو گئی، وہ بیگم صاحبہ تھیں۔ انہوں نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں سن کر وہ یقیناً میری مدد اور صورت حال جاننے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں۔

"بچو شہزی۔" وہ ایک دم چلا کر بولیں۔ میں کامران کی طرف پلٹا۔ وہ بجلی کی سی پھرتی سے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر دوسرے پاؤں کی پنڈلی میں بندھی میان سے ایک خنجر نکال کر مجھ پر پھینک چکا تھا۔ میں نے بروقت تیزی سے جھکائی دی تھی۔ "شائیں" کی سنسناتی آواز سے خنجر میرے چہرے کے قریب سے گزرا تھا کہ مجھے اس کی خوف ناک "جھپک" اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔ یہ وہی ترک تھی جو شاید مجھ پر آزما چکی تھی، گویا یہ ان کا خاص ہتھیار تھا، میں نے طیش میں آ کر ایک گولی اس کے زمین پر ٹکے گھٹنے پر داغ دی۔ وہ بری طرح چیخ گیا۔ کامران کے حلق سے بڑی کربناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ اپنا زخمی گھٹنا پکڑ کر وہیں لڑھک گیا۔ میں دانت بھینچ کر اس کی طرف بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"اب بس... چلو اٹھو۔" میں اسے گھسیٹ کر کار کی طرف لایا۔ بیگم صاحبہ کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ میں عقبی سیٹ پر کامران کو دبوچ کر سوار ہو گیا۔ اس وقت میں نے عقب میں دیکھا، کچھ روشنیاں چمکتی دکھائی دیں۔

"بیگم صاحبہ! گاڑی بھگاؤ، دشمن آ رہا ہے۔"

بیگم صاحبہ کو ساری صورت حالات کا ادراک تھا۔ انہوں نے فوراً کار سٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"بائیں والے کی طرف موڑیں گاڑی۔" میں نے کہا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ کار جھاڑیوں والی زمین پر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ اس دوران میں نے بیک اسکرین سے عقب میں دیکھا۔ روشنیاں دور رہ گئی تھیں۔ دشمن جب تک حالات کا ادراک ہوتا، ہم ان کی پہنچ سے دور جا چکے تھے۔ بیگم صاحبہ بڑے ماہرانہ انداز میں کار ڈرائیو کر رہی تھیں۔ میں نے کامران کو دبوچ رکھا تھا۔ پستول میں نے اپنی جیب میں اڑس لیا تھا۔ کامران زخمی تھا۔ مجھے اب اس سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا وہ کراہ رہا تھا اس نے کراہتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"تم... میرے زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گا۔"

"بے شک مر جاؤ ہمیں پروا نہیں۔" میں نے دانستہ بے نیازی سے کہا۔

"تت... تم... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔"

"دد... دیکھو... کار کی ڈکی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ کم از کم میری مرہم پٹی تو کر دو۔"

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ہم کار کھڑی کر کے تمہاری مرہم پٹی کریں اور تمہارے کتے ہم تک پہنچ جائیں۔"

"وہ اب دور نکل گئے ہیں تم انہیں جل دینے میں کامیاب ہو چکے ہو۔"

"شہزی! اگر تم نے اس کے منہ سے کچھ اگلوانا ہے تو اس کی جان بچانا ضروری ہے، اس کی مرہم پٹی کیے دیتے ہیں۔"

معاً بیگم صاحبہ نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ بیگم صاحبہ کو شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ کامران ایک بین الاقوامی تنظیم کا ٹاپ ایجنٹ تھا۔ اتنی آسانی سے منہ کھولنے والا نہیں تھا۔ ثریا نے اگر مجھے اسپیکٹرم کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو میں بھی مارا جاتا۔ کبھی بے خبری فائدہ دیتی ہے تو کبھی باخبری سودمند ثابت ہوتی ہے۔ یقیناً بیگم صاحبہ سے یوں سننے سے کامران کے کان ضرور کھڑے ہوئے ہوں گے۔

تو ہم میں نے بے دستور انجان بنے رہنے کی اداکاری کرتے ہوئے اسی بے پروائی سے کہا۔

''ہم نے اس کا اچار نہیں ڈالنا محترمہ۔'' (میں نے دانستہ بیگم صاحبہ نہیں کہا تھا)

''ہاں، مسٹر کامران! مجھے سب سے پہلے ثریا کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو تمہاری مدد... آہ...'' وہ کرب انگیزی سے کراہا... کیونکہ میں نے اس کے سفید جھوٹ پر اس کے زخمی بازو میں اپنے ہاتھ کا پنجہ گاڑ دیا تھا۔ میری انگلیاں اس کے خون سے تر ہو گئیں، اس اثنا میں سڑک آ گئی۔ بیگم صاحبہ کو میں نے ملتان کی جانب ہی روانہ ہونے کا کہا۔ ہائی وے پر آتے ہی کار فرانے بھرنے لگی۔

''میں جھوٹ سننا بالکل پسند نہیں کرتا مسٹر کامران! ٹاپ ایجنٹ فرام اپیکزم۔'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''تمہارے اسٹیشن چیف وزیر جان کو کیسے اس بات کا پتا چلا تھا کہ ثریا غداری کر رہی ہے؟ اور اب وہ کہاں ہے؟''

میری ان معلومات پر وہ بے پروہ تہ صرف مرعوب نظر آنے لگا بلکہ تشویش زدہ نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔

''اب کی بار میں تمہارا زخمی گھٹنا دباؤں گا۔ میرے سوال کا جواب دو۔ ثریا زندہ ہے یا مردہ مگر جھوٹ نہیں سنوں گا میں، کنفرم کرنے کے میرے پاس اور بہت ذرائع ہیں تمہارے جھوٹ سچ کو...''

''وہ زندہ ہے۔''

''کہاں ہے؟''

''ہماری قید میں ہے۔''

''تمہیں کوارٹر کے زیرو پوائنٹ میں؟'' میں نے کہا۔ اسے جھٹکا لگا۔ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''تو اس کتیا نے یہاں تک تمہیں بتا دیا ہے۔''

میں نے طیش میں آ کر ہونٹ سکیڑے اور اس کے زخمی گھٹنے پر زوردار گھونسہ رسید کر دیا۔ کار کے دم بخود محدود ماحول میں اس کی لرزہ خیز چیخ ابھری۔

''کہا نا میں نے... فضول بکواس نہیں سنوں گا میں۔'' میں غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''جہنم میں جاؤ... میں تمہیں کچھ نہیں بتانے والا۔ بے شک مر جانے دو مجھے۔'' تکلیف، اذیت اور بے بسی نے اسے شاید پاگل کر دیا تھا۔ میرا ذہن ایسے موقع پر تیزی سے کام کرتا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے غیر معمولی ذہن سے نوازا تھا۔ عقل سلیم یعنی کامن سینس... یہ کسی میں کم کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ کم زیادہ بھی نہیں ہوتی۔ بات اسے صحیح وقت پر استعمال کرنے کی ہوتی ہے۔ اگرچہ ثریا نے مجھے اپیکزم کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا مگر جتنا بتایا تھا اس سے میں بہت نتائج اخذ کر چکا تھا۔ یہ یقیناً دیسی و ولایتی کتوں کی کوئی بین الاقوامی تنظیم تھی۔ کوئی بڑا گینگ یا انٹرنیشنل لیول کا گروپ... کامران جیسے لوگوں کی کیا کمزوری ہو سکتی ہے۔ ان جیسوں کے منہ کیسے کھلوائے جاتے ہیں۔ مجھے اس کا بخوبی ادراک تھا۔ لہٰذا بڑی نرمی کے ساتھ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بولا۔

''ٹھیک ہے، تم کچھ نہ بولو... پی ایس ایس والے خود ہی تم سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔'' کہتے ہوئے میں نے ونڈ اسکرین پر لگے بیک وویو پر نظریں جمائیں۔ وہاں کامران کا چہرہ فوکس تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔

''پپ... پی ایس ایس...؟ یہ کون لوگ؟''

میرے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا خوف زدہ لہجہ خود ہی اس امر کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ جانتا ہے مگر دانستہ انجان بن رہا ہے۔ میں نے لوٹی جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں جھوٹ بولنے کا، کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ تم پاور سیکرٹ سروس والوں سے بے خبر ہو جبکہ تمہاری اس ولایتی تنظیم اپیکزم کے ایجنٹ ان سے میرے سامنے بھڑ بھی چکے ہیں۔ انہوں نے پی ایس ایس کے چنگل سے اپنے متوقع اسٹیشن چیف وزیر جان کو چھڑایا تھا۔''

''اوہ... تو تم پاور کے لیے کام کرتے ہو۔''

''نہیں، فری لانسر ہوں۔ اپنے ذاتی مفادات اور غرض و غایت کے لیے میں کسی کے لیے بھی کام کر سکتا ہوں۔ ثریا سے میری یہی ڈیلنگ تھی، مگر تم نے اسے غدار سمجھ لیا۔''

میں نے مکاری سے کام لے کر اسے بلف کیا تو بے اختیار وہ اپنی گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر آنکھ مار دی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز الجھن کے تاثرات گڈمڈ ہوتے دیکھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں نے دانستہ اس پر نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوتے کھنڈرے سے لہجے میں کہا۔

''محترمہ! اپنے آدمی سے بات کر لو، شکار کہاں پہنچایا

جائے مگر اس سے پہلے رقم کی بات کرلو۔ اسپیکٹر مرکا ٹاپ ایجنٹ کامران... پچیس لاکھ سے ایک روپیا کم نہیں۔"

"مم... میں تمہیں پچاس لاکھ دوں گا... مجھے چھوڑ دو۔"

"ویل گریٹ، یہ تو اچھی ڈیلنگ ہے۔" میں چٹخارے مار کے بظاہر خوشی سے بولا۔ کار ڈرائیو کرتی ہوئی بیگم صاحبہ نے شاید میری چالاکی بھانپ لی تھی، انہوں نے بیک ویو مرر سے سوالی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے انہیں آنکھ ماری۔ وہ میرا اشارہ بھانپ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے چڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"مگر یہ وعدے کی خلاف ورزی ہوگی۔ پھر کون ہم پر اعتماد کرے گا۔ ہم خود کو اتنا بکاؤ نہیں بنا سکتے۔"

"تم خاموش رہو محترمہ! مجھے ڈیل کرنے دو۔" میں نے بیگم صاحبہ کو مصنوعی انداز میں ڈپٹا پھر کامران کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں مسٹر کامران! تم پچاس لاکھ کی بات کررہے تھے؟"

"پہلے میری مرہم پٹی تو کردو۔ مجھ پر نقاہت طاری ہورہی ہے، آہ..." وہ کراہا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو روڈ کے کنارے کار کھڑی کرنے کا کہا پھر نیچے اتر کر ڈکی کھولی اور اندر سے ایک چوکور باکس نکال لیا۔ پستول میں بیگم صاحبہ کو تھما آیا تھا۔ بیگم صاحبہ کار سے اتر کر اس پر پستول تانے کھڑی تھیں۔

میں نے اس کی مرہم پٹی کردی۔ گولی بازو میں پیوست تھی۔ وہ میں نہیں نکال سکتا تھا جبکہ دوسری گولی گھٹنے کو بری طرح ترخا کر "چھو" ہوگئی تھی یعنی نکل گئی تھی۔

بہرحال سردست یہی کافی تھا کہ جریان خون بند ہوگیا تھا۔ کچھ گولیاں کامران نے خود ہی اس میں سے نکال کر پھانک لی تھیں۔ پانی کی دو بوتلیں تھیں، میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، سڑک دور تک ویران تھی، کوئی اکا دکا گاڑی زناٹے سے گزر جاتی۔ میں نے کامران کی کنڈیشن کا جائزہ لیا، اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس کی سانسیں بھی تیز چل رہی تھیں۔ میں نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا تاکہ اسے کچھ ہوا لگے۔ اس کے منہ سے بوتل لگا کر میں نے اسے پانی بھی پلایا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی، اس اثنا میں بیگم صاحبہ نے ہولے سے کہا۔

"شہزی! اس کی تلاشی تو لو، مجھے سیل فون کی اشد ضرورت ہے۔" میں نے ان کی معقول بات پر اپنی بھویں اچکائیں۔ تلاشی لینے پر کئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس کی گھڑی بھی اتار لی جس پر مجھے واچ ٹرانسمٹر کا گمان تھا۔ اس کے کان سے چپکا ہوا خفیہ ٹرانسمٹر بھی اچک لیا۔ کچھ چابیاں بھی، پرس اور سیل فون برآمد ہوا۔

سیل فون دیکھ کر بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ وہ انہوں نے فوراً میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور ایک نمبر پنچ کرنے لگیں۔

"ہیلو، نبیل! میں بول رہی ہوں۔ تم لوگ کہاں ہو؟ خیریت سے ہو؟ او... شکر ہے خدا کا۔ میں بھی خیریت سے ہوں۔ شہزی نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، تم سب بے فکر رہو، میں بالکل ٹھیک ہوں اور شہزی کے ساتھ ملتان روڈ سے واپس پہنچ رہی ہوں۔ شاید سابیوال سے آگے ہیں ہم... نہیں، تم لوگوں کو ادھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ بھی ملتان پہنچو... ہرگز نہیں... تمہیں بھی میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا حکم ہے... کون؟ اول خیر، اچھا... ہاں... دو اسے فون۔"

اول خیر کے ذکر پر میں چونکا۔ بیگم صاحبہ نے اس سے ری باتیں کیں پھر میری جانب فون بڑھا دیا۔ میں نے بے قراری سے فون لیا اور ہیلو کہا۔

"او... خیر کا کا! بڑا پا مارا ہے تو نے یار، کیسا ہے تو؟ ٹھیک تا ہے؟" دوسری جانب سے اس کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں ٹھیک ہوں اول خیر... باقی تفصیلی باتیں ملتان پہنچ کر کرتے ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے میں بتا دیتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ میرے یار۔"

اس کے بعد میں نے سیل اپنی جیب میں رکھ لیا اور بیگم صاحبہ کو بتا دیا۔ ملتان پہنچ کر ہمارا گزر نواں چوک سے ہوگا۔ وہاں نبیل دادا وغیرہ ہمارے منتظر ہوں گے پھر ہم سب ان کی معیت میں بیگم ولا پہنچے۔

میں کامران کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ہنوز نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ میں نے دو تین بار اسے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ ایک روڈ سائڈ پمپ اسٹیشن سے ہم نے فیول ڈلوایا۔ اس کے بعد روانہ ہوگئے۔

میرا ارادہ اب بدل گیا تھا۔ میں ملتان پہنچ کر ریاض باجوہ سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کامران کو ان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بتا پہنچنے کی کوشش کی تو تھی مگر اس میں لمبا چوڑا گھڑاگ تھا۔ تاہم میں ایک تجربہ

ضرور کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ثریا کی فکر تھی۔ فیول ڈلوانے کے بعد ہم پھر روانہ ہو گئے۔

"تم ڈیلنگ کی بات کر رہے تھے۔" تھوڑی دور جانے کے بعد کامران کی نقاہت بھری آواز ابھری۔ میں ذرا چونکا۔ بیگم صاحب کی توجہ کار ڈرائیو کرنے پر مرکوز تھی۔

"میں ثریا کے بغیر ڈیلنگ نہیں کروں گا۔" میں نے باآخر مسکت جواب دیا۔

"ثریا کو بھول جاؤ۔" وہ حتمی لہجے میں بولا تو میں نے بھی سرد مہری سے کہا۔ "تمہارے پاس آدھا پون گھنٹا ہے فیصلہ کرلو، ورنہ میں تمہیں پی ایس ایس والوں کے سپرد کر دوں گا۔" میرا جواب خاصا کاری ثابت ہوا وہ جھلا کر بولا۔

"آخر تمہیں ثریا سے کیا لینا دینا ہے، اب تم براہ راست میرے ساتھ معاملات طے کر سکتے ہو۔" اس کی مکاری پر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میرے کچھ اصول ہیں۔ میں ان کے مطابق چلتا ہوں۔ ثریا سے میرے کئی معاملات ادھورے ہیں۔ پہلے مجھے اس کے بارے میں پتا چلنا چاہیے۔ بصورت دیگر اگر تم نہیں مانتے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ پاور والے خود ہی تم سے ثریا کے بارے میں اگلوا لیں گے۔"

"تم پاور سیکرٹ سروس والوں کے متعلق جانتے بھی ہو، وہ ہیں کون؟" اس نے پینترا بدلا۔

"مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے اپنے مال سے مطلب ہے۔" میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔ وہ کار کی سیٹ سے سر ٹکائے میری جانب ذرا گردن موڑ کر بولا۔

"پاور والے اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ وہ کسی زرخرید کو اپنے حکم کا غلام بنائیں۔ تم ان کے باقاعدہ ایجنٹ ہو اور تمہاری اب تک کی کارکردگی سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم پی ایس ایس کے سپر ایجنٹ ہو یا پھر ڈیلٹا ایجنٹ۔"

"ڈیلٹا ایجنٹ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہ غور جانچتی ہوئی نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"یا تو تم دانستہ انجان بن کر مکاری کر رہے ہو یا پھر میرا شبہ درست ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم تم کہنا کیا چاہتے ہو۔" میں نے مختصراً تلخ لہجے میں کہا اور دانستہ بیزار نظر آنے لگا۔

"اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ پی ایس ایس درحقیقت انٹر سروسز والوں ہی کی ایک ذیلی خفیہ سروس ہے۔ جسے جدید خطوط پر استوار کیا گیا ہے۔ یہ عام لوگوں میں گھل مل کر ان کی سائیکی جانچتے ہیں اور پھر اپنی کسوٹی پر کسی کو پرکھ کر ان سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کا غیر متعلقہ ایجنٹ ہوتا ہے جنہیں اپنی اصطلاح کے مطابق یہ ڈیلٹا ایجنٹ کہتے ہیں۔"

میں اس کی انفارمیشن پر چونکا۔ لامحالہ میرا خیال اپنی طرف اور میجر ریاض کی طرف چلا گیا۔ گویا پاور والوں نے مجھے ڈیلٹا ایجنٹ بنایا ہوا تھا۔ میں نے پھر بظاہر بیزار کن لہجے میں کہا۔ "مجھے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔" کامران بولا۔ "پاور والے بسا اوقات اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر کرمنل لوگوں سے بھی کام لینا اچھی طرح جانتے ہیں۔" اس کی بات پر میں چونکا۔ گویا میرا پھینکا ہوا ترپ کا پتا ٹھیک پڑا تھا۔ وہ مجھے کوئی کرمنل ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے دانستہ معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

"اب جب تم مجھے سمجھ ہی گئے ہو تو پھر معاملے کی بات کیوں نہیں کر لیتے۔"

"میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔" وہ بولا۔ "تم نے سلور اسٹالون کی فلمز فرسٹ بلڈ اور جون ریمبو نہیں دیکھیں۔ اس میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ امریکی ملٹری انٹیلی جنس، جان ریمبو کی بہادری، دلیری اور شجاعت سے معمور جذبے کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ان کا ایک خطرناک قیدی ہوتا ہے۔ مشن مکمل کرنے کے بعد وہ اسے دوبارہ جیل میں ڈال دیتے ہیں بلکہ ایک دو بار تو اسے بدنامی سے بچنے کے لیے ہلاک کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کیونکہ عالمی پلیٹ فارم پر امریکی خفیہ فورسز کی بدنامی ہو رہی تھی اور ان کا یہ راز فاش ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے مفادات کے لیے اپنی جیلوں میں قید خطرناک جرائم پیشہ قیدیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر پُرتشدد اور غیر انسانی مہم پر روانہ کرتے ہیں۔"

وہ اتنا بھونکنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے میں اس کی لغو بیانی کو بھونکنا ہی کہوں گا۔ بے شک امریکا میں یہ ہوتا ہو لیکن یہاں یقیناً ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں بھی عام لوگوں کی نظروں میں کرمنل تھا مگر جاننے والے میری حیثیت جانتے تھے کہ میں ایک امن پسند، صلح جو اور محب وطن پاکستانی تھا۔ پاور والوں نے ایسے ہی میرا انتخاب نہیں کیا تھا اور اس کی بھی ایک ٹھوس وجہ تھی، جس کے مطابق انہیں چودھری ممتاز کے بارے میں علم ہو چکا ہوگا نیز یہ بھی کہ میری

اس سے کس نوعیت کی ذاتی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ تاہم کامران میرے بارے میں جیسا سوچ رہا تھا وہ میرے مفاد میں ہی تھا۔ میں اس کی باتوں کی نفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے بارے میں اس کا یہ مغالطہ میرے حق میں تھا۔ لہٰذا اپنا پرانا سوال دہرایا۔ ''معاملے کی بات کرو اور ثریا کو میرے حوالے کرو۔''

''وہ مر چکی ہے۔'' اس نے سفاکی سے کہا۔ میرے دماغ میں دھواں بھرنے لگا۔ ایک ہوک سی اٹھی مگر میرا دل اس کی بات پر یقین کرنے کو نہیں چاہا۔ لہٰذا اسی بے پروائی سے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جانو اور پاور والے...'' یہ کہتے ہوئے میں نے بیگم صاحبہ سے کہا ''ہم کتنی دیر میں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں گے؟''

بیگم صاحبہ بظاہر خاموشی سے کار ڈرائیو کر رہی تھیں مگر میں جانتا تھا وہ بڑے غور و خوض سے ہماری باتیں سن رہی ہوں گی اور میری چنتر بازی پر دل ہی دل میں مسکرا بھی رہی ہوں گی۔ جواباً مختصراً بولیں۔ ''پہنچنے ہی والے ہیں۔''

''ہوں، گڈ۔'' میں نے ایک لمبی ہنکاری بھر کر دوبارہ... مطمئن انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا مگر ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے کامران کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے الجھن آمیز پریشانی کے علاوہ جھلاہٹ کے آثار بھی محسوس ہوئے۔

''میرا خیال ہے مجھے پاور والوں کو مطلع کر دینا چاہیے۔'' یہ بڑبڑاتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے کامران کا سیل فون نکال لیا اور یونہی نمبر پنچ کرنے لگا۔ ''مجھے ہاٹ لائن نمبر یاد ہے۔ تمہارا سیل فون خوب کام آرہا ہے۔'' میں نے دانستہ کامران کی بے بسی اور جھلاہٹ کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو... ٹھہرو... ایک منٹ۔'' وہ یک دم بولا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ چمکی۔

''ثریا زندہ ہے۔ میں تم سے تعاون کرنے پر تیار ہوں۔'' ہانا آخر وہ بولا۔

''اب میں تم پر بھروسا نہیں کرسکتا، تم کہہ رہے تھے کہ ثریا مرگئی ہے اور اب تم بتا رہے ہو کہ وہ زندہ ہے، میں تمہاری کون سی بات کا اعتبار کروں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''میں سچ بول رہا ہوں ثریا زندہ ہے۔'' مجھے اس کا لہجہ جھوٹ کی چغلی کھاتا محسوس نہیں ہوا۔ ثریا کے زندہ ہونے کی خبر پر میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

''اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟''

''پہلے معاملے کی بات کرو۔''

''معاملے ہی کی بات کر رہا ہوں۔ ثریا کے بغیر ہمارے درمیان کوئی معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

''میں ثریا کو تمہارے سامنے پلیٹ میں ڈال کر پیش نہیں کرسکتا۔ وہ قید میں ہے اور سخت پہرے میں ہے۔''

''میں خود اسے چھڑا لوں گا تم صرف مجھے سچ سچ بتاؤ گے کہ اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟ مگر یاد رکھنا ثریا کو حاصل کرنے تک تم میری قید میں رہو گے اور اگر تمہاری بات جھوٹ ثابت ہوئی اور ثریا مجھے مطلوبہ جگہ نہ ملی تو یاد رکھنا پاور والے بعد میں تمہارا جو حشر کریں گے سو کریں گے، میں تمہیں ایسی بھیانک اذیتوں سے دوچار کروں گا کہ...'' میں نے اسے آخر میں تہدید کرنا چاہی تھی مگر وہ میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولا۔

''اشتاد و نجامت اور شہزی، ممتاز خان پر چھوٹی موٹی فتوحات حاصل کرکے یہ مت سمجھ لینا کہ تم نے بڑا پالا مار لیا ہے کیونکہ تم نہیں جانتے وہ تمہاری کس طرح درونِ خانہ جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ وہ اسٹیبلشمنٹ میں اپنی اچھی خاصی حیثیت قائم کرچکا ہے۔ وہ تمہاری اہم کمزوری سے بھی واقف ہے۔ بہت جلد تم اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

اس کی بات پر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ دماغ میں دھواں بھرنے لگا۔ میری ایک ہی کمزوری تھی اور وہ تھی عابدہ۔ اگرچہ ثریا نے بھی اس سلسلے میں مجھے کچھ اشارہ دیا تھا اب کامران کی اس بات سے وہ اشارہ مجھے مماثلت زدہ محسوس ہوا تو میں اندر سے بے قرار اور متوحش سا ہوگیا مگر مجھے تسلی بھی تھی کہ یہ محض گیدڑ بھبکی تھی۔ عابدہ امریکا کے اسپتال میں فاخرہ کے علاج کے دوران بالکل محفوظ تھی اور سرمد بابا اس کی پل پل کی خبر لے رہے تھے۔ یکبارگی میرے ذہن میں کامران کے سیل فون پر عابدہ سے بات کرنے کا خیال آیا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے اوپر تلے پیش آرہے تھے کہ مجھے عابدہ یا سرمد بابا سے دوبارہ بات چیت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا مگر ابھی میں نے عابدہ سے بات کرنے کے اپنے اس ارادے سے خود کو باز ہی رکھا۔

''تم کیا بکواس کر رہے ہو، میں نہیں جانتا... مجھے ثریا کا پتا بتاؤ۔''

"تم اگر مجھ سے تعاون کرو تو میں تمہیں اسپیکٹرم میں شمولیت دلوا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "یہی نہیں تمہاری ممتاز خان سے بھی صلح صفائی کروا دی جائے گی۔"

"مجھے ثریا کا پتا... بتاتے ہو یا نہیں؟" میں نے اپنے اندر کی جلتی سلگتی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، تم مجھے پاور والوں کے حوالے کر دو۔" وہ پورے سکون سے بولا۔ "مگر یاد رکھنا... اسپیکٹرم کی ابتدا امریکا ہی کی سرزمین سے پھوٹی ہے اور ممتاز خان اسپیکٹرم کا کیسا ایجنٹ ہے۔ یہ بھی مت بھولو کہ اس وقت تمہاری معشوقہ دریہ نہ امریکا ہی کے ایک اسپتال میں موجود ہے۔"

"گاڑی روکو..." میں حلق کے بل دھاڑا۔ بیگم صاحبہ نے فوراً کار کو سڑک کے کنارے کرکے بریک لگا دیا۔ کامران وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ میرے دل و دماغ میں آتشیں جنوں خیزی کی لہریں گرم لاوا کی طرح بھر گئیں۔ کار رکتے ہی میں نے کامران کی طرف والے دروازے پر زوردار لات رسید کر دی۔ دروازہ کھلا تو دوسری لات میں نے کامران کو بھی جڑ دی۔ وہ چیخ مار کر کار سے باہر تارکی میں لڑھک گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے جمپ لیا اور باہر کودا۔ پھر خاک چاٹتے ہوئے کامران کو دبوچ لیا اور اس پر جنونیوں کے سے انداز میں تابڑ توڑ گھونسے، ٹھوکریں اور لاتیں برسانا شروع کر دیں۔ وہ اذیت ناک انداز میں چیخنے چلانے لگا۔ بیگم صاحبہ نے کار سے اتر کر میرے بپھرے ہوئے وجود کو سنبھالا دینے کی کوشش میں تھام لیا۔ "ہوش کرو شہزی! پلیز اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ مار دو گے اسے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ میرا غیظ قدرے کم ہونے لگا تو میں نے دھیرے سے بیگم صاحبہ کو ہٹا کر نڈھال اور ہانپتے کراہتے کامران کو دبوچ کر دوبارہ کار کے اندر پھینکا اور اپنا پُرغیظ چہرہ اس کے قریب لے جا کر خوفناک لہجے میں بولا۔ "میں تجھے کتے کی موت ماروں گا، بتاؤ مجھے... تم لوگ عابدہ کے خلاف کون سی سازش تیار کر رہے ہو؟ کامران! تمہیں اب بتانا پڑے گا... ورنہ..."

"م... میرا وعدہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔" وہ کراہ کر بمشکل بولا۔ "ل... لیکن مجھے پاور والوں کے حوالے مت کرنا۔"

اس دوران بیگم صاحبہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بولیں۔ "ہمیں نکلنا چاہیے شہزی! دیر ہمارے لیے مناسب نہ ہوگی۔"

میں نے ان کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ انہوں نے گیئر ڈال کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اول خیر وغیرہ نے نواں چوک کو مقام اتصال بتایا تھا مگر وہ ہمیں قادر پور کے قریب مل گئے، وہ اور ان کے باقی ماندہ ساتھی ایک کار اور جیپ میں سوار تھے۔ بیگم صاحبہ کو زندہ سلامت میرے ساتھ پا کر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا تھا۔ اول خیر بڑے پرتپاک انداز میں مجھ سے ملا تھا جبکہ کمیل دادا محض سرسری انداز میں... وہ مجھ سے ناخوش نظر آ رہا تھا۔ ملتان کی جانب ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ملتان پہنچ گئے، اور پو پھٹنے تک ہم بخیریت بیگم ولا پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

اول خیر اور بیگم صاحبہ سمیت سارے ساتھی میری بہادری کی تعریفیں کر رہے تھے اور مجھ سے بہت خوش تھے مگر کمیل دادا ایک واحد آدمی تھا جو میری اس کامیاب مہم کو بار بار "رسکی" قرار دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا میں نے جنگل ڈیرے میں جذباتی ہو کر جو درانہ وار قدم اٹھایا تھا وہ بیگم صاحبہ کی جان کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا، وغیرہ۔

اول خیر نے دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی۔ ورنہ وہ میرے حق میں بولتا ضرور تھا۔

ہم کھانا پینا کر کافی دیر تک آرام کر چکے تھے۔ کامران کو تہ خانے میں جنگی خان کے ساتھ قید کر دیا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ نے میری حمایت میں کمیل دادا سے کہا۔ "شہزی نے جو کچھ کیا وہ حالات کے بالکل متقاضی تھا۔"

"مگر بیگم صاحبہ! ہم سب وہاں موجود تھے اور دشمنوں پر حاوی ہونے والے تھے، ایسے میں شہزی کو سوچ سمجھ کر مجھ سے مشورہ لے کر قدم اٹھانا چاہیے تھا۔" کمیل دادا بولا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

"جھوٹ مت بولو کمیل دادا! وقت سے پہلے ہی جنگل ڈیرے میں بابن ڈکیت کے کارندوں کو ہماری آمد کا پتا چل چکا تھا۔ انہوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ ہم پسپا ہونے لگے تھے۔ خود تم دشمن کی کچھار میں پیش قدمی کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ ایسے میں مجھے بیگم صاحبہ کو چھڑانے کے لیے اپنی جان پر کھیلنا پڑا۔"

"اس میں بھی تمہاری ہی غلطی تھی۔" کمیل دادا برہمی

سے بولا۔ ''بابن ڈکیت پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے تم نے ایک نئی پسوڑی ڈال دی تھی۔ تمہیں کیا ضرورت تھی ممتاز خان کی گاڑی کو ٹریپ کرنے کی، تم اور اول خیر اس مشن میں ناکام ہو گئے اور ممتاز خان بچ نکلا۔ یوں بابن ڈکیت اور اس کے مسلح ساتھی ہوشیار ہو گئے۔''

اب اول خیر خاموش نہ رہ سکا، بولا۔ ''بڑے استاد! شہزی کی یہ پلاننگ درست تھی کیونکہ ہمارے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ممتاز خان بھی وہاں پہنچنے والا ہے اور اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے وہ بیگم صاحبہ پر تشدد کا راستہ اختیار کرنے والا ہے۔ ہم ممتاز خان کو یرغمال بنا کر بیگم صاحبہ کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہتے تھے، بے شک ہمیں اس سلسلے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن جلد ہی اس کا ازالہ شہزی نے اپنی جان پر کھیل کر کیا کیونکہ اس وقت حالات ہی خطرناک رخ اختیار کر چکے تھے۔''

لاجواب ہوتے ہی کھیل دادا نے اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر بے چارے اول خیر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تم تو خاموش ہی رہو اول خیر، تم پر سے ابھی غداری کا لیبل نہیں اترا۔ پہلے اپنا داغ دھونے کی فکر کرو پھر تم شہزی کی وکالت کرنا۔'' ایسے میں اول خیر چپ ہو جاتا تھا تاہم اس بار وہ فقط اتنا ضرور بولا۔

''میں بیگم صاحبہ سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔'' اول خیر تو بے چارہ ایسے میں اتنا ہی کہہ پاتا تھا مگر میں کھیل دادا کے سامنے ہمیشہ خم ٹھونک کر جوابی کارروائی کرتا تھا۔ مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ وہ اندر سے سخت حسد اور جلاپے کا شکار ہو رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے سلسلے میں اسے شروع ہی سے مجھ سے ذاتی عناد اور بغض ہونے لگا تھا۔ میں نے کھیل دادا کی طرف دیکھ کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''کھیل دادا! تمہارے اس کینہ پرور کردار اور سلوک نے تمہیں خود اپنے آدمیوں کی نظروں میں چھوٹا کر دیا ہے۔ کیا یہ موقع ایسی باتوں کا ہے؟ اول خیر نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر تن تنہا... بیگم صاحبہ کی تلاش کا بیڑا اٹھایا تھا اور چک نواں پہنچ کر ہمیں یہ اطلاع دینے والا بھی اول خیر ہی تھا کہ بیگم صاحبہ کو اس وقت بدر اقبال عرف بابن ڈکیت نے یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''اس بحث کو اب ختم کرو۔'' معاً بیگم صاحبہ نے اپنا ایک ہاتھ قدرے بلند کر کے گمبھیر اور تحکمانہ لہجے میں کہا تو سب کو چپ لگ گئی گویا ہم اس مہم کی کامیابی و ناکامی کے سر ہونے کا فیصلہ سننے کے منتظر ہو گئے۔

''تم لوگ لاحاصل بحث کر رہے ہو جبکہ ہم اب تک حالت جنگ میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے اور شہزی کے ساتھی پولیس کی قید میں ہیں۔ اس راشی خور پولیس افسر روشن خان نے نہ جانے ان کا کیا حشر کر رکھا ہو۔ ہمیں ان کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔'' بیگم صاحبہ کی بات اپنی جگہ درست سہی مگر مجھے تھوڑی حیرت سی ہوئی کہ انہوں نے ایسا کوئی اعتراف کرنے کی جسارت کیوں نہ کی جس سے یہ تو ظاہر ہوتا کہ بیگم صاحبہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے والی یہ خطرناک مہم کس کے سر تھی؟ مجھے اپنی داد و واہ کی کوئی پروا نہ تھی مگر میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ کم از کم بیگم صاحبہ اول خیر کے سلسلے میں کچھ حوصلہ افزا کلمات تو ضرور ادا کرتیں۔ اول خیر مجھ سے دوستی یاری کی پاداش میں مسلسل کھیل دادا جیسے بغضی آدمی کے زیر عتاب آتا رہا تھا۔ مجھے بیگم صاحبہ کے اس دوغلے پن پر دکھ ہوا تھا۔ تاہم میں نے سردست خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

ارشد، شوکت حسین اور شکیلہ کے سلسلے میں مجھے تشویش آمیز فکر تھی۔ یوں تو ریاض باجوہ صاحب نے مجھے نہ صرف ان کے بلکہ میرے سلسلے میں بھی تسلی دی تھی کہ وہ ہائی کمان سے اپنے تفویض شدہ خصوصی اختیارات کے ذریعے اس سلسلے میں کچھ کرنے والے تھے، میجر صاحب کا خیال آتے ہی میں نے ذہن میں فوری ابھرنے والے ایک خیال کے تحت فیصلہ کیا کہ کامران کو اسپیکٹرم کے ایک ٹاپ ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے حوالے کر دوں۔ اب وہی کامران کے منہ سے بہت سی باتیں اگلوانے کی جسارت کر سکتے تھے۔ یوں بھی یہ ان کا شکار تھا۔ اس طرح مجھے پی ایس ایس کی خصوصی سپورٹ حاصل رہتی۔ کیونکہ میں گزرتے وقتوں کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے اردگرد بھانت بھانت کے خطرناک دشمنوں کا گھیرا وسیع تر ہوتا جا رہا تھا مگر کامران کا وعدہ یاد آتے ہی کہ وہ مجھے سب کچھ بتانے پر راضی تھا بشرطیکہ میں اسے پاور والوں کے حوالے نہ کرتا۔ یہ سوچ کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اول خیر کو مخاطب کر کے بولا۔ ''آؤ ذرا میرے ساتھ... میں کامران سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں۔''

''بیٹھ جاؤ شہزی! ابھی بیگم صاحبہ کا حکم نہیں ہوا۔'' مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر کھیل دادا ناگواری سے بولا تو میں نے اسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''بیگم صاحبہ کا احترام مجھ پر لازم ہے مگر یہ بات میں

پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں یہاں کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوں اور تم اپنی بزرہ سرائیوں کو بھی لگام دو گہیل دادا! آؤ... اول خیر۔"

"اول خیر اپنی جگہ سے ہٹے گا بھی نہیں۔" گہیل دادا طیش میں آکر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے میں تہ خانے میں چلا جاتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے قدم آگے بڑھایا تو بیگم صاحب نے گمبھیر آواز میں مجھے رکنے کو کہا۔

"ٹھہرو شہزی۔" میں رک گیا اور پُرمتانت نظروں سے بیگم صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اول خیر سے تحکمانہ کہا۔ "اول خیر! تم جاؤ... شہزی کے ساتھ۔" اس حکم پر اول خیر فوراً اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔

"شکریہ بیگم صاحب۔" میں نے ہولے سے کہا اور جاتے ہوئے گہیل دادا پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ بغض و کینہ کے باعث مسخ ہو رہا تھا۔

میں اور اول خیر تہ خانے میں آگئے۔ جنگی خان کی حالت ابتر تھی۔ اسے رسن بستہ حالت میں ایک طرف ڈالا ہوا تھا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ دوسری جانب کامران پڑا تھا۔ میں ایک کرسی پر جا کر براجمان ہو گیا اور پاؤں کی ٹھوکر مار کر کامران کو جگایا۔

"وقت ضائع کیے بغیر مجھے بتاتے چلو کیا کہنا چاہتے ہو تم..."

"پہلے مجھے ضمانت دو کہ تم مجھے چھوڑ دو گے۔" وہ غرانٹ لہجے میں بولا۔ اس کی بار بار قلابازیاں کھاتی باتوں سے میرا دماغ مارے طیش کے پھر بھنکنے لگا تھا۔ دانت پیس کر بولا۔

"اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا اور یاد رکھو اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔" پھر اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے کے لیے میں نے اپنی جیب سے اس کا سیل فون نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور آخر میں اسے تہدید بھی کر ڈالی۔ "اگر اب تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو پی ایس ایس والوں کو فون کر دوں گا، وہ تمہیں لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی پھر بولا۔

"یہ... کون سی جگہ ہے؟"

"غیر متعلقہ اور فضول سوال نہیں سنوں گا میں، صرف میری باتوں کا جواب دو گے تم۔" میں نے کہا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر بولا۔ "پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"تم نے عابدہ کے متعلق جو بکواس کی تھی اس میں کتنی حقیقت ہے؟"

وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "ممتاز خان تمہیں زیر کرنے کے لیے عابدہ کو ہٹ کرنا چاہتا ہے۔"

"کس طرح؟ وہ تو پاکستان میں نہیں ہے؟" میں نے بغور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اسپیکٹرم کے ذریعے۔"

"وہ کس طرح؟"

"اسپیکٹرم کے ایجنٹ ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ اسپیکٹرم کی شروعات امریکا سے ہوئی تھی؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، یہ وہاں کی ایک انڈر گراؤنڈ انٹرنیشنل سینڈیکیٹ ہے۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا، بولا۔ "یہ اسپیکٹرم ہے کیا بلا؟ اور یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" اس نے کہا۔ پھر ملتجی لہجے میں اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لیے مجھے پانی تو پلا دو۔"

"نہیں، پہلے سوالوں کے جواب دو۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم پھر چالاک بن رہے ہو، تمہیں اسپیکٹرم کی حقیقت کے بارے میں نہیں پتا؟ جبکہ تم اس کے ایک ٹاپ ایجنٹ ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے فقط یہی پتا ہے۔"

اس بار اول خیر نے اس سے پوچھا۔ "اسپیکٹرم... یہاں... ہمارے ملک میں کیا کر رہی ہے۔ یہاں اس کے کیا مقاصد ہیں؟ یہ تو تم ضرور جانتے ہو گے کیونکہ وہ تم جیسے کتوں کے گلے میں بلاوجہ پٹا نہیں ڈالے ہوئے ہے؟"

اول خیر کے اس سوال نے اسے کچھ بوکھلا دیا تاہم بولا۔ "ہمیں یہاں کی حکومتی اور غیر حکومتی سیاسی اتھارٹیز پر کڑی نظر رکھنے کا مشن سونپا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

وہ اول خیر کے اس "کیوں" کا جواب دینے کے بجائے بڑی مکاری سے پینترا بدل کر مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "شہزی! میں تمہیں ثریا کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

میں اس کی آئی کائی بھانپ کر غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔ "پہلے اول خیر کی بات کا جواب دو۔"

''وہ... وہ... مجھے ہلاک کر ڈالیں گے۔'' وہ گھگھیانے لگا۔

''زندہ تو ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔'' اول خیر نے اس کی طرف گھورا۔ تاہم میں نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کامران کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا۔

''اگر تم ہم سے تعاون کرو گے تو ہم تمہیں بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں بلکہ میں خود ایک ڈیلٹا ایجنٹ کی حیثیت سے پاور والوں سے تمہاری اس شرط پر سفارش بھی کروں گا کہ تمہارے مکمل تعاون کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ تمہارے تحفظ کو بھی یقینی بنائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھے اثر پذیری سے کھلتا محسوس ہوا پھر دوسرے ہی لمحے وہ بڑے متاسفانہ لہجے میں بولا۔

''کاش! میں نے ثریا کی بات مان لی ہوتی... کاش! میں اسے ان کے حوالے نہ کرتا۔''

''کون سی بات؟'' میں نے اس کے چہرے پر اپنی بھانپتی ہوئی نظریں مرکوز کیے ہوئے سکیڑ کر پوچھا۔

''اس نے میرا ضمیر جگانے کی کوشش کی تھی مگر مجھ پر عیش پرستی اور پرعیش زندگی کا خواب رنگیں سوار تھا۔''

''تو اب تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے؟'' اول خیر نے اس سے پوچھا تو وہ پُرتاسف لہجے میں بولا۔

''اب ضمیر جاگنے کا کیا فائدہ۔ مگر اس وقت میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ ثریا جو کچھ کہہ رہی تھی وہ کسی کمزور چڑیا کی حیثیت سے بڑھ کر نہ تھا۔ میں اسے بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ وہ چیونٹی بن کر ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے کی بے وقوفانہ کوشش کر رہی ہے۔ وہ بجز خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔''

''بات کمزور اور طاقتور کی نہیں ہوتی کامران، حوصلے اور ہمت کی ہوتی ہے جو تمہارے اندر نہیں۔'' میں نے اسے اکسایا اور اس کا خوابیدہ ضمیر جھنجوڑنے کی غرض سے بولا۔ ''دیکھو اب بھی کچھ نہیں بگڑا... ہم سے تعاون کرو... مجھے لگتا ہے اپیکزم والے اپنے کسی ناپاک اور گھناؤنے مقاصد کے لیے ہمارے وطن کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے یہاں وارد ہوئے ہیں۔''

''اپیکزم والوں کی حیثیت بھی کٹھ پتلیوں سے کم نہیں... ان کے پیچھے بھی کسی کا بہت بڑا ہاتھ ہے ایک خفیہ ہاتھ...'' کامران نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا تو میں اور اول خیر قدرے چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

''مجھے پانی پلا دو... میں اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا... سب بتا دوں گا۔'' وہ بولا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ کامران اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا۔

''یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ میں خود بھی اپیکزم کا ٹاپ ایجنٹ ہونے کے باوجود ان کی اصل حقیقت سے ناواقف تھا بلکہ میں کیا میرے جیسے دیگر ایسے مقامی آلۂ کار بھی ناواقف تھے ماسوائے چند بڑے تنظیمی عہدے داروں کے، جن میں ممتاز خان اور اسٹیشن چیف وزیر جان بھی شامل ہیں کہ ان کے اصل اغراض و مقاصد ہیں کیا... نیز اپیکزم کن کے لیے کام کر رہی ہے مگر یہ سب ثریا نے پتا چلا لیا تھا۔ جب ثریا کا پول کھلا تو اس نے مجھے ان کی اصل حقیقت بتائی بھی تھی مگر جانے کیوں میں نے اس کی باتوں کو اہمیت نہ دی، افسوس...'' وہ رکا پھر میری طرف تکتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا۔ ''شہزی! تم ایک کام کرو۔ میں... میں... یہاں غیر محفوظ ہوں۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا جو کچھ مجھے ثریا نے بتایا، اس کا دل بھی انہی باتوں کی وجہ سے اپیکزم سے کھٹا ہو گیا تھا، وہ باضمیر تھی۔ تم... مجھے پی ایس ایس والوں کی تحویل میں دے دو... پلیز... جلدی کرو۔'' اس کے چہرے پر اچانک انجانا سا خوف سمٹ آیا تھا۔ اس کے بارے میں میرا شبہ یکلخت تحلیل ہونے لگا۔ اس کا چہرہ، اس کا لہجہ غمازی کر رہا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے بالآخر جھنجوڑ ڈالا تھا۔ نیز اسے اس بات کا پچھتاوا بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس نے ثریا کے سلسلے میں جو کچھ کیا تھا وہ اسے نہیں کرنا چاہیے تھا اور یقیناً ثریا بھی پہلے اپیکزم کی کامران کی طرح ایک فعال رکن تھی مگر جیسے ہی اسے اپنی ذاتی کوششوں کے ذرائع سے اپیکزم کی اصلیت معلوم ہوئی تو وہ ان سے متنفر ہو گئی اور پھر بعد میں اس نے ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر بدقسمتی سے اس کا راز کھل جانے کے باعث کامران سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے کامران کو بھی ان کی اصلیت بتا کر اس کا ضمیر جھنجوڑنے کی کوشش کی ہوگی۔ ثریا نے جو کچھ کامران کو بتا کر اس سے مدد کی درخواست کی ہوگی، آج کامران کو اس پر پشیمانی ہو رہی تھی۔

اول خیر پانی لے آیا تھا مگر آتے ہی اس نے بتایا کہ اوپر بیگم صاحبہ مجھے بلا رہی ہیں۔ ممتاز خان کا فون آیا تھا اور وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

میں اس اطلاع پر چونکا اور سیدھا اوپر آ گیا۔ بیگم

صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ ممتاز خان کا فون تھا اور صاف لگتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کے بیچ ٹیلی فون پر گرما گرم گفتگو ہوتی رہی ہے۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری جانب سے ممتاز خان کی بھنائی ہوئی آواز ابھری۔

''شہزی! تم نے جتنی اونچی اڑان بھرنی تھی سو بھرلی۔ اب تمہیں زمین پر ہی آنا پڑے گا۔''

میں اس کی بات پر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''میں زمین پر ہی تھا ممتاز خان مگر تم آسمان پر اڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو بکواس کرنی ہے کرو... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''کامران کو تم نے کہاں رکھا ہوا ہے؟''

''میں تمہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔''

''میرا مطلب ہے اگر وہ ابھی تک تمہارے حوالے ہے تو اسے چھوڑ دو۔ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔''

میں اس کی بات پہ چونکا۔ وہ مکاری سے جاننا چاہتا تھا کہ اگر کامران ہمارے قبضے میں ہے تو اسے یقیناً بیگم ولا میں ہی رکھا ہو گا اور وہ یہاں اپنے وحشی یا وفادار کتوں کے ساتھ یہاں بلا بولنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے کسی بات کے ختم ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں ہے، رہی بات کامران کی تو جس کا شکار تھا، میں اسے ان کے حوالے کر چکا ہوں۔''

''وہ... تم پی اے سی کی بات کر رہے ہو؟''

''یقیناً۔''

''تم بہت پچھتاؤ گے شہزاد احمد خان! انہیں جانتے نہیں کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔''

''تیور دکھاتے ہی دیتے رہو گے یا پھر میں فون بند کر دوں...''

''چوبیس گھنٹے تمہیں دے رہا ہوں۔ کامران کو ہمارے پاس ہونا چاہیے... ورنہ تم عابدہ سے متعلق بہت بری خبر سنو گے۔ یاد رکھو شہزی! مت بھولنا کہ تم اسے امریکا بھیج کر محفوظ سمجھ رہے ہو۔''

عابدہ کے ذکر پر میرا دماغ الٹنے لگا۔ میں نے بھی شعلہ بار لہجے میں کہا۔ ''میں نے عابدہ کو امریکا... اس کے تحفظ کے لیے نہیں کی بیماری کی بھلائی کے لیے روانہ کیا تھا اور اس کی حفاظت کرنے والی ذات اوپر موجود ہے جس کے قبضے میں سب کی جان ہے۔ میں تو تمہیں پہلے صرف ایک بھونکنے والا کتا سمجھتا تھا اب پتا چلا ہے کہ تم خود بھی کسی کے زرخرید کتے بن چکے ہو مگر یاد رکھنا ممتاز خان! اگر عابدہ کا تم نے ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش کی تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم مجھ سے موت کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''صرف چوبیس گھنٹے... یاد رکھنا۔'' دوسری جانب سے ممتاز خان نے میری دھمکی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سرمد بابا کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری جانب سے ''ہیلو'' کی شناسا آواز ابھرتے ہی میں نے ایک گہری سانس لے کر سلام کیا تو وہ میری آواز پہچانتے ہی تشکر آمیز بے چینی سے بولے۔

''ش... شش... شہزی بیٹا! تم کیسے ہو؟ تم کہاں ہو؟ ٹھیک تو ہو ناں تم؟ تم نے مجھے خوش خبری بھی نہیں دی۔''

خوش خبری کی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ میری زندگی اب تک اتنے آلام و مصائب میں گھری ہوئی تھی کہ اب تو میرے لیے ''خوش خبری'' کا لفظ بھی اجنبی بن کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''بابا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور خیریت سے ہوں۔ مجھے آپ پہلے عابدہ کے بارے میں بتائیں وہ کیسی ہے؟ کب پاکستان لوٹ رہی ہے؟ عارفہ کا تو آپریشن ہو چکا ہے؟''

''بیٹا! وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ عارفہ کا کامیاب آپریشن ہو چکا ہے مگر ڈاکٹروں نے اسے بیڈ ریسٹ کا کہہ دیا ہے۔ عنقریب دونوں واپس وطن لوٹنے والی ہیں۔''

سرمد بابا کی بات سن کر میرے دل و دماغ میں سکون کی لہری سرایت کر گئی۔ ایک تو عابدہ کی طرف سے خیریت کی اطلاع مل گئی تھی دوسرے وہ جلد پاکستان لوٹنے والی تھی۔ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''بابا! آخری بار آپ کی عابدہ سے کب بات ہوئی تھی؟''

''شہزی بیٹا! میں تو روزانہ ہی بات کرتا ہوں دونوں سے۔ اکثر تو دن میں دو بار بھی۔ کیا تمہاری بات نہیں ہوئی؟''

''ایک بار ہوئی تھی بابا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''بڑی مشکلوں سے رابطہ ہوتا ہے، اسپتال کی منیجمنٹ سے کچھ تو امن وہاں سخت ہونے کے باعث مجھے بات کرنے کے سلسلے میں تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ بہت مختصر بات ہوئی تھی۔ اب کرتا ہوں۔''

''تم ہو کہاں پر بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں ملتان میں ہی ہوں اور بیگم ولا سے بول رہا ہوں۔ تب انہوں نے مجھے خوش خبری والی بات بتائی کہ

میرے اوپر جتنے بھی کیس تھے وہ ختم کردیے گئے تھے۔ ایک بڑے پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں جنگی خان سے خون ریز ناکرے کے بعد میں نے جن اغوا کاروں سے میجر باجوہ صاحب کے بیٹے کو چھڑایا تھا، نیز مذکورہ اسپتال میں نصب خفیہ سی سی کیمروں کے سامنے میں نے جس طرح جنگی خان اور اس کے مسلح کارندوں کی دہشت گرد کارروائی کو آشکار کرتے ہوئے اسے چودھری ممتاز خان کا مقرب خاص کارپرداز ظاہر کیا تھا وہ میڈیا کے سامنے آچکا تھا۔ لہٰذا اب حکومتی مشینری پر زور دیا جارہا تھا کہ جنگی خان جیسے خطرناک مجرم کو پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے رینجرز کے حوالے کردیا جائے، وغیرہ۔

مرد بابا نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی اطلاع بھی دی تھی کہ ایڈووکیٹ خانم شاہ بھی صحت یاب ہوچکی تھیں اور انہیں اس حقیقت کا علم ہوتے ہی کہ نیلم کوٹھی میں زبیر خان کے آدمی نارڈ کی گولی کا نشانہ بننے کے بعد میں ہی اسے اپنی جان پر کھیل کر اسپتال پہنچایا تھا اور اس کی جان بچ گئی تھی، اس نے میرے حق میں نہ صرف گواہی دی تھی بلکہ پیروی بھی کی تھی۔ یوں ان کی اور میجر باجوہ صاحب کی مشترکہ کاوشوں سے میری خصوصی طور پر بحالی ہوگئی تھی۔

گویا اب جنگی خان اور کامران کو میجر باجوہ صاحب کے حوالے کرنا از بس ضروری ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے مرد بابا سے جلد ملنے کا وعدہ کرکے رابطہ منقطع کردیا اور عابدہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر نہ ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے بیگم صاحبہ سے ساری حقیقت گوش گزار کردی۔ وہ میرے آئندہ کے لائحہ عمل سے مطمئن اور متفق نظر آرہی تھیں پھر وہ اپنے کاروباری و دیگر معاملات میں مصروف ہوگئیں جبکہ میں اول خیر کے ساتھ جنگی خان اور کامران کو ایک کار میں ڈال کر سیدھا رینجرز کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔

باجوہ صاحب بڑے پرتپاک انداز میں ہم سے ملے، پھر میں نے انہیں کامران سے متعلق ساری تفصیلات گوش گزار کیں تو وہ غور و فکر کا شکار ہوگئے۔ میں نے انہیں ثریا کے متعلق بھی بتایا کہ اسے اسمگلرز والوں کی قید سے چھڑانا لازمی ہوگا، مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقعات انہوں نے کامران سے پوچھ گچھ کے بعد مجھے دلائی تھیں۔ وہ خاصے پُرجوش نظر آرہے تھے اور میری فتوحات سے مسرور بھی تھے۔ مجھ سے انہوں نے الگ کمرے میں ایک مختصر اون ٹو ون ملاقات بھی کی اور مجھے ایک کارڈ بھی جاری کیا جس میں میری تصویر چسپاں تھی، یہ خصوصی اختیارات کا کارڈ تھا، یہ کارڈ حاصل کرکے مجھے پہلی بار ایک مکمل تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ نیز انہوں نے مجھے مختصراً ٹریننگ کرانے کے لیے وقت بھی مانگا تھا۔ میری یہ ٹریننگ پی ایس ایس کے خفیہ تربیتی کیمپ میں ہونا تھی جس میں جدید ہتھیاروں اور اسپائی آلات اور ڈیوائسز سے لے کے بھاری مشینری کا کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم بھی شامل تھا۔ نیز اس ٹریننگ کے بعد میری باقاعدہ رہائش گاہ اور تنخواہ بھی مقرر کرنا تھی، میں ایک والنٹیئر کی حیثیت سے "اعزازی" طور پر پی ایس ایس میں بھرتی کردیا گیا تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد کا کچھ اشارتی حوالوں سے مجھے پہلے ہی میجر صاحب بتا چکے تھے۔ نیز باقی معلومات مجھے پی ایس ایس کے خفیہ تربیتی کیمپ کے لیکچر سیشن میں بتانا تھیں۔ وہاں میجر سہیل عاطف سے ملاقات کرنا تھی۔ باجوہ صاحب نے مجھے کارڈ کے ایک کونے میں بنے مخصوص "چپ" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ درحقیقت ایک "سینسر چپ" ہے جس کے اندر میرا مکمل بائیو ڈیٹا مع میرے کارناموں کے محفوظ ہے۔ یہ کارڈ مجھے...... میجر سہیل عاطف کو دینا ہوگا۔

میرے لیے یہ سب کچھ خاصا سنسنی خیز تھا۔ مجھے لگتا تھا میری بھاگتی دوڑتی بے مقصد زندگی کو جیسے اب ایک نئی سمت ملنے والی تھی مگر بردست میں مذکورہ تربیتی کیمپ کو جوائن کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ کیونکہ ابھی مجھے... کچھ ذاتی...... سلسلے میں وزیر جان سے ملنا تھا اور اس کے منہ سے بہت کچھ اگلوانا تھا۔ آخر پتا تو چلتا میں کون ہوں؟ میرا باپ کون ہے؟ میری ماں کہاں ہے؟ ان سارے سوالوں کے جواب مجھے وزیر جان کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا لیکن بات پھر وہی آجاتی تھی کہ گویا ابھی میری جنگ ممتاز خان سے ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ اس کے ساتھ تو اصل جنگ اب شروع ہونا تھی، ایسے میں جبکہ ممتاز خان اور وزیر جان خود ہی ایک بڑی مجرم تنظیم کی پشت پناہی میں آکر خود کو زیادہ بااثر اور طاقتور سمجھنے لگے تھے، پھر عابدہ سے متعلق اس کی دھمکی بھی خالی از علت نہیں ہوسکتی تھی۔ وزیر جان کا معاملہ دوسرا تھا مگر وہ بھی مجھے ممتاز خان والے معاملے سے زیادہ گمبھیر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس میں اب زبیر خان کہاں فٹ ہونے والا تھا، یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ ایڈووکیٹ خانم شاہ سے ملنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ان سارے معاملات دگرگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں بھی اب اپنے سلسلے میں آگے کچھ...... کرتا اور خدا نے از خود ہی اس سلسلے

میں میجر باجوہ صاحب کی صورت یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ لہٰذا اب قلابازیاں کھاتے ہوئے میرے ذہن رسا میں یہی ارادہ پختہ ہونے لگا کہ مجھے اس والنٹیئر "شمولیت" کو ویلکم کہنا چاہیے اور کچھ دنوں کی ٹریننگ پر چلے جانا چاہیے۔

لہٰذا میں نے باجوہ صاحب سے سنجیدگی کے ساتھ اس سلسلے میں گفتگو کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ پی ایس ایس والوں کا وہ خفیہ تربیتی مرکز عام ٹریننگ کیمپوں سے قطعی مختلف ہے، وہاں ایمرجنسی اور جنگی بنیادوں پر ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بہرحال میں نے اس کی ہامی بھر لی۔ انہوں نے مجھے علی الصباح ہیڈ کوارٹر آنے کا کہہ دیا جہاں ایک بند وین میں مجھے مذکورہ تربیتی کیمپ لے جایا جانے والا تھا۔ اس کے بعد مجھے ڈیلٹا ایجنٹ سے کمانڈو کا درجہ دے دیا جاتا۔ باجوہ صاحب سے یہ تفصیلی معاملات طے کرنے کے بعد میں نے ان سے اپنے ساتھیوں ارشد، شوکی اور شکیلہ کی رہائی کے سلسلے میں درخواست کی تو انہوں نے اسی وقت آئی جی صاحب رحمان تیموری صاحب سے ہاٹ لائن پر رابطہ کیا اور مجھ سے حاصل کردہ مختصراً تفصیل ان سے متعلق انہیں گوش گزار کر دی۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد باجوہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی ان تینوں کے بارے میں پتا کر کے بتائیں گے۔"

میں نے مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اول خیر کو گیسٹ روم میں بٹھایا گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ بے چارہ وہاں اکیلا بیٹھا بور ہو رہا ہوگا۔

تھوڑی دیر گزری... تیموری صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے باجوہ صاحب کو ایک چونکا دینے والی اطلاع دی کہ ارشد وغیرہ سرے سے پولیس کے قبضے میں تھے ہی نہیں۔ یہ سن کر مجھے سخت تشویش ہوئی، میں سمجھ گیا اس میں چودھری ممتاز اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ روشن خان کی ضرور کوئی ملی بھگت ہوگی۔ مجھے شوکی اور بالخصوص شکیلہ سے متعلق ایک نئی پریشانی نے آ گھیرا اور میں سخت مضطرب نظر آنے لگا۔

تیموری صاحب سے بات کر کے باجوہ صاحب نے مجھ سے کنفرم کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"آر یو شیور... مسٹر شہزی کہ تمہارے ان تینوں ساتھیوں کو پولیس نے واقعی گرفتار کیا تھا؟"

میں نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ "باجوہ صاحب!... میں دشمنوں کی سازش سمجھ رہا ہوں کہ وہ کیا مغالطہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے تینوں ساتھیوں کو ڈپٹی روشن خان نے ہی گرفتار کیا تھا اور مجھے اس کا پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ اپنے خفیہ اور مذموم مقاصد کے لیے ان کی گرفتاری کو شو آف نہیں کرے گا۔"

"ہوں... خیر شہزی! تم فکر نہ کرو۔ ان کا جلد پتا چل جائے گا۔"

"میں اب چلوں گا باجوہ صاحب!" میں نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے ایک نئی اور پریشان کن بے چینی نے آن لیا تھا۔

میں اول خیر کے ساتھ نکلا تو وہ میرے چہرے کی تفکر آمیز پریشانی بھانپ گیا کار میں بیٹھتے ہی توصیفی لہجے میں بولا۔

"او خیر... کاکے، تو نے وڈی ٹور شور بنالی ہے۔ بڑے فوجی افسر تیرے دوست بن گئے ہیں۔ پر تو خاصا پریشان بھی نظر آ رہا ہے، آخر کیا بات ہے؟"

میں نے اسے اپنی پی ایس ایس میں شمولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا نہ ہی ٹریننگ کے متعلق... تاہم میں نے اسے ارشد وغیرہ کے تھانہ لاک اپ سے پُراسرار غیاب کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا وہ راتب خور کمینہ روشن خان ایسی حرکت کرے گا۔ شکر ہے اس روز تم اس کے ہتھے نہیں چڑھے تھے، ورنہ..." وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

"اول خیر... اب اس ڈپٹی روشن خان سے بھی فیصلہ کن دو دو ہاتھ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور چونکا اس وقت جب میں پولیس ہیڈ کوارٹر کے اندر اپنی جیپ لے جا کر کھڑی کر چکا تھا۔ اول خیر کو مجھ سے اس قدر تیزی کی توقع نہ تھی، وہ فطری طور پر ذرا بوکھلا سا گیا مگر پھر ہولے سے "او خیر..." کہہ کر چپ ہو رہا۔

مجھے کار سے اترتے دیکھ کر چند وردی پوش پولیس اہلکار میری طرف بڑھے مگر کسی نے بھی مجھ سے "اڑنے" کی جرأت نہ کی۔ ان کے بولنے سے پہلے ہی میں نے سنجیدگی سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔ "مجھے ڈپٹی روشن خان سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو تم صاحب سے؟" مخاطب نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہ میں ان کو ہی بتاؤں گا۔" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا تو وہ ہمیں عمارت کے اندر آفیسرز بلاک میں لے آیا اور برآمدے میں بچھی ایک لکڑی کی بینچ نما کرسی پہ ہمیں چھوڑ کر ڈپٹی روشن خان کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر

بعد وہ اہلکار لوٹا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''صاحب پوچھ رہے ہیں کہ آپ کو کس سلسلے میں ان سے ملنا ہے؟''

''تم نے انہیں بتایا نہیں کہ...''

''ظاہر ہے... میں بتا چکا ہوں۔'' وہ میری بات کاٹ کر سرد لہجے میں بولا۔ ''وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ملاقات کی وجہ جاننے کے بعد وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ تمہیں ملاقات کا وقت دیں یا نہیں۔'' اس کی بات سن کر میرا دماغ ایک لمحے کو بھنا کر رہ گیا۔ جی میں تو آئی کہ اس ٹٹو اہلکار کو پرے دھکیل کر دیدہ دلیری سے اس راشی اور راتب خور روشن خان کے کمرے میں جا گھسوں اور اس کا گریبان دبوچ کر اس کے غرور کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اس کی اوقات... یاد دلا دوں اور شاید میں ایسا کر بھی ڈالتا، اگر اول خیر... ٹٹو اہلکار کی بات پر میرے چہرے کے بگڑتے تاثرات بھانپ کر مجھ سے سرگوشی میں یہ نہ کہتا۔

''کاکا! ذرا ہولا رہ۔ تیری فتح اور رہائی نے اسے اس بوکس قسم کے غرور میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ اب ایسے سستے قسم کے ہتھکنڈوں سے اپنی تھڑی لولی برتری ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہے گا۔''

اول خیر کے ان دور رس جملوں نے جیسے میرے سینے میں کھولتے لاوے پر ٹھنڈا پانی کا کام دیا تھا اگرچہ یہ سرگوشی اول خیر نے میرے کان کے قریب کی تھی مگر ٹٹو اہلکار نے یہ سن لی تھی۔ ناک بھوں چڑھا کر اول خیر سے بولا۔

''یہاں صاحب کے خلاف کوئی غلط بات نہیں چلے گی۔ اپنے آنے کا مقصد بتاؤ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

اس کی بدتمیزی پر میں دانستہ اسے تاؤ دلانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔

''اپنے صاحب سے جا کر کہہ دے... ہم ان تینوں قیدیوں سے ملنا چاہتے ہیں جنہیں اس نے اپنی روایتی پولیس گردی دکھاتے ہوئے بیگم ولا سے غیرقانونی دھاوے کے بعد گرفتار کیا تھا۔''

''شٹ اپ... بکواس بند کرو اپنی...'' ٹٹو اہلکار نے میری طرف گھورتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا تو جواب میں، میں نے بھی اسی لہجے میں چڑھتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کے کہا۔

''زیادہ بدتمیزی کی جرأت اب مت کرنا... تمہارے اور تمہارے صاحب کے کالے کرتوت میڈیا میں آچکے ہیں اور اس وقت بھی میڈیا کی خفیہ آنکھ تمہیں کہیں سے گھور رہی ہے... جن کی نگاہ میں قانونی حیثیت معتبر ہی نہیں مستند بھی ہو چکی ہے، جاؤ... جو کہا ہے وہ کرو۔''

ٹٹو اہلکار کی اکڑفوں رخصت ہونے لگی۔ بھلا اس پرائیویٹ میڈیکل سینٹر والے خون ریز معرکے اور میری خصوصی ضمانت، میڈیا کی حمایت اب کہاں ڈھکی چھپی رہی تھی۔ وہ فوراً پلٹا اور کمرے میں غائب ہو گیا۔

''او خیر... کاکا، تو نے تو اس کی پتلون ہی گیلی کر دی مگر پھر بھی ذرا ہتھ ہولا رکھ... یہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہے۔'' اول خیر نے پھر سرگوشی کے سے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے ڈپٹی روشن خان کے کمرے کی طرف نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔

''اول خیر... ان لوگوں نے بہت پولیس گردی کر لی اب میری باری ہے۔''

''او خیر...'' وہ ہولے سے بولا پھر شاید خودکلامیہ بڑبڑایا۔ ''لگتا ہے آج پھر کوئی نیا رونا پڑنے والا ہے۔'' وہ ٹٹو اہلکار دوبارہ واپس آتا دکھائی دیا۔ میری بھانپتی نظروں نے دور سے ہی اس کے چہرے کو تاڑ لیا۔ وہ اب خاصا بجھا ہوا نظر آ رہا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی ''اکڑ'' کے غبارے سے جو ہوا نکالی تھی، لگتا تھا شاید روشن خان نے دوبارہ اس کے اندر بھر دی تھی۔ لہٰذا قریب آ کے گردن اکڑا کے بولا۔

''صاحب کو ایسے کسی قیدیوں کا علم نہیں ہے اور انہوں نے آپ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ دونوں جا سکتے ہو۔''

میں نے مارے طیش کے دانت پیس لیے اور روشن خان کے کمرے کی طرف قدم بڑھانا چاہا تھا کہ اول خیر نے مجھے روک دیا۔ ''چل اوئے کاکے... کوئی نئی پسوڑی نہ ڈال دینا... ابھی چھوڑ بعد میں دیکھتے ہیں، آ...''

وہ مجھے بازو سے تھامے برآمدے سے باہر راہ طے میں لے آیا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔

''یہ کھلی پولیس گردی ہے۔ قانون کی آڑ میں یہ دشمنی کی واردات کو تحفظ دے رہے ہیں... ہمارے تینوں ساتھی یرغمال بنا لیے گئے ہیں اور ہمیں یہ بھی نہیں پتا کہ وہ خدانخواستہ زندہ بھی ہیں یا... نہیں۔''

میں کار کے قریب آتے ہوئے بپھرے ہوئے لہجے میں بولا تو اول خیر نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والا دروازہ کھول کر مجھے اندر سوار کرا دیا اور خود جلدی سے اسٹیئرنگ سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد کار اسٹارٹ کر

کے آگے بڑھا دی۔ ہیڈ کوارٹر کے وسیع و عریض احاطے سے نکلتے ہی اول خیر نے کہا۔

''کاکے! پریشان نہ ہو۔ اگر زہر کو زہر ہی کاٹتا ہے تو یہی سہی۔ ہم بھی اس رذیل صفت راتب خور روشن خان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گے۔''

میں اس کی بات سن کر چونکا۔ ''کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو اول خیر، جو میں سوچ رہا ہوں؟''

''او خیر، اب تیرے ساتھ رہتے ہوئے ذہنی ہم آہنگی تو آئے گی نا...'' وہ مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''روشن خان جس طرح تاریکی میں پولیس گردی دکھاتا ہے تو ہم بھی راتوں میں قانون کے ایسے جعلی رکھوالوں کے لیے بہت اعلیٰ درجے کے بدمعاش ثابت ہوں گے، وارداتیں ہونے دے اس کے گھر پر چڑھائی کریں گے، ایسے تو ایسے ہی سہی۔''

''واہ... اول خیر، جیو میرے یار۔ تم نے میری نس نس میں جوش دوڑا دیا۔'' میں نے لمبی ہنکاری بھر کے کہا پھر اچانک مجھے باجوہ صاحب کا خیال آیا۔ عقل نے ترغیب دی کہ اس سلسلے میں باجوہ صاحب سے ضرور بات کرنی چاہیے کہ ڈپٹی روشن خان کس دھڑلے سے اپنی وردی کا غلط استعمال کر رہا تھا، ممکن ہے روشن خان کے خلاف ان کے ذہن میں کوئی کلیو ہو اور وہ اسے بروئے کار لاتے ہوئے اسے ایسا سبق سکھائیں جو اس کی تنزلی پر منتج ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اسی وقت سیل فون سے باجوہ صاحب کی ہاٹ لائن پر ان سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورتِ حال گوش گزار کر دی۔ وہ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بولے۔

''شہزی! بے شک یہ ڈپٹی روشن خان کی ایک غیر قانونی حرکت ہے اور میں بھی یہ سمجھ رہا ہوں کہ اس نے ارشد، شوکی اور شکیلہ کو کس مقصد کے لیے اور کس کے کہنے پر یرغمال بنا رکھا ہوگا مگر اس بات کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دیکھو، ہمارے کام کا ایک مخصوص طریقۂ کار ہوتا ہے۔ ورنہ اس طرح سول اتھارٹیز میں مداخلت کرنے سے عام عوامی حلقوں میں ہمیں بدنام کیا جائے گا۔ تمہارے کیس کے سلسلے میں بھی میڈیا، اتھارٹیز اور چند دیگر ایسی اہم کلیدی شخصیات کو استعمال کرنا پڑا تھا جن سے ہماری خاصی گہری اور دیرینہ شناسائی ہے۔ ہمارا ہر قدم ملک اور قوم کے مفاد میں ہی اٹھتا ہے۔ چاہے وہ تاریکی کے پردے میں ہی کیوں نہ اٹھایا جائے مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ممتاز خان کے معاملے میں پی ایس پی ایس کو مجبوراً ظاہر ہونا پڑا اور اس کی وجہ ''ایمرجنسی'' ہے مگر میں جانتا ہوں ممتاز خان کم از کم اس معاملے میں ہرزہ سرائی کرنے یا بھونکنے کے بجائے مقابلے کو ترجیح دے گا۔ بہرحال تم یہ معاملہ اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرو کیونکہ اب تم آزاد ہو اور تمہاری حیثیت و شخصیت معاشرے میں مثبت انداز میں ڈیکلیئر ہو چکی ہے۔ اوکے۔''

''تھینک یو سر! آپ نے یہ کہہ کر میری بھی ایک طرح سے مشکل حل کر دی۔'' میں نے کہا۔ باجوہ صاحب میرا اشارہ سمجھ کر ہنسے تھے اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے مطمئن انداز میں کار کی سیٹ سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

بیگم ولا پہنچ کر ہم نے بیگم صاحبہ کو یہ بتایا تو انہیں تینوں ساتھیوں کی طرف سے شدید تشویش ہوئی۔ نیز ڈپٹی روشن خان کی اس کھلی بددیانتی پر طیش بھی آیا۔ وہ روشن خان پر ماورائے قانون اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کا مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں جس سے میں نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بیگم صاحبہ، کیونکہ یہ تاریکی کے پردے کے پیچھے ہونے والی جنگ ہے اور اس جنگ میں جو جیتا... وہی سکندر ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں اپنے طریقۂ کار سے بھی آگاہ کر دیا۔

کھیل دادا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ حسبِ عادت میری اس نئی مہم جوئی پر ''مین میخ'' نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ بھڑوں کے چھتے میں دانستہ ہاتھ ڈالنے والی بات ہوگی، ابھی تو بڑی مشکلوں سے ہم نے پولیس سے جان چھڑائی ہے۔ اب پھر آبیل مجھے مار والی حرکت ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

''کس نے تم سے یہ کہہ دیا کہ پولیس نے ہماری جان چھوڑ دی ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے تین اہم ساتھیوں کو وہ مردود ڈپٹی روشن خان ماورائے قانون غائب کر چکا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ پولیس نے ہماری جان چھوڑ دی ہے۔''

''شہزی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' بیگم صاحبہ نے باوقار لہجے میں کہا۔ ''ایک محاذ پر دشمنوں کو شکستِ فاش ملنے کے بعد اب وہ ہم سے تاریکی کے پردے میں جنگ مسلط کرنا

چاہتے ہیں تو ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دینا چاہیے۔ ممتاز خان نے اس بار بڑی خطرناک اور گہری چال چلی تھی، ایک طرف مجھے یرغمال بنالیا دوسری طرف اپنے ڈپٹی روشن خان کے ذریعے بیگم ولا میں بغیر کسی سرچ وارنٹ کے ریڈ دلوادی جس کے نتیجے میں وہ شہزی سمیت ہمارے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گیا جس کا پولیس میں دور دور تک کوئی ریکارڈ نہیں۔''

کھیل دادا نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ ''بیگم صاحبہ! ڈپٹی روشن خان، چودھری ممتاز کا زرخرید اور ہوٹ ہے۔ اسی طرح چودھری ممتاز نے اس جیسے جانے کتنے لوگوں کو اپنا کتا بنا رکھا ہوگا۔ ہم کس کس سے لڑتے رہیں گے جبکہ وہ خود سات پردوں کے پیچھے چھپ ہوا ڈوریاں ہلاتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہمیں روشن خان پر حملہ کرنے کے بجائے چودھری ممتاز کو ٹارگٹ کرنا چاہیے۔''

''تمہاری بات بھی کسی حد تک قابلِ غور ہے۔'' بیگم صاحبہ نے اس کی حمایت میں کہا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ ''لیکن ممتاز خان نے اب دیسی ہی نہیں ولایتی کتے بھی پال لیے ہیں۔ اس نے خود کو کافی حد تک انڈر گراؤنڈ کر رکھا ہے جبکہ ہمارے تینوں ساتھیوں کی بازیابی فوری ایکشن لینے کی متقاضی ہے اور اس سلسلے میں جو شکار ہمارے سب سے زیادہ قریب ہے وہ ممتاز خان نہیں بلکہ ڈپٹی روشن خان ہے۔''

بیگم صاحبہ نے بڑی مضبوط دلیل دے کر کھیل دادا کا منہ بند کر دیا مگر پھر بھی وہ اپنے دل کا بغض نکالے بنا نہ رہ سکا، بولا۔ ''ٹھیک ہے پھر... اس مہم جوئی کی کمانڈ میرے سپرد ہوگی۔''

''میرے ہوتے ہوئے تم فیصلہ صادر کرنے والے کون ہوتے ہو کھیل دادا؟'' بیگم صاحبہ نے تلخی سے کہا تو وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔ فوراً خفیف ہو کے بولا۔

''ہم... میرا یہ مطلب نہیں تھا بیگم صاحبہ۔''

''میں اس کی مکمل طور پر کمانڈ شہزی کے سپرد کرتی ہوں۔ کیا کہتے ہو تم شہزی؟'' بیگم صاحبہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

''میں آپ کے اس اعتماد کا مشکور ہوں بیگم صاحبہ! میں اول خیر کو ساتھ رکھنا چاہوں گا، اس مہم میں جتنے کم لوگ ہوں انتہائی مفید ہوگا۔ ہم دونوں کافی ہوں گے۔''

''بیگم صاحبہ! اول خیر کی حیثیت اب واضح کرنا ہوگی آپ کو... یہ غدار ہے ہمارا... یا ساتھی؟'' ذرک اٹھانے کے باوجود کھیل دادا آخری حربے مسلسل آزمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پچھلے والے معاملے کو وہ نہیں بھولا تھا۔ اور اس کو ایک سنجیدہ ایشو بنا کر وہ اول خیر کو پچھاڑنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ بیگم صاحبہ کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے کہا۔

''بیگم صاحبہ! میں آپ سے پہلے ہی اول خیر کے سلسلے میں سفارش کر چکا ہوں۔ یہ ایک سچا اور وفادار انسان ہے۔ اس کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر اسے معاف کر دینے کی آپ سے عاجزانہ گزارش بھی کرتا ہوں۔''

''یہ صرف تمہارا وفادار ہوگا، ہمارا نہیں۔'' کھیل دادا نے اپنے دل کی میل اگلی۔ ''اس کی فطرت سے ہم بھی اب تک آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ گروہ سے باہر کے لوگوں سے ہی دوستی نبھاتا اور وفاداری کرتا ہے اور یہ بیگم صاحبہ کی حکم عدولی کے ناقابلِ معافی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ اگر اس کی سزا تجویز نہ کی گئی تو تنظیم میں ایک غلط روایت پڑ جائے گی۔''

کھیل دادا نے کسی گھاگ اور مکار پراسیکیوٹر کی طرح اول خیر کو بیگم صاحبہ کی عدالت میں مجرم ظاہر کرنے کی سعی چاہی ۔۔۔۔۔ اس کا یہ کہنا کہ اول خیر ''باہر والوں'' سے وفاداری یا دوستی نبھاتا ہے تو اس کا اشارہ بلاشک و شبہ میرے اور چھتے کی طرف ہی تھا۔

میں نے کہا۔ ''اول خیر کی وفاداری کسی بھی شک و شبے سے بالاتر ہے۔ میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اپنے حوالے سے نہیں... بیگم صاحبہ کے جاں نثار ساتھیوں کے حوالے سے... اور میں اس بات کی بھی ضمانت دینے کو تیار ہوں کہ اگر خدانخواستہ بیگم صاحبہ پر کوئی برا وقت آیا تو اول خیر مجھے چھوڑ کر بیگم صاحبہ کو ہی ترجیح دے گا۔''

''جذباتی باتیں کر کے تم اپنے جگری یار کی وکالت نہیں کر سکتے شہزی! یہ کڑے اصولوں کی بات ہے۔''

کھیل دادا زہریلے لہجے میں بولا تو میں نے بے اختیار بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کا چہرہ گم صم سا نظر آنے لگا۔ اس پر کھیل دادا نے دوبارہ زہر کی پھنکار ماری۔

''اول خیر کو مزید آزمانا... دوسرے سوراخ سے سانپ ڈسوانے کے مترادف ہوگا۔ اگر یہ سچا ہے تو اسے چھتے کو ہلاک کر دینا چاہیے۔'' شاطر کھیل دادا کی اس بات پر مجھے بے انتہا طیش آ گیا۔

''تم خود بیگم صاحبہ کے احکامات کی کتنی پاسداری کرتے ہو۔ یہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کھیل دادا! تم تو مجھے اس رات کو چڑا بازار کے ویران چوراہے پر کار سے

اتار کر واپس چلے گئے تھے جب پولیس میرے پیچھے تھی، حالانکہ بیگم صاحبہ نے تمہیں کسی بھی صورت مجھے اکیلا نہ چھوڑنے کا سختی سے حکم دے رکھا تھا۔''

''تم ہرزہ سرائی کر رہے تھے۔'' کمیل دادا نے تنتری لولی تاویل دی اور پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں مزید الجھتے... بیگم صاحبہ کی تمکنات... آواز ابھری۔

''اول خیر کے سلسلے میں بہت پہلے فیصلہ کر چکی ہوں۔ مگر مجھے اسے ظاہر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔''

بیگم صاحبہ کی اس بات پر جیسے وہاں موجود ہم سب کے چہروں پر سناٹے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بالخصوص اول خیر کا خاموش اور نادم نادم سا چہرہ مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان لگا۔

''میرا فیصلہ بہت مختصر اور حتمی ہے۔'' بالآخر بیگم صاحبہ نے کہنا شروع کیا اور دم بخود سا ماحول جیسے سماعت بن گیا۔ ''ویسے تو میں نے اول خیر کے لیے بہت کڑی سزا سوچی تھی مگر شہزی سے اس کی گہری یاری کو دیکھتے ہوئے میں اسے صرف اس قدر سزا دیتی ہوں کہ... اسے اپنے حلقۂ وفاداری اور اپنی ہم رکابی سے الگ کرتی ہوں۔ آج کے بعد سے اول خیر کا نہ ہم سے تعلق رہے گا نہ ہمارے معاملات و دیگر امور سے، اور نہ ہی ہمارے گروہ کے کسی ادنیٰ ترین ساتھی سے... شہزی چونکہ ہمارے گروہ سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے ہم اس پر شہزی سے تعلق توڑنے کا حکم دینے کا حق نہیں رکھتے۔''

میں نے سکون اور اطمینان کی سانس لی کیونکہ میرے نزدیک اول خیر کی یہ سزا بہت معمولی تھی لیکن جب میں نے اول خیر کی طرف دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ بیگم صاحبہ کا فیصلہ صادر ہوتے ہی اس کا چہرہ جیسے دھواں دھواں سا ہو کے رہ گیا۔ اس کی یک ٹک بیگم صاحبہ کی طرف تکتی آنکھوں سے انتہائی کرب ناکی جھلکنے لگی۔

''بیگم صاحبہ! ہم... مجھے آپ کی کڑی سزا قبول ہوتی مگر ایسی سزا تو نہ دیں... آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ سزا میرے لیے ہرگز ہرگز معمولی نہیں۔'' بالآخر اول خیر کی غم انگیز کپکپاتی آواز ابھری۔ میں نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ میری فطری آبزرویشن والی صلاحیت مجھ پر یہ باور کرا رہی تھی کہ بیگم صاحبہ خود بھی جانتی تھیں کہ اول خیر کے لیے کون سی سزا کڑی سے کڑی ہو سکتی ہے اور انہوں نے گویا وہی کڑی سزا دی تھی مگر وہ میری سمجھ میں نہ آ سکی تھی اور میں خوش تھا جبکہ بیگم صاحبہ نے ''دوہری'' ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف تو مجھے خوش کر دیا تھا اور دوسری طرف انہوں نے اول خیر کو درحقیقت کڑی ہی سزا دی تھی۔

بیگم صاحبہ نے اول خیر کی داد فریاد سننا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کچھ کہنا چاہا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھ سے پُرمتانت لہجے میں بولیں۔

''شہزی! میں تمہاری کامیابی کی دعا کرتی ہوں۔ میرے کسی ساتھی کی تمہیں ضرورت پڑے تو کسی کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو ماسوائے سہیل دادا کے۔'' کمیل دادا سمیت اس کے ساتھی بھی احتراماً کھڑے ہو چکے تھے۔

میں نے بھی کھڑے ہو کر بیگم صاحبہ سے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''میرے لیے آپ کا ساتھی اول خیر ہی کافی ہے۔''

''خبردار شہزی! آئندہ اول خیر کو ہمارا ساتھی کہنے کی غلطی بھی مت کرنا۔'' وہ فوراً تیز اور برہم لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں اور کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ کمیل دادا ایک فاتحانہ نگاہ ہم پر ڈالتے ہوئے بیگم صاحبہ کا دم چھلا بنا ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ باقی ساتھی بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ صرف میں اور اول خیر وہاں رہ گئے۔ میں اپنے چہرے پر تشویش و تفکر کے آثار لیے اس کی طرف بڑھا اور اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر بولا۔

''ایسا کیا ہوا میرے یار! تو نے تو اتنی سی بات اپنے دل کو لگا لی؟'' میرا انداز اسے تسلی اور حوصلہ دینے کا سا تھا مگر وہ تو جیسے پشیمانی اور کرب جیسی حالت سے دوچار نظر آ رہا تھا۔ وہ کرب آمیز لہجے میں بولا۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے شہزی! میرے لیے یہ بہت بڑی سزا ہے، یہ تم نہیں سمجھو گے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں اول خیر... یہ بات تیرے لیے بڑے صدمے کا باعث بنی ہے مگر میں واقعی اسے چھوٹی سزا سمجھا تھا لیکن تیری کیفیت اور تیری غمگساری کچھ اور کہانی کہہ رہی ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اسی ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولا۔

''ہاں کاکا، یہ واقعی ایک کہانی ہے۔ ایک بڑی کہانی۔'' اس کے گہرے اور عجیب اسرار بھرے انداز نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ وہ کسی کہانی کی بات کر رہا تھا، کیسی کہانی؟ کیا اول خیر کی بھی اپنی کوئی کہانی تھی؟ جس کی ابتدا بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی یا پھر کوئی اور معاملہ تھا؟ سچی بات تو یہ تھی کہ میں خود بھی ابھی تک اول خیر کے ماضی سے

ناواقف تھا۔ دل تو چاہا تھا میرا کہ اس سے آج پوچھ ہی لوں مگر اول خیر کی موجودہ ذہنی کیفیت نے مجھے اس کے بارے میں کچھ پوچھنے سے مانع ہی رکھا۔ مجھے کیبل دادا پر بھی شدید طیش آنے لگا کہ اس بدبخت نے اچھے بھلے موضوع کا رخ بدل کر بیگم صاحب کی توجہ اس کی جانب مبذول کرا دی تھی۔

اول خیر کو دل جوئی کی ضرورت تھی۔ میں نے جبراً مسکرا کے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور بولا۔ "چل یار اٹھ، نکل یہاں سے، جب تک تو ادھر رہے گا تیری یہی کیفیات رہیں گی۔"

"شہزی کاکا! میں اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟ میرا اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شہزی! تو نہیں جانتا بیگم صاحب میرے لیے کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ میں نے انہیں ہر اس روپ میں دیکھا ہے جو پاکیزہ جذبے اور مقدس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ میری سرپرست تھیں۔ میں نے انہیں مہربان اور شفیق ماں کے روپ میں بھی دیکھا۔ بہن کے روپ میں بھی اور... اور ایک سخت گیر باس کی صورت میں بھی مگر ان کی سخت گیری میں بھی ماں باپ جیسی شفقت ہوتی تھی۔ آج انہوں نے مجھے اس سے محروم کر دیا، اپنے سائے سے دور کر دیا۔"

"چل اٹھ، یہاں سے نکل۔" میں نے اسے بازو سے تھام لیا اور پھر ہم بیگم ولا سے نکل آئے۔ اگرچہ مجھے بیگم صاحب کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میں ان کی گاڑی بھی استعمال کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ پتا نہیں کیوں اول خیر کی یہ حالت دیکھ کر خود میرا دل بھی اب یہاں سے کھٹا ہونے لگا تھا۔

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا سرمد بابا کے گھر آ گئے۔ وہاں ماسی شریفاں موجود تھی۔ ایک بوڑھا ملازم بھی تھا۔ دونوں بے اولاد میاں بیوی تھے، اور عرصے سے وہاں ملازم تھے۔ سرمد بابا دفتر میں تھے۔ تاہم میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ بھی پہنچنے ہی والے تھے جبکہ خرم اور نعیمہ گھر پر ہی تھے۔ خرم کا پورا نام خرم دانش تھا۔ اسے پیار سے دانی کہتے تھے اور نعیمہ کو پنکی۔ دونوں نے ہمیں ادب سے سلام کیا پھر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور اول خیر نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ ماسی ہمارے لیے چائے لے آئی تھی۔

"کاکا! میں سمجھتا ہوں بیگم صاحب نے بہت غلط وقت پر مجھے خود سے الگ کر دیا۔ مجھے اپنی فکر نہیں مگر جب تک ممتاز خان زندہ ہے وہ خطرات میں گھری ہوئی ہیں۔" اول خیر کے لہجے میں تفکر تھا۔ میں نے اس سے ازراہ تشفی کہا۔

"یار تو فکر نہ کر... میں بیگم صاحب سے بعد میں معافی تلافی کی بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات رد نہیں کریں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، مقصد اس کا غم دور کرنا تھا تاکہ اس کی دلی کدورت کچھ کم ہو سکے مگر وہ اسی طرح پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"نہیں کاکا! اب تیرا یہ وار بھی شاید کام نہ کر سکے۔ یہ الگ معاملہ ہے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ بیگم صاحب مجھے اپنے ماضی اور اپنے محبوب مرحوم لئیق شاہ کے بارے میں سب بتا چکی ہیں۔ اس نے سن کر ہولے سے سر کو محض ایک جنبش دی تھی۔

میں نے ایک بار پھر عابدہ سے بات کرنے کی کوشش چاہی تو معلوم ہوا سیل فون کی سم بلاک کر دی گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی۔ اگرچہ کامران ہماری ہی کسٹڈی میں تھا وہ ویسے بھی یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی وہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ یقیناً اس کے سیل فون کی سم اس کے کسی تنظیمی ساتھی کے نام سے ہو گی جو اس کے سرکردہ نے بند کروا دی ہو گی۔ اچانک مجھے لینڈ لائن کا خیال آیا۔ میں نے لینڈ لائن پر دھڑکتے دل سے فون ملایا تو فوراً ہی مذکورہ اسپتال کی ایڈمنسٹریشن سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے مخاطب کو روم نمبر اور مریضہ عارفہ کا بتاتے ہوئے اس کی ساتھی عابدہ سے بات کرنے کا کہا تو ذرا دیر تک ہلکے میوزک کی آواز آتی رہی اور پھر عابدہ کی آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

یہ آواز روح بن کر میرے وجود میں عین دل کے مقام پر دھڑکی تھی اور میرے پورے وجود کو ایک سرشاری میں بھگو دیتی تھی۔ میں نے تڑپ کر عابدہ کو یوں پکارا جیسے وہ مجھ سے محض چند قدموں کی دوری پہ کھڑی ہو اور میں بے تابانہ اسے آواز دے کر اپنے قریب آنے کے لیے پکار رہا ہوں۔

"عابدہ... کک... کیسی ہو تم؟ میں شہزی بات کر رہا ہوں۔"

میری آواز سن کر دوسری جانب شاید عابدہ بھی ایک لمحے کو گنگ رہ گئی تھی پھر جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بولی۔ "شش... شہزی! تت... تم... کہاں ہو؟ اب تک مجھ سے بات کیوں نہیں کر سکے؟ تم ٹھیک تو ہو نا... اللہ تمہیں سلامت رکھے... کتنی صدیاں بیت جاتی ہیں ہوا ناب اور اندیشناک وسوسوں تلے تم سے بات نہیں ہوتی، کبھی تو

سرمد بابا کو بھی تمہاری خیریت کے بارے میں علم نہیں ہوتا، ایسے میں تو میں بالکل ادھ موئی ہوجاتی ہوں۔ تم سن رہے ہو نا... شہزی؟" وہ کہے جارہی تھی گویا جذبات... میں بہے جارہی تھی۔

"عابدہ! تمہارے ہوتے ہوئے بھلا تمہارے شہزی کو کیا ہوسکتا ہے، جس کی دعائیں واقعی اثر پذیر ہوتی ہیں کہ چاہے حالات جس قدر بھی کٹھن ہوں ہم ایک دوسرے کی آواز تو سن لیتے ہیں نا... میں بالکل ٹھیک ہوں عابدہ اور اس وقت سرمد بابا کے گھر سے تمہیں فون کررہا ہوں۔ یہ خوش خبری سنانے کے لیے کہ میں اب قانونی طور پر باعزت رہا ہوچکا ہوں۔"

ایسا میں نے میلوں دور فاصلوں کا کرب جھیلتی عابدہ کی پریشانی اور تشویش کو کم کرنے کے لیے محض طفل تسلی کے لیے کہا تھا ورنہ حقیقت کچھ اور تھی جسے شاید عابدہ بھی محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"خدا کا شکر ہے مگر شہزی! کیا تمہارے دشمن بھی قانون کی گرفت میں آچکے ہیں؟"

"ابھی ایسا نہیں ہوا۔" میں نے ہولے سے کہا۔ اسے اندھیرے میں، میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ تاہم امید افزا لہجے میں بولا۔ "مگر ایک دن وہ بھی ضرور قانون کی گرفت میں نہیں تو خدا کی پکڑ میں ضرور آنے والے ہیں۔ تم سناؤ، ٹھیک تو ہو نا تم؟ عارفہ کیسی ہیں؟ سرمد بابا بتارہے تھے ان کا آپریشن کامیاب ہوچکا ہے۔ بیڈ ریسٹ بھی ختم ہونے کو ہے پھر تمہارے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والی ہے اور عنقریب عارفہ کو اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا ہے۔"

"ہاں، یہ صحیح ہے ہفتے دس دن میں عارفہ کو ڈسچارج کردیا جائے گا اور انہی دنوں ہماری واپسی کی تیاری ہوگی۔ سرمد بابا کہہ رہے تھے کہ وہ ہمیں لینے کے لیے خود بھی امریکا آئیں گے۔"

"اچھا۔ یہ تو اور اچھی بات ہوگی۔"

"شہزی! تم اپنا خیال رکھتے ہو نا؟" عابدہ نے اچانک بڑی نرمی بڑی محبت سے پوچھا۔ میں جی جان سے مسکرا کے محبت پاش لہجے میں بولا۔

"ہاں عابدہ، کیوں نہیں، مجھے معلوم ہے کہ مجھے اپنا خیال رکھنا ہے اپنے لیے نہیں تمہارے لیے۔"

"اپنے لیے کیوں نہیں؟" وہ مسکراتے لہجے اور مہکتی شوخی سے بولی۔

"ارے بابا! اپنے لیے بھی رکھتا ہوں اور تم..."

"ظاہر ہے میں بھی رکھتی ہوں اپنا خیال۔"

"کس کے لیے؟ اپنے لیے یا میرے لیے؟" میں ایک نشے کی سی کیفیت میں بولا۔ اس کی نوخیز کلی جیسی چٹختی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی، امرت بن کر میری نس نس میں سمارہی تھی، میرے اندر کو سرشاری میں بھگو رہی تھی۔

"ہمارے بیچ اپنا تمہارا کب رہا ہے شہزی! میرا تو اپنا بھی تم ہو۔ صرف تم۔" وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولی پھر جیسے اچانک اس کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔

"شہزی!..."

"ہاں... ہاں کہو؟"

"تمہیں بھی اخبارات پڑھنے کا موقع ملتا ہے؟... ٹی وی کی خبریں وغیرہ سنتے ہو؟"

"اخبار پڑھنے کا موقع تو خال خال ہی ملتا ہے۔ البتہ ٹی وی دیکھنے کا کبھی کبھار موقع مل جاتا ہے، کیوں خیریت؟"

وہ چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔

"امریکا میں ورلڈ ٹریڈ ٹاور سینٹر میں دھماکوں کے بعد یہاں مقیم مسلم کمیونٹی بالخصوص پاکستانیوں کو بہت شک و شبے کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کی عام عوام بھی چبھتی نظروں سے ہمیں گھورتی ہے۔ دعا کرو میں اور عارفہ بہن جلد وطن واپس لوٹ آئیں۔"

عابدہ کی اس بات پر نہ جانے کیوں مجھے پورے وجود میں ان جانے اور متوقع خدشات کی تشویش بھری لہری سرائیت کرتی محسوس ہونے لگی۔ ورلڈ ٹریڈ ٹاور سینٹر کی تباہی سے متعلق خبریں تو جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا ہی میں پھیلی ہوئی تھیں جسے نائن الیون کے طور پر یاد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں امریکا درون و برون اپنی تحقیقات میں بھی مصروف تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

"ارے بھئی تو اس میں تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم کون سا ہمیشہ کے لیے امریکا رہنے گئی ہو۔ برغرض علاج گئی ہو اور اب خیر سے لوٹنے والی ہو۔ پھر تمہارا امریکا میں داخلہ بھی بین الاقوامی قوانین کے تحت ہوا ہے۔ خوامخواہ اس سلسلے میں تمہیں پریشان یا تشویش زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے شہزی، مگر یہاں کی بعض خفیہ ایجنسیوں کے لوگ... غیر ملکیوں سے خوامخواہ ہی پوچھ گچھ

کرتے رہتے ہیں۔ کئی ایک کو تو غائب بھی کر چکے ہیں باسکل ہولارڈ نامی ایک خفیہ ادارے کا افسر سادہ وردی میں مجھ سے بھی مل چکا ہے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے، وہ اپنی عمومی اور ضابطے کی کارروائیوں کو نمٹا رہے ہوں گے۔ تم نے انہیں مطمئن تو کر دیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "میں اسے دو تین بار مطمئن کرنے کی کوشش کر چکی ہوں۔ نیز اپنے سفری کاغذات، عارفہ بہن سے متعلق... وہ سب کچھ اسے بتا اور دکھا چکی ہوں لیکن چلو چھوڑو تم پریشان ہو جاؤ گے۔ یہ واقعی ضابطے کی کارروائی ہی نمٹا رہے ہوں گے۔" عابدہ نے کسی خاص بات کا انکشاف کرتے کرتے یک دم اپنی بات بدلی تو مجھے تشویش ہوئی، فوراً بولا۔

"نہیں عابدہ! مجھ سے کچھ مت چھپاؤ... لیکن کیا؟ تم کیا بتانا چاہ رہی تھیں، مجھے بتاؤ... پلیز۔" میرے تشویش بھری اصرار پر بالآخر وہ بولی۔

"شہزی! سرمد بابا نے مجھے اس قسم کی گفتگو فون پر کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔ ان کے خیال میں امریکا کے حالات کے پیش نظر کچھ مخصوص کالز ریکارڈ یا ٹریس کی جا رہی ہوں۔ اگر ہمارے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو... وہ کسی شبہے کے پیرائے میں یہاں کی ایجنسیوں کے لیے کھٹک کا باعث نہ بن جائے... میں تو یہاں رہتے ہوئے روزانہ ہی اخبار پڑھتی اور ٹی وی دیکھتی ہوں۔ مجھے حالات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ میرا خیال ہے بس تم دعا کرو ہم خیریت سے وطن واپس پہنچ جائیں۔"

اس کی بات درست تھی۔ میں نے بھی اصرار نہ کیا مگر مجھے عابدہ کی باتوں نے نہ معلوم سی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ باسکل ہولارڈ نامی اس شخص کے بارے میں کیا انکشاف کرنا چاہ رہی تھی، تاہم میں یہ سوچ کر کچھ مطمئن بھی تھا کہ ہمارا ایسا کسی سے کوئی تعلق نہ تھا جو کسی تشویش یا مصیبت کا باعث بنتا۔ میں نے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اس دوران سرمد بابا بھی آگئے۔ مجھ سے مل کر وہ بہت مسرور اور مطمئن ہوئے۔ اول خیر کو بھی وہ میرے دوست کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔

کافی دنوں بعد سرمد بابا کے ساتھ آج تفصیلی نشست جمی تھی۔ وہ بہت خوش تھے اور بار بار عابدہ کے حوالے سے میرا شکریہ بھی ادا کرتے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے ان کی بہو عارفہ کی طبیعت کا پوچھا۔ وہ بولے۔ "شہزی بیٹا! اللہ کا شکر ہے اس نے بڑا کرم کیا میری بچی پر... ڈاکٹرز نے جن کے جگر کی کامیاب پیوند کاری کر لی ہے اور کسی متوقع کمپلیکشن کے باعث اسے کچھ دن آبزرویشن اور بیڈ ریسٹ پر رکھا تھا۔ اب اسے اوکے قرار دے دیا ہے بس چند دنوں کی بات ہے، دونوں خیر سے لوٹنے والی ہیں۔"

"میری بھی عابدہ سے بات ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ بتا رہی تھی کہ آپ خود ان دونوں کو لینے جائیں گے؟"

"ہاں، ارادہ تو میرا یہی ہے بلکہ میرا ایک طرح سے بزنس ٹرپ بھی پینڈنگ میں چلا آ رہا تھا۔ وہاں کے حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ التوا کا شکار ہوتا رہا۔ اب سوچا اسی بہانے ہی چلا جاؤں۔"

"آپ کب جا رہے ہیں پھر؟" میں نے پوچھا۔

"دو چار روز میں چلا جاؤں گا۔ اچھا ہوا تم آ گئے اب

انتقام

ایک امریکی دورانِ سفر ایک بار پر رکا۔ اندر اکا دکا گاہک ہی موجود تھے۔

اس نے بیئر کا ایک گلاس لیا۔ بارمین نے دو سینٹ کاٹ کے اسے ریزگاری لوٹائی تو وہ حیران رہ گیا۔

"اتنی سستی بیئر تو میں نے اپنی زندگی میں نہیں پی۔" مسافر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "اور یہ سینڈوچ کتنے کا ہے؟"

"پانچ سینٹ۔" بارمین نے سنجیدگی سے کہا۔

مسافر کا سر چکرا گیا۔ ایسی برائے نام قیمتوں پر کوئی بار چل ہی نہیں سکتا تھا، اس نے پوچھا۔ "تم اس بار کے مالک ہو؟"

"نہیں، ملازم ہوں۔" جواب آیا۔

"مالک کہاں ہے؟"

"اوپر... میں اوپر بنے ہوئے ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"وہ اوپر تمہاری بیوی کے ساتھ کیوں ہے؟"

"مجبوری ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں ڈیوٹی ٹائم پر نیچے آتا ہوں تو وہ آرام کرنے کے بہانے اوپر چلا جاتا ہے۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے جواب میں، میں اس کا کاروبار تباہ کر رہا ہوں۔"

سوات سے محمود عباسی کی جوابی کارروائی

شاید واقعی جلد نکل جاؤں۔"

"یہاں آپ کے کاروبار کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"جمال الدین میرا بہت پرانا اور قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ وہ بیک وقت میرا پی ایم بھی ہے اور پی اے بھی... بلکہ مشیر بھی۔ تم شاید جمال سے نہیں ملے ہو۔ دانی اور پنکی تو اسے انکل کہتے ہیں۔ دونوں مانوس ہیں اس سے۔"

"جی، ملا تو نہیں ہوں جمال صاحب سے لیکن غائبانہ تعارف ہے میرا ان سے۔"

"شہزی بیٹا! اب یہ بھاگم دوڑی چھوڑو اور آرام سے میرے پاس رہو۔ عارفہ اور عابدہ بھی خیر سے جلد لوٹنے والی ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے تھمے پھر ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔

"شہزی بیٹا! میری بڑی خواہش ہے کہ میں خود تمہاری اور عابدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی کروں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے کئی سال پہلے بڑی محبت اور ....چاہ سے اپنے اکلوتے بیٹے محمود کی کی تھی۔" اپنے مرحوم بیٹے کو یاد کر کے ان کا لہجہ ڈبڈبا گیا۔ بوڑھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ سرمد بابا ایک ہمدرد اور عظیم انسان تھے۔ میری تو ان سے اطفال گھر میں بہت پرانی شناسائی تھی، اس وقت جب میں خود ایک بچہ تھا۔ آفرین ہے اس بوڑھے شخص پر جس نے اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ کیا مگر ان کے اکلوتے بیٹے محمود نے ان کے ساتھ کیسا سفاکانہ برتاؤ کیا تھا۔ انہیں گھر سے ہی بے دخل کر دیا اور سب کچھ بڑی چالاکی سے اپنے نام بھی کروا لیا۔ یقیناً اس میں محمود کی بیوی عارفہ کی بھی سکھائی پڑھائی کا دخل رہا ہوگا۔ مجھے یاد تھا۔ اطفال گھر میں جب پہلی بار سرمد بابا سے میرا سامنا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے اپنے بیٹے اور بہو (محمود اور عارفہ) کی بے حسی کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔

بہرحال سرمد بابا کی شادی والی بات پر میں نے بھی ان کی دل جوئی میں کہا۔ "ہاں بابا! میں بھی آپ کے مرحوم بیٹے محمود کی طرح ہی ہوں۔ عابدہ بھی آپ کی بیٹیوں جیسی ہے۔ ہماری شادی آپ ہی اپنے دستِ مبارک سے کریں گے۔"

میری بات پر سرمد بابا کے بوڑھے چہرے پر مسرت و خوشی کے تاثرات امڈ آئے پھر بولے۔ "شہزی بیٹا! یقین کرو گے میری بات کا... میں اس وقت جس پر سب سے زیادہ اعتماد اور بھروسا کرتا ہوں... وہ صرف اور صرف تم اور عابدہ ہی ہو۔ تمہارے علاوہ میں عابدہ کا بھی دل سے مشکور ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "بابا! آپ ہمیں اپنی اولاد کی طرح بھی سمجھتے ہیں اور پھر شکریہ جیسے الفاظ کہہ کر ہمیں شرمندہ بھی کر رہے ہیں۔"

میری بات پر سرمد بابا بے اختیار ہنس پڑے۔ "تم بھی ہر بات پکڑ لیتے ہو۔ ارے بھئی شکریہ ادا کرنا تو ہمارا فرض بنتا ہے۔" اس کے بعد ہم سب نے مل کر کھانا کھایا پھر میں اول خیر کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے اب ایسا لگتا تھا جیسے اول خیر کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی آج سے بیگم ولا اور بیگم صاحبہ سے تعلق ختم ہو گیا تھا۔ اول خیر کے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے جو فرمان جاری کیا تھا، وہ نامناسب تھا۔ میرے خیال میں اس وقت بیگم صاحبہ سمیت ہم سب ہی حالتِ جنگ میں تھے۔ ان حالات میں بیگم صاحبہ کا اول خیر کو اپنے گروہ اور اپنے ٹھکانے سے بے دخل کرنا نامناسب تھا۔ یوں تو چودھری ممتاز صرف بیگم صاحبہ کا ہی نہیں ہمارا بھی دشمن تھا اور ہم اس جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے لیکن باوجود اس کے بیگم صاحبہ کے اس فیصلے سے میں بھی اب خوش نہ تھا۔

اول خیر نے مجھے سوچتا پا کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو کاکا؟"

"مجھے بیگم صاحبہ کا فیصلہ سخت ناگوار گزرا ہے۔ انہوں نے یقیناً کمیل دادا کے کہنے اور دباؤ پر ایسا کیا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"او خیر... نہیں کاکا! بیگم صاحبہ کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ وہ خود بھی ان سے انحراف نہیں کرتیں مگر مجھے سب سے زیادہ فکر تمہاری ہے اور..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے قدرے چونکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"اور کیا؟"

"مجھے تمہاری زیادہ فکر ہے کاکے۔" اس نے جیسے یک دم بات بنانے کی کوشش چاہی تو میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کے بولا۔

"میری فکر کرنے کی بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ ہو۔"

"او خیر... کاکا! میری جان تجھ پر قربان۔" وہ مخصوص لہجے میں یارباش انداز سے بولا۔ "مگر شہزی کاکا! تو بیگم صاحبہ سے تعلق مت توڑنا... تجھے ابھی شاید ان کی ضرورت پڑتی رہے گی۔"

''بہت بڑی بات کردی تو نے اپنے شہزی کاکے سے
اول خیر۔'' میں نے یک دم تلخ سی سنجیدگی سے کہا تو وہ بے
چارہ میرے بدلے ہوئے لہجے پر پریشان سا ہو گیا۔ میرا
چہرہ تکتے ہوئے بولا۔
''کیا ہوا کاکے؟ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے
تجھ سے؟''
''تم اتنا عرصہ میرے ساتھ رہے ہو اول خیر، کیا اب
بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکے؟ کیا تم مجھے اتنا ہی کمزور اور بے بس
سمجھتے ہو کہ میں سہاروں کی تلاش میں رہتا ہوں؟ یہ ٹھیک
ہے کہ ابتدا میں چند وقتی اور مشترکہ مجبوریوں کے باعث مجھے
بیگم صاحبہ اور اس کے آدمیوں سے اتفاق کرنا پڑا... مگر کیا تم
نے دیکھا نہیں کہ...'' میں کچھ سوچ کر رکا پھر ایک گہری
سانس خارج کر کے بولا۔ ''اب میں اور کیا کہوں؟ یہ پھر
احسان جتانے والی بات نہ ہو جائے۔''
''او خیر... کاکا! میں سب سمجھ رہا ہوں اور دیکھتا بھی
آیا ہوں۔'' اول خیر بے جگر مسکراہٹ سے بولا۔ ''بیگم
صاحبہ کو بھی اس حقیقت کا بہ خوبی علم ہوگا کہ اس کے مقابلے
میں تمہارے ان پر احسانات زیادہ ہیں۔ تم نے اپنے بل
بوتے اور اپنے زور بازو پر بیگم صاحبہ کے لیے بے جگری
سے وہ کچھ کیا ہے جو ہم بھی... میرا مطلب ہے اس کے
ساتھی بھی ان کے لیے نہیں کر سکے تم نے تن تنہا اپنی جان پر
کھیل کر بیگم صاحبہ کو چودھری ممتاز خان اور اس کے
خطرناک گرگے... بابن ڈکیت کے چنگل سے نہ صرف
چھڑایا بلکہ اسے واصل جہنم بھی کر ڈالا لیکن کاکے! میرے
کہنے کا مقصد کچھ اور تھا، یہ زندگی ہے اور زندگی ہمیشہ ایک سی
نہیں گزرتی، یہ ہمیشہ الٹ پلٹ کا شکار رہتی ہے، ایک
دوسرے کی مدد کی ضرورت انسان کو پڑتی رہتی ہے۔''
میں نے اس کی بات پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اول
خیر! میرے لیے تمہاری یاری ہی کافی ہے۔ پھر اللہ بھی تو
میرے ساتھ ہے۔''
''بے شک۔'' وہ بولا۔ ''تیرے لیے تو میری جان
بھی حاضر ہے میرے سوہنے شہزی کاکا... پر یار! میں پھر
بھی تجھ سے یہی کہوں گا کہ تو بیگم صاحبہ سے تعلق مت توڑ
ابھی۔'' اس کی بات پر میں نے سنجیدگی سے کہا۔
''اول خیر! اصل بات یہ ہے کہ مجھے تیرے سلسلے میں بیگم
صاحبہ کے اس فیصلے سے سخت اختلاف ہے۔ اب میرا دل
خراب ہونے لگا ہے ان سے۔ اب اس موضوع کو ادھر ہی
دفن کر دے... مجھے تجھ سے ایک اور ضروری بات کرنی
تھی۔''
''ہاں، بول کیا بات ہے؟'' وہ پورے دھیان سے
میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا تو میں نے اسے وزیر
جان اور اسپیکٹرم سے متعلق مزید تفصیل سے آگاہ کر دیا۔
اول خیر یہ سن کر سناٹے میں آگیا کہ میں نے اپنے باپ کا پتا
لگا لیا تھا لیکن... اس کی میرے ساتھ بے حسی اور بے رخی
اپنی جگہ نہ صرف برقرار تھی بلکہ وہ تو میری جان کا بھی دشمن
بن بیٹھا تھا۔
''پھر وہ تیرا باپ نہیں ہو سکتا شہزی کاکے! یہ کوئی اور
ہی معاملہ ہے۔''
اول خیر نے فوراً تبصرہ کیا تو میں نے پرسوچ لہجے میں
اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے اس کی تائید میں کہا۔ ''ہاں
اول خیر! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ میرا باپ نہیں ہو سکتا
مگر یار! میں تو اسے اپنے بچپن سے ہی دیکھتا آیا ہوں۔
مجھے تو اپنی سگی ماں کا بھی نہیں معلوم... میں نے تو سب کچھ
اسے ہی اپنا سمجھا تھا۔ یار... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وزیر
جان میرا باپ نہیں ہو؟ اگر وہ میرا باپ نہیں تھا تو پھر وہ جب
سے اطفال گھر چھوڑ کے گیا تھا تو غمگین کیوں ہوتا تھا؟ اپنے
لخت جگر کی جدائی میں پھر کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو
بہتے تھے؟ اگر وہ میرا باپ نہیں ہے تو پھر کون ہے میرا باپ؟
یہ آخر کیا راز ہے؟ میرا اصل باپ کہاں ہے؟'' میرا لہجہ
رقیق اور جذباتی ہونے لگا۔ اول خیر مجھے غم زدہ پا کر اپنے
بیڈ سے اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اپنا ایک ہاتھ
میرے کاندھوں پر پھیلا کے بولا۔
''او خیر... کاکے! تو تو ایک دم جذباتی ہو جاتا ہے،
میرے یار۔''
''یہ محض جذباتیت نہیں ہے اول خیر۔'' میں نے
سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ میری پہچان اور میری شناخت کا معاملہ
بھی ہے۔ میں اپنی ذات کے شخص کو اس وقت تک نامکمل
ہی سمجھوں گا جب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھ جاتا کہ اگر
وزیر جان میرا باپ نہیں تھا تو پھر وہ سب کیا تھا؟ اور کیوں
تھا؟ ماں کا تو مجھے بتایا ہی تھا کہ وہ سوتیلی تھی میری... تو کیا...
تو کیا... اول خیر... میرا باپ بھی سوتیلا... مگر کیسے؟ یہ
سب کیا ہے... کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں... اول خیر۔''
میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اول
خیر کو میری اس اعصاب زدہ کیفیات پر یک دم تشویش
ہونے لگی۔ وہ مجھے سنبھالا دینے کی کوشش کرنے لگا اور بولا۔
''شہزی کاکے خود کو سنبھال یار، ارے تو تو بڑے

مضبوط دل گردے کا آدمی ہے۔ میں ہوں تیرے ساتھ... اور وزیر جان بھی سرا نہیں ہے۔ تو نے اس کا ٹھکانا دیکھ ہی رکھا ہے ناں... جس وقت تجھے گا جا کے اس کی گردن دبوچ کے ساری اگلی پچھلی حقیقت اگلوالیں گے اس کے منہ سے۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اپنی ذات کے تشخص اور شناخت کے معاملے میں میرے جیسا مضبوط اور آہنی اعصاب کا نوجوان... یہ سب باتیں سوچ کر ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا تھا مگر اول خیر کی دل جوئی سے بھی مجھے بڑی ڈھارس ملتی تھی۔ اس نے وہی کچھ کہا تھا جو کل سے میرے ذہن میں "پلان" تھا بلکہ میں نے تو ثریا سے ملاقات کے بعد ہی سے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ اب مجھے وزیر جان سے بھی دو دو ہاتھ کرنا پڑے تو میں پیچھے ہرگز نہیں ہٹوں گا۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے اول خیر سے کہا۔ "میرا دل بھی وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے اول خیر! پر مجھے اس کا ابھی تک موقع نہ مل سکا اور میں بدقسمتی سے یکے بعد دیگرے اور ہی حالات سے دوچار رہا۔"

"اب تو بے غم ہو جا کاکے! ٹھکانا تو نے دیکھ ہی رکھا ہے۔ صبح تڑکے ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔ ساہیوال کی طرف..." وہ بولا۔

"کرنا تو اب یہی پڑے گا مگر یار! اس معاملے میں کچھ ٹیڑھ ہے۔"

"کیسی ٹیڑھ؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ دنیا کے دکھاوے کے لیے بظاہر ایک صنعت کار ہے لیکن درحقیقت وہ کسی "اسپیکٹرم" نامی بین الاقوامی گروہ کا ایک اہم عہدے دار بھی ہے جسے ان کی اصطلاح میں "اسٹیشن چیف" کہا جاتا ہے۔ ثریا کے مطابق یہ اسپیکٹرم میں مقامی سطح کا ایک بڑا عہدہ گردانا جاتا ہے۔ پادروالوں کو بھی اس کی بھنک پڑ چکی ہے۔ وہ بھی اسے میرے ذریعے شکار کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ مگر پہلے میں وزیر جان کو شکار کرنا چاہوں گا۔ اس مقصد کے لیے میں نے ابھی میجر باجوہ صاحب کو بھی اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی تھی۔"

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کیا شہزی کاکے!" اول خیر یک دم پرجوش ہوتے ہوئے بولا۔ "تو فکر نہ کر... نیند پوری کر لے... کل صبح ساہیوال کی طرف نکل جائیں گے۔" اس کی بات پر میں نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح نیند پوری کر کے ہم بیدار ہوئے۔ ناشتا ہم سب نے اکٹھے کیا۔ اس دوران سرمد بابا نے مجھے امریکا روانگی کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے گزارش کی تھی کہ ان کی اور عابدہ وغیرہ کی امریکا سے واپسی تک میں ان کی کوٹھی میں ہی مقیم رہوں۔ ناشتے سے فراغت کے بعد دونوں بچے اسکول روانہ ہو گئے جبکہ سرمد بابا دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے کہ اچانک امریکا سے اکیس لینڈ لائن پر ایک کال موصول ہوئی۔ میں چونک سا گیا۔ وہ فون پر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا وہ کسی سے بڑی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کر رہے تھے۔ ان سے کچھ پوچھا جا رہا تھا۔ یہ گفتگو لگ بھگ نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف سے کوئی غیر شناسا ہی سرمد بابا سے مخاطب تھا۔ ورنہ عابدہ یا عارفہ سے وہ اردو میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

گفتگو کے دوران میں نے سرمد بابا کی زبان سے بانسکی ہولارڈ... کا بھی ذکر سنا تو مجھے اچانک ہی ایک نامعلوم سی تشویش نے آن لیا۔ کیونکہ یہ نام میں عابدہ سے گفتگو کے دوران بھی سن چکا تھا جو امریکا کے کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتا تھا۔

رابطہ منقطع ہونے کے بعد سرمد بابا کے چہرے پر بھی مجھے کچھ الجھن آمیز تفکر کے آثار نمودار ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے بابا؟ کون تھا؟ آپ خاصے پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟" میں نے پوچھا تو وہ اپنی پریشانی کو زبردستی کی مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"کوئی خاص بات نہیں شہزی بیٹا! بس وہ ذرا امریکا میں آج کل کچھ حالات ایسے ہیں۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد سے وہاں بعض غیر ملکیوں کے سلسلے میں کوئی نگرانی اور پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ تو ایک معمول کی کنفرمیشن عارفہ بیٹی اور عابدہ بیٹی سے متعلق مجھ سے کی گئی تھی۔ میں نے انہیں مطمئن تو کرنے کی کوشش کی ہے کہ عارفہ بغرض علاج وہاں مقیم ہے اور عابدہ اس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اس کے ساتھ... آپ لوگ بے شک ان کے کاغذات کی

جانچ پڑتال کرسکتے ہیں، وغیرہ۔‘‘

’’مجھے عابدہ نے ہاسکل ہولارڈ نامی ایک امریکی انٹیلی جنس افسر کے بارے میں بتایا تھا۔‘‘ میں نے کہا اور پھر عابدہ سے اس سلسلے میں کی ہوئی گفتگو کے بارے میں انہیں بتادیا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

’’شہزی بیٹا! یہ امریکی تو اپنے باپ پر بھی شک کر سکتے ہیں ہم کیا شے ہیں۔ او کے انجوائے یور سیلف... میں چلتا ہوں۔‘‘ کہتے ہوئے سرد بابا چلے گئے۔

اب میں اور اول خیر کوٹھی میں تنہا رہ گئے۔ ہمارا ارادہ پہلے روشن خان والی مہم کے لیے روانہ ہونے کا تھا مگر میں اس سے پہلے میجر باجوہ صاحب سے ایک ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنی ٹریننگ کو سردست موخر کرنے کے سلسلے کے علاوہ ان سے پوچھنا تھا کہ کامران نے انہیں اب تک اسپیکزم اور بالخصوص ثریا کے بارے میں کیا بتایا جبکہ اول خیر کا ارادہ تھا کہ ابھی میجر صاحب سے ملاقات کو موخر رہنے دیا جائے یہ بعد میں بھی ہو سکتی ہے، پہلے روشن خان اور وزیر جان کا معاملہ نمٹا دینا چاہیے۔

’’نہیں اول خیر۔‘‘ میں نے اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔ ’’مجھے ثریا کے سلسلے میں کنفرمیشن درکار ہے۔‘‘

’’وہ تو ہم وزیر جان کی گردن دبوچ کر بھی اگلوا سکتے ہیں۔‘‘

’’نہیں اول خیر، میجر صاحب سے ملاقات ضروری ہے، آؤ۔‘‘ میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

’’او خیر کا کے، اتنی جلدی نہ دکھا۔ ذرا ہولا رہ۔ دشمن باہر ہماری گھات میں ہو سکتے ہیں۔ ذرا تھوڑے سے بدل کر ہی باہر نکلیں گے۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

’’سردیوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ اوپر گرم چادریں ڈال لیتے ہیں۔ فی الحال یہی دیسی طریقہ اپنانا پڑے گا۔‘‘

’’یار کاکے! تو ادھر ہی فون پر باجوہ صاحب سے بات کیوں نہیں کر لیتا۔‘‘

’’نہیں اول خیر، ایسی باتیں فون پر نہیں کی جا سکتیں۔‘‘

’’او چل پھر آ گے لگ۔‘‘ وہ بولا۔

ہم نے گرم چادریں اوڑھ لیں اور پوری احتیاط کے ساتھ کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ اگرچہ کوٹھی کے پورچ میں ایک گاڑی کھڑی تھی مگر میں دانستہ سرد بابا کی کوئی گاڑی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم بڑی محتاط روی کے ساتھ کوٹھی سے نکلے اور فوراً ہی ایک ٹیکسی کر کے رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم دانستہ کوٹھی سے خاصی دیر سے روانہ ہوئے تھے اور لنچ کے کافی دیر بعد نکلے تھے۔

وہاں پہنچے تو میجر ریاض باجوہ کو اپنا ہی بے چینی سے منتظر پایا۔ اول خیر ان کے لیے اجنبی تو نہ تھا مگر وہ اس کے سامنے کوئی اہم بات کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے، وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔

یہ سادہ سا کمرا تھا جہاں سادہ سا ہی مختصر فرنیچر تھا۔ یہ وہی روم تھا جہاں کل ہم نے بیٹھ کر ون ٹو ون ملاقات کی تھی۔ درمیان میں گول لکڑی کی بغیر پوش کی میز تھی اور تین کرسیاں۔ ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ باجوہ صاحب بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

’’شہزی! میں سمجھتا ہوں ملک اور قوم کو تمہارے جیسے دلیر اور پُرعزم نوجوان پر فخر ہونا چاہیے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ چودھری ممتاز سے اپنی ذاتی جنگ کے دوران نادانستہ طور پر ایک بڑی اور نیک جنگ کے میدان کے شہسوار بن چکے ہو جس پہ پوری قوم، ملک اور امت مسلمہ کی بقا کا دارومدار ہے۔‘‘

وہ ذرا تھمے۔ میں پورے دھیان اور غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں ابھی ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔

’’شہزی! تم آج تک ممتاز خان کے ساتھ اس جنگ میں پوری دلیری کے ساتھ اور مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہے ہو جو تمہاری اس کے ساتھ ذاتی جنگ ہے۔ مجھے بتاؤ تمہارا اپنا دل ملک و قوم کے لیے کتنا دھڑکتا ہے۔ تمہارا دل وطنِ عزیز، پاکستان کی سلامتی اور امتِ مسلمہ کے لیے کس قدر دھڑکتا ہے؟‘‘

میجر باجوہ صاحب کے اس سوال پر میرے چہرے پر بڑی پُراعتماد اور پُرعزم مسکراہٹ ابھری تھی اور پھر میں نے اسی لہجے میں کہا۔ ’’میجر صاحب! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میرا بچپن اور پھر کسی حد تک لڑکپن ایک فلاحی ادارے میں گزرا ہے۔ ایک ایسا بچہ یا لڑکا جو ابتدا ہی اس طرح کے کڑے حالات سے دوچار رہے تو اس کے اندر فطری اور نفسیاتی طور پر کچھ صلاحیتیں وقت سے پہلے ہی بیدار ہونے لگتی ہیں۔ ان میں کچھ تو فطرت کا بھی حصہ ہوتی ہیں اور کچھ قدرتی طور پر ودیعت ہوتی ہیں پھر گزرتے وقت کے ساتھ

ساتھ یہ سب دو آتشہ بن کر ابھرتی ہیں۔

”اطفال گھر میں جب تک اس کے اصل روح رواں ملک حاجی اسحاق صاحب زندہ تھے تو ہماری تربیت اچھے اور واضح خطوط پر کی جاتی تھی، اپنی تربیت پر میں زیادہ توجہ دیتا تھا۔ کافی حد تک اپنی پڑھائی مکمل کی۔ اخبارات کا بھی مطالعہ کرتا رہا۔ مختلف ٹی وی چینلز کے سنجیدہ تجزیاتی پروگرام وغیرہ بھی غور سے دیکھتا تھا۔ ملکی اور اسلامی تاریخی واقعات تو میری گھٹی میں رچے بسے ہوئے ہیں میجر صاحب! اور اگر میں ممتاز خان یا اس طرح کے دیگر سماجی درندوں سے برسرِ پیکار ہوں تو اس میں ایک جذبہ میرا یہ بھی تو بنیادی طور پر شامل رہتا ہے کہ میرے وطن کی سرزمین ایسے بدطینت اور جرائم پیشہ افراد سے پاک ہو جائے۔ رہی بات وطن عزیز کی تو میں نہیں سمجھتا کہ ہماری سرزمین پاکستان کا بوڑھا، جوان، مرد، عورت حتیٰ کہ بچہ تک اس کی محبت میں سرشار نہ ہو۔ وطن کی محبت تو ہمارے خمیر میں گندھی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلم اُمہ کا دکھ درد اور اتحاد ہماری گھٹی میں پڑا ہونا چاہیے اور ایسا ہے بھی۔ معاف کیجیے گا میجر صاحب! آپ نے شاید شہزاد احمد خان عرف شہزی سے ایک بہت ہی بچکانا سوال کر ڈالا ہے۔“ یہ سب باتیں کرتے ہوئے میری سانسیں تیز چلنے لگی تھیں، چہرہ جوش سے مرتعش ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے چمک سی مترشح ہونے لگی تھی۔ میجر صاحب نے اپنی کرسی سے اٹھ کر والہانہ جوش کے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میرا کاندھا تھپک کر بولے۔

”ویل جنٹلمین! ہمارے اسی جوش... اسی نیک جذبات سے ہمارے دیدہ و نادیدہ دشمن آج بھی خوف زدہ رہتے ہیں کہ بے شک یہ قوم کچھ خارجی اور بیرونی سازشوں تلے وقتی طور پر خوابیدہ ضرور ہو جاتی ہے لیکن وقت پڑنے پر پورے تن من دھن کے ساتھ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ایک قوم کی صورت بیدار ہونے میں دیر بھی نہیں لگاتی ہے۔“

میں دانت پہ دانت جمائے خاموش رہا۔ ایسے میں میرے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میجر باجوہ صاحب مجھ سے کچھ خاص بات کہنے والے تھے۔ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہونے کے بعد وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

”شہزاد! ہمیں پوری امید تھی کہ کامران کے ذریعے ہمیں ”اپیکزم“ سے متعلق بہت سی باتوں بالخصوص اس کے خفیہ مقاصد اور اس کی اصلیت کے بارے میں جان کاری حاصل ہو جائے گی لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔“

”کیا مطلب میجر صاحب؟“ میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ”کیا کامران نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا ہے؟“

”نہیں۔“ میجر باجوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کامران جیسے دیسی ڈاؤٹ یا ایجنٹوں کو اپیکزم محض ایک ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتی ہے۔ انہیں کچھ زیادہ جان کاری نہیں ہوتی۔ وہ بس روپے پیسوں اور پُرتعیش مراعات کے لیے ان کے آگے سر جھکانے والے محض حکم کے غلام ہوتے ہیں اور وہ بس اسی میں ہی خوش اور مسرور رہتے ہیں لیکن کامران کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اس کے اندر بہرحال یہ تجسس کلبلاتا رہتا تھا کہ آخر اس بات کا پتا تو چلنا چاہیے کہ آخر ”اپیکزم“ ہے کیا بلا؟ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ جو بظاہر ایک بین الاقوامی مجرم تنظیم کا ”شو آؤٹ“ کرتی ہے لیکن وطن عزیز میں آخر اس کے وہ کون سے خفیہ مقاصد ہیں؟ بقول کامران کے اس نے اپنی سی محدود کوشش سے اور جو کام اسے تنظیم کے ذریعے سونپا جاتا تھا اس سے کامران کو ایک حد تک یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ اپیکزم عالمی سطح کے ایسے معاملات میں ملوث رہتی ہے جس سے کسی ایک ملک کو نقصان اور دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں اپیکزم کے اپنے کالے دھندے بھی چلتے رہتے ہیں مگر کامران نے ایک آخری بات بتا کر ہمیں چونکانے کے ساتھ تشویش میں مبتلا ضرور کر دیا ہے وہ ہے۔ ”بلیو ٹمسی...“

میجر باجوہ اتنا بتا کر خاموش ہوئے۔ میں اس عجیب نام پر ایک بار پھر الجھ کر رہ گیا۔ وہ آگے بولے۔ ”اس کے بارے میں بھی کامران کچھ زیادہ جان کاری نہیں کر سکا تھا۔ بس یہی بتایا کہ بلیو ٹمسی نامی کسی خفیہ تنظیم کے افراد اپیکزم کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کرنا چاہتے ہیں بلکہ کوئی بعید نہیں کہ بلیو ٹمسی نے اپیکزم کی خدمات لینے کے لیے اسے خاص اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے وطن عزیز میں ہائر کیا۔ ہم اس نام پر چونکے تھے۔ کچھ عرصے پہلے ”را“ نے پاکستان میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے ”بلیک کیٹس“ کو خفیہ کارروائی پر میدان میں اتارا تھا، جسے بری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا مگر افسوس ”بلیک کیٹ“ کے اصل مقاصد کیا تھے؟ یہ ہنوز جان کاری نہ ہو سکی تھی۔ اب اپنے طور پر ہمیں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بلیو ٹمسی ہی درحقیقت

''بلیک کیٹس'' کا دوسرا نام ہے۔ اس بار یہ نیک نئے پینترے کے ساتھ میدان میں کودی ہے اور اپنے کسی خفیہ اور دیرینہ ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے دوبارہ وطن عزیز کی جڑوں میں نئے کیل کانٹوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش میں مصروف کار ہے۔ ناکام بلیک کیٹس کا دوسرا اور نیا روپ دھارنے والی راٹی یہ ناچ رُ ''پہلوٹھی'' یعنی بلیو تمسی آخر ایسے کیا مقاصد رکھتی ہے کہ اسے فوری طور پر پہلی ناکامی کے بعد نام بدل کر دوبارہ میدان میں اترنا پڑا؟ ہم نے بھی تہیہ کر رکھا ہے کہ اس بار بلیک کیٹس یعنی بلیو تمسی کے مذموم خفیہ مقاصد کو بے نقاب کر کے ہی رہیں گے لیکن اپیکزم مانع آتی ہے۔''

''وہ کس طرح میجر صاحب؟'' میں نے فوراً کہا۔

''اپیکزم پر ہاتھ ڈالنا اب کون سا مشکل کام ہے؟'' میری بات پر وہ ہولے سے مسکرائے پھر بولے۔ ''اپیکزم نے خود کو بین الاقوامی سطح پر ایک ''معتبر ادارے'' کی صورت میں ڈیکلیئر کر رکھا ہے۔ بظاہر جس کا مقصد اپنے طور پر دنیا بھر کے تاریخی نوادرات کی حفاظت، نیز ایسے نوادرات بھی جو کسی ملک یا قوم کا تاریخی ورثہ ہوتے ہیں، گمشدگی یا برآمدگی کی صورت میں انہیں ان کے صحیح اور حق بجانب مقام پر رہنے دیا جائے، ان کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ اب تک یہ تنظیم یعنی اپیکزم بے شمار چوری شدہ نوادرات برآمد کر کے انہیں ان کے اصل ورثا تک پہنچا چکی ہے۔ اس تنظیم کو دنیا کے بیشتر ممالک کی مالی اعانت بھی حاصل ہے اور اس کے ممبر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس پر خفیہ طور پر ہی ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہے ورنہ عالمی سطح پر وطن عزیز کی بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک ''معزز ادارے'' کے خلاف کارروائی کرنے کی بنا پر ہمیں غیر مہذب کا ٹھپا لگا کر عالمی سطح پر بدنام کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''میجر صاحب! میرا خیال ہے کہ چودھری ممتاز خان اور وزیر جان ''اپیکزم'' کے مقامی سطح پر کلیدی اور اہم عہدے دار معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین پورا یقین ہے کہ کم از کم یہ دونوں تو ضرور اپیکزم اور اس کے بلیو تمسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہی ہوں گے۔ لہٰذا اگر ان دونوں اشخاص پر ہاتھ ڈالا جائے تو اپیکزم جیسے بظاہر معزز ادارے کی قلعی کھولی جا سکتی ہے۔''

''تمہارا پوائنٹ قابلِ غور ہے ینگ مین۔'' میجر باجوہ میری طرف دیکھ کر مخصوص مسکراہٹ سے بولے۔ ''ہم بھی اسی نقطے اور لائحہ عمل پر غور کر رہے ہیں مگر کھلے بندوں کارروائی کے مقابلے میں خفیہ کارروائی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس میں دامن بھی بچانا پڑتا ہے۔ ورنہ اس کے نتائج برعکس بھی نکلتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران ہم بال بال الٹے نتائج کی زد میں آنے سے بچے تھے۔ مگر اس طرح ہمیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ ''اپیکزم'' کے بارے میں خاصی حد تک معلومات حاصل ہوگئی تھیں مگر بات وہی آتی ہے کہ کھلے عام کارروائی کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔''

''میں جاننا چاہوں گا میجر صاحب کہ اپیکزم کے خلاف آپ کی پہلی خفیہ کارروائی میں آپ کو کیا معلومات حاصل ہوگئی تھیں؟'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ میری لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی دلچسپی پر وہ بولے۔

''ہشام جھنگری نامی ان کا ایک بہت فعال نمائندہ تھا۔ وہ ایک آرکیالوجسٹ تھا۔ اس کا تعلق اندرونِ سندھ کے علاقے لاڑکانہ سے تھا۔ بہت فرض شناس اور ذہین نوجوان تھا۔ اس نے اپنے شعبے کے حوالے سے کئی اچھے کام اور خدمات انجام دے کر اپیکزم کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ بھی کیا تھا مگر جیسے ہی اسے اپیکزم کے اصل اور درپردہ کالے کرتوتوں کی بھنک پڑی، وہ خاموشی کے ساتھ الگ ہوگیا۔ ہم اس کے آبائی شہر لاڑکانہ گئے تھے اس سے ملنے۔ اس نے ہی ہمیں اپیکزم کی کسی قدر حقیقت اور اصلیت کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی۔ جس قدر وہ جانتا تھا اس نے ہمیں بتا دیا۔ نیز آئندہ بھی اس نوجوان نے ہماری مدد کرنے کے عزم کا کھلے دل سے اظہار بھی کیا تھا۔ یوں سمجھو تمہاری طرح وہ بھی ہمارا ایک ایسا گمنام ساتھی ہے جو درپردہ رہتے ہوئے مگر عام لوگوں میں گھل مل کر ہمارے لیے کام کر رہا ہے مگر بدقسمتی سے پچھلے کچھ عرصے سے وہ لاپتا ہو چکا ہے یا پھر دانستہ روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ تاہم اس سے جتنی معلومات ہوگئی تھیں اس کے مطابق اپیکزم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے اور اس تنظیم کے ممبروں کو ضرورت کے وقت ایک ملک سے دوسرے ملک بھی بھیجا جاتا ہے۔''

''لیکن میجر صاحب! انہوں نے میرا مطلب ہے بلیو تمسی والوں نے اس ادارے پر اتنا تسلط کیسے قائم کیا ہوا ہے؟ مجھے تو یہ لوگ جرائم پیشہ اور انتہائی تربیت یافتہ لگتے

ہیں۔ آپ کا اور میرا ان سے ٹاکرا بھی ہو چکا ہے۔'' میں نے مداخلت کی۔

''سب بتا رہا ہوں تمہیں۔'' وہ مسکرائے۔ ''اس کے لیے مجھے سب سے پہلے تمہاری مثال دینا ہوگی۔''

''میری مثال؟'' میں نے الجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں شہزی! تمہاری مثال۔'' ان کے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ بکھری۔ ''تم اطفال گھر میں رہتے تھے اور جب تک ملک حاجی اسحاق صاحب مرحوم اس ادارے کے روحِ رواں تھے تو یہ ادارہ واقعی ایک فلاحی ادارے کے طور پر کام کرتا رہا لیکن جیسے ہی چوہدری ممتاز اور اس کے ایک پرانے گماشتے گنگل خان نے اپنے مذموم کاروبار اور گھناؤنے مقاصد کے لیے اس ادارے کو ''یرغمال'' بنا لیا تو پھر سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ پھر اطفال گھر ایک فلاحی ادارہ نہیں بلکہ جرم کا گڑھ بن گیا۔ عین اسی طرح بیوٹمسی والوں نے اس عالمی ادارے اسپیکٹرم کو اپنے گھناؤنے مقاصد اور مذموم سازشوں کے لیے use کر لیا اور اسے ''ہائی جیک'' کر ڈالا۔''

میں باجوہ صاحب کی بات پر ششدر سا رہ گیا۔ وہ بولتے رہے۔ ''اسپیکٹرم بھی کوئی ''دودھ کا دھلا'' ادارہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے بھی بعض ذاتی خفیہ مقاصد ہوتے تھے جو وہ گمشدہ نوادرات کی آڑ میں ملک ملک کی خدمت کا بیڑا اٹھا کر در پردہ حاصل کرتا رہتا تھا یعنی ملک کے راز، دفاعی امور سے متعلق خفیہ باتیں اور ایسے دیگر اہم راز وہ دوسرے ملک کو مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس ادارے پر امریکا ہی میں دو بار پابندی بھی لگی۔ اسے انڈر گراؤنڈ بھی ہونا پڑا مگر وہ عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ بڑی بڑی مضبوط مالی حیثیت کی ملکی و غیر ملکی شخصیات اسے سپورٹ کرتی تھیں۔ اس تنظیم کا بانی بھی ایک امریکی ہی تھا جس کے انتقال کے بعد ایک دوسرے امریکی لولووشی نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ خود امریکا کی انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیم کا ایک بڑا ''ڈان'' رہ چکا ہے۔ اسے اسپیکٹرم کا سربراہ بنانے میں بھی ہیکل اسٹار اور بیوٹمسی کا ہاتھ ہے۔ لولووشی اب خود ایک بڑی مضبوط اور پاورفل شخصیت بن چکا ہے۔ اپنے کالے کرتوت ڈھکنے کے لیے اس نے کاروبار میں بھی ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ وہ صیہونی سوداگروں کی ایک تنظیم ''جیوش بزنس میونٹی'' کی صدارتی کمیٹی کا ممبر بھی ہے۔ بیوٹمسی کی مالی اور دیگر سپورٹ کے نتیجے میں لولوشی نے اسپیکٹرم کو نئے سرے سے اور جدید خطوط پر منظم کیا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر لولوشی جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے اس لیے وہ بڑی بڑی مالیت کے سودے کرتا ہے جن میں ملک ملک کے کلیدی اور خفیہ عہدوں پر فائز عالمی شخصیات شامل رہتی ہیں۔ تاہم لولوشی نے اسپیکٹرم کو اب ایک خود مختیار ادارہ بنا دیا ہے۔''

باجوہ صاحب یہ ساری تفصیل بتا کر خاموش ہو گئے تو میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''باجوہ صاحب! یہ ساری باتیں آپ کو یقیناً کامران سے ہی پتا چلی ہوں گی؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ بولے۔ ''لیکن شہزی! حقیقت یہ ہے کہ کامران کو بھی ان باتوں کا علم نہ تھا۔ کیونکہ اسپیکٹرم کا کوئی بھی مقامی ایجنٹ سوائے دو مقامی عہدے داروں وزیر جان اور چوہدری ممتاز کے اسپیکٹرم سے متعلق اتنی حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ ثریا بھی نہیں اور ثریا نے ہی کامران کا ضمیر جگانے کی خاطر اسے یہ سب بتایا تھا جبکہ ثریا نے خود اپنے توسط سے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اسپیکٹرم کے یہ اہم راز جانے تھے۔ پتا نہیں اب وہ بے چاری کس حال میں ہوگی مگر میں سمجھتا ہوں ثریا نے ملک و قوم کی خاطر بڑا کام کیا ہے اور قربانی دی ہے۔ شہزی! کیا تم ثریا کی اتنی بڑی قربانی کو ضائع جانے دو گے؟''

''ہرگز نہیں، باجوہ صاحب ہرگز نہیں۔'' میں نے یک ترنت پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''ثریا بے چاری تو خود مجھے یہ ساری باتیں بتانا چاہتی تھی، میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ثریا ہی نہیں بلکہ اس کے چند اور بھی ہم خیال ساتھی ہیں، اب وہ کون کون ہیں یہ مجھے بھی معلوم نہیں لیکن میجر صاحب! خدا کرے ثریا ان کی قید میں ابھی تک زندہ ہو تو میں ضرور اسے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔''

''ویل اے پوائنٹ۔'' میجر باجوہ صاحب پورے جوش سے بولے۔ ''ہم بھی یہی چاہتے ہیں کسی طرح ثریا کو ان کے چنگل سے آزاد کرا لیا جائے تو نہ صرف مزید سنسنی خیز انکشافات سامنے آ سکتے ہیں بلکہ ثریا کے ذریعے اس کے ان ہم خیال ساتھیوں کا بھی پتا چل سکتا ہے جو ابھی تک اسپیکٹرم کے قابلِ اعتماد ایجنٹ سمجھے جاتے ہیں۔''

میں نے اپنے ذہن میں فوری طور پر ابھرنے والے ایک خیال کے تحت باجوہ صاحب سے کہا۔ ''میرا خیال ہے ثریا زندہ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے زیرِ تشدد ہوگی کیونکہ وہ اس کے ذریعے اس کے ہم خیال ساتھیوں کا بھی

نام اگلوانے کی کوشش کر رہے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ ثریا اس سلسلے میں کبھی بھی اپنی زبان نہیں کھولے گی چاہے اس کی جان ہی چلی جائے۔" یہ کہتے ہوئے میں خود بے چین سا ہو گیا۔ جی میں تو آئی کہ باجوہ صاحب کو اپنے آئندہ کے اہم مشن کے بارے میں بتا دوں لیکن میں نے سر دست ابھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وزیر جان پر اب میرا ہاتھ ڈالنا اور بھی اہم ہو گیا تھا چنانچہ میں نے باجوہ صاحب سے اجازت چاہی اور وعدہ کیا کہ میں ثریا کو اسمگلرز کی قید سے چھڑانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاؤں گا، آپ میرے لیے دعا کرنا۔

باجوہ صاحب نے مجھے ٹریننگ پر جانے کا بھی زور دیا تھا۔ ظاہر ہے ابھی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ تاہم میں نے پُرعزم مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے باجوہ صاحب سے کہا۔

"میجر صاحب! آپ بس میری کامیابی کی دعا کریں۔ اللہ نے مجھے اتنی صلاحیت دے رکھی ہے کہ میں بغیر کسی تربیتی عمل سے گزر کے اپنا نیک مقصد حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ کیونکہ میرا عزم میرا حوصلہ اور میرے حالات ہی میری تربیت گاہ اور میرا ہتھیار ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہا ہوں۔"

"گڈ! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" میجر ریاض باجوہ نے یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد میں اول خیر کے ساتھ رینجرز ہیڈ کوارٹر سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

باجوہ صاحب سے میری ملاقات خاصی سیر حاصل رہی تھی۔ جو باتیں انہوں نے مجھے بتائی تھیں اس کا ذکر میں نے اول خیر سے نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابھی کرنا چاہتا تھا۔ اسے میں نے صرف ممتاز خان سے جنگ کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ باجوہ صاحب سے میری ملاقات کیسی رہی تھی۔ اس کا میں نے اسے گول مول سا جواب دے دیا تھا۔

اب جلد از جلد وزیر جان کی گردن ناپنا از بس ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے مجھے بہت سے سوالوں کے جوابات حاصل ہو سکتے تھے، وہ میرا اہم ترین شکار بن چکا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اسے چھاپنا تھا اسے اپنے قابو میں کرنا تھا۔ اگرچہ جانتا تھا میں بھی کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے اور بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہو گا مگر وہ شہزی کیا جو خطروں سے پنگا لیے بنا چپکا بیٹھا رہے۔

لیکن وزیر جان والی مہم سے پہلے مجھے ڈپٹی روشن خان سے دو دو ہاتھ کرنا تھے، وہ بہت منہ چڑھنے لگا تھا یوں بھی مجھے اس سے بہت سے پرانے حسابات چکتا کرنا تھے۔ وہ میرے ساتھ "پولیس گردی" میں بہت آگے جا چکا تھا اور مجھے اس کی پولیس گردی کو آوارہ گردی سے نمٹنا تھا۔

جب ہم رینجرز کے ہیڈ کوارٹر سے نکلے تو شام گہری ہونے لگی تھی۔ ڈپٹی روشن خان اپنی سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب وہ پولیس میں ایک معمولی افسر ہوتا تھا تو اپنی ذاتی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ ڈپٹی بن جانے کے بعد اسے خاصا بڑا سرکاری بنگلا الاٹ ہوا تھا۔ اگرچہ میں بعض قانونی پیچیدگیوں سے اپنے بہی خواہوں کی مدد سے جان چھڑا چکا تھا اور آزاد تھا اور اب میری یہ حرکت مجھے دوبارہ کسی نہ ختم ہونے والے خطرناک قانونی گھن چکر میں پھنسانے کا باعث بن سکتی تھی لیکن روشن خان نے مجھے جس راستے پر چلنے پر مجبور کیا تھا اس راتب خور سے اس انداز میں نمٹنا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ وہ دنیا والوں کی نظر میں قانون کا رکھوالا بنا تھا مگر اس نے اپنی حرکتوں سے بڑے بڑے مجرموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت کے عقبی بیرونی احاطے میں اس کا بنگلا تھا۔ وہاں باقاعدہ پولیس کی چوکیاں قائم تھیں جدھر ہر وقت آٹھ آٹھ گھنٹے کا پہرا رہتا تھا۔

رات مزید گہری ہونے کا انتظار کرنے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہو گئے۔ سردی زوروں پر تھی۔ وقت سے پہلے اندھیرا چھا چکا تھا اور کہر آلود سخت سردی نے لوگوں کو گھروں کے اندر رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ سڑکوں پر سناٹا طاری تھا۔ میں اور اول خیر ایک رکشے میں سوار ہو کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے کسی نزدیکی مقام پر پہنچے۔ اس کے بعد رکشے والے کو فارغ کر کے آگے بڑھ گئے۔

ہماری یہ مہم بہت خطرناک اور رسکی تھی مگر رسک لیے بغیر ہمیں اپنے دشمن ساتھیوں کا کیسے پتا چل سکتا تھا۔ میں ڈپٹی روشن خان کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اگر پولیس کی وردی میں ماورائے قانون اور اپنے اختیارات سے تجاوز ہو کر بڑے دھڑلے سے میرے خلاف ہر قدم اٹھا سکتا تھا تو میں بھی اسے اسی انداز میں جواب دینا چاہتا تھا۔

اول خیر اور میں نے سردی سے بچنے کے لیے بھاری شالیں لے رکھی تھیں۔ ایک مقصد چہرہ چھپانا بھی تھا۔ ہم مٹرگشت کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ مطلوبہ رہائش گاہ سے پہلے پولیس چوکی ہمیں دور سے ہی نظر آ گئی۔ اس راستے

سے ہٹ کر ہم ایک چوڑی گلی میں آ گئے۔ یہاں گلی کے سرے پر ایک چھپر نما چائے خانہ تھا۔ جدھر مزدور طبقہ آ کر چائے پیتا تھا۔ ایک ٹیکسی اور دو تین رکشے بھی یہاں کھڑے دکھائی دیے۔ گلی سے نکلے تو ہم چوک کراس کر چکے تھے اور یہاں سے تقریباً پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہمیں روشن خان کی رہائش گاہ دکھائی دی مگر اس کے گیٹ پر نظر پڑتے ہی ہم بری طرح ٹھٹکے۔ گیٹ کھل رہا تھا اور اندر سے ایک کار برآمد ہو رہی تھی۔ ہم دائیں جانب کے مکانوں کی دیوار کی آڑ لیے تیز تیز قدموں سے ذرا آگے بڑھے تو ہمیں کار میں ڈرائیور اور اس کے برابر والی سیٹ پر ڈپٹی روشن خان عام شلوار سوٹ میں ملبوس بیٹھا نظر آیا جبکہ دو سادہ لباس میں پولیس والے بھی تھے جو پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ کار نئے ماڈل کی چمچماتی تھی، رنگ سیاہ تھا۔ یہ ہنڈا اکارڈ تھی۔

"او خیر کا کا یہ کدھر چلا ہے؟"

"ہم آج ہی اس سے ارشد وغیرہ کے سلسلے میں ملے ہیں، مجھے لگتا ہے یہ ان تینوں کا کوئی بندوبست کرنے نکلا ہے۔" میں نے اندازہ قائم کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر کا کا! ہمارے پاس تو گاڑی نہیں۔ اس کا تعاقب کیسے کریں گے؟" اول خیر کو پریشانی سی لاحق ہونے لگی۔ کار دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی گیٹ سے باہر آ کر ذرا دیر کو رکی تھی اور گیٹ کا مسلح چوکیدار بڑی مستعدی کے ساتھ روشن خان کی کھڑکی کے قریب جھکا اس کی کوئی ہدایت وغیرہ سن رہا تھا۔

"آؤ اول خیر، جلدی۔" میں نے سرسراتے اور جوش بھرے لہجے میں کہا اور پلٹا۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک رکشا لیا اور کسی فرضی جگہ کا نام بتا کر اس میں سوار ہو گئے۔ ہم نے رکشے والے کے ساتھ کیا کرنا تھا یہ میں اول خیر کے ساتھ طے کر چکا تھا۔ اپنے چہرے ہم نے نصف حد تک چھپا رکھے تھے۔ اس پر رکشے والا ذرا چونکا تھا مگر ہمارے رکشے میں سوار ہوتے ہی بھاؤ تاؤ کی دردسری سے بچنے کی خوشی میں اس نے فوراً رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

سامنے مین روڈ آ گئی رکشا ذرا رکا۔ ٹھیک اسی وقت عقب سے وہی سیاہ کار گزری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کار کا ڈرائیور مستعد تھا۔ مجھے تسلی تھی، کار کے مقابلے میں ایک رکشا والے پر تعاقب کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مین روڈ پر آ کر کار فراٹے بھرنے لگی۔ رکشا اس کے پیچھے تھا۔ اول خیر نے پستول نکال کر اس کی نال رکشے والے کی گدی سے لگا دی اور غرایا۔ "یہ جو سامنے سیاہ کار گزری ہے، تجھے اس کا تعاقب کرنا ہے رفتار بڑھا۔"

رکشے والا بُری طرح بدک گیا۔ میں نے بھی اس کی گردن پر اپنے ہاتھ کا شکنجہ سہلانے کے انداز میں رکھتے ہوئے دھمکی دی۔ "سوچنے میں وقت برباد مت کرو ورنہ تجھے ادھر ہی ہلاک کر کے تیرا رکشا لے اڑیں گے۔"

"او جی میرا رکشا بھلا اس کار کا مقابلہ کیسے کرے گا؟" وہ خوف سے گھگھیانے کے انداز میں بولا۔ "تو اول خیر غرایا۔

"اوئے چالاکی نہ کر زیادہ۔۔۔ کوئی کار اور رکشے کی ریس کا مقابلہ نہیں ہو رہا ہے سمجھا تو۔"

"میرا خیال ہے یہ ایسے نہیں مانے گا اس کے سر میں گولی اتار کر رکشا لے اڑو۔" میں نے دانستہ رکشے والے پر خوف کا نفسیاتی دباؤ ڈالتے ہوئے اول خیر سے کہا تو میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس نے فوراً رکشے کی رفتار بڑھا دی تاہم پھر بھی گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "او جی! میں غریب آدمی ہوں کسی لمبے رولے شولے میں نہ ڈال دینا۔"

"چلتے چلو اور جیسے کہوں ویسے ہی کرتے رہو تو کوئی رولا، سیاپا نہیں ہوگا۔" اول خیر نے کہا مگر باز وہ بھی نہ آیا، منمناتے ہوئے بولا۔

"پر تم اس کار کا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ کیا اسے ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

"ابے اب اپنی رکشے جیسے آواز والی چونچ بند رکھ، ہم کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتے۔ بس ان کا خفیہ ٹھکانا دیکھنا چاہتے ہیں۔" اول خیر دانت بھینچ کر بولا۔

مین روڈ پر رکشا، رواں ٹریفک کے درمیان دوڑتا رہا۔ ہماری نظریں ڈپٹی روشن خان کی کار پر جمی ہوئی تھیں۔ دو تین سگنلز بھی آئے۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کار کسی کھلی سڑک یا مضافات کی طرف نہ نکل جائے ورنہ ایک رکشے میں تیز رفتار کار کا تعاقب مشکل ہو جاتا۔ شکر تھا کہ ایسا نہیں ہوا۔ کار بیس پچیس منٹ بعد مختلف موڑ کاٹتی ہوئی ایک نو تعمیراتی پروجیکٹ والے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں نو تعمیر شدہ بنگلے اور کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں کچھ آباد کچھ غیر آباد تھیں۔

کار جس سفید رنگ کے بنگلے کے گیٹ کے باہر رکی تھی وہ نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھا اور آس پاس بیشتر پلاٹ خالی پڑے تھے۔ چند ایک کوٹھی بنگلے نظر آتے تھے۔ ان میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یقیناً وہ بے مکین تھے۔ البتہ چوکیدار باہر چارپائی ڈالے ضرور نظر آ رہے تھے۔

رکشے والے کو ذرا دور روک کر ہم اتر گئے۔ اور اسے کرایہ مع کچھ دھمکیاں دے کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ اسے کرائے سے زیادہ اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ فوراً وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ میں اور اول خیر آگے بڑھنے لگے۔ ہم دونوں سیاہ شالوں میں ملفوف ہونے کی وجہ سے تاریکی کا ہی حصہ نظر آرہے تھے۔

غیر آباد اور کچھ ادھوری رہائشی عمارتوں کے ڈھانچوں کی آڑ لیتے ہوئے میں اور اول خیر جب تک مطلوبہ بنگلے کے قریب پہنچے تب تک کار سوار اتر کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ گیٹ ہنوز بند ہی تھا۔ صرف بغلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک چوکیدار نما آدمی ہاتھ میں بڑا سا موٹا ڈنڈا سنبھالے اندر سے نکل کر باہر کار کے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

”کاکا! کام آسان ہی نظر آتا ہے۔ چل پہلے اس ڈنڈے بردار سے نمٹتے ہیں۔“

اول خیر نے سرگوشی کی۔ میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈپٹی روشن خان کو اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا ویسے بھی اسے کیا معلوم تھا کہ کوئی اس طرح اس کی کار کا تعاقب کر کے یہاں پہنچ سکتا ہے۔

ہم دونوں چیتے کی طرح خاموشی سے رینگتے اور جھکے جھکے انداز میں ڈنڈا بردار چوکیدار کے دائیں بائیں بیک وقت گویا بجلی کی طرح کڑکے۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے آہنی بازوؤں کا شکنجہ کسا جبکہ اول خیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا فولادی دستہ اس کی کنپٹی پر جڑ دیا۔ وہ میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ میں اسی طرح اسے گھسیٹتا ہوا بنگلے کی شمالی دیوار کے پیچھے لے گیا اور وہاں ایک کونے میں اس کے بے سدھ وجود کو ڈالنے کے بعد اول خیر کے پاس پہنچا تو اس نے چوکیدار کا ڈنڈا اٹھا رکھا تھا۔ وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کاکا! یہ تو سنبھال لے۔ کام آئے گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے ڈنڈا لے لیا۔ بغلی گیٹ آدھ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکنا چاہا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ مجھے ایک ہلکی چیخ سنائی دی تھی۔ بالکل بھنچی بھنچی سی چیخ تھی وہ... کیونکہ اس کے فوراً بعد وہ چیخ گھٹ کر رہ گئی تھی البتہ سی کی غراہٹ سے مشابہ بولنے کی آواز ابھری تھی۔ یوں جیسے کوئی دھتکار رہا ہو۔ یکلخت میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز ڈپٹی روشن خان کی تھی۔ تب پھر بنگلے کا مرکزی دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ کے ساتھ کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ مرکزی دروازے اور گیٹ تک میں تیس گز کا احاطہ تھا جہاں پھلواری نظر آتی تھی وہاں ایک دو الیکٹرک پول نصب تھے جن پر گلوب روشن تھے۔ ان کی روشنی میں ایک جیپ بھی کھڑی نظر آئی۔ مذکورہ دروازے سے کچھ افراد برآمد ہوئے اور میں انہیں دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے عقب میں موجود اول خیر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

نمودار ہونے والے افراد میں ڈپٹی روشن خان، اس کے دو سپاہی، باقی دو سادہ وردی میں اس کے کارندے تھے جبکہ باقی دو ہمارے ساتھی، شوکت حسین عرف شوکی اور اس کی بہن شکیلہ تھے۔ ارشد دکھائی نہیں دیا، مجھے تشویش ہوئی۔

”تت... تت... تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ ہمیں مارنا چاہتے ہو؟“

میں نے شوکی کو خوف سے ہکلاتے کہتے سنا۔ مجھے اس کی حالت خاصی پتلی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ یہاں رہتے ہوئے بھیانک مناظر دیکھنے کے تجربات سے گزرا ہو۔ شکیلہ بھی خوف زدہ نظر آرہی تھی، شوکی زیادہ مچل رہا تھا۔ دونوں کو سختی کے ساتھ دبوچ رکھا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں۔ ڈپٹی روشن نے اچانک اپنی قمیص کے اندر چھپے ہولسٹر سے ایک پستول نکال لیا۔ میں اس کی بھی نال دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ وہ شوکی کے چہرے کی طرف کر کے سفاکانہ غراہٹ سے بولا۔ ”اگر تم نے واویلا کرنا بند نہ کیا تو...“

اس کی آواز درمیان میں رہ گئی۔ شوکی کو شاید وقت سے پہلے اس سفاک حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ انہیں ملک عدم روانہ کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ وہ آخری بار زور سے مچلا... اور اپنا ایک بازو چھڑاتے ہی اس نے ڈپٹی کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ ڈپٹی روشن کو اس حرکت کی توقع نہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے شوکی کے ہاتھ میں اس کا سائلنسر لگا پستول آ گیا۔ مگر اسے فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا، اس سے قبل روشن خان کے ایک کارندے نے اپنے پستول سے اس پر فائر کر دیا جو اسے دبوچے ہوئے تھا، نہ جانے کس وقت اس نے خطرہ بھانپتے ہی پستول نکال لیا تھا۔ بہت قریب سے گولی چلی تھی اور شوکی کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی کربناک تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

بیوٹی

ایس... انور

جب بات ذاتی مفادات کی پاسداری کی ہو... یا پھر اس مقصد کی جسے پانے سے زندگی کے دھارے میں بڑی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہیں... تو پھر قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں... چاہے وہ کتنی ہی مہلک کیوں نہ ہوں... اپنے مخالف کے حاصل کردہ اسٹیٹس... شہرت اور کامیابی کو برداشت کرنا دشوار تر ہوتا ہے... وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی... مگر ایک حد پر آکے اس کی اعصابی جنگ نے ہتھیار ڈال دیے...

ایک گمشدہ شلٹ کی کہانی جس میں پراسراریت بھی ہے اور سراغ رسی بھی...

''مجھے سمجھنے دو کہ تم کیا چاہ رہی ہو تا کہ پورا معاملہ مجھ پر مکمل طور پر واضح ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

... ڈاؤن ٹاؤن آفس میں میرے مقابل بیٹھی ہوئی نیلی آنکھوں والی لینسی بشپ نے اپنی پلکیں جھپکائے بغیر صرف اثبات میں سر ہلا دیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ میں اپنی بات جاری رکھوں۔

''تم مجھ سے ایک بیس سال پرانے قتل کی تحقیق کروانا چاہتی ہو۔ یہی بات ہے نا؟''

''یہ صرف ایک قتل کی بات نہیں ہے، سراغ رساں جونز۔ میں تم سے اپنی ماں کی موت کے بارے میں چھان بین کرانا چاہ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ بات بڑی عجیب سی لگے گی لیکن یقین کریں اگر میں یہ محسوس نہ کرتی کہ تحقیق ضروری ہے تو میں یہاں تمہارے پاس کبھی نہ آتی۔''

میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''جب میری ماں کی موت واقع ہوئی تو اس وقت میری عمر صرف آٹھ سال تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ لمحہ کسی بچے کی معصوم زندگی میں کیا قیامت برپا کر دیتا ہے؟'' ٹینسی نے پوچھا۔

جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو ٹینسی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا اور بولی۔ ''نہیں، میرے خیال سے تم نہیں جانتے۔ مجھے ایسے زیادہ لوگ نہیں ملے جو اس بات کو سمجھتے ہوں جب آپ چھوٹے ہوتے ہیں تو آپ یہ سوچ کر سونے کے لیے بستر پر نہیں جاتے کہ اب آپ کبھی اپنی ماں کو نہیں دیکھ پائیں گے لیکن میرے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں اپنی ماں کو پھر کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی تو میں اس کے سینے سے دیر تک چمٹی رہتی، اس سے بھرپور پیار کرواتی، اپنے رخساروں کو اس کے بوسوں سے سرخ کرواتی، اس سے اتنا پیار مانگتی کہ...'' یہ کہتے ہوئے ٹینسی کی آواز رندھ گئی اور اس کی نیلی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے۔

میں خاموش بیٹھا اس کی جذباتی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ ٹینسی نے اپنے بیگ کو کھولا اور اسے ٹٹولتے ہوئے ایک رومال نکال کر اپنے آنسوؤں کو خشک کرنے لگی پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ ''یہ ہمیشہ میری حماقت رہی کہ میں لوگوں کی اس بات پر یقین کر لیتی تھی جو یہ کہہ کر مجھے دلاسا دیتے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ میرے زخم مندمل ہو جائیں گے اور میں اس بوجھ کو ہلکا محسوس کرنے لگوں گی لیکن بدقسمتی سے میں آج بھی 20 مارچ 1954ء کی اس شب پر کھڑی ہوں جب میری ماں کی موت واقع ہوئی تھی۔''

''لیکن اب کیوں ٹینسی؟'' میں نے پوچھا۔ ''اب تو اتنا بہت سا وقت گزر چکا ہے؟ کیا اس لیے کہ تمہاری ماں کی بیسویں برسی آرہی ہے؟''

ٹینسی نے ایک بار پھر رومال سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کو پونچھا اور گیلے رومال کو واپس اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''بات صرف اس حد تک نہیں بلکہ اس سے بھی بہت آگے کی ہے، سراغ رساں جونز مجھے تشفی چاہیے اور یہ تشفی اس وقت تک نہیں ہوگی جب تک میری ماں کے قاتل کو تلاش نہیں کر لیا جاتا۔''

''کیا یہ کیس حل نہیں ہوا تھا؟''

''اوہ، یہ کیس حل ہو گیا تھا اور اس جرم میں میرے باپ کو حراست میں لے لیا گیا تھا اور بعد میں انہیں مجرم قرار دے دیا گیا تھا۔ کئی سال تک مجھے بھی یقین رہا کہ ماما کے قتل کے ذمے دار وہی ہیں لیکن گزشتہ برس معاملات بدل گئے۔'' ٹینسی نے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''گزشتہ برس ایسا کیا ہوا تھا جو معاملات بدل گئے؟''

''میرے باپ نے مجھے جیل سے لکھا کہ انہیں میری مدد درکار ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے پاس اس بات کا ثبوت ہے جو ان کی بے گناہی ثابت کر دے گا۔ ان کے اس خط نے مجھے حقیقت میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سراغ رساں جونز اور میرا ذہن واپس 20 مارچ 1954ء کی اس شب کی طرف چلا گیا جب اسی شب میری ملاقات اپنے باپ سے بھی ہوئی تھی۔ گو میں نے ان کے ساتھ اپنی اس شب کی ملاقات کو یاد کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ مجھے اپنے باپ سے ملاقات کا منظر یاد آ گیا۔ یہ ملاقات گھر پر ہی ہوئی تھی۔ ہم دیر تک پارچیسی اور چائنیز چیکرز کھیلتے رہے تھے پھر ڈیڈی نے رات کو سونے کے لیے بستر پر لٹا دیا تھا۔ میں ان کے ساتھ تھی، تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''تب میرا مشورہ ہے کہ تم وہیں سے اپنے تجسس مٹانے کا آغاز کرو، ٹینسی۔ اپنے باپ سے بات کرو ثبوت اور شواہد اکٹھے کرو اور...''

وہ اپنی کرسی پر آگے کی طرف جھک گئی اور اس کی نیلی حسین آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''میں یہ نہیں کر سکتی۔''

''کیوں نہیں کر سکتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔''

میں نے اپنی میز کی دراز کھولی، ایک زرد لیگل پیڈ اور قلم نکالا اور ٹینسی کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے وہ سب کچھ لکھ کر بتا دو جو تم جانتی ہو۔''

''میں کہاں سے آغاز کروں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے شانے اچکا دیے۔ ''بالکل ابتدا سے... کیا خیال ہے؟''

☆☆☆

''میری ماں ڈورس گلیسپی تھی۔ کبھی ان کے بارے میں سننے کا اتفاق ہوا؟''

اس وقت تک جینسی خاصی حد تک پُرسکون ہو چکی تھی اور ہم دونوں بڑے بڑے مگوں میں بلیک کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی لوری سنا رہا ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "آئی ایم سوری، نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میرے خیال سے تمہارا ان کے نام سے واقف ہونا کوئی ضروری بھی نہیں۔ وہ ایک پن اپ گرل تھیں۔ حسین اور جنسی کشش کی حامل انہوں نے کئی میگزینز اور چند کیلنڈروں کے لیے پوز دیے تھے اور تصویریں کھنچوائی تھیں۔ کلب میں ہیجان انگیز رقص بھی پیش کیے تھے اور یقیناً انہیں پذیرائی بھی ملی تھی اور شہرت بھی لیکن صرف مقامی طور پر البتہ ان کی صلاحیتوں کے بارے میں سب ہی کا خیال تھا کہ یہ صرف مقامی طور پر محدود نہیں رہنی چاہیے۔ اسے وسعت ملنی چاہیے اپنے مرنے سے عین قبل وہ ایک چھوٹے بجٹ کی بی مووی سے ایک کردار کا ٹیسٹ دینے کے لیے کیلی فورنیا پرواز کا پلان بنا رہی تھیں۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس میں لازمی کامیاب ہو جاتیں۔" جینسی نے یہ کہہ کر اپنے بیگ میں سے ایک فولڈر نکالا اور میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ "یہ میری ماں کی تصویریں ہیں۔"

میں نے فولڈر کھولا اندر پیشہ ورانہ تصویروں کا ایک ڈھیر تھا۔ بیشتر تصویریں رنگین تھیں۔ تصویروں میں موجود عورت بلاشبہ بلا کی حسین تھی۔ ڈرامائی کاسمیٹکس... میک اپ، گھنگریالے سنہری بال، جھیل سی نیلی آنکھیں... ہر تصویر ایک شاہکار تھی۔ اس کا سراپا انتہائی جاذب نظر تھا اور پرانے ہالی ووڈ کے گلیمر کے دور پر بالکل فٹ بیٹھ رہا تھا۔

جب تصویریں دیکھنے کے بعد میں نے فولڈر پر سے نگاہ اٹھا کر جینسی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔

"تصویروں میں وہ سرخ گلاب دیکھا؟ یہ ماما کا ٹریڈ مارک تھا جب وہ صرف ماما ہوتی تھیں تب بھی اس کے بغیر کہیں نہیں جاتی تھیں۔ چاہے انہیں مارکیٹ جانا ہوتا تھا یا پوسٹ آفس۔ وہ اپنے بالوں میں سرخ گلاب لازمی لگا لیتی تھیں۔ مقامی لوگ انہیں بیوٹی کہہ کر پکارتے تھے۔"

"یہ خطاب ان کے لیے نہایت موزوں اور قطعی درست تھا۔" میں نے فولڈر بند کرتے ہوئے کہا۔ "وہ واقعی بے حد حسین تھیں۔ تم نے اپنی آنکھیں ان ہی سے لی ہیں۔"

"تھینک یو... بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنے باپ سے مشابہت رکھتی ہوں۔" یہ کہہ کر جینسی نے ایک آہ بھری۔ "جب میری ماں کا انتقال ہوا تو اس وقت ان کی عمر صرف پچیس برس تھی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ میں ان کے لیے ایک سرپرائز تھی اور اس کے نتیجے میں میرے والدین نے نوعمری... میں شادی کر لی تھی اور اس کے باعث میری ماں کو اپنے امید افزا مستقبل کو بڑھاوا دینے میں کوئی مدد نہیں ملی لیکن اس کے باوجود بھی وہ کبھی اپنے خواب سے دستبردار نہیں ہوئیں۔ چاہے وہ ڈنر تیار کر رہی ہوں یا کپڑے ستہ کر رہی ہوں یا مجھے اسکول لے جا رہی ہوں۔ ان کا خواب سوتی جاگتی آنکھوں کا خواب بنا رہتا تھا۔"

"تمہارے والدین کے آپس میں تعلقات کیسے تھے؟ تمہارے اپنے تناظر میں؟" میں نے سوال کیا۔

جینسی نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ کہنا مشکل ہوگا، ہے نا؟ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ہم بہت کم وقت اکٹھے گزارتے تھے۔ اس لیے کہ میرے ڈیڈی ہمیشہ اپنے کام میں مصروف رہتے تھے اور ماں کی اپنی خواہشات اور امنگیں تھیں۔ میں ان کے ساتھ وقت تو گزارتی تھی لیکن علیحدہ علیحدہ۔ کیا اس سے بات سمجھ میں آتی ہے؟"

"بالکل سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا ان میں تکرار ہوتی تھی؟ لڑائی جھگڑا؟ کیا گھر میں مار پیٹ بھی ہوتی تھی؟"

"کئی بار کی تکرار تو مجھے یاد ہے جو ہمیشہ رات گئے ہوتی تھی جب وہ سمجھتے تھے کہ میں سو چکی ہوں البتہ میں نے انہیں کبھی ہاتھا پائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن کسی کو کیا پتا کہ بند دروازوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے؟ جب میری عمر سات برس کی تھی تو میرے والدین میں علیحدگی ہو گئی تھی اور مجھے ہمیشہ سے یہی یقین تھا کہ معاملہ ان کی عمروں اور حالات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میرا نہیں خیال کہ ڈیڈی میری مما کی ترجیحات کو پسند کرتے تھے۔ اگر میری مما ایک نچلی مڈل کلاس سوسائٹی تک محدود اور مطمئن رہنے پر آمادہ ہو جاتیں اور سیدھی سادی گھریلو خاتون اور ایک ماں کا کردار ادا کرنے پر رضامند ہو جاتیں تو ان کی شادی آج کے دن تک برقرار اور قائم رہتی۔ کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ میں بس یہی جانتی ہوں میری ماں کبھی بھی متوسط یا عام زندگی گزارنے پر رضامند نہیں تھیں اور جب میرے ڈیڈی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو مجھے اپنی ماں کو کم کم، بہت کم دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ میں تب بھی ان سے بہت محبت کرتی تھی اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے جتنا ان سے بہتر ہو سکتا تھا اپنے

تھیں کیا لیکن میری اپنی ماں کے بارے میں کوئی زیادہ بڑی غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ وہ ایک اسٹار بننا چاہتی تھیں اور میں ان کی راہ میں ایک رکاوٹ تھی۔''

میں اپنے لیگل پیڈ پر چند نوٹس تحریر کرتا رہا جبکہ ٹینسی اسی دوران اپنی کافی کی چسکیاں لیتی رہی۔

''اپنے ڈیڈی کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''علیحدگی کے بعد کیا ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی؟''

''بالکل رہتی تھی۔'' ٹینسی نے کہا۔ ''عام طور پر میری دیکھ بھال میری آیا مس کولنز کیا کرتی تھی لیکن جب میری ماں شام کے بعد گھر سے چلی جاتی تھیں تو میرے ڈیڈی گھر آجایا کرتے تھے... آیا اور ڈیڈی.... میرے سونے کے وقت تک پاس رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ میری ماما کے گھر واپس آنے سے پہلے گھر سے چلے جاتے تھے کیونکہ ان کے درمیان معاملات مزید بدتر ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان حقیقت میں ان کی شادی کے دوران اتنے جھگڑے بھی نہیں ہونے تھے جتنے کے علیحدگی کے بعد ان کے مابین ہونے لگے تھے۔''

''غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ تمہارے ڈیڈی اس شادی کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' میں نے کہا۔

ٹینسی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میرا خیال بھی یہی ہے۔ تم خود دیکھ چکے ہو کہ میری ماں کتنی خوب صورت اور حسین تھی۔ یہ بات میرے ڈیڈی کے لیے بے انتہا مشکل کا باعث رہی ہوگی کہ وہ ان سے رشتہ ختم کرنے کو برداشت کرتیں۔''

''میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارے لیے کافی مشکل بات ہوگی لیکن پھر بھی تم نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے 20 مارچ کے واقعات کو پوری توجہ اور دھیان سے ایک بار پھر بیان کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اس رات کے بارے میں مجھے وہ ہر بات تفصیل سے بتادو جو تمہیں یاد ہے۔''

ٹینسی نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا۔ جب اس نے اپنا کافی کا کپ میری میز کے کنارے پر رکھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ''ماما نے اس روز ایک پرائیویٹ فوٹو سیشن کا اہتمام کیا تھا۔ وہ اپنے پورٹ فولیو کے لیے نئی تصاویر چاہتی تھیں اور وہ ٹھیک چار بجے سہ پہر گھر سے نکل گئی تھیں۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ وہ کیسی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں بیرونی لان میں کھیل رہی تھی جب وہ تیزی سے چلتی ہوئی گھر سے باہر آئیں۔ انہوں نے اپنے بال نہایت نفیس انداز میں سنوارے ہوئے تھے۔ وہ ایک نیا لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ایسا بھڑکیلا لباس میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس پر بڑی بڑی سرخ چیریز بنی ہوئی تھیں اور شانوں پر انہوں نے ایک چھوٹا سرخ رنگ کا کارڈیگن سویٹر پہنا ہوا تھا۔ میں انہیں الوداع کہنے کے لیے ان کی جانب دوڑ پڑی لیکن وہ اتنی پیاری، اتنی حسین اور عمدہ خوشبو میں بسی دکھائی دے رہی تھیں کہ مجھے ان کو چھوتے ہوئے ڈر سا لگنے لگا۔ انہوں نے مجھے پیار کیا۔ مجھ سے کہا کہ میں ایک اچھی لڑکی ہوں اور وعدہ کیا کہ صبح ناشتے میں ہم سب مل کر ایک بڑا سا چیز کیک کھائیں گے پھر وہ اپنی پرانی بے بی بلیو شیورلیٹ میں جا بیٹھیں اور کار اسٹارٹ کرکے روانہ ہوگئیں.... میں دوڑتے ہوئے گیٹ تک چلی گئی اور اس وقت تک ان کی کار کو دیکھتی رہی جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ میں اپنی ماما کے رخصت ہونے کی عادی ہوچکی تھی اور کبھی اس طرح انہیں الوداع نہیں کہتی تھی لیکن اس شام.... ویل، وہ میرا انہیں رخصت کرنے کا انداز کسی قدر مختلف تھا پھر اس کے بعد میں انہیں کبھی نہیں دیکھ پائی۔''

''لیکن اس رات تم نے اپنے ڈیڈی کو تو دیکھا تھا؟''

''ماما کو گھر سے گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈیڈی آگئے۔ وہ مجھے آئس کریم کھلانے کے لیے باہر لے جانا چاہتے تھے لیکن آیا کا خیال تھا کہ وہ مجھے باہر نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ ماما کو یہ گوارا نہیں تھا کہ میں ڈیڈی کے ساتھ باہر جاؤں۔ ڈیڈی آئس کریم لینے چلے گئے اور آئس کریم لے کر گھر آگئے۔ ہم فرنٹ پورچ پر بیٹھ گئے اور وہیں بیٹھ کر آئس کریم کھانا شروع کردی۔ ہم دونوں گھنٹوں وہیں بیٹھے رہے... صرف ہم دونوں حتیٰ کہ سورج ڈوب گیا۔ وہ دیر تک رکے رہے اور ہم نے مختلف کھیل کھیلے... ہم نے سیر ہوکر کھانا کھایا اور پھر وہ چلے گئے اور... گزشتہ سال سے پہلے میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

ٹینسی کی نظریں کھڑکی سے باہر جمی ہوئی تھیں۔ وہاں باہر لوگ مین اسٹریٹ پر تیزی سے اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ کچھ نے بارش سے بچنے کے لیے اپنے سروں کے اوپر اخبارات کی آڑ لی ہوئی تھی جبکہ بہت سے چھتریاں تھامے رواں دواں تھے لیکن میرے خیال میں ٹینسی کی توجہ ان لوگوں پر نہیں تھی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

پھر وہ خود ہی گویا ہوئی۔ ''اگلے روز صبح جب میں نیند سے بیدار ہوئی تو ماما گھر پر نہیں تھیں۔ آیا وہیں موجود تھی

اور بہت سے پولیس افسران بھی۔ تب ہی مجھے پتا چلا کہ میری ماں جاچکی ہیں اور وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی۔ میری ڈیڈی کو قتل کے الزام میں پہلے ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس کے بعد میری پرورش میری بڑی پھوپی نے کی۔ وہ ایک اچھی خاتون تھیں لیکن ہم نے آپس میں کبھی میری ماں، اس رات یا میرے باپ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔"

"سو تم اس یقین کے ساتھ پروان چڑھیں کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟"

"بلاشبہ، میں بھلا اور کس بات پر یقین کرتی؟ ان برسوں کے دوران میں انہوں نے کئی بار مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں ان سے بات کرنے سے انکار کرتی رہی حتیٰ کہ گزشتہ دسمبر میں مجھے ان کا خط موصول ہوا۔ ڈیڈی نے خط میں لکھا تھا کہ وہ کینسر سے مرنے والے ہیں اور انہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے میری مدد کی ضرورت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔

میں خاموشی سے مینسی کی بات سن رہا تھا۔

وہ خود ہی اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تب میں ہر ہفتے ان سے ملنے کے لیے ان کے پاس جاتی رہی حتیٰ کہ ایک روز ان کا انتقال ہوگیا تب تک مجھے ان کی بے گناہی پر یقین آنے لگا تھا مسٹر اسراغ رساں جوزف۔"

"اس یقین کی وجہ؟"

"وہ قریب المرگ بیمار تھے۔ وہ اپنا سب کچھ کھو چکے تھے۔ وہ تقریباً بیس سال سے اسیری کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس موقع پر انہیں جھوٹ بول کر کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ وہ اس بوجھ کے ساتھ مرنا نہیں چاہتے تھے کہ میں بھی انہیں مجرم سمجھتی رہوں جیسا کہ میں انہیں تمام زندگی سمجھتی رہی تھی۔ میں نے ان کی مدد کرنے کے لیے بے انتہا کوشش کی لیکن مجھے ہر موڑ پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ پولیس کے محکمے نے بھی میری کوئی مدد نہیں کی۔ کوئی بھی بیس سال پرانے کیس کو دوبارہ سے کھولنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا جو کہ ایک صاف ستھرے طریقے سے حل کیا جاچکا تھا۔"

میں نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "اس کے علاوہ اس بات کا امکان بھی زیادہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کیس پر کام کیا تھا، وہ اب محکمے سے وابستہ ہی نہ ہوں۔"

"ہاں۔" مینسی نے اپنا رخ میری جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "میں بس ہار مان لوں اور آگے بڑھنے کی کوشش کروں لیکن لگتا ہے کہ مجھ سے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے ڈیڈی کی یاد میں بس یہی ایک کام کرسکتی ہوں کہ ان کی بے گناہی کے دعوے کو درست ثابت کرسکوں اور میں حقیقت اور سچ بھی جاننا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر مینسی نے اپنے بیگ میں سے کاغذات کا ایک پلندہ نکالا اور میز پر میری جانب کھسکا دیا۔ "میں نے پولیس کی رپورٹس حاصل کرلی ہیں۔ ان کے نیچے اخبارات کے تراشے کلپ کیے ہوئے ہیں۔"

پھر مینسی نے خاموشی اختیار کرلی۔

میں نے ان پرانے کاغذات کا جائزہ لینا شروع کردیا جو برسوں پہلے پیٹرس کاؤنٹی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں فائل کیے گئے تھے۔ "ان کاغذات میں تمہاری ماں کی موت کا وقت رات گیارہ بج کر ستاون منٹ تحریر ہے، کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے تمہیں سونے کے لیے کس وقت بیڈ پر لٹایا تھا؟"

"میرے سونے کا وقت رات آٹھ بجے کا تھا لیکن اس رات انہوں نے مجھے نو بجے کے بعد بیڈ پر لٹایا تھا جو میرے معمول کے وقت سے خاصا دیر کا تھا۔" مینسی نے بتایا۔

میں نے رپورٹس ایک طرف کھسکا دیں اور بولا۔ "اگر تمہارے ڈیڈی نے تمہیں نو بجے بیڈ پر لٹا دیا تھا اور تم نے انہیں رخصت ہوتے سن لیا تھا تو پھر کس بنا پر تم یہ سوچ رہی ہو کہ انہوں نے تمہاری ماما کو قتل نہیں کیا ہوگا؟ ان کے پاس یقیناً اس کام کے لیے ایک عمدہ موقع دستیاب تھا۔"

"جب تک میں نے ڈیڈی سے بات نہیں کی تھی میرا بھی یہی خیال تھا۔ انہوں نے اعتراف کیا تھا کہ رات دس بجے کے بعد وہ دوبارہ گھر آئے تھے۔ آیا سے مکمل ملاقات کے لیے وہ دونوں ہی ساتھ تھے جب گیارہ بجے کے بعد کسی وقت میری ماں نے فون کیا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے سراغ رساں جوزف۔ کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی... میرا خیال ہے کہ وہ شور و غل تھا مجھے یاد ہے کہ مجھے ڈیڈی کی آواز سنائی دی تھی۔ انہوں نے اقرار کیا تھا کہ فون پر ان کے اور میری ماں کے درمیان بڑی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ ماما نے ان سے کہا تھا کہ وہ گھر واپس آرہی ہیں اور بہتر ہوگا کہ ان کے گھر پہنچنے تک وہ وہاں سے چلے جائیں لیکن وہ نہیں گئے انہوں نے ماما کے پہنچنے کا انتظار کیا اور آیا کے ساتھ ہی رہے لیکن جب ماما رات ایک بجے تک گھر نہیں پہنچیں تو وہ آخرکار وہاں سے چلے گئے۔"

"بدقسمتی سے یہ کوئی بات ثابت نہیں کرتی مینسی یہ سب سنی سنائی بات ہے۔" میں نے پولیس رپورٹس کی جانب

اشارہ کیا۔ ''آپا نے حراست میں بیٹے والے افسران کو اپنا یہی بیان دیا تھا لیکن یہ بیان ظاہر ہے عدالت نے رد کر دیا تھا۔'' میں نے ان کاغذات کو اٹھایا اور انہیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ ''یہاں ایک مرد گواہ کا بیان ہے جو کہ اسموکی جو بار سے نکل رہا تھا۔ اس نے سیاہ بالوں والے ایک دراز قد آدمی کو نصف شب کے فوراً بعد نارتھ کمبرلینڈ کی گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا جس نے نیوی بلیو رنگ کا پی کوٹ پہنا ہوا تھا۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنا چشمہ نیچے رکھ دیا۔

''میں تمہارے ساتھ ایمان داری سے کام لینا چاہتا ہوں۔ یہ تمام واقعات تمہارے ڈیڈی کے حق میں بہتر ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا وہ اس حلیے پر پورے اترتے ہیں جو اس گواہ نے بیان کیا تھا؟''

''ہاں لیکن...''

''ان کی سابقہ محبوبہ کے علاوہ کیا کوئی اور آدھی رات کو انہیں تمہاری ماں کے گھر دیکھ سکتا تھا؟ تمہارے ڈیڈی نے یہ جاننے کے باوجود کہ انہیں آپا کے ہمراہ اپنی بیوی کے بیڈ کو شیئر نہیں کرنا چاہیے تھا تمہاری ماما کا فون کیوں اٹھالیا تھا؟ یہ بہت زیادہ واقعاتی شہادتیں ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ نینسی، آئی ایم سوری۔'' میرا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''پلیز، میری التجا کو رد نہ کریں۔ میں حقیقت اور سچ جاننا چاہتی ہوں۔ چاہے مجھے..... یہ معلوم ہو جائے کہ میرے باپ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا تو مجھے اس کی قطعی پروا نہیں ہوگی۔ میں بس جاننا چاہتی ہوں۔''

نینسی کی کپکپاتی آواز میں مایوسی کا عنصر نمایاں ہو گیا تھا۔ ''دو افراد ایسے ہیں جو اس معاملے میں مدد کر سکتے ہیں۔ صرف وہ جنہیں یہ علم ہو سکتا ہے کہ اس رات حقیقت میں کیا ہوا تھا۔ بس ان سے بات کر لو، پلیز۔'' اس نے بے بسی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم ہی میری واحد اُمید ہو۔''

☆☆☆

''مجھے ملاقات کا وقت دینے کا شکریہ مسٹر فلپس۔'' میں نے رئیل اسٹیٹ کے مالک رچرڈ فلپس کے دفتر میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور اپنی میز کے مقابل رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''پلیز، بیٹھ جائیں۔''

میں بیٹھ گیا وہ میز کے پیچھے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

''تمہارا ٹیلی فون آنے پر مجھے خاصی حیرانی ہوئی کہ مسٹر اسمتھ

ہوشیار

سیلز مین ایک بہرے شخص کو آلۂ سماعت خریدنے پر آمادہ کرنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہا تھا لیکن وہ ضدی شخص آدھی قیمت پر بھی آلہ خریدنے کو تیار نہیں تھا۔

''تم کم سنتے ہو۔ آخر تمہارا کام کیسے چلتا ہوگا؟'' سیلز مین نے آخری وار کیا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' وہ اندر گیا اور چند لمحوں بعد ایک تار کے ساتھ واپس آیا۔ ''یہ دیکھو، میں نے یہ مفت میں ایک گیراج کے سامنے سے اٹھایا ہے۔ اس کا ایک سرا شرٹ میں ڈال لیتا ہوں، دوسرا اپنے کان میں اڑس لینے کی کوشش کرتا ہوں۔''

سیلز مین نے قہقہہ لگا کر اس کا مذاق اڑایا اور کہا۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ تو بے کار تار ہے۔''

''میرے بچے! ہوتا یہ ہے کہ لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ میں ثقلِ سماعت کا شکار ہوں اور میرا آلہ کسی خرابی کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ زور زور سے بولنا شروع کر دیتے ہیں... مجھے کیا ضرورت ہے کوئی قیمتی آلہ خریدنے کی؟''

رساں جونز۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ایک طویل عرصے کے بعد کسی نے بیوٹی کے بارے میں بات کی تھی۔''

''اس کی بیٹی نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں تم سے بات کروں۔'' میں نے بتایا۔

''نینسی نے؟'' فلپس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے برسوں سے اسے نہیں دیکھا اب تو وہ بہت بڑی ہو گئی ہوگی۔ وہ کیسی ہے؟''

''وہ اب اٹھائیس برس کی ہو چکی ہے مسٹر فلپس اور آج کل خاصی پریشان ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اپنی ماں کے قتل کے کیس کو ری اوپن کروانا چاہتی ہے اور اسی سلسلے میں میں یہاں تمہارے پاس آیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم تو جانتے ہو گے کہ اس کے باپ فرینک بشپ کو اس جرم میں سزا ہو گئی تھی۔'' فلپس نے کہا۔ ''کیا تمہیں علم نہیں ہے؟''

''مجھے معلوم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس جرم کی تقریباً بیس سال سزا بھگتنے کے بعد جس کے بارے میں اس

کا دعویٰ تھا کہ وہ جرم اس نے نہیں کیا تھا مسز بشپ کا حال ہی میں کاؤنٹی اسٹیٹ پریزن میں انتقال ہو چکا ہے۔'' میں نے بتایا۔

یہ سن کر فلپس کا چہرہ بدستور جذبات سے عاری رہا۔

''ٹینسی نے بتایا ہے کہ تم مقامی فوٹو گرافر ہوا کرتے تھے اور اس کی ماں کو ماڈلنگ کی راہ پر متعارف کروانے کے ذمے دار بھی تم ہی تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ان دنوں میں خود کو ایک اچھا خاصا آرٹسٹ سمجھا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اپنی کھینچی ہوئی تصاویر کے بدلے مجھے خاصی شہرت مل جائے گی لیکن فوٹو گرافی کے فن کا خاتمہ ہو گیا اور یہ فن ایک سائڈ پروجیکٹ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں رہا۔ مجھے اس فن میں کوئی زبردست قسم کی کامیابی نہیں ملی۔ وہ بیولی تھی جس کی بدولت مجھے کامیابی کی امید تھی لیکن جب وہ مر گئی تو فوٹو گرافی سے میرا لگاؤ بھی دم توڑ گیا۔ ریئل اسٹیٹ کا کاروبار میرا روزگار بن گیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔'' اس نے اپنے دفتر کی جانب ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر تاسف آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تم ڈورس مکھیپی کے فوٹو گرافر سے بڑھ کر کچھ اور بھی تھے، فلپس ہے نا؟''

اس نے ایک سرد آہ بھری اور بولا۔ ''ظاہر ہے، کیوں؟''

''یہ بات میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ڈورس عرف بیولی سے میری ملاقات ستمبر 1945ء میں ہوئی تھی جب موسم خزاں کے سالانہ فیسٹیول کی فوٹو گرافی کے لیے میری خدمات مستعار لی گئی تھیں۔ میں نے اس جیسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس تک رسائی حاصل کی اور اس سے پوچھا کہ کیا کبھی اس نے ماڈلنگ کرنے کے بارے میں سوچا ہے اور پھر اس کی تصویریں کھینچنے کے انتظامات کیے۔ وہ انتہائی فوٹو جینک تھی... فوٹو گرافی کے لحاظ سے انتہائی موزوں۔ میں نے اس کی تصاویر مختلف مقامی میگزینوں، سرکلرز اور مقابلوں میں بھیجنا شروع کر دیں اور ان میں سے بہت سوں میں اسے کامیابی بھی ملی اور اس نے مقابلے بھی جیتے۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی لیکن ہمارے تعلقات میں عیاشی یا نفسانی خواہشات کی تکمیل کا کوئی عنصر نہیں تھا۔''

''پھر اس کی ملاقات فرینک بشپ سے ہوگئی۔''

''ہاں، اور میں نے سوچا کہ ہم اپنی راہیں بدل لیں گے لیکن جب ٹینسی اس دنیا میں وارد ہوئی تو پھر ڈورس نے اپنے کیریئر میں آگے بڑھنے اور مزید ترقی کرنے کا عزم کر لیا۔ اس وقت پن اپ گرلز کے عروج کا زمانہ تھا اور ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ تب میں نے ڈورس اور دیگر لڑکیوں کے ساتھ جو اسٹارز بننا چاہتی تھیں کام شروع کر دیا۔ ان میں سے بیشتر میں عزم مصمم کی کمی تھی اور زیادہ محنت کرنے کا جذبہ بھی نہیں تھا۔ آخر میں ڈورس اور برنا ڈیٹ ہی باقی رہ گئی تھیں اور ہمارے درمیان کام کرنے کے تعلقات ڈورس کی موت تک برقرار رہے تھے۔'' فلپس نے بتایا۔

''اس حوالے سے بات اس رات کی آجاتی ہے... 20 مارچ 1954ء کی وہ رات۔'' میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹینسی کا کہنا ہے کہ اس کی ماں سرِشام ہی تمہاری طرف چلی گئی تھی تو پھر کیا ہوا تھا، مسٹر فلپس؟''

''بیولی ہالی ووڈ کی راہ پر گامزن تھی۔ 20 مارچ کی اس رات ہم ایک فوٹو شوٹ کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت کیبر لینڈ کے علاقے میں میرا ایک چھوٹا سا اسٹوڈیو ہوا کرتا تھا۔ بیولی، ڈورس نے ڈنر ایک ساتھ کیا اور اس شب کا زیادہ وقت ہم نے جاز موسیقی سننے میں گزارا تھا پھر نو بجے کے لگ بھگ ہم اسٹوڈیو واپس چلے گئے اور فوٹو شوٹ کا اختتام گیارہ بجے سے پہلے ہو گیا تھا۔ بیولی نے ٹینسی کی خبر گیری کے لیے اس کی آیا کو فون کیا اور...''

''تو یہ انکشاف ہوا کہ فرینک بشپ وہاں موجود ہے۔'' میں نے فلپس کی بات کاٹتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔

فلپس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بیولی کا فوری ردِعمل کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ نہایت اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ وہ اسی وقت وہاں سے چلے جانا چاہتی تھی لیکن اس وقت بارش بہت تیز ہو رہی تھی اور اس کی حالت یہ نہیں تھی کہ وہ ڈرائیو کر سکے۔ میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائے اور بارش تھمنے کا انتظار کرے تب وہ مان گئی۔''

''پھر وہ وہاں سے کس وقت روانہ ہوئی تھی مسٹر فلپس؟'' میں نے سوال کیا۔

''شاید پونے بارہ... کا وقت تھا۔ بارش تب بھی ہو رہی تھی لیکن اس وقت تک وہ خاصی پُرسکون ہو چکی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ خود کو بالکل بہتر محسوس کر رہی ہے اور اسے

زیادہ دور بھی نہیں جانا پھر وہ پچھلی دروازے سے نکل گئی تھی اور اس وقت میں نے اسے آخری مرتبہ زندہ دیکھا تھا۔'' فلپس رچرڈ نے بتایا۔

میں خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ اپنی میز پر آگے کی جانب جھک گیا اور اپنی نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو اور میری نگاہ میں یہ ایک قابل ستائش عمل ہے لیکن ساتھ ہی تمہیں یہ حقیقت بھی لازمی طور پر ذہن نشین کرنا ہوگی کہ تم ایک بیس سال پرانے قتل کے کیس پر کام کر رہے ہو اور ایک ناخوش عورت کی شکستہ یادوں کی راہنمائی میں عمل پیرا ہو۔ بیوٹی کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں بہت سی افواہیں گردش میں تھیں اور بیوٹی کی موت کے بعد بھی ان افواہوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو، مسٹر فلپس؟''

''میرے اور بیوٹی کے درمیان محبت اور دوستی کے سوا اور کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن فرینک بشپ کا خیال اس کے برعکس تھا اور اسی اندیشے کی بنا پر اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔''

''تو تمہارا خیال بھی یہی ہے؟''

''ہاں اور اب تمہیں کو اس حقیقت کو لازمی تسلیم کر لینا چاہیے۔'' فلپس نے کہا۔

☆☆☆

''ڈورس مرنے کے بعد اتنی ہی خوب صورت لگ رہی تھی جتنی کہ اپنی زندگی میں تھی۔ کسی کے بارے میں اس قسم کی یاد کیا کچھ عجیب سی بات نہیں؟ لیکن ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں نے اتنی پیاری اور دلکش لاش پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ کسی تدفین کی رسم اتنے بھرپور انداز کی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پورا ٹاؤن اپنی شکستہ بیوٹی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے امڈ آیا تھا۔''

اتنے میں چائے کی کیتلی کی سیٹی کی آواز نے برنا ڈیٹ کو چونکا دیا۔ وہ اپنے چھوٹے سے کچن کی میز پر سے اٹھ کر اسٹوو کی جانب بڑھ گئی۔ ''وہ ہیرس کا ڈنٹی میں سب ہی کو عزیز تھی سب ہی اس سے بے حد پیار کرتے تھے مسٹر جونز لیکن مجھے یقین ہے کہ فلپس نے اس بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔''

''ہاں، اس نے بتایا کہ ڈورس اور تم نے اس کے فوٹوگرافی کے ابھرتے ہوئے مستقبل کو قائم رکھنے میں اس

کی بھرپور مدد کی تھی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے ان دنوں ہم سب بڑے بڑے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہم۔۔۔ اس جگہ کی غربت سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ ایک بھرپور، ولولہ انگیز اور عشرت کی زندگی بسر کرسکیں لیکن ہمارے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔" برناڈ نے بے بسی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا پھر وہ چائے کی پیالیاں لے کر واپس میز پر آگئی اور ایک بار پھر میرے مقابل بیٹھ گئی۔

"ڈورس کیسی آگے بڑھنے میں تقریباً کامیاب ہوچکی تھی، ہے نا؟" میں نے کہا۔ "میں نے جو کچھ سنا ہے اس کے مطابق اپنے مرنے سے قبل وہ قومی سطح پر خاصی شہرت حاصل کررہی تھی۔"

یہ سن کر برناڈیٹ مسکرادی۔ "اگر آپ بلندی پر پہنچنے کے لیے راہ میں ہر کسی کے ساتھ سونے کے لیے رضامند ہوں تو پھر مقبولیت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یوٹی کو مردوں کو لبھانے میں لطف آتا تھا اور وہ ان کی رفاقت سے انجوائے کرتے تھے۔ وہ اور میں دونوں ہی جنگل کوئن میں ہینا کے کردار کے حصول کے لیے دوڑ میں شامل تھے لیکن آخر میں فلپس نے ہالی ووڈ کے اسٹوڈیو ایگزیکٹیو کو ڈورس کا پورٹ فولیو بھیجنے کا فیصلہ کرلیا اور پھر لازمی ڈورس کو اس کردار کے لیے اسکرین ٹیسٹ کے لیے چانس کی پیشکش ہوگئی۔ مجھے یقین ہے کہ اسے وہ کردار بھی مل جاتا لیکن یہ فیصلہ اس کی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوتا یا کسی اور بنیاد پر؟" برناڈیٹ نے آخری جملہ معنی خیز لہجے میں ادا کیا اور اپنا چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا پھر چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ "بہرحال، یہ ایک مشکوک معاملہ ہے۔"

"فلپس کا کہنا ہے کہ یوٹی کے ساتھ اس کے تعلقات خالص دوستی اور محبت پر مبنی تھے اور ان میں جنسی کشش کا کوئی پہلو شامل نہیں تھا۔" میں نے بتایا۔

"اوہ اتنے بھولے مت بنو مسٹر جونز۔ فلپس اور ڈورس کا افیئر برسوں سے چل رہا تھا اور ان کے احساسات اور جذبات کی ذمے دار میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قرار نہیں دے سکتی۔ ان کا کوئی قصور نہیں تھا، وہ ایک انتہائی جاذب نظر جوڑی تھی۔ اس دور میں فلپس نہایت ہی ہینڈسم ہوا کرتا تھا۔ دراز قامت، خوبرو اور ہینڈسم ٹائپ البتہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور یہاں کے باسیوں کو باتیں بنانا اچھی لگتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے وہ پینے پلانے اور چرچ کی مذہبی تقریبات میں شرکت کرنے سے عشق کرتے ہیں۔ فلپس کے ڈورس سے تعلقات خاصے رسوا کن تھے۔ اشارے اس بات کے ہوتے تھے کہ اگر چند شرائط کو مدنظر نہ رکھا گیا تو ان کا افیئر عام ہوجائے گا اور فلپس کو اپنی بیوی اور بیٹے سمیت اور بہت کچھ کھونا پڑے گا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ وہ ان دھمکیوں پر بندش لگانے کے لیے بھی کچھ کرسکتا تھا؟"

"کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ یوٹی، فلپس کو بلیک میل کررہی تھی؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"بالکل بجا کہا، ڈورس جانتی تھی کہ اسے کیا مطلوب ہے اور اسے کس طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے اور اس بارے میں، میں اس کی اس خوبی کی معترف ہوں۔" برناڈیٹ نے کہا۔

"اس بارے میں یہ موثر اشارہ ہے فلپس نے ڈورس کو قتل کیا تھا اور ایک سنگین الزام ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ فرینک بشپ کو محض ایک ممکنہ سبب کی بنا پر مجرم قرار دینے کے مقابلے میں کوئی زیادہ سنگین الزام ہے؟ جب پولیس نے ایک بار فیصلہ کرلیا کہ وہی قاتل ہے تو تمام تحقیقات رک گئیں۔ دھیان سے سوچو مسٹر جونز، فلپس وہ آخری مرد تھا جس نے ڈورس کو زندہ دیکھا تھا اگر تم ایک مردہ شخص پر سے بدنامی کا داغ دھونے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر میرا مشورہ یہی ہے کہ تم پیٹرس کاؤنٹی کے باسی ریئل اسٹیٹ کی اہم شخصیت کا باریک بینی سے جائزہ لو۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا مس برناڈیٹ۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر ڈورس کی کامیابی کے سبب فلپس کو بھی اپنے بہتر مستقبل کا موقع مل رہا تھا تو یہ بات عقل تسلیم نہیں کرتی کہ اس نے ڈورس کو قتل کیا ہوگا۔ میں نے سنا ہے کہ یوٹی کی موت کے ساتھ ہی اس کا مستقبل بھی ختم ہوگیا تھا اور تمہارا مستقبل بھی۔"

"ہاں لیکن میرے خیال میں قربانیاں تو دینی ہی پڑتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہوں اگر ان کا مقصد اپنے بہترین ذاتی مفادات کے تحفظ سے ہو۔ جب ڈورس کا قتل ہوا تو بلاشبہ یہ میرے تیزی سے پنپتے ہوئے کیریئر کا اختتام بھی تھا البتہ فلپس کے پاس اپنا ذاتی اسٹیٹ کا کاروبار موجود تھا جس پر وہ انحصار کرسکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو پیٹرس کاؤنٹی سے باہر بھی جاسکتا تھا اور جہاں تک میرا تعلق تھا۔۔۔ میرا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ ڈورس کی موت کے بعد بھی میں نے کامیابی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد

کی لیکن اس وقت میں تقریباً تیس سال کی ہو چکی تھی اور میری مدد کرنے کے لیے میرے پاس فلپس نہیں تھا۔ میرا خیال ہے باقی تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو۔'' اس نے ہمارے خالی کپوں کی جانب ہاتھ بڑھایا اور بولی۔ ''میں تھوڑی اور چائے لے کر آتی ہوں۔''

جب برناڈیٹ ہمارے چائے کے کپ دوبارہ پُر کرنے چلی گئی تو میں اس چھوٹے سے ہال وے نما راہ داری میں چلا گیا جس میں اس سابقہ پن اپ گرل نے اپنا ذاتی تخلیق کردہ قائم کیا ہوا تھا۔ وہاں دیواروں پر برناڈیٹ کی فریم شدہ تصویریں جو بیشتر بلیک اینڈ وائٹ میں تھیں آڑے ترچھے انداز میں لگی ہوئی تھیں۔

''تمہارے پاس تصویروں کا ایک متاثر کن ذخیرہ ہے۔'' میں نے قدرے بلند آواز میں پکارتے ہوئے کہا۔

''تھینک یُو، اپنی ان تصویروں کو یوں سجائے رکھنا قدرے بے مقصد ہی ہے لیکن ان تصویروں کو دیکھ کر ماضی کی حسین اور حیرت انگیز یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ عمر رسیدہ ہونا تا قابل یقین حد تک ایک مشکل مرحلہ ہے، مسٹر جونز اور یہ میرے لیے قابل قبول نہیں۔'' برناڈیٹ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم بلاشبہ حسین اور خوب صورت تھیں۔'' میں نے کہا۔

تصویروں میں وہ دراز قامت، لچک دار چھریرے بدن اور بھرے بھرے والی ان خواتین کے مانند دکھائی دے رہی تھی جن کا تعلق طبقۂ امرا سے ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ بڑھیا لباس اور پوشاک زیب تن کیے ہوئے تھی۔ اس کا سراپا جنسی جذبے کو ابھارنے والا تھا۔

وہ ڈورس کلیسپی سے بالکل متضاد لگ رہی تھی۔

''تمہاری تصویریں دیکھ کر مجھے ماضی کی نامور اداکارہ بیٹی پیج کی یاد آ رہی ہے۔'' میں نے تبصرہ کیا۔

''تھینک یُو مسٹر جونز، یہ الفاظ میرے لیے ستائش کا درجہ رکھتے ہیں۔''

پھر ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی اور میں اس کی تصویروں کا جائزہ لینے لگا۔

''کوئی تصویر خاص طور پر دلچسپ لگی؟''

میں پلٹ گیا، برناڈیٹ میرے عین پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ ''ہاں، یہ تصویر جس پر فروری 1954 کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔'' میں نے تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ رچرڈ کا آئیڈیا تھا مجھے یہ آئیڈیا قدرے احمقانہ لگا تھا کہ نیوی کے سپاہیوں کا ہیٹ پہن کر سیلوٹ کرتے ہوئے تصویر کھنچواؤں لیکن یہ فوٹو درحقیقت ہمارے فوجیوں کے لیے ایک قسم کا انسپائریشن ثابت ہوا۔ میرے خیال میں یہ جنگی کارناموں میں ایک طریقے سے میری شرکت بھی کہی جا سکتی ہے۔''

''اور یہ پی کوٹ جو تم نے پہنا ہوا ہے؟ کیا یہ بھی فلپس رچرڈ ہی کا آئیڈیا تھا؟''

''درحقیقت یہ اسی کا آئیڈیا تھا۔''

''لیکن یہ اس کا آئیڈیا نہیں تھا کہ تم وہی کوٹ پہن کر ہیوئی کو قتل کر دو۔ ہے نا مس برناڈیٹ؟''

برناڈیٹ یہ سنتے ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے دائیں بائیں حرکت کرنے لگیں۔

''تم ڈورس کلیسپی کی شہرت، کامیابی اور غالباً اس کے عاشق کو بھی حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ جب ہیوئی کو ہاف وو ڈ بھیجنے کے لیے چن لیا گیا تو یہ بات تمہاری برداشت سے باہر ہو گئی، ہے نا؟ اس کو قتل کرنا اور فلپس کو قتل کے الزام میں پھانسنے کا مطلب اپنے کیریئر کی قربانی تھا۔ تمہیں یقیناً اس بات کا بخوبی احساس تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارے ذہن میں حتمی انتقام لینا اس کامیابی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا جو تمہیں حاصل ہو سکتی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا ہاتھ اپنی برساتی کی جیب میں ڈال دیا۔

''لیکن تمہارا پلان ناقص ہو گیا اور ایک بے گناہ شخص نے اپنی زندگی جیل میں گنوا دی... اور صرف تمہاری وجہ سے اور اب تمہارے پاس کچھ بھی نہیں تمہاری جوانی، تمہارا حُسن سب جا چکے ہیں اور اب تمہارے پاس صرف بڑھاپا باقی رہ گیا ہے... جو تم جیل کی کوٹھری میں سلاخوں کے پیچھے گزارو گی۔''

میرے ان الفاظ نے جیسے برناڈیٹ کے غیظ و غضب کو چنگاری دکھا دی۔ وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔

لیکن اسی دوران میں اپنی برساتی کی جیب میں سے ... پستول نکال چکا تھا۔ میں نے پستول کی نال براہ راست اس کی پیشانی پر تان لی۔ پستول پر نگاہ پڑتے ہی اس کا غصہ ... جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

پھر وہ فرش پر بیٹھتی چلی گئی اور سر پکڑ کر رونا شروع کر دیا۔

▲▲

لہورنگ

انوار صدیقی

علم اور فراست زندگی کے وفادار ساتھی ہیں... جو کبھی دغا نہیں دیتے لیکن ہوس پرستی اور خطا کاری ایسے اندھیروں میں دھکیلتی ہے کہ پھر کوئی شمع روشن نہیں ہو پاتی... ایک راست گو انسان کی کہانی جو علم و عمل میں اپنے آپ کو یکتا سمجھتا تھا... لیکن شیطان کا کام اذیت دینا ہے... وہ اُن بندوں کے پیچھے لگ جاتا ہے... جو اپنے مضبوط کردار کے باعث ہمیشہ اس کو شکست دیتے ہیں... انسان اور شیطان کے درمیان ازلی جنگ کے اسرار و رموز... ایک ایسی غلطی... جس کا کوئی مداوا ممکن نہ تھا... ایک سرکشیدہ انسان کی کہانی جو اپنی وحشی خواہشات کی تکمیل کی خاطر دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

خونی رشتوں میں عداوت کروا دینے والوں کا فسانۂ لہورنگ

طیارے میں داخل ہونے والا وہ آخری مسافر تھا۔ ائرہوسٹس نے روایتی انداز میں مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ وہ خوب صورت خدوخال کا مالک تھا۔ گرے پینٹ اور ڈارک بلیو شرٹ نے اس کی کھلتی رنگت کو اور خوشنما بنا دیا تھا۔ فضائی میزبان کی تجربہ کار نظروں نے اس کی عمر کا تخمینہ پچیس اور اٹھائیس کے درمیان لگایا تھا۔

مسافر نے جیب سے اپنے بورڈنگ کارڈ کا نصف حصہ نکال کر ائرہوسٹس کو دکھایا تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری اور معنی خیز ہو گئی۔ پھر وہ مسافر کو ہاتھ کے اشارے سے فرسٹ کلاس کی طرف لے گئی جہاں صرف پانچ مسافر پہلے سے موجود تھے۔

''اے ون'' ائرہوسٹس نے نشست تک اس کی راہنمائی کرنے کے بعد دبی زبان میں مسکرا کر کہا۔ ''یہ نمبر کسی خوش قسمت آدمی ہی کو ملتا ہے۔''

مسافر نے اپنے ہاتھ میں دبا چرمی بیگ برابر والی نشست پر رکھا پھر سیٹ پر بیٹھ کر ویسٹ بیلٹ باندھنے لگا۔ ابھی تک اس نے ائرہوسٹس کی کسی بات کا جواب دینے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

طیارے نے آہستہ آہستہ ٹیک آف کرنا شروع کیا۔ مسافروں کو پرواز کے درمیان احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے سلسلے میں ضروری ہدایت نشر ہو رہی تھیں۔

کنٹرول ٹاور سے آخری ہدایت ملنے کے بعد طیارے نے رن وے پر اسپیڈ پکڑنی شروع کی تو مسافر نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ فلائٹ ٹھیک وقت پر روانہ ہوئی تھی۔ طیارے نے رن وے پر رفتار پکڑنے کے بعد زمین سے اپنا رشتہ ختم کر کے فضا کی بلندیوں کی طرف اٹھنا شروع کیا تو مسافر نے نشست کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں پریشان کن خیالات گڈمڈ ہونے لگے تھے۔

صبح تقریباً آٹھ بجے اپنے لگژری فلیٹ میں وہ اس

سنسنی خیز خبر کی تفصیل پڑھ رہا تھا جب عنبرین نے اسے کال کر کے پریشان کن لہجے میں کہا تھا۔

''ساجد! میرا مشورہ ہے کہ تم پہلی فلائٹ سے ملک سے کہیں باہر چلے جاؤ۔''

''پہلے تم نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب خوف زدہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟''

''میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں لیکن..... حالات اب سازگار نہیں ہیں۔'' عنبرین ایک ہی سانس میں بولتی رہی۔ ''احتشام انکل کا قتل معمولی بات نہیں ہے۔ پولیس کے ماہرین بنگلے کا ایک ایک کونا جھانکتے پھر رہے ہیں۔ علاقے کا ایس پی بھی جائے واردات پر موجود ہے۔''

''لیکن موجودہ حالات میں میرا منظرِ عام سے ہٹ جانا پولیس کے شبہات کو اور ہوا دے سکتا ہے۔''

''ابرار کو کیوں فراموش کر رہے ہو؟'' عنبرین نے سرسراتے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہ بھی نہ بھولو کہ باپ کی پُراسرار موت کے بعد ابرار کی زبان بھی تمہارے خلاف زہر ہی اُگلے گی۔''

''لعنت بھیجو اس پر۔'' ساجد نے حقارت سے جواب دیا۔ ''کسی بھی شہادت یا ٹھوس ثبوت کے بغیر پولیس محض ابرار کے بیان پر مجھے پھانسی نہیں چڑھا سکے گی۔''

''تم ایک اہم حقیقت کو کیوں فراموش کر رہے ہو؟''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' ساجد نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہاری ماں۔'' عنبرین نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''انکل نے اسے طلاق دیتے وقت طلاق نامے میں بھی یہی لکھا تھا کہ اس کا ماضی صاف ستھرا نہیں بلکہ داغ دار تھا۔''

''زبان کو لگام دو۔'' ساجد نے جھلا کر کہا۔ ''احتشام احمد دودھ پیتے بچے نہیں تھے۔ دوسری شادی بھی تمہارے انکل نے سب کچھ جانتے بوجھتے کی تھی۔''

''مجھے غیر نہ سمجھو ساجد..... میں جو کچھ کہہ رہی ہوں،

تمہارے بھلے کو کہہ رہی ہوں۔"

"تم نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے؟" ساجد نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔

"قانون کی نظروں میں میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ جو بھی فیصلہ ہوگا وہ پولیس کی چھان بین اور ابرار کے بیان کی بنیاد پر ہوگا۔"

"جانتا ہوں مگر... تم بھی اس بات کی گواہ ہو کہ میں نے بھی ماں سے ناراض ہو کر علیحدہ رہائش اختیار کرلی ہے۔ صرف تمہاری خاطر ایک دو بار مرنے والے کی دلیز پھلانگی تھی۔"

"والدین اگر حادثے کا شکار ہو کر مجھے تنہا نہ چھوڑ جاتے تو میں بھی انکل کے ساتھ رہنے پر مجبور نہ ہوتی۔"

"میں حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ابرار شروع دن سے تمہارے میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔" عنبرین نے تیزی سے جواب دیا۔ "اس وقت انکل کی کروڑوں کی جائداد کا معاملہ پولیس کی نگاہوں میں زیادہ اہم ہے جس کا ایک معقول حصہ تمہاری ماں کے علاوہ انکل کی تحریر کردہ وصیت کی روشنی میں تمہیں بھی....."

"شٹ..." ساجد کسی درندے کی طرح غرایا۔ "میں تمہارے انکل اور ان کی وصیت.... دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں جس کاروبار کی دیکھ بھال کررہا ہوں، اس کا معاوضہ میری ضروریات کے لیے بہت ہے۔"

"ہوسکتا ہے تم درست کہہ رہے ہو لیکن پولیس...."

"جہنم میں گئی پولیس اور اس کی تفتیش.... تمہاری ذاتی رائے کیا ہے میرے بارے میں؟ کیا تم کو بھی اس بات کا غم ہے کہ تمہارے چہیتے انکل کا تعلق اب اس دنیا سے نہیں رہا؟"

"میں جو کچھ مشورہ دے رہی ہوں، وہ تمہارے بھلے کے لیے ہے۔ اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔"

"جس چھت کے نیچے تمہارے مقتول انکل رہتے تھے وہاں کچھ اور افراد بھی تھے۔ ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"سب سے زیادہ غم آنٹی کو ہے۔" عنبرین کی آواز ابھری۔ "ابرار بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بجائے انکل کی دولت پر عیش کررہا ہے اور اب وہ بھی انکل کی جائداد کے ایک بڑے حصے کا حق دار بننے کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔"

"ابرار کی صحت بھی اچھی نہیں ہے لیکن ابھی تک اس نے کسی غلط راستے کا انتخاب بھی نہیں کیا، اسے بھی غنیمت سمجھو۔" ساجد نے تلملا کر قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ "اسے بگاڑنے میں آنٹی کا بھی ہاتھ ہے۔ انکل کے بعد اب وہ ماں کو جھانسا دے کر ان کا حصہ بھی ہتھیانے کی کوشش ضرور کرے گا۔"

"مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ آنٹی اور ابرار سے زیادہ مجھے تمہاری فکر لاحق ہے۔"

"کیا میرے جانے کے بعد تم تنہا حالات کا مقابلہ کرسکوگی؟" ساجد نے پہلی بار ہمدردی کا اظہار کیا۔

"تم سے ہمیشہ کے لیے جانے کو نہیں کہہ رہی۔" جواب میں عنبرین نے بھی اسے پیار سے سمجھایا۔ "اپنے کاروبار کے سلسلے میں بھی تم وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہو۔ پولیس کو زیادہ شک بھی نہیں ہوگا۔ انکل کے قتل کا مسئلہ حل ہوجائے تو تم واپس آجانا۔"

ساجد نے عنبرین کی بات مان لی لیکن اب وہ بڑی سنجیدگی سے اپنی حماقت پر غور کررہا تھا۔ احتشام احمد کے قتل کے سلسلے میں پولیس مشکوک افراد کی جو لسٹ مرتب کرتی، اس میں ایک نام اس کا بھی ضرور شامل کیا جاتا۔ تفتیشی افسران اس اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کرسکتے تھے کہ ایک جوان بیٹے کی ماں نے پہلے شوہر کے انتقال کے چند سال بعد احتشام احمد سے دوسری شادی کرلی تھی۔

ہر چند کہ احتشام احمد نے دوسری شادی آمنہ بیگم اور اپنے جوان بیٹے سے چھپ کر کی تھی لیکن اس کی بھنک دو مہینے بعد آمنہ بیگم کو مل گئی کہ ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کو برباد کرنے میں پر جبیں بانو کا ناپاک وجود شامل تھا جس نے ایک شوہر کے مرنے کے بعد احتشام احمد پر ڈورے ڈال کر دوسری شادی کرلی تھی۔ خود احتشام احمد نے بھی دوسری شادی کے لیے اپنی رہائش سے بہت دور ایک دوسرا بنگلا کرائے پر حاصل کرلیا تھا۔

آمنہ بیگم نے جوان بیٹے کی وجہ سے اس تلخ حقیقت کو زبان تک لانے سے گریز ہی کیا لیکن جب یہ لاوا پھٹا تو ایک بھونچال آگیا۔ جوان بیٹے کا سرخ لہو بھی ماں کی حمایت میں جوش مارنے لگا۔ احتشام احمد نے حالات کو سنبھالنے کی خاطر پر جبیں بانو کو طلاق دے دی۔ وقتی طور پر طوفان کی شدت کم ہوگئی لیکن نفرتوں کا پودا دلوں میں جڑ پکڑتا گیا جس کا نتیجہ بالآخر احتشام احمد کی پُراسرار موت کی شکل میں

سامنے آیا۔

ساجد کا ذہن ان پیچیدہ حالات کی روشنی میں بری طرح الجھ رہا تھا۔ عنبرین کی بات مان کر اس نے جو قدم اٹھایا تھا اب اس کا کوئی دوسرا اور فوری علاج بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ کینیڈا کے لیے جو فلائٹ پکڑی تھی، اس کو منزل تک پہنچنے میں پندرہ گھنٹے درکار تھے۔ ان پندرہ گھنٹوں میں اس کے پاس فرار کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

ساجد نے خود کو سنبھالنے کی کافی کوشش کی۔ جہاز میں دل بستگی کا سامان وہی ائر ہوسٹس تھی جس نے بڑے خوب صورت انداز میں اسے خوش آمدید کہا تھا لیکن وہ اس کی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی جس کا اظہار وہ سب سے کرنے کی عادی تھی۔ اس کا تجربہ ساجد کو پہلے بھی ہوائی سفر کے دوران بخوبی ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی وہ ائر ہوسٹس کو دیکھ کر اپنی نشست پر صرف پہلو بدل کر رہ گیا جو ایک ادھیڑ عمر کے مسافر کا کوٹ اتارنے میں بڑی بے تکلفی اور اپنائیت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ساجد نے برابر والی سیٹ سے فیشن میگزین اٹھا کر اس کے اوراق الٹنے پلٹنے شروع کر دیے لیکن وہ اس الجھن کو کم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جو اسے لاحق تھی۔ اس کا ذہن پھر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہونے لگا۔

☆☆☆

احتشام احمد کی لاش ان کے بستر پر پڑی تھی۔ خواب گاہ میں اس وقت ابرار احمد اور آمنہ بیگم کے علاوہ عنبرین بھی سوگوار ماحول کا ایک حصہ نظر آ رہی تھی۔

علاقے کے ایس پی کی موجودگی میں اس کا عملہ ضروری تفتیشی کارروائی میں مصروف تھا لیکن ایس پی کی تیز اور تجربہ کار نظریں مرنے والے کے لواحقین کے چہروں کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔ اس کے حکم پر ملازموں کو بھی مرحوم کے بنگلے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔

دو گھنٹے کی چھان بین اور ضروری شواہد کو ہر طرح محفوظ کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ خواب گاہ کو سیل کرنے کے بعد سب ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے جہاں ایس پی نے براہِ راست چھان بین کی خاطر مرحوم کی بیوہ سے سوالات کیے۔

”مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کے غم میں شریک ہونے کے باوجود اپنے پیشہ ورانہ فرائض پورا کرنے کی خاطر مجبور ہوں۔ قاتل یا قاتلوں تک پہنچنے کی خاطر آپ سب کا بیان ہی مجھے کامیاب کر سکے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھ سے تعاون کریں گی۔“

آمنہ بیگم نے اپنا سوگوار چہرہ اٹھا کر ایس پی کو دیکھا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”میری دلی آرزو یہی ہے کہ اس گھر کی خوشیاں برباد کرنے والا جلد از جلد اپنے بدترین انجام تک پہنچے۔ وہ کوئی بھی ہو، ہماری ہمدردی کا مستحق نہیں ہو سکتا۔“

”کیا آپ اور مرحوم ایک ہی خواب گاہ میں رات گزارتے تھے؟“ ایس پی نے چبھتے ہوئے لہجے میں پہلا سوال کیا۔

”پہلے ایسا ہی تھا لیکن.....“ آمنہ بیگم نے ہونٹ چباتے ہوئے کسمسا کر جواب دیا۔ ”مگر کچھ عرصے سے ہم علیحدہ علیحدہ کمروں میں سو رہے تھے۔“

”اس کا سبب غالباً مرحوم کی دوسری شادی تھی؟“

آمنہ بیگم نے اس بار سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

”دوسری شادی کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟“ ایس پی نے کچھ توقف سے پوچھا۔

”یقیناً ہوگی مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”کیا مرحوم کو آپ سے کوئی ایسی ذاتی شکایت تھی جو دوسری شادی.....“

”میں بتاتا ہوں۔“ ابرار احمد نے ماں کے چہرے پر ابھرنے والی بیزاری کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”دوسری شادی کی وجہ میری ماں نہیں، وہ بے غیرت عورت تھی جس نے ہمارے گھر کی خوشیوں کو برباد کیا ہے۔“

ایس پی نے نظریں گھما کر ابرار احمد کو دیکھا۔ شاید اسے دخل اندازی پسند نہیں آئی تھی۔ ایک لمحے وہ خاموش رہا پھر اس نے چونک کر سوال کیا۔

”آپ نے عورت کے سلسلے میں تھی، کیوں استعمال کیا؟“

”اس لیے کہ اس آبرو باختہ عورت نے ڈیڈ سے محض دولت کے لالچ میں شادی کا ڈھونگ رچایا تھا۔“ ابرار احمد نے بدستور حقارت سے جواب دیا۔ ”... اپنے مقاصد حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے ڈیڈ سے طلاق کا مطالبہ کیا ہوگا۔“

”آپ یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ ایس پی نے پہلو بدل کر کریدنے کی کوشش کی۔ ”کیا آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟“

”میں بتاتی ہوں۔“ آمنہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں ایس پی کو مخاطب کیا۔ ”طلاق کی اطلاع بھی مجھے میرے

شوہر نے چند روز قبل دی تھی۔ اپنی ندامت کا اظہار کرتے ہوئے مرنے والے نے یہ اقرار بھی کیا تھا کہ دوسری شادی سے قبل اس نے دوسری عورت کے اصرار پر ایک وصیت نامہ بھی اپنے وکیل کی موجودگی میں تحریر کیا تھا جس کی رُو سے اس عورت اور اس کے سوتیلے بیٹے کو بھی جائداد کے کچھ حصے کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔“

”آئی سی۔“ ایس پی نے پہلو بدلا۔ ”گویا مشکوک افراد کی فہرست میں ان کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔“

”قتل کس نے کیا، اس کا فیصلہ آپ کی تفتیش اور رپورٹ کی روشنی میں عدالت کرے گی لیکن ذاتی طور پر مجھے بھی شبہ ہے کہ ڈیڈ کے قتل میں ان دونوں ماں، بیٹے کا ہاتھ کسی نہ کسی زاویے سے شامل ہے۔“ ابرار احمد نے اپنی نفرت کا اظہار کیا پھر عنبرین کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مطلقہ فاحشہ ابھی تک اسی شہر میں ہے جبکہ اس کا سوتیلا بیٹا ساجد فرار ہو چکا ہے۔“

”فرار ہو چکا ہے؟“ ایس پی نے پہلو بدلا۔ ”آپ کو اس کا علم کس طرح ہوا؟“

”اپنے شبہے کی بنیاد پر میں نے سب سے پہلے اسی کو فون کیا تھا۔ اس کے دو ٹکے کے کاروباری دفتر سے یہی معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی کاروباری سلسلے میں کینیڈا چلا گیا ہے۔ ڈیڈ کے قتل کے بعد اس کے فوراً ہی ملک چھوڑ دینے کو محض اتفاق کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ میں فضائی کمپنی کی فلائٹ انکوائری سے اس کی روانگی کی تصدیق بھی کر چکا ہوں۔“

”کیا ساجد کا آپ کے گھر آنا جانا تھا؟“

”جی ہاں۔“ ابرار احمد نے ناپسندیدہ انداز میں جواب دیا۔

”سوچ کر جواب دیں مسٹر ابرار ۔۔۔۔ کیا ساجد کل رات بھی کسی وقت آیا تھا؟“

”ہو سکتا ہے لیکن میں نے نہیں دیکھا۔“

”آپ کیا کہتی ہیں اس سلسلے میں؟“ ایس پی نے آمنہ بیگم سے سوال کیا۔

”میں زیادہ تر اپنے کمرے تک محدود رہتی ہوں اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتی۔“

”ساجد کے بارے میں بہرحال آپ کی کوئی ذاتی رائے ضرور ہوگی۔“

”میری ناقص معلومات کے مطابق بھی وہ اپنی ماں کی دوسری شادی سے خوش نہیں تھا۔“

”ون منٹ۔“ ایس پی نے چونک کر ابرار احمد کی جانب دیکھا۔ ”جب آپ کے مرحوم والد نے ساجد کی ماں کو علیحدہ مکان میں رکھا تھا اور وہ اس کی شادی سے خوش بھی نہیں تھا تو ۔۔۔۔ یہاں کس سلسلے میں آتا جاتا تھا؟“

”وہ ۔۔۔۔ ساجد کالج میں دراصل عنبرین کا کلاس فیلو تھا۔“ ابرار احمد نے قدرے رک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔

ایس پی کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے ابرار احمد کو ڈرائنگ روم سے باہر بھیج کر عنبرین کو قریب آ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا چہرہ کسی قسم کے اندرونی جذبات کی ترجمانی سے یکسر عاری تھا۔

”مرحوم کو جو صورتِ حال پیش آچکی ہے، اس کی روشنی میں آپ کیا کہتی ہیں گی؟“

”میں کے باپ کے بعد میں اپنے مشفق انکل کے سائے سے بھی محروم ہو گئی۔“ عنبرین نے مغموم لہجے میں کہا۔

”آپ کا کیا اندازہ ہے؟ کیا مرحوم کے بعد آپ کی آنٹی آپ کا خیال نہیں رکھیں گی؟“

”میں ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔“ عنبرین نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ”انکل اور آنٹی دونوں نے بھی مجھے والدین کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے سے پیشتر ہم موت کے اسباب کے بارے میں حتمی بات نہیں کر سکتے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ مرحوم کو پہلے کسی طرح بے ہوش کیا گیا اس کے بعد گولی ماری گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرنے والے کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی، اس کی ایک اہم وجہ اور بھی ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔“

”وہ کیا۔۔۔۔؟“

”قاتل مرحوم کے لیے کوئی اجنبی نہیں بلکہ جانی پہچانی شخصیت تھی۔“ ایس پی نے رک رک کر کہا۔ اس کی نظریں بدستور عنبرین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ”گولی مارنے کی خاطر جو آٹومیٹک ہتھیار استعمال کیا گیا وہ بھی مرحوم کا تھا۔“ عنبرین نے چونک کر ایس پی کو دیکھا لیکن چیختے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”میں کوشش کروں گی آپ کی ہر طرح کی مدد کی جائے۔“

”شکریہ۔“ ایس پی ماہرانہ انداز میں مسکرایا پھر اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ ”آپ مسٹر کو ساجد کو کس خانے میں فٹ کریں گی؟ کیا وہ اپنی ماں کی دوسری شادی سے خوش تھا؟“

''اس کا جواب وہ بہتر طور پر دے سکتا؟'' عنبرین نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''اس گھر میں وہ کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے دو تین بار ہی آیا تھا لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ماں کی دوسری شادی سے پہلے ہی ساجد نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔''

''کیا آپ کو اس کا یہاں آنا جانا پسند تھا؟'' ایس پی کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''میں نے کبھی برا منانے کا اظہار بھی نہیں کیا اس لیے کہ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے، اس میں صاف دل سے کسی واقف کار سے ملنے جلنے کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ انکل یا آنٹی نے بھی کبھی ساجد کے یہاں آنے پر اعتراض نہیں کیا۔''

''ایک اہم بات اور، کیا ساجد کل شام کے بعد کسی وقت یہاں آیا تھا؟''

''جی نہیں۔'' عنبرین نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

''پھر اسے حادثے کی اطلاع کس طرح ہوئی؟'' ایس پی نے چبھتے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا اس کا آج ہی کینیڈا جانا محض اتفاق کہا جاسکتا ہے؟''

عنبرین نے اس بار فوری جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ایس پی کے سوال سے کسی ذہنی کشمکش کا شکار ہوگئی تھی۔

''آپ خاموش کیوں ہیں؟'' ایس پی نے ساجد کے بارے میں پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''حادثے کی اطلاع اسے کس طرح ہوئی؟''

''انکل کے قتل کی اطلاع اسے میں نے دی تھی۔'' عنبرین نے اقرار کیا۔ ''کینیڈا جانے کا مشورہ بھی ساجد کو میں نے ہی دیا تھا۔''

''اس کی کوئی وجہ بھی ضرور رہی ہوگی؟''

''جی ہاں۔'' عنبرین نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ ''دراصل ابرار کو میری وجہ سے ساجد کا یہاں آنا جانا پسند نہیں تھا۔''

''آئی سی۔'' ایس پی نے پہلو بدلا پھر اس نے عنبرین کو دو تین مزید معلوماتی سوالات کرنے کے بعد کمرے سے جانے کی اجازت دے کر علاقے کے تھانہ انچارج انسپکٹر سراج کو طلب کیا۔

''کوئی پیش رفت ہوئی سر؟'' انسپکٹر نے ایس پی کے اشارے پر دریافت کیا۔

''مکمل چھان بین تفتیشی افسر کی حیثیت سے آپ کو ہی کرنی ہے۔ میں نے مقتول کی ذاتی حیثیت کی بنا پر یہاں آنا ضروری سمجھا تھا۔'' ایس پی نے سامنے گول میز پر رکھے ہوئے موبائل کو اٹھا کر سراج کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''گھر کے افراد سے میری جو گفتگو اب تک ہوئی، وہ اس میں ریکارڈ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں آپ کو بھی کچھ کارآمد باتیں مل جائیں۔ باقی ڈسکشن میں آپ سے بعد میں کروں گا۔''

''میں ملازموں کا بیان لے چکا ہوں سر، اب ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟''

''ملازموں کو میرے خیال میں زیادہ پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ویسے آپ کو اختیار ہے۔'' ایس پی نے اٹھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر وہ زیادہ دیر نہیں رکا۔

☆☆☆

باپ کے انتقال کے بعد ساجد نے ریڈی میڈ کپڑوں کے کاروبار کو پوری توجہ سے سنبھال لیا تھا۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں اس نے اپنی دن رات کی انتھک محنت کے بعد کاروبار کو نہ صرف مقامی مارکیٹ میں پھیلا دیا بلکہ کچھ دوستوں کی مدد سے کینیڈا کی مارکیٹ میں بھی ایکسپورٹ کا کام شروع کردیا تھا جو بتدریج اس کے کاروبار کو بیرونی منڈیوں میں بھی وسعت دینے میں معاون ثابت ہوا تھا۔

صبح دس بجے سے شام سات بجے تک وہ دفتری اور مارکیٹ کے دیگر کاموں میں مصروف رہتا۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے گھر پہنچ کر وہ ماں کی دلجوئی میں لگ جاتا تھا۔ یہ روزمرہ کا معمول تھا لیکن اس روز قسمت کے ستارے شاید گردش میں آنے والے تھے جب وہ خلاف معمول شام کے چار بجے گھر آگیا۔ اپنے گھر کے دروازے پر ایک قیمتی کار کو کھڑا دیکھ کر وہ ایک لمحے کو حیران ہوا پھر اس نے یہی سمجھا کہ شاید گاڑی والے نے پارکنگ کی تنگی کو محسوس کر کے اس جگہ کا انتخاب ضرورتاً کیا ہوگا مگر گھر میں قدم رکھتے ہی دوسرا جھٹکا لگا ---- احتشام احمد اور اپنی ماں کو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر وہ چونکا پھر فوری طور پر ایک خوش گوار غلط فہمی کا شکار ہوکر اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس کے ذہن میں عنبرین کا تصور ابھرا جو اپنے والدین کے ایک حادثے میں شکار ہوجانے کے بعد احتشام احمد کے گھر منتقل

ہو گئی تھی۔

عنبرین۔ کالج میں اس کی کلاس فیلو تھی پھر وہ دونوں وقت کے ساتھ ایک دوسرے کے مستقبل کا حسین خواب بن گئے تھے۔ ان کی پاکیزہ محبت کے چرچے پھر پورے کالج میں ہونے لگے۔ ساجد کے ایک قریبی دوست نے ایک بار اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میری مانو تو عنبرین کا خیال ذہن سے نکال دو۔''

''کیا مطلب؟'' ساجد نے چونک کر اپنے اس مخلص دوست کو حیرت سے دیکھا۔ ''کیا تم بھی دوسرے لڑکوں کی طرح.....''

''غلط مت سمجھو ساجد۔'' دوست نے وضاحت کی۔ ''کالج کی بات اور تھی یہاں مخلوط تعلیم ہونے کی وجہ سے کسی کو زیادہ انگلیاں اٹھانے کی ہمت نہیں تھی لیکن باہر کی طبقاتی دنیا میں تمہارے اور عنبرین کے پیار کو لوگ کچھ اور رنگ دیں گے۔ احتشام احمد کی شخصیت، ان کی امارت اور اسٹیٹس کے بارے میں تم بھی جانتے ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ تمہاری اور عنبرین کی محبت کو پروان چڑھنے کی اجازت دیں گے خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب خود عنبرین کو بھی حالات کی گردش نے ان کی ذمے داری بنا دیا ہے۔''

ساجد نے خاموشی سے گردن جھکالی۔ اس کا ذہن بھی اسٹیٹس کے تانے بانوں میں الجھ کر رہ گیا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ابرار احمد بھی عنبرین کے دعوے داروں میں سے ہے۔ احتشام احمد اور آمنہ بیگم بھی عنبرین جیسی سونے کی چڑیا کو جو کروڑوں کی جائیداد کی تنہا وارث رہ گئی تھی، ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

پھر سالانہ امتحان ختم ہوئے تو کھلے عام ملاقاتوں کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ ہفتے میں ایک دو بار موبائل پر مختصر گفتگو ہو جاتی تھی۔ عنبرین نے دبی زبان میں کہا بھی تھا کہ ساجد ماں کو رشتے کے لیے بھیجے لیکن باپ کی موت کے بعد ساجد اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ماں کو آمادہ کرتا۔ اسے اندیشہ تھا کہ احتشام احمد اس کی مالی پوزیشن کے تحت عنبرین کا ہاتھ اسے دینے کی حامی نہیں بھریں گے۔

''تم ہمت کرو ساجد، میں کوئی ان پڑھ یا گنوار لڑکی نہیں ہوں جو اپنی قسمت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکوں۔ والدین کا سایہ سر سے ضرور اٹھ گیا ہے لیکن کروڑوں کی جائیداد میرے نام ہے۔ ہم علیحدہ رہیں گے تو تم اپنا بزنس بھی بڑے پیمانے پر کرسکو گے۔''

''کیا تم اپنے انکل کے سامنے زبان کھول سکو گی؟''

''میں کوئی بے زبان جانور نہیں جو خاموشی سے قربان ہو جاؤں۔ مذہب نے مجھے پسند اور ناپسند کا جو حق دیا ہے، اس سے بھی ناواقف نہیں ہوں۔''

''لیکن میں تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' عنبرین نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''تم اپنی والدہ کو پیغام لے کر بھیجو، باقی میرا کام ہے۔''

''مجھے تھوڑا وقت درکار ہے۔'' ساجد نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ ''بزنس کو کچھ اور اسٹیبلش کرلوں اس کے بعد میں ماں کو بھی دل کا حال بتادوں گا۔''

''اوکے، اینڈ وش یو گڈ لک۔'' عنبرین نے بڑے پیار سے جواب دیا پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔

عنبرین کو حاصل کرنے کی لگن اور ماں کے دل سے بیوگی کا غم دور کرنے میں ساجد نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ قسمت اور وقت نے اس کا ساتھ دیا تو حالات خود بخود سازگار ہوتے چلے گئے۔ بیرونی منڈیوں تک ایکسپورٹ کا سلسلہ قائم کرنے کے بعد وہ اس قابل تھا کہ عنبرین کا ہاتھ تھام سکے۔ اس غرض سے وہ اس دن شام چار بجے گھر آگیا تھا تا کہ ماں سے اپنے دل کا حال بتا سکے لیکن خلاف توقع احتشام احمد اور ماں کو آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا پھر وہ اس خوشگوار غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ شاید عنبرین نے کسی طرح اپنے اور ساجد کے پیار کی داستان گھر والوں کے کان تک پہنچادی ہوگی جو احتشام احمد نے خود اس کے غریب خانے تک آنے کی زحمت گوارا کرلی۔ وہ آڑ میں ہو کر ان کی گفتگو سننے لگا۔

''میں تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں؟'' احتشام احمد کی آواز ابھری۔ ''اقرار یا انکار؟''

''فوری طور پر میں اس اہم مسئلے کا کوئی جواب دینے سے قاصر ہوں۔'' ماں نے ہچکچا کر کہا۔

''شادی کا پیغام کوئی جرم نہیں ہے جسے مسئلہ بنالیا جائے۔''

''آپ مرد ہیں اس لیے زبان کھولنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے لیکن میں عورت ہوں اور ماں بھی اس لیے ڈرتی ہوں۔''

''ڈرنے کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟''

''ہاں۔'' ماں نے کچھ توقف سے جواب دیا۔ ''میری زندگی کی کتاب کے کچھ اوراق آپ کی نظر سے بھی گزر چکے ہیں۔ انسان مارنے والے کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے

بولنے والوں کی زبان بند نہیں کی جا سکتی۔"

"کیا ساجد بھی اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ وہ تمہاری سوتیلی اولاد ہے؟"

احتشام احمد کا وہ جملہ ساجد کے وجود میں کسی آتش فشاں کے ابلتے ہوئے لاوے کی طرح اترتا چلا گیا۔ ایک لمحے کو وہ اس انکشاف کو اپنی سماعت کا وہم سمجھا لیکن پھر برجیس ناز کے جواب نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی۔

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، اس راز کو دوبارہ زبان تک نہ آنے دیجیے گا ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی اور اب تو ساجد کے سوا میرے پاس کچھ باقی نہیں رہا۔"

"مجھے منظور ہے لیکن اس شرط پر کہ تم بھی میری خواہش کا احترام کرو۔"

"آپ کو آمنہ بیگم سے ایسی کیا شکایت ہے جو دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔" برجیس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "یہ بھی نہ بھولیں کہ آپ ایک جوان بیٹے کے باپ ہیں۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔" احتشام احمد نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ابرار میرے کسی معاملے میں بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ رہا آمنہ بیگم کا مسئلہ تو تم بھی جانتی ہو کہ ایک پیچیدہ آپریشن کے بعد وہ میرے قرب کو پہلی جیسی رغبت سے قبول نہیں کرتی... بالکل سرد ہو کر رہ گئی ہے۔"

"لیکن اس میں اس غریب کا کیا قصور ہے؟ وہ آپریشن بھی اس نے آپ کی خواہش پر کروایا تھا۔ آپ اپنے کیے کی سزا دوسرے لوگوں کو دے رہے ہیں؟"

"سزا اور جزا کی بات چھوڑو برجیس بیگم۔ یہ بھی نہ بھولو کہ کسی نے تمہیں داغ دار کر کے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا۔" احتشام احمد نے چبھتے انداز میں کہا۔ "دوسرے مرد نے فوراً تمہارا ہاتھ نہ تھاما ہوتا تو ساجد کا بھید بھی کھل گیا ہوتا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو احتشام۔" برجیس نے جواب دیا۔ "اوپر والے کی لاٹھی بھی سزا اور جزا کے بارے میں بھی غلط فیصلے نہیں کرتی۔ وہ اپنے مجبور بندوں کی بے کسی پر خصوصی کرم کرتا ہے۔ جس نے بھی میری مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا وہ بھی خدا کی بے آواز لاٹھی کا نشانہ ضرور بنے گا۔"

"مجھے اس کا نام نہیں بتاؤ گی؟" احتشام احمد نے تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہو کر دریافت کیا۔

"وقت کا انتظار کرو، ہو سکتا ہے کہ حالات تمہیں کسی ایسے موڑ پر پہنچا دیں جب تم کو بھی کسی کی اصلیت کا اندازہ ہو جائے۔ اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"لعنت بھیجو ان باتوں پر۔" احتشام احمد نے اس بار فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم بہرحال مجھ سے شادی کرنے کے سلسلے میں انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہو۔ میں دو روز بعد پھر آؤں گا۔"

"اگر تم ضد کر رہے ہو تو پھر تمہیں میری ایک شرط بھی قبول کرنی ہوگی۔"

ساجد کا پورا وجود طوفان میں گھرے کسی معصوم پودے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس نے جو کچھ سن لیا تھا اس سے زیادہ سننے کی تاب بھی نہیں تھی اس لیے تیزی سے پلٹا اور الٹے قدموں گھر سے واپس چلا گیا۔

اس رات وہ خاصی دیر سے گھر واپس آیا۔ ماں نے اس کے چہرے پر پھیلی ویرانیوں کا اندازہ لگایا تو بڑے پیار سے بولی۔

"کیا بات ہے ساجد، آج اتنی دیر کہاں ہو گئی؟"

"زندگی اور کاروبار میں اکثر کچھ ایسے نشیب و فراز آجاتے ہیں جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔" ساجد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "نفع اور نقصان انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

"نقصان کی فکر کرو گے تو کاروبار کی اونچ نیچ کا تجربہ کیسے کرو گے؟" ماں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "انسان کو ہر حال میں صبر و شکر سے کام لینا چاہیے، چلو کھانا کھا لو۔"

"نہیں۔" ساجد نے سرد انداز میں جواب دیا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے ساجد؟" ماں نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔ "ایسا کیا نقصان ہو گیا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی؟"

"آج... آج وہ شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا جس میں مجھے میرے ماضی، حال اور مستقبل کا عکس نظر آتا تھا۔" ساجد نے خلا میں گھورتے ہوئے دل برداشتہ انداز میں کہا۔ "ٹوٹے ہوئے شیشے دوبارہ نہیں جڑا کرتے۔"

برجیس نے ساجد کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھا۔ جو بات ساجد کی زبان سے نکلی وہ اس شبہے کو تقویت دے رہی تھی کہ وہ احتشام احمد اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکا تھا۔ کچھ لمحے وہ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی

[illegible] 2015 [illegible]

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

رفعت جاوید نے عیاں کیا **رنگ خلش** کا اصل رنگ......

نگہت سیما کی ماضی وحال میں تیزی سے سفر کراتی دلچسپ تحریر...... **اعتبار وفا**

اسیر وفا میں **زمر نعیم** نے سمیٹے وفا کے انوکھے باب

متاع دل...... **نبیلہ ابر راجا** نے اٹھایا چند تلخ حقائق سے پردہ

چلو ہم ساتھ چلتے ہیں ...... **صائمہ اکرم** کی ایک پرفسوں تحریر

اختر شجاعت کے قلم سے...... **توبہ**...... **توفیق الٰہی** ایک روح پرور مضمون

شیریں حیدر کے مشاق قلم کا ایک اور شاہکار **گھنٹی** کی صورت

مایہ ناز قلم کار......

نیلم احمد بشیر نے بخشی ہماری بزم کو رونق اپنی کھٹی، میٹھی مگر پرفکر باتوں سے

دیگر ممتاز لکھاریوں کی پرتنوع کاوشیں جن میں **ہما بخاری**، **صائمہ قیصر**، **صدف آصف**، **نزہت جبیں ضیا**، **شمیم فضل خالق** و دیگر شامل ہیں۔

[illegible]

رہی پھر دبی زبان میں پوچھا۔

''کیا تم شام کو گھر آئے تھے؟''

''نہ آتا تو شاید مجھے کچھ کروہ چہرے اور باتوں کا پتا بھی نہ چلتا۔'' ساجد نے اس بار دوٹوک جواب دیا پھر اپنے جذبات کو کسی حد تک قابو میں رکھ کر بولا۔ ''چہروں کو بے نقاب دیکھ لینے کے بعد اب میں یہاں نہیں رہ سکتا لیکن جانے سے پہلے بیٹا حق سمجھ کر ایک سوال ضرور کروں گا.... میرا باپ کون تھا؟''

برجیس کے خوابوں کے سارے تاج محل ساجد کے ایک ہی سوال سے چکنا چور ہو گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ساجد کو دیکھتی رہی۔ پھر دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو سنبھالتی ہوئی بیٹھ گئی۔

''اس خاموشی کو کیا سمجھوں..... اعتراف یا کوئی ڈراما؟''

''زبان کو بند رکھو ساجد۔'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''اس سے پہلے تم نے کبھی میرے سامنے زبان نہیں کھولی۔''

''اس لیے کہ مجھے اپنی اور تمہاری حقیقت اور اصلیت کا رائی برابر شبہ بھی نہیں ہوا تھا لیکن آج کے بعد جب بھی میرا تمہارا سامنا ہوگا میں یہ سوال بار بار کروں گا کہ میرا باپ کون تھا؟ کیا تم بھی اس کا نام نہیں بتا سکتیں؟''

ساجد کے لب و لہجے میں ایسی کاٹ، ایسا زہر تھا کہ برجیس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ ساجد جو الزام لگا رہا تھا، وہ اس گفتگو کی روشنی میں غلط بھی نہیں تھا جسے وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا۔

ساجد نے ماں کو منہ ڈھانپتے ہوئے دیکھا تو اس کے اندر کی تلخی اور بھڑک اٹھی، حقارت بھرے لہجے میں بولا۔

''میرے جانے سے پریشان نہ ہو..... تم سے میرا کیا رشتہ ہے؟ یہ بھی یاد نہیں..... یہ تم جانتی ہو لیکن بہرحال تم نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ پرورش کی ہے تمہارا حق نہیں ماروں گا۔ بہرحال تم کو ایک معقول رقم ملتی رہے گی۔''

''زبان کو لگام دو ساجد۔'' برجیس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''تو میرا بیٹا، میرا خون ہے اور خون..... خون سے جدا نہیں ہو سکتا تو نہیں نہیں جائے گا۔''

''تمہاری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے والوں نے تمہیں زندگی کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ مکروفریب بھی سکھا دیا ہوگا۔'' ساجد نے ہونٹ چباتے ہوئے اسے حقارت سے گھورا۔ ''مجھے روک کر اپنا نقصان مت کرو۔ میں رہا تو تم نئی شادی بھی نہیں رچا سکو گی۔ احتشام احمد جیسی موٹی اور سونے کا انڈا دینے والی آسامی بھی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ تمہاری وجہ سے عنبرین کے ساتھ میری محبت کا دم بھی گھٹ جائے گا۔ اپنے آپ پر تو تم نے رحم نہیں کیا اپنا سب کچھ آنکھ بند کر کے ایرے غیرے کو سونپتی رہیں لیکن اب اپنا نہیں تو میری محبت کا خیال رکھو۔۔۔ شادی کے بعد تم اس پوزیشن میں بھی ہو گی کہ احتشام احمد سے کم از کم میری سفارش کر دو۔''

''بکواس بند کر ساجد۔'' برجیس تڑپ کر بولی۔ ''تو نے میری اور احتشام احمد کی جو باتیں سنی ہیں، وہ سب سچ نہیں ہیں۔ حالات کے پیش نظر سچ بولنا مناسب نہیں تھا ورنہ.....''

''ورنہ شاید تمہاری زندگی کے کچھ اور ڈھکے چھپے افسانے بھی سامنے آ جاتے۔''

''سا..... جد.....'' برجیس کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پوری شدت سے دھاڑی۔ ''جا..... چلا جا..... دور ہو جا میری نظروں سے اب کبھی اپنی صورت بھی نہ دکھانا۔''

ساجد نے پلٹ کر اسی لب و لہجے میں کچھ زیادہ تلخ بات کہنی چاہی پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ قدم بڑھاتا اپنے کمرے میں جا کر ضروری سامان سمیٹنے لگا پھر وہ رات بھی اس نے کسی نئی چھت تلے بسر کی۔۔۔ اور اب وہ کینیڈا جاتے ہوئے جہاز میں بیٹھا اسی نکتے پر غور کر رہا تھا کہ شاید اس نے احتشام احمد کی موت کے بعد عنبرین کا مشورہ مان کر فوری طور پر باہر جانے کا پروگرام بنا کر دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔

☆☆☆

انسپکٹر سراج نے ایس پی کے جانے کے بعد..... ......موبائل میں ریکارڈ شدہ بیان کو پوری توجہ سے سنا۔ اس کے سامنے اس وقت ابرار احمد کے سوا کوئی اور نہیں تھا جو بظاہر خود کو بے پروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سارے بیانات سننے کے بعد انسپکٹر نے ابرار احمد کو دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

''اس گھر میں مرحوم کے بعد اب آپ ہی ایسی شخصیت کے مالک رہ گئے ہیں جو قاتل یا قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے میں پولیس کی مدد کر سکیں۔''

''صرف میں ہی کیوں؟'' ابرار نے پہلو بدل کر سنجیدگی سے کہا۔ ''میری والدہ..... عنبرین اور ہمارے ملازم بھی اسی گھر سے متعلق ہیں۔''

''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن موجودہ حالات کی روشنی میں ہمیں کسی ایسے فرد کی تلاش ہے جو مرحوم سے ملنے کے لیے ان کے کمرے میں آخری بار گیا ہو۔''

''اوہ.....'' ابرار احمد نے کسمسا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی والدہ اور عنبرین کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن گزشتہ رات تقریباً نو بجے والد صاحب نے مجھے اپنی خواب گاہ میں بلایا تھا۔ اس وقت وہ کچھ الجھے ہوئے ضرور تھے لیکن اس کی وجہ کچھ دوسری نوعیت کی تھی۔''

''کیا آپ اس کی نوعیت بتانا پسند کریں گے؟''

''میرا خیال ہے کہ اس بات سے والد صاحب کے قتل کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔''

''یہ سوچنا آپ کا نہیں، پولیس کا کام ہے۔'' انسپکٹر سراج نے پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔ ''اکثر ایک چھوٹی سی غیر اہم بات بھی کسی چنگاری کی طرح آگ بھڑکانے کا سبب بن جاتی ہے۔''

ابرار احمد نے انسپکٹر کے یکلخت سنجیدہ ہوجانے کو محسوس کیا تو اس نے تھوڑے توقف سے کہا۔

''دراصل ڈیڈی کی خواہش تھی کہ عنبرین اور میری شادی خواہ بعد میں ہو لیکن نکاح فوری طور پر ہوجائے۔''

''آئی سی۔'' انسپکٹر نے پہلو بدل کر چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا فوری نکاح کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''آپ غلط اندازے نہ لگائیں انسپکٹر۔'' ابرار احمد نے اس کے تجسس کو بھانپ کر قدرے خفگی کا اظہار کیا۔ ''ڈیڈی کو ہمارے فوری نکاح کی فکر اس لیے تھی کہ وہ..... وہ ساجد سے عنبرین کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔''

''اوہ.....'' انسپکٹر نے دوبارہ سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''ریکارڈ شدہ بیان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ مس عنبرین اور ساجد کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔''

''جی ہاں اس کے یہاں آنے کی یہی وجہ تھی۔''

''کیا مرحوم نے بھی اسے یہاں آنے جانے سے منع کیا تھا؟'' انسپکٹر نے مزید وضاحت کی۔ ''میرا خیال ہے کہ گھر کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اگر وہ ساجد کو یہاں آنے جانے سے روک دیتے تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا؟''

ابرار احمد نے جواب میں محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کسی بات کو مکمل کر کہنے سے گریز کررہے ہیں۔'' انسپکٹر نے سوال کیا۔ ''مرحوم کی ساجد کے سلسلے میں بے بسی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔''

''والدین کے مرجانے کے بعد عنبرین نے ہمارے ہاں رہنا شروع کیا تھا۔ ڈیڈ اس کی دل آزاری نہیں چاہتے تھے اور..... اور عنبرین نے خود بھی ساجد کے یہاں آنے پر اعتراض نہیں کیا۔''

انسپکٹر چبھتی ہوئی نظروں سے ابرار کو دیکھتا رہا پھر اس نے کھل کر اپنے خیال کا اظہار کیا۔ ''اس کے مطلب یہ ہوا کہ وہ اور ساجد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے؟''

''یہی خیال ڈیڈ کا بھی تھا۔''

''آپ کیا کہیں گے اس سلسلے میں؟''

''میں بھی حالات کی روشنی میں اب یہی کہوں گا کہ ڈیڈ کی پُراسرار موت میں کسی نہ کسی زاویے سے ساجد کا ہاتھ بھی ضرور شامل ہے۔ نہ ہوتا تو اس بڑے حادثے کے فوراً بعد وہ ملک سے باہر نہ جاتا۔''

''رائٹ..... لیکن آپ یہ بھی نہ بھولیں کہ مس عنبرین نے اپنے بیان میں اقرار کیا تھا کہ مرحوم کے قتل کی اطلاع ساجد کو اسی نے دی تھی اور کینیڈا جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر ساجد کو آپ کے شبے کی روشنی میں مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کیا جائے تو عنبرین صاحبہ کا نام بھی اس کے ساتھ شامل ہوگا۔'' ابرار کسمسا کر رہ گیا۔

''ایک بات اور.....'' انسپکٹر نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ ''کیا شادی کے مسئلے پر بھی مرحوم اور عنبرین کے درمیان بھی کوئی ایسی گفتگو ہوئی جس کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکے؟''

''مجھے اس کا علم نہیں ہے۔''

''کل رات آپ کے علاوہ کوئی اور بھی مرحوم کی خواب گاہ میں گیا تھا؟''

''والدہ صاحبہ اپنے بیان میں بتا چکی ہیں کہ وہ..... کچھ عرصے سے علیحدہ کمرے میں سو رہی تھیں لیکن کبھی کبھی والد صاحب سے کسی خاص گھریلو مسئلے پر بات کرنے کی خاطر اکثر وہ دوپہر کے اوقات میں وہاں آتی جاتی رہی ہیں۔ کل رات وہ گئی تھیں یا نہیں میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''کوئی بات نہیں..... پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے علاوہ پستول اور خواب گاہ کے دوسرے حصوں سے ملنے

والے فنگر پرنٹس کی رپورٹ آجائے تو پھر ہمیں قاتل کا سراغ لگانے میں بھی زیادہ سہولت ہوگی۔'' انسپکٹر نے فائل اور دیگر سامان سمیٹتے ہوئے کہا پھر ابرار احمد سے مصافحہ کر کے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

ساجد کے گھر چھوڑ کر چلے جانے سے ربیس کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوگیا تھا، اس کا پُر کرنا اس کے اختیار کی بات نہیں تھی۔ ماضی کی کچھ کمزوریوں نے اس کی زبان پر قفل ڈال دیے تھے۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھی کہ کھل کر اپنی صفائی پیش کر سکتی۔ صرف اپنی مجبوریوں پہ کھل کر آنسو بہانے کے سوا کوئی بات اس کے اختیار میں نہیں تھی۔

ساجد کے جانے کے دو دن بعد احتشام احمد دوبارہ سامنے آیا تو ربیس کا دل چاہا کہ حقارت سے اس کے منہ پر تھوک دے، دھکے مار کر گھر سے نکال دے یا پھر اس کا خون کر دے جو اس کی خوشیوں کو بار بار ڈستا رہتا تھا لیکن وہ اس وقت بھی دل پر جبر کر کے رہ گئی۔ بات بڑھتی تو رائی کا پربت بن جاتی اور اس پربت سے اُٹھنے والی دھوئیں سانس لینا بھی دوبھر کر دیتی۔ ساجد کا وجود بھی لپیٹ میں آتا جو ربیس کو کسی قیمت پر منظور نہیں تھا چنانچہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر احتشام احمد کو پھر اپنی دہلیز پھلانگنے کی اجازت دے دی۔

''قبل اس کے کہ میں تمہاری مرضی معلوم کروں، یہ بتادوں کہ میں نے تمہاری خاطر ایک بنگلا کرائے پر حاصل کرلیا ہے۔'' احتشام احمد نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تم مجھے اپنے آخری فیصلے سے بھی آگاہ کر دو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' ربیس نے دل شکستہ لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا میں تمہاری کسی بات سے انکار کر سکتی ہوں؟''

''آج تم کچھ افسردہ نظر آ رہی ہو؟'' احتشام نے اسے کریدنے کی خاطر سوال کیا۔ ''کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں۔'' ربیس نے نچلا ہونٹ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''ساجد گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''کیوں؟''

''پچھلی بار جب تم آئے تھے تو اس نے ہم دونوں کی بات سن لی تھی۔''

''اوہ۔'' احتشام کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ''کیا اسے بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ تمہاری سوتیلی اولاد ہے؟''

''اس ذکر کو بھی تم ہی بار بار نکالتے ہو۔'' ربیس نے دل پر جبر کر کے شکوہ کیا۔

''ایسی باتیں ہمیشہ راز نہیں رہتیں، کبھی نہ کبھی ان کا پول بہرحال کھل جاتا ہے۔''

''شاید تم بھی غلط نہیں کہہ رہے ہو لیکن تم بھی جانتے ہو کہ میں نے اسے کس نازو پیار سے پال پوس کر جوان کیا ہے۔''

''کیا ساجد نے کبھی تم سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تھا؟''

''تم کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟'' ربیس نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ساجد کی طرح مجھے بھی اس بات کی کھوج ہے کہ اس کا باپ کون ہوسکتا ہے؟ تمہیں کہیں نہ کہیں سے اس کی بھنک تو ضرور ملی ہوگی۔''

''چور کا بھائی بھی گرہ کٹ ہی ہوتا ہے۔'' ربیس نے بے اختیار ہنس کر کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ہنسی میں کوئی اندرونی کرب بھی شامل تھا۔

''تم نے اس وقت یہ مثال کیوں دی؟'' احتشام احمد کی کشادہ پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''تمہارا ماتھا اب کیوں ٹھنک رہا ہے جبکہ تمہارے ذہن میں ابھرنے والی شخصیت اپنی خوبیوں سمیت دفن ہوچکی ہے۔''

احتشام ایک لمحے ربیس کو گھورتے رہے پھر موضوع بدل کر کہا۔ ''میں چاہتا ہوں تمہاری اور میری شادی میں اب کوئی تاخیر نہ ہو۔''

''کل بھی کسی وجہ سے میں تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کرسکتی تھی آج بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

احتشام نے بات کو طول دینے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے ہی دن انہوں نے قاضی کو بلا کر نکاح پڑھوالیا اور ربیس ان کے ساتھ اپنے گھر کو حسرت بھرے انداز میں قفل لگا کر خاموشی سے رخصت ہوگئی۔ اس کی وہ سہاگ رات بھی بڑے کرب کے عالم میں گزری مگر اس نے دل پر جبر کر کے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

دوسرے دن وہ نئے گھر میں تنہا بیٹھی اپنے ماضی اور حال کے تانوں بانوں میں الجھ رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ بجتی رہی پھر بند ہوگئی۔ اس نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی لیکن جب دوسری بار بھی وہی آواز اس کے وجود میں ہلچل مچاتی رہی تو اس نے جھنجلا کر فون اٹھالیا۔

''کون ہے؟'' اس کا لہجہ بھی گزرتے وقت کی طرح تلخ ہی تھا۔

''ایک اور نئی شادی مبارک ہو۔''

''کیا تم نے اس وقت میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے فون کیا ہے؟'' برجیس کی آواز شدتِ جذبات سے کپکپانے لگی۔

''ایک بات معلوم کرنی چاہوں گا۔ میرے تمام ضروری دستاویزات پر ولدیت کی جگہ منظور احمد کا جو نام لکھا ہے، وہ کون تھا؟''

''منظور احمد ایک فرضی نام ہے۔'' برجیس نے دل مسوس کر جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''قدرت کو جو منظور تھا، میں نے وہی مناسب سمجھا۔ اس سے زیادہ وضاحت کرنا میرے اختیار میں.....''

''جہنم میں جاؤ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔'' دوسری جانب سے رابطہ منقطع کیا گیا تو برجیس ناز اپنے بستر پر گر کر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دیکھنے کے بعد انسپکٹر کو بظاہر ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا کہ احتشام نے کسی مخصوص ذاتی یا ذہنی پریشانی کے سبب ایک ایسی دوا استعمال کی جو بظاہر خواب آور تھی لیکن اس کی زیادہ مقدار استعمال کرنے سے حرکتِ قلب بند ہونے کا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی یہی وضاحت کی گئی تھی۔ جائے وقوعہ سے دوا کی جو بوتل ملی تھی وہ بھی خالی تھی۔ پستول پر صرف اور صرف مرحوم کے فنگر پرنٹس ملے تھے جس میں کچھ تازہ بھی تھے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں دو باتیں قرینِ قیاس تھیں۔ یا تو جو خواب آور دوا استعمال کی گئی وہ ناکافی تھی یا پھر دوا لینے کے باوجود مرحوم نے اپنی موت کو یقینی بنانے کی خاطر آتو میٹک کی ایک گولی بھی داغ دی تھی۔ دوسری صورت میں بھی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مرحوم ہر قیمت پر اپنی موت کو یقینی بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

پوسٹ مارٹم اور ریکارڈ پر موجود بیانات کی روشنی میں کسی فردِ واحد کو قاتل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یعنی بیانات کی روشنی میں ابھی کچھ مشکوک افراد باقی تھے جن سے مل کر ان کو مزید کریدنے کی ضرورت تھی جن میں سرِفہرست ساجد کا تھا جو احتشام احمد کی موت والی رات کی دوسری صبح اول فلائٹ سے کینیڈا چلا گیا تھا۔ آمنہ بیگم سے

بھی مزید تفتیش ضروری تھی اس لیے کہ انہوں نے ایس پی کو جو مختصر جواب دیے وہ خاطر خواہ نہیں تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے انسپکٹر سراج نے آمنہ بیگم سے ملنا ضروری سمجھا۔

"آپ مقتول کے سب سے زیادہ قریب رہی ہیں اس لیے میری ناقص رائے میں اگر آپ مجھ سے تعاون کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم قاتل یا قاتلوں کے مکروہ چہروں کو بے نقاب نہ کر سکیں۔"

"میں ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ وہ تہذیب کے دائرے کے اندر ہو۔" آمنہ بیگم نے پُروقار لہجے میں جواب دیا۔ "غیر ضروری اور بے ہودہ سوالات کے جوابات دینا میں پسند نہیں کروں گی۔"

"میں ذاتی طور پر اس بات کا خیال رکھوں گا کہ میرے سوالات سے آپ کو مزید کسی صدمے سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ میں اس نازک نکتے کی اہمیت کو بھی بخوبی سمجھ سکتا ہوں کہ مرحوم نے خواہ کسی وجہ سے بھی دوسری شادی کی، اس سے آپ کی حق تلفی اور دل آزاری بہرحال ضروری ہوئی ہوگی۔"

آمنہ بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"آپ کے خیال میں دوسری شادی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟" انسپکٹر نے کچھ توقف سے دریافت کیا۔

"میں اگر اسے ایک مرد کی خودغرضی کہوں تو آپ کو ناگوار تو نہیں لگے گا؟" آمنہ بیگم نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"قطعاً نہیں۔" انسپکٹر سراج نے پیشہ ورانہ انداز میں مسکرا کر کہا پھر پہلو بدل کر دوبارہ اپنے سوال کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ "خودغرضی زیادہ تر مردوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوتی ہے۔"

جواب میں آمنہ بیگم نے قریب رکھی ایک فائل اٹھا کر اس میں سے اپنے آپریشن اور میڈیکل رپورٹ کی فوٹو کاپی نکال کر انسپکٹر کے حوالے کرتے ہوئے خشک لہجے میں تائید کی۔ "آپ اسے آن ریکارڈ رکھ سکتے ہیں لیکن کسی وقت سکون سے بغور پڑھنے کی زحمت بھی گوارا کریں۔"

"اس تعاون کے لیے بھی میں آپ کا مشکور ہوں۔"

فوٹو کاپیاں واپس فائل میں رکھنے کے بعد اس نے آمنہ بیگم سے کہا۔ "مسٹر ابرار نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ مقتول نے آخری وقت میں انہیں اپنی خواب گاہ میں بلایا تھا۔ اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ مس عنبرین سے فوری طور پر شادی کرلے۔"

"مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔"

"کیا آپ کی بھی یہی خواہش ہے کہ ان دونوں کی شادی کسی خاص وجہ سے فوری طور پر ہونی ضروری ہے۔"

"صرف خواہش کرنا میرے اختیار کی بات ضرور ہے انسپکٹر لیکن حتمی فیصلہ بہرحال عنبرین کا حق ہے۔ وہ بالغ ہے اور سمجھدار بھی۔ ہم زبردستی اس پر اپنا کوئی فیصلہ نہیں تھوپ سکتے۔"

"آپ کا ذاتی خیال کیا ہے؟" انسپکٹر نے متبادل رخ اختیار کیا۔ "کیا مس عنبرین کو ابرار کا رشتہ منظور نہیں ہوگا؟"

"اس کا جواب بھی وہی بہتر طور پر دے سکتا ہے لیکن ......" آمنہ بیگم نے کچھ توقف کے بعد صاف گوئی سے کہا۔ "اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو یقیناً انکار کردیتی۔"

"اس انکار کی معقول وجہ بھی ضرور ہوتی؟"

"جی ہاں۔" آمنہ بیگم نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا۔ "میں جانتی ہوں کہ عنبرین، ساجد کو پسند کرتی ہے جو اس کا کلاس فیلو بھی رہ چکا۔ عنبرین ہی کی وجہ سے وہ یہاں دو تین بار مجبوراً آیا بھی ہے ورنہ ہماری دہلیز کو پھلانگنے کی کوشش بھی نہ کرتا۔" آمنہ بیگم نے ہونٹ چباتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "مرحوم یا مقتول نے دوسری شادی ساجد کی ماں سے ہی کی تھی۔"

"اس سلسلے میں مسٹر ابرار نے جو بیان ایس پی کو دیا ہے، اس میں خاص طور پر یہی کہا گیا ہے کہ ساجد برجیس کا سوتیلا بیٹا ہے۔"

"اس بات کو آپ قانونی حیثیت نہیں دے سکتے اس لیے کہ کسی کے سگے یا سوتیلے ہونے کا فیصلہ ایک ماں کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا۔"

"یو آر رائٹ۔" انسپکٹر نے اقرار کیا پھر پہلو بدل کر پوچھا۔ "مسٹر ساجد کے بارے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟"

"قانون اسے کس زاویے سے دیکھ رہا ہے اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔ میں ذاتی طور پر یہی کہوں گی کہ ساجد پڑھا لکھا اور مہذب لڑکا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ برجیس ناز سے علیحدگی کے باوجود بزنس سے ہونے والی آمدنی کی ایک خطیر رقم ہر ماہ بڑی پابندی سے بھیجتا رہتا ہے۔"

"آپ کی معلومات میری رہبری کے لیے بہت اہم ثابت ہوں گی مگر میں ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا۔" انسپکٹر نے اپنائیت سے کریدنے کی خاطر

سوال کیا۔ ''اگر میری جگہ آپ تفتیشی افسر ہوتیں تو مسز ساجد کو کس خانے میں فٹ کرتیں؟''

''موجودہ حالات میں اس نے ملک سے باہر جاکر اپنی شخصیت کو مشکوک کرلیا ہے اس لیے اگر اس پر شبہ کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انسپکٹر..... پولیس پر آنکھ بند کرکے اعتماد کرلینا میرے اصول کے خلاف ہے اس لیے کہ کبھی کبھی یہ خود اعتمادی بھی خاصی مہنگی پڑ جاتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ آپ پر اعتماد کرکے میں اپنے دل کا کچھ بوجھ ضرور ہلکا کرسکتی ہوں۔''

''میں اس اعتماد کے لیے بھی آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' آمنہ بیگم نے پھر کچھ دیر مہر بہ لب رہنے کے بعد ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

''میرے اور مرحوم کے کمروں کے درمیان ایک دروازہ مشترک ہے جس پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ دوسری شادی کے بعد ہم دونوں نے ہی دروازے کو اپنی اپنی جانب سے قفل ڈال دیا تھا لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں ہر روز اس دروازے سے کان لگائے خاصی دیر تک سن گن لیتی رہتی تھی۔ حادثے والی رات میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھی۔'' آمنہ بیگم ایک لمحے کو چپ ہوگئیں تو انسپکٹر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی تجربہ کار نظریں بدستور آمنہ بیگم کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا ایکسرے کرنے میں مصروف تھیں۔

''اس منحوس رات مرحوم نے ابرار سے پہلے عنبرین کو اپنی خواب گاہ میں بلوایا تھا۔ چند رسمی باتوں کے بعد انہوں نے اچانک جھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا میں صرف تمہاری وجہ سے ساجد کا اس گھر میں آنا جانا برداشت کررہا ہوں ورنہ اسے اپنی دہلیز عبور کرنے کی اجازت کبھی نہ دیتا۔ مرحوم کی بات کے جواب میں عنبرین نے بھی خشک لہجے میں کہا تھا کہ وہ فون کرکے ساجد کو آنے جانے سے منع کردے گی۔ عنبرین کا جواب سن کر مرحوم نے ایک بات بڑے فیصلہ کن لہجے میں کہی تھی کہ تم میری مرضی کے بغیر ساجد سے نہیں ملوگی۔ اس کے ساتھ کسی بھی قیمت پر میں تم کو شادی کی اجازت... نہیں دوں گا۔''

''جواب میں مس عنبرین نے کیا کہا؟'' انسپکٹر نے آمنہ بیگم کی وقتی خاموشی کو محسوس... کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہی جو ایک عاقل، بالغ اور خود مختار لڑکی کو کہنا چاہیے تھا۔'' آمنہ بیگم نے پُرسکون انداز میں بتایا۔

''عنبرین نے مہذب مگر کھلے الفاظ میں کہا تھا کہ شادی کرنے کا جو حق اسے خدا نے دیا ہے، اسے کوئی دوسرا نہیں چھین سکتا۔''

''بکواس بند کرو اور.... اور ایک بات کان کھول کر سن لو۔'' مرحوم نے چیخ کر کہا۔ ''تم کم از کم میری زندگی میں ساجد سے شادی نہیں کرسکوگی۔''

''پھر...؟'' انسپکٹر سراج نے بے چینی سے دریافت کیا۔ ''مس عنبرین نے کیا جواب دیا؟''

''اس نے نہایت سادگی سے ایک مختصر بات کہی تھی کہ ساجد کو ہر قیمت پر اپنانے کی خاطر وہ خود اپنی سانس کی آخری سرحدوں تک بھی انتظار کرسکتی ہے۔ اس کے بعد وہ شاید مرحوم کو کوئی جواب دیے بغیر ہی چلی گئی تھی۔'' آمنہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''عنبرین کے جانے کے بعد مرحوم نے ابرار کو بلا کر کہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ جلد از جلد عنبرین کو ہموار کرکے اس کے ساتھ نکاح کے دو بول پڑھوالے۔''

''اب آپ کیا کہیں گی؟'' اس بار انسپکٹر نے اپنی نشست پر کسمسا کر دبی زبان میں کہا۔ ''اگر ہم ساجد پر کسی بھی زاویے سے شبہ کریں تو کیا مس عنبرین کو شریک جرم نہیں سمجھا جاسکتا۔''

''میں سمجھی نہیں؟'' آمنہ بیگم نے وضاحت طلب نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا۔

''مس عنبرین کے جواب کی روشنی میں یہ بات کھل کر بھی جاسکتی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے خاتمے کے بعد ہی ان دونوں کی شادی ممکن تھی۔''

''اوہ...!'' آمنہ بیگم نے خود اپنی ہی کہی ہوئی بات کی اہمیت کی روشنی میں انسپکٹر کی بات کو تولا تو اس میں خاصا وزن تھا۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے ایک بار فیصلہ کن لہجے میں ایس پی کے سامنے دیے گئے بیان کے جملے کو دہرایا۔

''میری دلی آرزو اب بھی یہی ہے کہ اس گھر کی خوشیاں برباد کرنے والا جلد از جلد اپنے بدترین انجام تک پہنچے، وہ کوئی بھی ہو ہماری ہمدردی کا مستحق نہیں ہوسکتا۔''

''آپ کا یہ جذبہ بھی میرے لیے قابلِ قدر ہے۔'' انسپکٹر سراج نے کھلے دل سے صاف گوئی کا اظہار کیا پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی روشنی میں دریافت کیا۔

''مرحوم کی خواب گاہ سے خواب آور دوا کی خالی بوتل ملی ہے۔ اس ضمن میں آپ کیا کہیں گی؟''

''نیند کی خاطر... روزانہ چوتھائی گلاس پانی میں آٹھ

دس قطرے پینا ان کا روز کا معمول تھا۔"

"پستول پر جو فنگر پرنٹس ملے ہیں، وہ بھی مرحوم کے سوا کسی اور کے نہیں ہیں تو کیا ہم اس روشنی میں مرحوم کی موت کو قتل کے بجائے خودکشی کا نام نہیں دے سکتے؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کوئی آخری فیصلہ کرنا بھی قانون کے اختیار میں ہے۔ میں صرف یہ کہوں گی کہ مرحوم مضبوط اعصاب کے مالک تھے لیکن غصے اور جذبات کی روانی میں انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

آمنہ بیگم کے بعد انسپکٹر سراج نے ابرار احمد کو مختلف زاویوں سے کریدا پھر اس نے خاص طور پر یہ تاکید بھی کردی کہ اس کی اجازت کے بغیر وہ شہر سے باہر جانے کی غلطی نہ کرے۔

پھر اس نے عنبرین سے رابطہ کیا۔

"کیا آپ کے علم میں ہے کہ مسز ساجد کی کینیڈا سے واپسی کب تک ہوگی؟"

"جی نہیں۔" عنبرین نے سپاٹ لہجے میں مختصر جواب دیا۔

"حیرت ہے۔" انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اپنے انکل کی موت کی اطلاع کے ساتھ ہی آپ نے مسز ساجد کو باہر جانے کا مشورہ دیا تھا۔"

"جی ہاں.... اس کا اقرار میں اپنے سابقہ بیان میں بھی کرچکی ہوں۔"

"اس مشورے کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟"

"میں نہیں چاہتی تھی کہ ساجد کے بے داغ کردار پر کوئی حرف آئے۔"

"آپ کی مرحوم سے آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"انکل کے بیڈ روم میں۔" عنبرین نے صاف گوئی سے جواب دیا پھر وہ بات بھی دہرادی جو ساجد کے حوالے سے آمنہ بیگم بھی بتاچکی تھیں۔

"کیا آپ کو یقین آگیا تھا کہ مرحوم کی زندگی میں آپ ساجد سے شادی نہیں کرسکیں گی؟"

"جی نہیں۔" عنبرین نے پہلو بدل کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "انکل نے وہ بات جذباتی رو میں کہی تھی۔ مجھے اعتماد تھا کہ وہ اپنے فیصلے کو بدلنے میں زیادہ دیر بھی نہیں کریں گے۔ پہلے بھی خاص طور پر میرے سلسلے میں ان کا رویہ ہمیشہ بہت مخلصانہ اور شفقت آمیز رہا ہے۔"

"ہوسکتا ہے لیکن.... اتفاق سے اسی رات وہ دنیا سے بھی چل بسے۔"

"اس کا صدمہ مجھے بھی اتنا ہی ہے جتنا اس گھر کے دوسرے افراد کو ہے۔" عنبرین نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

"کیا آپ کسی پر شبہے کا اظہار نہیں کریں گی؟"

"حقیقت کیا ہے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔"

"بہرحال اب آپ کا ساجد سے شادی کرنے کا راستہ...."

"انسپکٹر....." عنبرین نے جذباتی انداز میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کو شبہ کرنے کا اختیار ضرور ہے لیکن آپ میرے اجلے دامن پر کیچڑ نہ اچھالیں۔ میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔"

اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر لمبے لمبے قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

جو وقت گزر چکا تھا، وہ پلٹ کر واپس نہیں آسکتا تھا لیکن حالات کے پیش نظر اس کا فوری تدارک بھی ضروری تھا چنانچہ کینیڈا میں ساجد نے زیادہ وقت نہیں گزارا۔ روانگی میں اس نے وہاں سے دو چار آرڈر لیے اور دو روز بعد ہی اس نے واپسی کی سیٹ بک کروالی۔

اس وقت بھی اس کے ذہن میں بس یہی ایک سوال گردش کررہا تھا کہ احتشام احمد کے قتل یا پُراسرار موت کے بعد تفتیش کرنے والے اس کی اچانک غیر حاضری کو کس نظر سے دیکھ رہے ہوں گے۔

بورڈنگ کارڈ حاصل کرنے کے بعد وہ ڈیپارچنگ لاؤنج سے گزر کر گیٹ نمبر فورٹین کی طرف جارہا تھا جب اس کے موبائل پر کسی کے کال کی سرخ روشنی جلنے بجھنے لگی۔ روشن اسکرین پر عنبرین کا نمبر دیکھ کر اس نے موبائل آن کرنے میں خاصی عجلت کا مظاہرہ کیا۔

"ساجد...." اس نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ "اس وقت کیسے فون کیا؟"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"ائرپورٹ پر، فلائٹ میں چالیس منٹ باقی ہیں۔"

"پلیز ساجد.... اپنی سیٹ کینسل کردو میری خاطر۔"

"کیا بات ہے؟ تم اس قدر پریشان کیوں ہو؟"

"پولیس کسی وجہ سے مجھ پر بھی شبہ کیا جارہا ہے۔" عنبرین نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "ابرار کی زبان بھی

تمہارے خلاف زہر اُگل رہی ہے۔‘‘

’’ایسی صورت میں اگر میں نے یہاں اپنا قیام طویل کیا تو پولیس بھی اسے ابرار کے حوالے سے زیادہ شدت سے محسوس کرے گی۔‘‘

’’میں نے فوری طور پر ایک پلان بنایا ہے۔‘‘ عنبرین نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ ’’ویزا حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ اس کے بعد میں بھی تمہارے پاس آجاتی ہوں۔‘‘

’’یہ تمہاری دوسری حماقت ہوگی۔‘‘ ساجد نے اسے سمجھایا۔ ’’ایسی صورت میں پولیس کا شبہ یقین میں بھی بدل سکتا ہے۔‘‘

’’بغیر ٹھوس ثبوت کے دنیا کا کوئی قانون ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔‘‘ عنبرین نے کہا۔ ’’آنٹی نے تمہارے اور میرے بارے میں جو بیان دیا ہے، وہ بھی ہمارے حق میں ہے۔‘‘

’’پولیس کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید میں بھی آنٹی کے بیان کو کوئی اہمیت نہ دیتا۔‘‘

’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’سمجھنے کی کوشش کرو۔‘‘ ساجد نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تمہارے انکل کی دوسری شادی سے آنٹی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچی ہوگی۔ کوئی دوسری عورت ان کی جگہ لے اس بات نے ان کے اندر بھی انتقام کے جذبے کو ضرور ابھارا ہوگا۔ وہ انکل کے حادثے میں ملوث نہ سہی لیکن پولیس دوسرے زاویے سے ان کو بھی مجرم سمجھنے میں بہرحال حق بجانب ہوگی۔‘‘

’’تم شاید ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہاں بدلتے ہوئے حالات نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے۔ تمہارے نہ ہونے سے میں اور بھی پریشان ہوں۔‘‘

’’میں نے بھی تمہارے مشورے پر جلد بازی کا مظاہرہ کر کے حماقت کی تھی لیکن اب تم بھی اسی حماقت کو دہرا کر پولیس کو مزید شبہات کا موقع فراہم کرنے کی بھول نہ کرنا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ عنبرین نے مختصر جواب دے کر لائن منقطع کر دی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر احتشام احمد کی پُراسرار موت کے تانے بانوں میں الجھنے لگا۔

☆☆☆

برجیس کو جس وقت احتشام کی پُراسرار موت کا علم ہوا۔ وہ ایک لمحے کو گنگ ہو گئی تھی پھر اس نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگانا شروع کر دیا۔ اس کی کیفیت ان حالات کا ردِعمل تھا جس سے وہ گزر رہی تھی۔ ایک دو روز تک وہ اسی کیفیت کا شکار رہی پھر اس نے خود کو حالات کے دھارے کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ یہ اور بات تھی کہ کچھ بھولی بسری یادوں کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔

وقت اور حالات..... جس نے اس کا بہت کچھ چھین لیا تھا۔ اس کی خوشیاں، آرزوئیں، تمنائیں اور خوابِ کامیابی دوسروں کو ملی اور غم برجیس کو جھیلنا پڑا جو اپنی زندگی کے کئی سہاروں سے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ محروم ہوتی گئی۔

خدا اور اس کے رسولؐ کے بعد اس کی زندگی کا ایک کمزور مگر مضبوط سہارا ساجد بھی تھا۔ ساجد جسے اس نے ماں کا مقدس نام دیا تھا۔ اس کی پرورش کی تھی، پروان چڑھایا تھا لیکن باپ کا نام دینے سے قاصر رہی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں ساجد نے اس کی برسوں کی ممتا کو ٹھکرا کر علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ دوسرا نام احتشام احمد کا تھا۔ اس کی مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا۔

احتشام احمد کی موت کن حالات میں ہوئی؟ برجیس کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ مقامی اخبارات نے صرف اس کی موت پُراسرار حالات میں ہونے کی خبر شائع کی تھی۔

اس وقت بھی وہ ایک اخبار کو سامنے پھیلائے خیالات کے حصار..... میں ہچکولے لے رہی تھی۔ ساجد کو یاد کر رہی تھی جس نے احتشام سے شادی کے بعد مبارک باد کا فون کر کے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا تھا مگر اس کی موت پر تعزیت کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ مغموم بیٹھی تھی کہ اچانک ایک پریشان کن خیال اس کے سرد وجود میں دہکتی آگ کے شعلوں کے مانند لپکا۔ اس نے اخبار کو ایک طرف ڈال دیا۔ خود کری سے اس طرح بے چین ہو کر اٹھی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

’’کہیں ساجد ہی احتشام کا قاتل نہ ہو؟‘‘

برجیس ذہن میں ابھرنے والے اس خیال سے تڑپ اٹھی۔ اس نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ساجد ہی نے اقدامِ قتل اٹھایا ہوتا تو اس کا نام بھی کہیں نہ کہیں کسی حوالے سے ضرور آتا مگر دل کی دھڑکنیں تھمنے کے بجائے اور تیز ہونے لگیں تو اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر احتشام احمد کے بڑے بھائی احترام احمد کے ایک پرانے ملازم عبدالرحمٰن کا جو رحمان بابا کے نام سے مشہور

سے نمبر ملایا۔ دوسروں کی طرح برجیس بھی رحمان بابا کا بے حد ادب کرتی تھی۔

احترام احمد اور ان کی بیگم کے ایک حادثے میں شکار ہونے کے بعد جب عنبرین، احتشام احمد کے گھر منتقل ہوئی تھی تو رحمان بابا کو ساتھ لے گئی تھی۔

موبائل کی کال بیل خاصی دیر تک گنگناتی رہی پھر رابطہ ختم ہوگیا۔ برجیس کے اندر کی بے چینی بڑھنے لگی۔ پھر اس نے بڑی احتیاط سے ان ہی نمبروں کو دوبارہ آزمایا۔ اس بار اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ چار گھنٹیوں کے بعد دوسری جانب سے کسی نے کھانستے ہوئے نحیف آواز میں سوال کیا۔

''کون ....؟''

''م .... میں .... میں برجیس ناز بول رہی ہوں۔''

''کون ساز؟''

''ساز نہیں رحمان بابا .... برجیس ناز۔'' اس بار قدرے بلند آواز میں جواب دیا۔ اس نے سوچا کہ شاید وقت کے ساتھ ساتھ رحمان بابا کی قوت سماعت بھی کمزور ہو چکی ہو۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

''تم .... میری بیٹی برجیس کہاں سے بول رہی ہو .... بہت زمانے بعد رحمان بابا کو یاد کیا؟'' رحمان بابا نے ---- تھم تھم کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تو برجیس کو اس کی گفتگو سے اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا کہ شاید رحمان بابا کو اس کے اور مرنے والے کی شادی کی خبر نہیں تھی۔

''سنا ہے، عنبرین کے انکل بھی اللہ کو پیارے ہوگئے؟''

''ہاں ---- آں ....'' رحمان بابا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''اللہ کو یہی منظور تھا۔ ایک نہ ایک دن سب کو جانا ہے مگر ادھر پولیس کے بڑے بڑے افسر بھی ٹاکم ٹوئیاں مار رہے ہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے .... کیا یہ قتل کی واردات ہے؟'' اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''فی الحال کچھ پتا نہیں چل رہا .... اندر ہی اندر کچھ کھچڑی پک رہی ہے مگر تم کیوں پریشان ہو بیٹا؟''

جواب میں برجیس کوئی بہانہ تراشنے کا سوچ رہی تھی جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔ اس نے رحمان بابا کے سوال کا جواب دینے کے بجائے موبائل آف کر دیا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو ایک باوردی پولیس انسپکٹر کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

''آپ شاید برجیس ناز ہیں؟'' آنے والے نے جو انسپکٹر سراج کے سوا کوئی اور نہیں تھا، برجیس ناز کے چہرے کی یکلخت بدلتی رنگت کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مرحوم یا مقتول! احتشام احمد کے سلسلے میں آپ کا بیان لینے کی غرض سے آیا ہوں۔''

''تشریف لائیے۔'' برجیس خود پر قابو پاتی ایک طرف ہٹ گئی۔ انسپکٹر نے ایک نظر کمرے پر ڈالی پھر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ برجیس ناز نے درمیان میں رکھی گول میز کی دوسری جانب والی کرسی کا انتخاب کیا، ساتھ اس نے دل کی دھڑکنوں کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی۔

''میرا خیال ہے آپ کو احتشام احمد کے پُراسرار قتل یا موت کی اطلاع مل چکی ہوگی؟'' اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''جی ہاں۔''

''آپ اس بارے میں کیا کہنا پسند کریں گی؟''

''صرف ایک مختصر سی بات .... قدرت کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔''

''میں آپ کے جواب سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکا۔'' انسپکٹر کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ ''میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کو مرحوم یا مقتول کی موت سے خوشی ہوئی یا اس میں دکھ کا بھی کوئی پہلو شامل ہے؟''

''انسانی رشتوں کے حوالے سے مجھے دکھ بھی ہوا لیکن اتنا زیادہ بھی نہیں ہے کہ اسے مکمل کر بیان کرسکوں۔''

''اس کی وجہ یہ ہوگی کہ مرنے والے نے آپ سے دوسری شادی کرنے کے کچھ عرصے بعد ہی طلاق بھی دے دی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''طلاق کی کوئی خاص وجہ بھی ہوگی؟'' انسپکٹر کا لہجہ گمبھیر ہونے لگا۔

''شاید پہلی بیوی اور اس کے جوان بیٹے کو یہ رشتہ ہضم نہیں ہوسکا۔'' برجیس نے بدستور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''غالباً اسی وجہ سے مسز ساجد نے بھی آپ سے علیحدگی اختیار کرلی؟'' انسپکٹر نے زہرخند سے سوال کیا تو برجیس تڑپ اٹھی۔

''ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے لیکن دوسری اہم یہ وجہ تھی کہ اس نے ایک موقع پر مرنے والے کی زبان سے یہ بات سن لی تھی کہ ساجد میرا سگا نہیں سوتیلا بیٹا ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن ساجد نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ اسی ایک راز کی

قیمت چکانے کی خاطر مرنے والے نے مجھے... دوسری شادی پر مجبور کر دیا تھا جبکہ میں..."

"ون منٹ۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ کر سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ "حقیقت کیا ہے... کیا ساجد آپ کا سگا بیٹا نہیں ہے؟"

"میں اس سوال کا یہی ایک آخری جواب دے سکتی ہوں کہ میں نے اسے اپنی اولاد ہی کی طرح پال پوس کر جوان کیا ہے۔"

"کیا اس کی والدیت کے سلسلے میں خود آپ بھی مشکوک ہیں؟"

"انسپکٹر....." جواب میں برجیس یکلخت چیخ اٹھی۔ "تم مجھ سے ایسے انداز میں گفتگو نہ کرو جو میری قوتِ برداشت سے باہر ہو جائے۔"

"قانون بہرحال یہ جاننا چاہے گا کہ مسٹر ساجد کی ولدیت کے خانے میں کس کا نام درج ہے؟" انسپکٹر نے ٹھوس انداز اختیار کیا۔

"ہم... میں تمہارے اس سوال کے جواب میں خاموشی ہی بہتر سمجھتی ہوں۔"

"آپ کی خاموشی کی صورت میں ساجد کی شخصیت کے گرد ہمارا حلقہ اور تنگ ہو جائے گا۔" انسپکٹر نے قدرے خشک انداز میں کہا۔ "مسٹر ساجد کا فوراً ملک سے باہر چلے جانا اور کچھ لوگوں کے بیان کی روشنی میں قانون ساجد کو مجرم سمجھنے میں حق بجانب ہوگا۔"

"نہیں۔" برجیس پھر تڑپ اٹھی۔ "ساجد معصوم ہے وہ کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔"

"قتل جنونی کیفیت کے اس ردِعمل کا نام ہے جو اچانک سرزد ہو جاتا ہے۔ آپ اس نازک مسئلے کو بھی سمجھنے پر غور کریں۔" انسپکٹر نے کہا۔

برجیس ناز نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ بے بسی کی تصویر بنی وہ قانون کے ایک ذمے دار آفیسر کے چہرے پر لکھی تحریر پڑھتی رہی۔

انسپکٹر پوری توجہ سے برجیس کے تاثرات کو پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک لمحہ خاموش رہا پھر اس نے قدرے نرم لہجے میں ایک نئے زاویے سے سوال کیا۔

"کیا مرنے والے سے دوسری شادی آپ نے اپنی مرضی سے کی تھی؟"

"نہیں۔" برجیس نے نظریں جھکا کر مدھم لہجے میں کہا۔ "اس شادی میں بھی میری مجبوریوں کا دخل تھا۔"

"مجبوریوں کی کوئی معقول وجہ بھی ضرور ہوگی؟"

"ہاں..... آں۔" برجیس ناز نے نظریں اٹھا کر تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔ "مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ میرے انکار کی صورت میں مرنے والا ساجد کے اُجلے دامن پر کیچڑ اچھالنے کے اوچھے ہتھکنڈوں سے بھی باز نہیں آئے گا۔"

"آئی سی۔" انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ کا کوئی قیمتی راز مرنے والے کے پاس موجود تھا؟"

"بات راز کی نہیں، انسان کے سوچنے کا انداز جب شرافت کی سطح سے گر جائے تو بہت ہی غلط فہمیاں جنم لینا شروع کر دیتی ہیں، احتشام احمد نے بھی کسی ایسی ہی بات کو ایک عورت کی کمزوری سمجھ رکھا تھا۔"

"آپ اس کی وضاحت بھی کر سکتی تھیں، احتشام کا داخلہ بھی اپنے گھر میں بند کر سکتی تھیں؟"

"یہی نہ کر سکی جس کا خمیازہ بھگت رہی ہوں۔"

"موجودہ صورتِ حال کی روشنی میں اس راز کو معلوم کرنا میرے لیے ضروری ہے۔"

"جو مُردے دفن ہو چکے ہیں اب ان کی قبروں کو کھودنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" برجیس نے ایک لمبی سانس لے کر جواب دیا تو انسپکٹر سراج نے اپنی نشست پر پہلو بدل کر اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا۔

"اگر آپ نے میرے ساتھ تعاون سے گریز کیا تو پھر ساجد گلے گلے پھنس جائے گا۔"

"یہ ظلم ہوگا۔" برجیس نے تلملا کر احتجاج کیا۔ "اگر میری باتیں مشکوک ہیں تو تم مجھے بھی گرفتار کر سکتے ہو۔ ساجد اگر کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا تو اس کا آنا جانا معمول کے مطابق بھی سمجھا جا سکتا ہے اور.... اور کسی ثبوت کے بغیر دنیا کا کوئی قانون اسے سزا نہیں دے سکتا۔"

"مجرم اور ملزم کا فرق آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا محترمہ۔" انسپکٹر نے اس بار کسی پولیس کا بگڑا ہوا انداز اختیار کیا۔ "ہم اسے فی الحال مشکوک سمجھ کر مجرم کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لیں گے پھر اب تک حاصل کردہ تحقیق اور ساجد کے بیان کی روشنی میں عدالت اسے ملزم بھی قرار دے سکتی ہے۔" برجیس نے انسپکٹر کے بدلے ہوئے لب و لہجے کو محسوس کیا تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے غور سے دیکھا۔

"احتشام اور مس عنبرین کے درمیان جو آخری گفتگو ہوئی تھی، اس کی تفصیل بھی آمنہ بیگم کے بیان میں موجود ہے

جس کی روشنی میں بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ساجد اور مس عنبرین کسی قیمت پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کو تیار نہیں تھے خواہ انہیں احتشام احمد کی لاش پر سے ہو کر ہی کیوں نہ گزرنا پڑتا۔“

”میں آپ کے سوالات کے جواب میں خاموش رہنا ہی پسند کروں گی۔“ برجیس نے بے بسی کا انداز اختیار کیا۔

”آپ کو شاید ایک بات نہیں معلوم۔“ انسپکٹر نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اس بات کی اطلاع مل چکی ہے کہ ساجد آج رات کینیڈا سے واپس آرہا ہے۔ ائرپورٹ سے باہر نکلنے سے پہلے ہی پولیس اسے حراست میں لے لے گی۔“

”تم صاحب اختیار ہو انسپکٹر لیکن میں پھر یہی کہوں گی کہ ساجد بے گناہ ہے۔“

”ایک سوال اور کروں گا۔“ انسپکٹر نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ ”ساجد کے سفری دستاویزات میں جس منظور احمد کا نام درج ہے وہ کون ہے؟“

”وہ ... وہ ایک فرضی نام ہے۔“ برجیس نے کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔

”تمہارے پہلے شوہر کا کیا نام تھا؟“ انسپکٹر نے پہلی بار اسے تم کہہ کر مخاطب کیا۔

”نادر حسین۔“ برجیس کی آواز کپکپانے لگی۔

”کیا اس نے بھی تم سے ساجد کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں چاہی تھی؟“

”اس نے بھی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ہی مجھ سے شادی کی تھی۔“

”بہت خوب ..... گویا تمہارے وجود کے چاروں طرف ناقابلِ یقین معموں کا جال بنا ہوا ہے۔“

برجیس نظریں جھکائے خاموش بیٹھی اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کا شمار کرتی رہی۔

”میں دو پولیس والوں کو تمہارے گھر پر تعینات کر کے جاؤں گا اب اپنے آپ کو زیرِ حراست ہی سمجھو۔“ انسپکٹر نے پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر کو آف کرتے ہوئے اٹھا کر جیب میں رکھا پھر برجیس کو قہر آلود نظروں سے گھورتا تیزی سے پلٹ کر باہر چلا گیا۔

برجیس تادیر گم صم بیٹھی رہی۔ انسپکٹر نے جس انداز میں اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے چبھتے ہوئے الفاظ اور جملوں کے نشتروں سے کریدا تھا اس کی خلش اور رویہ وہ محسوس کر رہی تھی۔

ماضی اور حال گزر چکا تھا۔ اب مستقبل کے خدشے برجیس کے ذہن میں راکھ میں دبی چنگاریوں کے مانند سلگ رہے تھے۔ حالات کی سلگتی ہوئی بھٹی میں پہلے ہی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اب انسپکٹر نے اسے حراست میں لے کر محض گھر کی چہار دیواری تک محدود کر دیا تھا۔ آزاد ہو کر بھی وہ خود کو قید رکھنے پر مجبور تھی۔ ایسے میں ایک لازوال قوت کا تصور اس کے ذہن میں ابھرا اس نے سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا بڑی درد بھری آواز میں بولی۔

”میرے مالک ..... تو ہی جانتا ہے تیری لکھی ہوئی تقدیر اٹل ہے۔ تیرا مجبور بندہ صاحبِ اختیار ہونے کے باوجود قسمت کے جال میں الجھ کر اسی انجام کو پہنچتا ہے جو پہلے سے رقم کر دیا گیا ہے۔ میں بھی تیری ایک لاچار بندی ہوں جو حالات کی گردش کا شکار ہو کر نوشتۂ تقدیر کو پورا کر رہی ہوں۔ وقت اور حالات نے مجھے جو دکھ دیے، وہ بھی تجھے معلوم ہیں۔ جو خوشیاں دے کر چھین لیں وہ بھی تیرے علم میں ہیں۔ لوحِ محفوظ پر فرشتوں نے تیرے حکم سے جو لکھ دیا وہ بھی اٹل ہے۔ میرے معبود میں تیرے آگے جھولی پھیلا کر صرف اتنی دعا مانگتی ہوں کہ ساجد کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ وہ ممتا کو ٹھکرا کر چلا گیا ہے، میں نے صبر کر لیا..... میں زبان کھولنے سے قاصر تھی لیکن تو بھی گواہ ہے وہ مجرم یا قاتل نہیں ہے۔ ایک ماں ہونے کے رشتے سے میں یہ گڑگڑا کر کہہ سکتی ہوں کہ ساجد کی تمام محرومیوں کو میرے نام رقم کر دے۔

میرے ساتھ کیا ہوا..... کیا ہوتا رہا..... کیا ہو رہا ہے..... تو دیکھ رہا ہے میرے مالک۔ میں تجھے تیری خدائی کا واسطہ دیتی ہوں ساجد کو ہر مصیبت، آفت اور بلاؤں سے محفوظ رکھنا۔ اسے کچھ بھی ہوا تو پھر میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔“ برجیس تادیر خدا کے سامنے دامن پھیلائے گڑگڑاتی رہی پھر دعا مانگ کر فارغ ہوئی تو اس نے دور پار خلاؤں میں جھانکتے ہوئے بڑی حقارت سے کہا۔

”احتشام احمد..... تم تو سب سے زیادہ بزدل اور ڈرپوک ثابت ہوئے۔ پہلے تو ایسے نہیں تھے جبھی ایک عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر تم اس کے تقدس کو اپنی ہوس کی آگ سے سلگاتے رہے۔ کھلونا سمجھ کر کھیلتے رہے اور وہ ..... دل پر جبر کیے تمہاری چیرہ دستیوں کو برداشت کرتی رہی۔ ایک معصوم وجود کی خاطر تمہارے تمام اوچھے ہتھکنڈے برداشت کرتی رہی۔ اپنی عزت اور گھر والوں سے ڈر کر تم نے طلاق کے تین بول دہرا کر مجھے حرفِ غلط کی طرح اپنی زندگی سے کھرچ کر نکال دیا۔ میں تڑپی مگر فریاد

بھی نہ کرسکی اور اب .... اب جب میں نے پہلی بار تمہارے حلق میں وقت اور حالات کی حقیقتوں کے زہر کا پہلا قطرہ ٹپکایا تو تم نے اپنی عزت اور خاندانی وقار کو قائم رکھنے کی خاطر خودکشی کرکے چھٹکارے کا شارٹ کٹ اختیار کرلیا۔ میں نے تمہیں اتنا نامرد بھی نہیں سمجھا تھا۔ تھو ہے تمہاری بزدلی پر۔"

☆☆☆

عنبرین اس وقت آمنہ بیگم کے پاس ان کے کمرے میں بیٹھی ان کا غم بانٹنے کی کوشش کررہی تھی۔

"انکل کی موت کا غم مجھے بھی ہے۔ والدین کے حادثے میں مرنے کے بعد میں نے بھی انکل اور آپ کو اپنا سب کچھ جان کر اس گھر میں پناہ لی تھی مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاید میرے منحوس قدم کی وجہ سے ....."

"حماقت کی باتیں نہ کرو عنبرین۔" آمنہ بیگم نے بڑے پیار سے کہا۔ "ابھی میں تمہارے سر پر ہاتھ رکھنے کو سلامت ہوں۔"

"خدا آپ کا سایہ تادیر قائم رکھے لیکن انکل کے بعد آپ نے بھی خود کو اپنے کمرے تک محدود کرلیا ہے۔"

"زخم بھرتے بھرتے بھر جائے گا۔" آمنہ بیگم نے سرد آہ بھر کر جواب دیا پھر بے حد اپنائیت سے بولیں۔ "تم میرے پاس آجایا کرو تو میرا دل بھی بہل جائے گا۔ تمہیں بھی تنہائی کا احساس نہیں ہوگا۔"

عنبرین اور آمنہ بیگم کے درمیان محبت بھری معصوم باتیں ہورہی تھیں جب ابرار احمد نے کمرے میں قدم رکھا۔ کرسی کھینچ کر وہ بھی ماں کی مسہری کے ساتھ بیٹھ گیا پھر اس نے اس بات کو بھی خاص طور پر محسوس کیا کہ عنبرین اس کے آنے کے بعد زیادہ دیر نہیں رکی۔ کسی کام کا بہانہ کرکے اٹھ گئی۔

"تمہارے باپ کے مرنے کا اثر عنبرین نے بھی شدت سے لیا ہے۔" آمنہ بیگم نے بیٹے سے کہا۔ "خدا اس کی خوشیوں کو ہمیشہ برقرار رکھے۔ بے حد نیک، شریف اور حساس طبیعت کی مالک ہے۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔"

"آمین۔" ابرار احمد نے دل پر صبر کرکے رکی لہجے میں کہا پھر پہلو بدل کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ پاپا کے مرنے کے بعد اب عنبرین بھی یہاں کے سوگوار ماحول سے اکتائی اکتائی نظر آرہی ہے۔"

"تم یہ بات اس قدر یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟"

"آپ نے شاید غور نہیں کیا اس وقت میں بھی آپ کی دلجوئی کی خاطر ادھر آیا تھا لیکن عنبرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکی۔"

"ابرار۔" آمنہ بیگم نے بیٹے کے جملے کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "یہ تمہارا اور عنبرین کا ذاتی مسئلہ ہے ہمیں اس پر اپنی کسی خواہش کو زبردستی ٹھونسنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے۔"

"کیا آپ کو بھی میری خوشی منظور نہیں ہے؟" ابرار نے پہلو بدل کر روبی زبان میں شکوہ کیا۔

"بات تمہاری خوشی کے علاوہ عنبرین کی اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کی بھی ہے۔"

"جانتا ہوں لیکن آپ بھی اس کی دشمن نہیں ہیں۔" ابرار نے نئے زاویے سے ماں کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ "اس کو برے اور بھلے کے بارے میں سمجھا سکتی ہیں۔"

"کھل کر بات کرو ابرار..... برے اور بھلے سے تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"میں ساجد کی بات کررہا ہوں جس کی ولدیت کے خانے میں درج نام ابھی تک مشتبہ ہے۔"

"یہ بات خود عنبرین کے بھی علم میں ہے۔"

"پھر بھی وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔" ابرار نے کسمسا کر موضوع گفتگو کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی۔ "اس شادی سے عنبرین کے علاوہ خود ہمارے وقار اور عزت کو بھی ٹھیس لگے گی۔"

"میں اس پہلو پر غور کرچکی ہوں۔" آمنہ بیگم نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "اس مسئلے پر میں تم سے اختلاف نہیں کروں گی لیکن یہ نہ بھولو کہ عنبرین بھی بالغ ہے۔ خدا نے اسے شادی کے معاملے میں اپنی پسند اور ناپسند کا جو اختیار دیا ہے، وہ ہم اس سے زبردستی چھین نہیں سکتے۔"

"اور اس نے اسی اختیار کی بدولت پاپا سے یہ بھی کہا تھا کہ ساجد سے شادی کرنے کی خاطر وہ آخری حد تک ان کی موت کا انتظار بھی کرسکتی ہے۔ پاپا کی موت کی اطلاع کے بعد اس نے ساجد کو ملک سے باہر چلے جانے کا مشورہ بھی دیا تھا۔" ابرار نے جھلا کر جواب دیا۔ "پولیس کے ریکارڈ پر بھی یہ تمام تفصیلات درج ہیں۔"

"ابرار۔" آمنہ بیگم نے بیٹے کو تیز نظروں سے گھورا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا تمہارے پاپا کو عنبرین نے قتل کیا ہوگا؟"

''نہیں..... لیکن ساجد کے سلسلے میں ابھی کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''ہمارے ملازمین کا بیان بھی پولیس لے چکی ہے۔'' آمنہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رقابت کی آگ نے تمہاری آنکھوں پر شبہے کا جو پردہ ڈال رکھا ہے، اسے بھی دور کرنے کی کوشش کرو۔''

''ملازموں کے درمیان کوئی جاسوس بھی ہوسکتا ہے۔ آپ بھی اس نکتے کو فراموش نہ کریں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''رحمان بابا۔'' ابرار احمد نے بدستور اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ ''وہ عنبرین کے والدین کے وقتوں کا نمک خوار ملازم ہے۔ عنبرین کو اس نے گودوں میں کھلایا ہے تو اس کی خاطر وہ ساجد کے سلسلے میں جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔''

''شبہے کی جڑیں تمہارے ذہن میں اتنی گہری ہو چکی ہیں کہ تم کو انسان، انسان میں فرق کی تمیز بھی نہیں رہی۔ رحمان بابا کو میں بھی اس وقت سے جانتی ہوں، جب میری شادی ہوئی تھی۔'' آمنہ بیگم نے بیٹے کو سرزنش کی۔ ''وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ جو کسی کے قتل میں ملوث ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''ہوسکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' ابرار احمد نے الفاظ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری اطلاع کے مطابق ساجد واپس آرہا ہے۔ یہ بات پولیس کے علم میں بھی ہے۔ جب تک پولیس چھان بین مکمل نہ کرلے، کوئی بھی یقین سے کوئی آخری بات نہیں کرسکتا۔''

ابرار احمد اپنا جملہ مکمل کرکے چلا گیا تو آمنہ بیگم نے پھر مسہری کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے انہیں بھی اولاد کی خوشیاں منظور تھیں لیکن اپنے شوہر کی پُراسرار موت کے معاملے میں وہ عنبرین جیسی معصوم لڑکی یا رحمان بابا کی ملی بھگت کسی سازش کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ساجد کے سلسلے میں بھی انہوں نے پولیس کو جو بیان دیا تھا، وہ بھی کسی شبہے سے بالاتر ہی تھا۔

خاصی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتی رہیں۔ شوہر کی دوسری شادی کے بعد انہوں نے تمام زخموں کو اپنے وجود میں سمیٹ کر ہونٹوں پر تالے ڈال لیے تھے۔ اپنے کمرے تک محدود ہوکر رہ گئی تھیں۔ دوسری عورت کو طلاق دینے کے بعد شوہر نے دوبارہ ان کو قریب آنے کو کہا تو ان کے وجود میں اس عورت کے جذبے تڑپ کر بیدار ہوگئے جس کو بے گناہ ہونے کے باوجود وقت کی صلیب پر زندہ لٹکا دیا گیا تھا۔ جس کی ساری قربانیوں کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ جس کے حصے کی تمام جائز خوشیوں کو قدموں تلے روند دیا گیا۔ جس کی ہونٹوں کی تمام مسکراہٹوں کا گلا گھونٹا گیا جس کے سارے حقوق زبردستی چھین کر ایک مرد نے کسی دوسری عورت کے دامن میں ڈال دیے۔

اور اب..... جب قدرت نے اس رشتے کے درمیان زندگی اور موت کی خلیج پیدا کردی تھی تو وہ اس گزرتے وقت کو اپنے خوابوں میں بسا کر جیسے تیسے وقت گزار رہی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے خوابوں کو بھول کر ابرار، عنبرین اور ساجد کے درمیان پیدا ہونے والی مثلث کے مختلف پہلوؤں پر غور کررہی تھیں جب کسی کے قدموں کی چاپ سن کر ان کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔

''کیا بات ہے کلثوم؟'' انہوں نے آنکھیں کھول کر ملازمہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جو الٹے قدموں واپس جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

''معافی چاہتی ہوں بیگم صاحبہ مجھے اندازہ نہیں تھا آپ اس وقت.....''

''سو نہیں رہی تھی۔'' آمنہ بیگم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بس یونہی ذرا آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ کوئی کام ہے؟''

''جی..... اپنے رحمان بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

کلثوم کی زبان سے رحمان بابا کا نام سن کر آمنہ بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ ایک لمحے کو ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں ابرار نے اپنے شبہے کا سارا غبار رحمان بابا پر تو نہیں اتار دیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ رحمان بابا کی کسی شکایت کا جواب کس زبان سے دے سکیں گی جبکہ وہ خود رحمان بابا کی عمر اور ان کے ادب کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھتی تھیں۔ وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھیں جب کلثوم نے ان کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کہیں تو رحمان بابا کو اس وقت ٹال دوں؟''

''نہیں، انہیں اندر بھیج دو۔'' کلثوم الٹے قدموں چلی گئی۔ آمنہ بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ چند منٹ بعد رحمان بابا نے کمرے میں قدم رکھا، ان کے چہرے پر تذبذب کی کیفیت دیکھ کر آمنہ بیگم کے ذہن میں پھر یہی خیال ابھرا کہ شاید ابرار نے کسی نادانی کا ثبوت دے کر ان کے وجود میں ہلچل مچادی ہے۔

ذاتی طور پر وہ رحمان بابا کو نہ صرف بھلا مانس سمجھتی تھیں بلکہ ہمیشہ ان کا احترام بھی کرتی تھیں۔ اس وقت بھی انہوں نے بڑی اپنائیت سے ان کی دلجوئی کے لیے دریافت کیا۔

”کیا بات ہے رحمان بابا، آپ مجھے کچھ بجھے بجھے سے نظر آرہے ہیں۔ کسی نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟“

”یہاں سب ہی اپنے ہیں دلہن بیگم پھر پریشان کون کرے گا؟“

”کوئی بات تو ضرور ہے۔“

”ہاں.... آں۔“ رحمان بابا نے پلکیں جھپکاتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ ”آج ایک عرصے بعد کسی نے فون کیا تھا۔ اسی وجہ سے ایک عجیب سی الجھن کا شکار ہوں۔“

”کوئی پرانا عزیز یا واقف کار؟“

”الجھن کی بات یہ ہے کہ اس نے بھی احتشام کے بارے میں ہی دریافت کیا تھا کہ یہ سب کچھ اچانک کیسے ہو گیا؟“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ آمنہ بیگم کے لہجے میں درد کی کسک جاگنے لگی۔ ”کسی کی موت پر اپنوں کے علاوہ پرائے بھی دکھ کا اظہار تو کرتے ہیں۔“

”یہ میں بھی جانتا ہوں دلہن بیگم لیکن.... الجھن اس بات کی ہے کہ اس کا صاحب سے کیا تعلق تھا؟“

”آپ کس کی بات کررہے ہیں رحمان بابا؟“ آمنہ بیگم نے کہا۔ ”آپ کا کوئی واقف ہی رہا ہوگا ورنہ آپ کے نمبروں کا علم اسے کس طرح ہوتا؟“

”برسوں پرانی بات ہے دلہن بیگم جب وہ حالات کے بھنور میں پھنس کر بے بسی کا شکار ہو گئی تھی اور....“ رحمان بابا نے کچھ توقف کے بعد الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا تو خیال تھا کہ وہ بدنصیب مر کھپ گئی ہوگی لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے، نہ ہوتی تو بھلا فون کیسے اور کیوں کرتی۔“

”آپ کا اس سے کیا رشتہ تھا؟“ آمنہ بیگم نے رحمان بابا کی باتوں پر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”انسانیت ہی کا ایسا رشتہ ہے دلہن بیگم جو ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔“ رحمان بابا نے بدستور ہمدردی سے جواب دیا۔ ”میں بھی اسے انسانیت ہی کے رشتے سے جانتا ہوں۔“

”اس کا کوئی نام بھی ضرور ہوگا۔“

”ہاں.... اس کا نام بھی آسمان پر چمکتے ایک ستارے کی طرح تھا.... پروین....“ رحمان بابا روانی میں بتاتے رہے۔ ”بڑے ناز و نعمتوں میں پلی بڑھی تھی اس لیے اس کا نام بھی پروین ناز....“

”رحمان بابا....“ آمنہ بیگم صبر نہ کرسکیں۔ ان کے اندر کی عورت چیخ اٹھی۔ ”تم اس حرافہ کی تعریف کررہے ہو جس نے میرے سہاگ پر شب خون مارا۔ اس گھر کی خوشیوں کو اپنے منحوس قدموں تلے روند ڈالا۔“

جواب میں رحمان بابا کا منہ بھونچکوں کی طرح کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ آمنہ بیگم کو حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ جو جملے ان کے کانوں سے ٹکرائے تھے، وہ بھی صدائے بازگشت بن کر گونجنے لگے۔ انہیں اپنی قوتِ سماعت پر دھوکے کا احساس ہو رہا تھا۔

”چلے جائیں میرے کمرے سے میں اپنی خوشیوں کے دشمن کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔“

”م.... میں.... چلا جاتا ہوں دلہن بیگم لیکن میں جس کی بات کررہا ہوں، وہ اس قابل کہاں رہ گئی تھی کہ کسی دوسرے کی خوشیوں کے آڑے آسکتی۔“

”نکل جائیں میرے کمرے سے.... پلیز۔“ آمنہ بیگم نے دوبارہ بپھرے ہوئے لہجے میں ہاتھ اٹھا کر دھتکارا تو رحمان بابا کو ایسا ہی لگا جیسے کسی نے ان کے وجود اور زندگی کے سارے بھرم کو ایک ہی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کردیا ہو۔ وہ جانے کے ارادے سے تھکے تھکے مضمحل انداز میں پلٹے۔ دو قدم آگے بڑھے پھر کسی جذبے کے تحت پلٹ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ کو ضرور کوئی دھوکا ہوا ہوگا یا کسی دشمن نے....“

”دھوکا مجھے نہیں آپ کو ہوا ہے جو آبرو باختہ عورت کی حمایت کررہے ہیں جس نے نہ صرف میرے سہاگ پر ڈاکا ڈالا بلکہ اس کی ناجائز اولاد بھی ابرار کی خوشیوں کو روندنے کے درپے ہے۔“ آمنہ بیگم کے وجود کا آتش فشاں آگ اگلنے لگا۔

”ناجائز اولاد....“ رحمان بابا کے جسم کے رعشہ کی شدت بڑھنے لگی۔ ”یہ آپ کس کی بات کررہی ہیں؟“

”ساجد کی.... جس کی ولدیت کے بارے میں شاید آپ بھی ناواقف ہو یا پھر جان بوجھ کر انجان بننے کی کوشش کررہے ہوں“ آمنہ بیگم نے اس بار حقارت کا اظہار چیخ کر کیا۔ ”چلے جائیں میرے کمرے سے لیکن ایک بات سن لیں.... اپنی زبان پر قابو ہی رکھنا ورنہ آپ کی شرافت

اور بڑھاپے کا بھرم بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔"

رحمان بابا کا پورا وجود جیسے کسی بپھرے ہوئے طوفان کی شدتوں میں آگیا ہو۔ وہ ایک لمحے تک ہکا بکا سے کھڑے آمنہ بیگم کے جملوں پر غور کرتے رہے پھر کسی تھکے ہارے مسافر کی طرح سر جھکا کر اپنے وجود کا بوجھ سنبھالتے الٹے قدموں واپس چلے گئے۔

آمنہ بیگم غصے کی شدت سے کانپتی رہیں۔ بربیس ناز کے وجود نے ان کی خوشیوں کو تاراج کیا تھا، ان کی ہنستی مسکراتی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ بسے بسائے گھر کو ماتم کدہ بنا دیا تھا پھر وہ رحمان بابا جیسے نیک دل اور جہاندیدہ شخص کی زبان سے اس کم ذات عورت کی تعریف کس طرح سنتیں۔

تادیر وہ اسی کیفیت سے دوچار رہیں پھر سوچا کہ شاید رحمان بابا کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دے کر اچھا نہیں کیا۔ اگر وہ انہیں کرید کر بربیس کی اصلیت کے دوسرے پہلو بھی اگلوا لیتیں تو شاید پولیس کو اصل مجرم یا قاتل تک پہنچانے میں مدد بھی کر سکتی تھیں۔ اس خیال کے پیش نظر انہوں نے اپنے اندر کی عورت کو کسی دوسری عورت سے نفرت کرنے کی شدتوں کو کم کیا پھر بہت غور وخوض کے بعد رحمان بابا کو دوبارہ ملازمہ کے ذریعے بلا لیا۔

رحمان بابا دوسری بار کمرے میں داخل ہوئے تو پہلے سے زیادہ بوڑھے اور غمزدہ نظر آ رہے تھے۔ آمنہ بیگم کی سمت نظر اٹھائے بغیر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ آمنہ بیگم نے ان کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھا پھر خود کو سنبھال کر بولیں۔

"رحمان بابا میں آپ سے....."

"اس کے آگے کچھ نہ کہنا دلہن بیگم۔" رحمان بابا نے ہاتھ جوڑ کر نظریں اٹھائیں۔ رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

"میں شاید اپنی حیثیت اور اوقات بھول گیا تھا جو زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں آپ کا مجرم ہوں اس لیے خود اپنے آپ کو سزا دوں گا۔ میں..... میں..... کل تک آپ کی کوٹھری خالی کر کے یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔ عنبرین بیٹی کو اپنے منہ کالا کرنے کی وجہ بھی نہیں بتاؤں گا۔ ہو سکے تو آپ بھی اس بوڑھے کو اس کی برسوں کی خدمت کا صلہ سمجھ کر ہی معاف کر دیجیے گا۔ یہ آپ کی مہربانی ہو گی۔ اس کے علاوہ جو سزا آپ کو منظور ہو وہ بھی سنا دیں۔ میں اسے بھگتنے سے بھی انکار نہیں کروں گا۔ آپ کا نمک کھایا ہے تو نمک حرامی کی جرأت بھی نہیں کروں گا۔"

"بہت ناراض ہو گئے مجھ سے۔" آمنہ بیگم کو پھر رحمان بابا کی بزرگی اور معتبر شخصیت کا احساس ہوا تو خلوص دل سے بولیں۔ "میری جگہ آپ ہوتے تو شاید آپ بھی....."

"میں سمجھتا ہوں دلہن بیگم۔" رحمان بابا کے دل کا غبار بھی چھٹنے لگا۔ "برسوں دونوں گھروں کا نمک کھایا ہے۔ اتنے قریب رہا ہوں کہ خود کو بھی گھروں کی درو دیوار کا ایک حصہ سمجھنے لگا ہوں۔ آپ کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید میرا اعتقاد بھی ڈانواں ڈول ہو جاتا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔"

"اب تو آپ ہمیں چھوڑ کر جانے کا نہیں سوچیں گے؟"

رحمان بابا نے نظر بھر کر آمنہ بیگم کو دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش کھڑے اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں گھرے رہے پھر رک رک کر بولے۔

"انسان خود کھرا ہو تو پھر کھری بات کہنے سے نہیں ڈرتا۔ لگی لپٹی کہنے کا عادی نہیں ہوں دلہن بیگم اس لیے ڈرتا ہوں اور اب..... اب شاید عمر کے ساتھ خود بھی سٹھیا گیا ہوں اسی لیے الگ تھلگ پڑا رہتا ہوں۔ عنبرین کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو میری ذمے داری کے ساتھ پیر کی بیڑیاں بھی کٹ جائیں گی۔"

"دوبارہ ایسا کبھی نہ سوچیے گا رحمان بابا۔" آمنہ بیگم نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ "عنبرین کے بعد مجھے بھی آپ کی پرخلوص اور بزرگانہ رہنمائی کی ضرورت ہو گی۔"

رحمان بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنائیت اور محبت بھرے دو بول سن کر کسی موم ہی کی طرح پگھل گئے۔ آمنہ بیگم ان کی کیفیت محسوس کر رہی تھیں۔ انہیں ان سخت و سست جملوں کا احساس ہو رہا تھا جو وہ جذبات کی رو میں کہہ گئی تھیں چنانچہ کچھ دیر رحمان بابا سے ہمیشہ کی طرح اپنائیت سے باتیں کرتی رہیں پھر انہوں نے دبی زبان میں پوچھا۔

"آپ بربیس ناز کو کیسے جانتے ہیں؟" جواب میں رحمان بابا خاموش ماضی کے دھندلکوں کی کچھ بھولی بسری یادوں کو سمیٹتے رہے پھر انہوں نے بربیس ناز کی ذات سے وابستہ جو کہانی سنائی، اس نے آمنہ بیگم کے وجود کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ کہانی ختم ہونے کے بعد بھی کمرے میں بہت دیر خاموشی مسلط رہی پھر آمنہ بیگم نے ہی مہر سکوت توڑی۔

"کیا آپ کے پاس اس کا موبائل نمبر ہے؟"

"آخری بار اسی بدنصیب نے بات کی تھی۔" رحمان

بابا نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ عنبرین کے نمبر ہوں گے۔“

آمنہ بیگم.... رحمان بابا سے موبائل لے کر چند ثانیوں پر نظر دوڑاتی رہیں پھر کچھ سوچ کر انہوں نے رحمان بابا ہی کے موبائل سے اس نمبر کو کال کیا۔ جھلا کر وقفے وقفے سے اس نمبر کو پھر ڈائل کرتی رہیں، دوسری سمت سے ہر بار صرف ایک ہی ریکارڈ جواب سنائی دیا۔

”آپ جس نمبر پر ڈائل کر رہے ہیں وہ کسی کے استعمال میں نہیں۔“

”کیا بات ہے دلہن بیگم؟“ رحمان بابا نے آمنہ بیگم کی جھلاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا وہ فون نہیں اٹھا رہی یا آپ نے اس سے بات کرنا پسند نہیں کیا؟“

”جس نمبر کی سم سے اس نے آپ کو کال کیا تھا اسے موبائل سے نکال لیا گیا ہے۔“

”میں سمجھا نہیں.... اس نے ایسا کیوں کیا؟“ رحمان بابا نے حیرت کا اظہار کیا۔

”کچھ مسئلے اتنے الجھے ہوئے ہوتے ہیں جو آسانی سے حل نہیں ہوتے۔“ آمنہ بیگم نے مطلوبہ نمبر کو علیحدہ لکھ کر موبائل رحمان بابا کو واپس کرتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے ہدایت کی۔ ”آپ نے اس وقت جو باتیں مجھ سے کی ہیں، اس کا تذکرہ بھول کر بھی کسی اور سے نہ کیجیے گا۔“

رحمان بابا نے اپنائیت میں سر کو خفیف سی جنبش دی پھر خاموشی سے پلٹ کر واپس چلے گئے۔ برجیس کی سنی سنائی کہانی آمنہ بیگم کے وجود کے احاطے میں تادیر صدائے بازگشت بن کر گونجتی رہی۔ اس کہانی کے گراف میں جو اتار چڑھاؤ اور قدم قدم پر موڑ تھے وہ اس قدر گنجلک اور پیچیدہ تھے کہ خود آمنہ بیگم بھی اس کی بھول بھلیوں میں الجھ کر گم ہونے لگیں۔

☆☆☆

ساجد نے ائرپورٹ پر اترنے کے بعد سب سے پہلے ایک طرف جا کر عنبرین کے نمبر ڈائل کیے۔ وہ خود کو تازہ ترین حالات سے باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ دوسری گھنٹی کے بعد ہی عنبرین کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

”تم نے میری بات نہ مان کر اچھا نہیں کیا۔“

”خیریت؟“

”پولیس کیا کرتی پھر رہی ہے، مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن یہاں اب گھر میں بھی کھچڑی پک رہی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”ابرار ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنے کی خاطر داؤ پیچ لگا رہا ہے۔ آج آنٹی کے ساتھ بھی خاصی دیر اس کی باتیں ہوئی ہیں، بعد میں اس نے رحمان بابا کو بلا کر ان سے بھی خاصی دیر تک بات چیت کی تھی۔“

”رحمان بابا فرشتہ صفت انسان ہیں۔ وہ کسی برائی میں بھی شریک نہیں ہو سکتے۔“

”جانتی ہوں۔“ عنبرین نے تائید کی۔ ”وہ مجھے بھی بیٹیوں کی طرح چاہتے ہیں۔ میرا ابرار ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

”میں اب آ گیا ہوں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ساجد نے اسے ڈھارس دی۔

”خدا تمہیں ہر مصیبت سے محفوظ رکھے لیکن.... نہ جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”او کے۔“ ساجد نے اس بار بے پروائی کا مظاہرہ کیا پھر موبائل آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔

موبائل جیب میں ڈال کر اس نے ٹرالی بیگ کا ہینڈل تھام کر آگے کی طرف قدم اٹھانے شروع کیے لیکن اس کی نظریں بدستور اس شخص.... کا جائزہ لے رہی تھیں جو ایک مخصوص فاصلے سے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

کینیڈا میں مختصر ترین قیام کے باوجود عنبرین اسے صبح و شام فون کر کے حالات سے باخبر رکھتی تھی۔ ان خبروں کے پیش نظر اسے یقین تھا کہ واپس پہنچتے ہی پولیس اسے پہلی فرصت میں گھیرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ امیگریشن اور کسٹم کاؤنٹر سے گزر کر وہ ائرپورٹ سے باہر آیا تو وہی مشکوک شخص لمبے لمبے قدم بڑھاتا اس کے قریب آ گیا، مخصوص لہجے میں بولا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ کا نام ساجد ہے؟“

”اور آپ کا تعلق یقیناً پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔“ ساجد نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کو اس کا خیال کیسے آیا؟“ اجنبی نے جو انسپکٹر سراج کے سوا کوئی اور نہیں تھا، ساجد کو تیز نظروں سے گھورا پھر اپنا تعارف بھی کروا دیا۔

”میں انکل احتشام کی موت کے دن ہی چونکہ بزنس ٹور پر کینیڈا چلا گیا تھا اس لیے مجھے بھی اطلاع ملی تھی کہ پولیس کو انکل کی موت کے سلسلے میں میرا بیان بھی درکار ہے۔“

”آپ کو اس بات کی اطلاع کس نے دی تھی؟“

"میں پندرہ گھنٹے کی مسلسل نان اسٹاپ فلائٹ سے خاصا تھک گیا ہوں انسپکٹر۔" ساجد نے انسپکٹر سراج سے کہا۔ "کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ میرے ساتھ فلیٹ تک چلنے کی زحمت گوارا کریں۔ وہاں بیٹھ کر ہم سکون سے بات کرسکیں گے۔"

انسپکٹر نے ساجد کے چہرے کے تاثرات کو اپنی عقابی نظروں سے ٹٹولا پھر بادل ناخواستہ آمادہ ہوگیا لیکن اس نے ساجد کو اپنی ہی گاڑی میں بٹھانا ضروری سمجھا تھا۔ راستے میں زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ انسپکٹر کے علاوہ خود ساجد نے بھی خاموشی ہی اختیار کی۔

فلیٹ پر پہنچ کر ساجد جتنی دیر میں منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوا، اس کے ملازم نے چائے تیار کرلی تھی۔ ساجد نے کرسی پر بیٹھ کر انسپکٹر سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"مجھے آپ کے بزنس کی تفصیل معلوم ہوچکی ہے لیکن آپ کے اور مس عنبرین کے تعلق کے حوالے سے قانون آپ سے بھی چھان بین ضروری سمجھتا ہے۔"

"آپ مجھے بھی ایک قانون پسند شہری ہی سمجھیں۔" ساجد نے سنبھل کر جواب دیا۔ "میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

انسپکٹر نے مختلف پہلوؤں سے ساجد کو کریدنے کی کوشش کی۔ اس کا تجربہ دو باتوں کی نشاندہی کررہا تھا یا تو ساجد بے قصور اور معصوم تھا یا پھر اتنا گھاگ تھا کہ خود کو قانون کے جال سے بچانے کی خاطر اس نے سادگی کا خول چڑھا رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک نئے پہلو سے ساجد کے اعتماد کو متزلزل کرنے کی خاطر چبھتے ہوئے اس کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مسٹر ساجد.... کیا آپ کھل کر اس راز سے پردہ اٹھائیں گے کہ آپ نے کس وجہ سے ماں سے علیحدگی اختیار کرلی تھی؟"

"اس بات کا مرنے والی ذات سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟" ساجد نے پہلی بار محتاط انداز اختیار کیا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ محترمہ برجیس ہی مرحوم یا مقتول کی دوسری بیوی بھی تھیں۔"

"جانتا ہوں۔" ساجد نے پہلو بدل کر جواب دیا۔

"کیا آپ کو ان دونوں کی شادی سے کسی وجہ سے اختلاف تھا؟" انسپکٹر نے سنسنی خیز انداز میں چبھتا ہوا سوال کیا۔

"نہیں.... میں اس شادی سے پہلے ہی گھر چھوڑ چکا تھا۔"

"اگر برا نہ مانیں تو ایک نازک سا سوال پوچھوں؟" انسپکٹر نے حاوی ہونے کی کوشش کی۔ "کیا آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ آپ کے تعلیمی اور سفری دستاویزات میں والدیت کے خانے میں جو نام درج ہے وہ درست ہے؟"

"سوری انسپکٹر۔" ساجد نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "دنیا میں کوئی فرد اپنی پیدائش کے بعد والدین کے خانے میں درج شدہ نام کے بارے میں یقین سے کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

"یو آر ہنڈرڈ پرسنٹ رائٹ لیکن کم از کم ماں ضرور جانتی ہے کہ بچے کا اصلی باپ کون ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟" ساجد نے اپنی نشست پر کسمسا کر انسپکٹر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"محترمہ برجیس کا دستخط شدہ بیان بھی ہمارے پاس آن ریکارڈ ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ "انہوں نے یہ بیان دیا ہے کہ منظور احمد ایک فرضی نام ہے۔ شاید آپ کے گھر چھوڑنے کی وجہ بھی یہی ہو؟"

"میں انکار نہیں کروں گا مگر اس بات سے آپ کیا نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں؟" ساجد نے برہمی کا اظہار کرنے کی خاطر نچلا ہونٹ چباتے ہوئے انسپکٹر کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

جواب میں انسپکٹر مخصوص انداز میں مسکرایا پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔ "یہ بیان بھی آن ریکارڈ آچکا ہے کہ احتشام احمد نے حادثے سے قبل مس عنبرین کو اپنی خواب گاہ میں بلا کر کہا تھا کہ کم از کم ان کی زندگی میں آپ کی اور مس عنبرین کی شادی کسی قیمت پر نہیں ہوسکتی۔ آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟"

"میں اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔"

"اوہ...." انسپکٹر نے پھر چبھتا ہوا سوال کیا۔ "کیا مس عنبرین کی طرح آپ بھی یہی جواب دیں گے کہ اس سے شادی کرنے کی خاطر آپ بھی کسی کے مرنے یا جینے کی پروا نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔" ساجد کا چہرہ کسی جذبے سے تمتما اٹھا۔ "میں عنبرین سے محبت کرتا ہوں۔ اسے دل و جان سے چاہتا بھی ہوں لیکن کسی کی لاش پر کھڑے ہوکر شہنائیوں کی گونج میں شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"گڈ.... میں آپ کے اس جذبے کی تعریف میں

کسی بخل سے کام نہیں لوں گا لیکن ....'' انسپکٹر کچھ توقف سے بولا۔ ''مس عنبرین کا جواب کچھ اور تھا۔ اس نے مرحوم بے کھلے لفظوں میں کہا تھا کہ آپ سے شادی کرنے کے لیے وہ کسی کی موت کا انتظار کرنے کو بھی تیار ہے۔''

''عنبرین نہ صرف یہ کہ بانغ ہے بلکہ خود مختار بھی ہے۔ جو بات اس کی زبان سے نکلی وہ اس پر زبردستی کوئی غلط فیصلہ تھوپنے کا ردعمل بھی ہوسکتا ہے۔'' ساجد نے پہلو بدل کر کہا۔ ''صرف اس ایک جملے سے اس کے خلاف ....''

''کیا غلط ہے کیا صحیح ... یہ سوچنا آپ کا نہیں قانون کا کام ہے۔'' انسپکٹر نے اس کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔ ''جس رات تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا اسی رات احتشام احمد کا زندگی کی بازی ہار جانا .... اس کو بھی اگر جملوں کے پس منظر میں فوکس کیا جائے تو اسے بھی محض اتفاق نہیں سمجھا جاسکتا۔ ایسی صورت میں کہ جب بے ہوشی کی دوا کی بوتل بھی خالی ملی اور استعمال ہونے والے آٹو میٹک پر صرف اور صرف مرنے والے کے فنگر پرنٹس کا ملنا .... یہ بھی قابل غور ہے۔''

''اس ضمن میں بھی کوئی آخری نتیجہ اخذ کرنا قانون ہی کی ذمے داری ہے۔'' ساجد نے چبھتے ہوئے انداز میں جواب دیا تو انسپکٹر کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔

''ہوسکتا ہے کہ اس پُر اسرار واردات کی پشت پر ایک کے بجائے دو مجرموں کی ملی بھگت شامل ہو۔'' انسپکٹر نے جوابی حملہ کیا۔ ''اس امکان پر بھی غور کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''اگر آپ کا شبہ مجھ پر ہے تو میں اس وقت بھی خود کو قانون کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کروں گا۔''

''تھینکس۔'' انسپکٹر نے بدستور خشک لہجہ اختیار کیا۔ ''آپ برجیس ناز کو کیوں بھول رہے ہیں جس کو مرنے والے نے کچھ عرصہ اپنی زوجیت میں رکھ کر فارغ کردیا تھا۔''

''میں جس گھر کو چھوڑ چکا ہوں، اس کے کسی فرد سے ہمدردی کا اظہار نہیں کروں گا۔''

انسپکٹر نے اس بار فوراً ہی کوئی سوال نہیں کیا۔ برجیس کے نام پر ساجد نے جس انداز میں بے پروائی کا اظہار کیا تھا، اس پر غور کرتا پھر پینترا بدل کر سوال کیا۔

''احتشام احمد کی موت کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''عنبرین نے۔''

''اور فوری طور پر باہر جانے کا مشورہ بھی اسی کا تھا؟''

''اس نے صرف مشورہ دیا تھا۔'' ساجد نے سنبھل کر سنجیدگی سے کہا۔ ''جانا نہ جانا میرے اختیار کی بات تھی۔''

''بہرحال .... آپ نے اسی کے مشورے پر عمل کیا تھا؟''

''مجھے کینیڈا میں بزنس کے سلسلے میں کچھ ضروری کام بھی نمٹانے تھے۔''

''بہت خوب۔'' انسپکٹر نے زہرخند سے کہا۔ ''گویا آپ کے لیے بزنس کے کچھ ضروری کام نمٹانے احتشام احمد کی آخری رسومات میں شرکت کرنے سے زیادہ اہم تھے؟''

''احتشام احمد سے میرا کوئی خونی رشتہ بھی نہیں تھا۔'' ساجد نے سادگی سے جواب دیا۔

''اس کے باوجود وہ آپ کے گھر آنا جانا تھا۔'' انسپکٹر نے طنزیہ ہوئے لہجے میں کہا۔ ''برجیس ناز اور احتشام احمد کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لینے کے بعد ہی آپ نے برجیس ناز کے سامنے اپنی ولدیت کا سوال اٹھایا جس کے جواب میں یہی کہا گیا تھا کہ منظور احمد ایک فرضی نام ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

انسپکٹر کا جوابی حملہ اس قدر بھرپور تھا کہ ساجد تلملا اٹھا۔ پہلی بار اس نے انسپکٹر کو ناپسندیدہ نظروں سے گھورا پھر بے حد سرد لہجے میں بولا۔ ''آپ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کریں انسپکٹر۔ اپنی تفتیش کو صرف مرحوم یا مقتول کی حد تک محدود رکھیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''مسٹر ساجد ....'' جواب میں انسپکٹر کے تیور میں بھی تناؤ آگیا۔ ''میں اس وقت یہاں آپ سے قیمتی مشورے مانگنے نہیں آیا ہوں۔ یہ بھی خیال رہے کہ ممکنہ طور پر مشکوک افراد کی فہرست میں ایک اہم نام آپ کا بھی ہے اس لیے آپ محض اپنا دامن بچانے کی فکر کریں۔ حالات کے پیش نظر مجھے آپ کی زندگی کے ہر نجی پہلو کو کریدنے کا پورا پورا اختیار ہے .... انڈراسٹینڈ۔''

انسپکٹر کے لہجے کی گرمی نے ساجد کی رگوں میں دوڑتے خون کو گرما دیا لیکن اس نے دل پر جبر کرکے خاموشی ہی مناسب سمجھی جس کی ایک اہم وجہ عنبرین کی ذات بھی تھی جسے اس کے ساتھ حالات کی سنگینی میں برابر کا شریک سمجھا جارہا تھا۔

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر انسپکٹر نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ''میری اجازت کے بغیر آپ کہیں

آنے جانے کی غلطی نہ کریں ورنہ میں آپ کو باقاعدہ طور پر حراست میں لینے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔" جواب میں ساجد خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کچھ دیر تک مختلف پہلوؤں سے سوالات کرنے کے بعد جب انسپکٹر جانے کے لیے اٹھا اس وقت بھی اس نے ساجد کو بے حد مشکوک نظروں سے گھورا تھا۔

☆☆☆

ابرار احمد کو جہاں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کا غم تھا وہاں اس بات کا ملال بھی تھا کہ آمنہ بیگم نے ماں ہونے کے باوجود عنبرین کے سلسلے میں اس کی خواہش کو تسکین پہنچانے کے بجائے ساجد کے حق میں ایسے جملے کہے تھے جس نے ابرار کو اور زیادہ دل برداشتہ کر دیا تھا۔ وہ ماں سے گلہ کرتو کوئی شکایت نہیں کر سکا لیکن ساجد سے نفرت کے جذبے میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ عنبرین کو کسی قیمت پر بھی حاصل کرنے کی خواہش کو دل کے نہاں خانوں سے نہیں نکالے گا۔ کم از کم ساجد کے مقابلے میں وہ اپنی شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔

بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اس نے خود کو سی قدر بدلنا تو گوارا کر لیا تھا لیکن اب ہر بات پر نظر رکھنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ ساجد کے سلسلے میں اس نے رحمان بابا کو جس انداز میں ملوث کرنے کی خاطر ماں کے کان میں زہر پھونکا تھا وہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔ کوئی بات ایسی ضرور تھی جس نے آمنہ بیگم کو رحمان بابا پر زیادہ مہربان کر دیا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ان کے اور ماں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی جس نے آمنہ بیگم کو بھی ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں گم رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس تغیر کے پیچھے یقیناً کوئی اہم بات رہی ہوگی مگر رحمان بابا نے نہایت معصومیت سے ابرار احمد کو ٹال دیا۔ گفتگو کی تفصیل بتانے کے بجائے اس نے مختصر یہ کہا تھا کہ اس کے اور آمنہ بیگم کے درمیان کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی تھی۔

رحمان بابا کا وہ جواب ابرار احمد کو ہضم نہیں ہوا۔

اس وقت بھی وہ باہر لان میں بیٹھا کوئی ایسا پلان ذہن میں مرتب کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے حق میں موثر اور عنبرین اور ساجد کے حق میں ایسی دیوار ثابت ہوتا جس کو پھلانگنا ساجد اور عنبرین دونوں کے اختیار سے باہر ہوتا۔ وہ اپنی اس منتشر سوچ کو کوئی آخری شکل دینے میں محو تھا جب آمنہ بیگم نے اسے کلثوم کے ذریعے اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔

دس منٹ بعد جب وہ ماں کے کمرے میں داخل ہوا اس وقت بھی وہ گہری سوچ میں غرق تھیں۔ ان کے چہرے پر طاری تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ ذہنی طور پر کسی کرب کا شکار ہیں۔ ابرار ان کے قریب ہی بیٹھ گیا تو انہوں نے کچھ توقف کے بعد اسے بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

''باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد ان کے کاروبار اور اس گھر کی ذمے داریوں کا سارا بوجھ بھی تمہیں سنبھالنا ہے۔ میں نے اس وقت تمہیں اسی مقصد سے بلایا ہے۔''

''آپ حکم دیں میں کسی ذمے داری سے منہ نہیں پھیروں گا۔'' ابرار احمد نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''میں نے طے کیا ہے کہ تمہارے والد کے وکیل کو بلا کر اب سب کچھ تمہارے نام منتقل کر دیا جائے۔''

''یہ بھی آپ کی مرضی پر منحصر ہے لیکن مجھے قدم قدم پر آپ کی شفقت اور رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔''

آمنہ بیگم تادیر اس موضوع پر بیٹے سے بات کرتی رہیں پھر کچھ دیر کسی خیال میں گم صم رہنے کے بعد انہوں نے ایک حساس موضوع کو چھیڑ دیا۔

''میں نے سنا ہے کہ ساجد باہر سے واپس آگیا ہے؟''

''اس وقت آپ کو میرے مستقبل کو بنانے، سنوارنے کی بات کرتے کرتے ساجد کیوں یاد آگیا؟'' ابرار احمد نے ماں کی زبان سے اپنے راستے کے زہریلے کانٹے کا نام سنا تو دبی زبان میں اپنی نفرت کے جذبوں کا اظہار بھی کر دیا۔ ''آپ جانتی ہیں کہ وہ میری خوشیوں کا دشمن ہے۔''

''شبہے اور نفرت کا پودا اگر انسان کے وجود میں جڑ پکڑ لے تو اس کی ہر سوچ منفی ہو جاتی ہے۔'' آمنہ بیگم نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''عنبرین اگر اسے پسند کرتی ہے تو اس میں ساجد کا کیا قصور۔ عملی زندگی میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی ورنہ قدم قدم پر مشکلات ہی پیش آئیں گی۔''

''گویا آپ بھی ساجد کو اولاد کی محبت پر ترجیح دے رہی ہیں؟''

''یہ بھی تمہارا وہم ہے۔ ویسے ساجد کے بارے میں میری سوچ روز اول سے ایک ہی ہے۔'' آمنہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے بڑے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ سنجیدہ، بردبار اور پُرخلوص شخصیت کا مالک ہے۔ میں نے اس کے اندر کبھی کوئی کھوٹ نہیں پایا۔''

''اوہ ....'' ابرار نے خفگی کے انداز میں طنز کیا۔ ''ایسی صورت میں تو آپ بھی عنبرین اور اس کی شادی ....''

''شادی کے مسئلے کو درمیان میں نہ لاؤ۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور اٹل ہوتے ہیں۔ انسان اس میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کرسکتا۔'' آمنہ بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہر محبت کا انجام شادی نہیں ہوتی اس لیے کسی بات کو اپنے اوپر طاری کر لینا بھی حماقت ہی ہے۔ انسان کو موسموں سے سبق لینا چاہیے جو کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ وہ بھی قدرت کے اشارے پر بدلتے رہتے ہیں۔''

ابرار کو ماں کی باتوں سے یہی احساس ہو رہا تھا کہ وہ عنبرین کے لیے ساجد کو ترجیح دے رہی ہیں۔ اس نے ماں کو چھیڑنے کے بجائے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

''میرا خیال ہے کہ رشتوں کی نوعیت کے اعتبار سے عنبرین نے کبھی تم سے بے رخی کا انداز نہیں اختیار کیا۔'' آمنہ بیگم نے بیٹے کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے ہمیشہ تمہارے ساتھ ہنستے بولتے دیکھا ہے۔ وہ تمہاری روزمرہ کی چھوٹی موٹی ضرورتوں کا خیال بھی رکھتی ہے۔''

''میں نے اس بات سے کبھی انکار نہیں کیا۔''

''کیا تم نے بھی اس پر اپنی محبت اور پسند کا اظہار کیا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''پھر تم ساجد کو اپنے راستے کا کانٹا کیوں سمجھ رہے ہو؟''

''حیرت ہے ....'' ابرار احمد نے الفاظ چباتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیا آپ نے پاپا اور عنبرین کے سلسلے میں ساجد سے شادی کے متعلق جو باتیں پولیس کو بتائی تھیں، وہ غلط ہیں؟''

''نہیں .... اس کا ایک ایک حرف درست ہے۔'' آمنہ بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا پھر کچھ توقف سے بولیں۔ ''تمہارے پاپا نے عنبرین سے یہی کہا تھا کہ ان کی زندگی میں ایسا کبھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔''

''عنبرین نے جو جواب دیا وہ بھی آپ کو یاد ہوگا؟''

''ہاں۔'' آمنہ بیگم پھر کسی خیالوں میں گم بیٹھی رہیں پھر تھکے تھکے لہجے میں بولیں۔ ''میں تم سے پہلے بھی کہہ چکی

ہوں وقت اور حالات نے عنبرین کو ہمارے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور کردیا ہے ورنہ تمہیں بھی اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کا بہ خوبی اندازہ ہوگا۔ والدین کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اسے یہ احساس بھی ضرور ستاتا ہوگا کہ مرنے والوں نے اسے کس پیار و محبت، ناز و محبت اور لاڈ سے پال پوس کر پروان چڑھایا تھا۔ ایسی صورت میں جب تمہارے پاپا نے اس پر ایک فیصلہ جتلا کر غلط انداز میں تھوپنے کی کوشش کی تو اس کے جذبات کو بھی یقیناً ٹھیس پہنچی ہوگی۔"

"اور اسی رات پاپا کی پراسرار موت....."

"ابرار۔" آمنہ بیگم نے بیٹے کے جملے کو رد کرتے ہوئے جھلا کر کہا۔ "جس بات کا سراغ ابھی پولیس بھی نہیں لگا سکی، تم بھی اس کے بارے میں کوئی حماقت کی بات زبان تک لانے سے گریز ہی کرو۔"

ابرار کے چہرے پر الجھن کے تاثرات پھیل کر گہرے ہونے لگے۔ آمنہ بیگم اسے غور سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ساجد کے لیے تمہارے خیالوں میں نفرت کا جو پودا جڑ پکڑ رہا ہے اسے ذہن سے اکھاڑ پھینکو۔ ہوسکتا ہے کہ جسے تم آج اپنی خوشیوں کا دشمن سمجھ رہے ہو کل تمہارے حق میں ایک ہمدرد دوست ثابت ہو۔"

"کیا آپ نے یہی کہنے کی خاطر مجھے اس وقت بلایا تھا؟" ابرار نے کسمسا کر ناخوشی کا اظہار کیا۔

"ہاں۔" آمنہ بیگم نے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "اسی ضمن میں میری ایک بات غور سے سن لو۔ تم ساجد کے خلاف اب پولیس کے کانوں میں کوئی زہر نہیں بھرو گے۔"

"میں اب اجازت چاہوں گا۔" ابرار احمد نے ناگوار انداز میں کہا پھر وہ جانے کے لیے پر تول رہا تھا جب آمنہ بیگم نے اسے تحکمانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"بیٹھ جاؤ اور جو بات میں کہہ رہی ہوں اسے بغیر کسی وضاحت کے غور سے سنو..... کل تمہارے پاپا نے عنبرین اور ساجد کے سلسلے میں ایک فیصلہ جذباتی انداز میں کیا تھا اور آج..... آج میں بھی تمہیں اس بات کا یقین دلا رہی ہوں کہ میں بھی اپنی زندگی میں ان دونوں کی شادی کی ہمیشہ اور آخری وقت تک مخالفت ہی کرتی رہوں گی لیکن میری اس مخالفت کا انداز دوسرا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سن لو کہ ہر پہلو سے ساجد کو اپنی ہمدردی کا مستحق بھی سمجھتی ہوں۔"

"میں آپ کی ان متضاد باتوں کو کس رخ سے دیکھوں؟" ابرار نے کسمسا کر پوچھا۔ "ساجد سے محبت یا نفرت؟"

"تم صرف اس بات پر دھیان رکھو کہ میں تمہاری ماں ہوں اور ماں باپ بھی اپنی اولاد کے حق میں برا نہیں سوچتے۔"

"محض ایک بات کی اور وضاحت کردیں۔" ابرار نے تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہوکر ماں کی نگاہوں میں اندر تک جھانکا۔ "پاپا کے بعد اب آپ بھی ساجد اور عنبرین کی شادی کی مخالفت کررہی ہیں۔ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی؟"

"میں اس وقت تمہارے کسی سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔"

"میرے لیے اور کیا حکم ہے؟"

"صبر و تحمل سے آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ ساجد کو اپنے راستے کی دیوار یا خوشیوں کا دشمن نہ سمجھو اور کوشش کرو کہ تم کسی مناسب طرزِ عمل سے عنبرین کا دل جیت سکو۔"

ابرار احمد نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ماں کے جملوں کے پیچ و خم نے اسے کسی حد تک الجھا دیا تھا۔ دوسری طرف آمنہ بیگم بھی اندر ہی اندر اس کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کررہی تھیں جو رحمان بابا نے سنائی تھی۔ اس کہانی کا ہر پہلو کسی زہریلے بچھو کی طرح ان کے وجود کی گہرائیوں میں اپنے ڈنک مار رہا تھا۔

☆☆☆

انسپکٹر کے جانے کے بعد ساجد کچھ دیر ان حالات کے تانے بانوں میں الجھ رہا جو وقت اور حالات نے اس کے گرد بن دیے تھے۔ وہ تعلیم یافتہ تھا، سمجھدار تھا پھر بزنس کے بکھیڑوں میں قدم رکھنے کے بعد اس نے گردشِ لیل و نہار کی اونچ نیچ اور سرد و گرم حالات میں کھل کر سانس لینے سے کافی کچھ سیکھ لیا تھا۔

احتشام احمد کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ عنبرین سے پیار نہ ہوتا تو شاید وہ اس دہلیز پر قدم رکھنا بھی گوارا نہ کرتا جہاں اس کی خوشیوں کا دشمن رہتا تھا۔ احتشام احمد سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی بھی نہیں تھی لیکن ان کے وجود نے ساجد کی زندگی سے سکون کو چھینا تھا۔ اس دہلیز سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہوگیا تھا جہاں وہ برجیس ناز کے ساتھ رہتے ہوئے زندگی کا ایک طویل سفر کیا تھا۔ برجیس ناز کو اس نے ہمیشہ اپنی ماں سمجھا تھا۔ ماں..... جس کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ اس جنت میں منہ بولے باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اس کے ناتواں کاندھوں پر گھر کی دیکھ بھال

کے علاوہ بزنس کا سارا بوجھ بھی آ گیا تھا۔ ان حالات میں بھی اس نے وقت کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ نئے معمولات میں اس نے خود کو کسی مشین کے پرزے کی طرح ایڈجسٹ کر لیا تھا۔

اس وقت بھی ساجد گزرے ہوئے خواب جیسے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جب ایک منحوس دن وہ خلافِ توقع معمول سے پہلے گھر پہنچ گیا تھا پھر اس نے احتشام احمد اور برجیس ناز کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو پہلی بار اسے بڑی شدت سے احساس ہوا کہ اب تک وہ زندگی کے جن گزرے ہوئے دنوں کو نخلستان سمجھ رہا تھا، وہ اس کی معصوم خواہشات کا ایک حسین فریب تھا۔ سراب اور فریب کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

احتشام احمد کی باتوں اور برجیس ناز کے سہمے سہمے جواب کے پیچھے سے جو گھناؤنے چہرے نظر آئے وہ بڑے مکروہ تھے۔ ناقابلِ شناخت تھے۔ ساجد نے خوابوں کا جو تاج محل برسوں میں تعمیر کیا تھا وہ پل بھر میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اسے برجیس ناز سے نفرت ہو گئی جس نے ساجد سے اس کی ولدیت کی اصلیت کو چھپایا تھا اور ..... اور زندگی کے کسی گھناؤنے پہلو کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی خاطر وہ احتشام احمد کی نفسانی خواہشات کے بھینٹ بھی چڑھ چکی تھی۔

تصویر کے اس دوسرے رخ کو دیکھنے کے بعد ہی ساجد نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ برجیس ناز نے اس کا راستہ روک کر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ جو کچھ اپنے کانوں سے سن چکا تھا اس سے زیادہ سننے اور برداشت کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ پل بھر میں برجیس ... کی دہلیز سے برسوں کا ناتا توڑ کر چلا گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موڑ تھا پھر ...

احتشام احمد کی پُراسرار موت کے بعد اس نے عنبرین کی ضد پر ملک چھوڑ کر جو غلطی کی تھی اب وہ اس کے آڑے آ رہی تھی۔ یہ زندگی کا دوسرا موڑ تھا جس نے اس کے سکون کو وقتی طور پر برباد کر دیا تھا۔

ساجد کا ذہن اس وقت ان ہی باتوں کے تانے بانوں کے درمیان الجھ رہا تھا کہ اس کے موبائل پر عنبرین کی کال آ گئی۔ عنبرین کے اصرار پر انسپکٹر سراج سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل سناتا رہا پھر اپنی ذاتی معلومات کی خاطر اس نے عنبرین کو ایک بار پھر ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''کیا اس بات کا سراغ ملا کہ آٹو میٹک کس نے چلایا تھا؟''

''یہی ایک سوال سب کے ذہن میں چکرا رہا ہے البتہ پولیس نے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مرحوم نے پہلے خواب آور دوا کی خاصی زیادہ مقدار استعمال کی پھر کسی وجہ سے اپنی موت کو یقینی بنانے کی خاطر آٹو میٹک بھی استعمال کر ڈالا۔''

''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آٹو میٹک کا استعمال کسی دوسرے نے دستانے پہن کر کیا ہو جس کا مقصد فنگر پرنٹس کے امکانات کو ختم کرنا ہو؟''

''ایسی صورت میں وہ گھر ہی کا کوئی فرد ہوگا۔'' عنبرین کی سہمی ہوئی آواز ابھری۔ ''اس لیے کہ ملازموں کا بھی بیان ہے کہ وقوعہ والی رات ہمارے گھر کوئی نہیں آیا تھا۔''

''ان بیانات کی روشنی میں تمہارا شبہ کس پر ہوگا؟''

''کسی کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔'' عنبرین نے بدستور پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر صرف انکل کی جائداد کو ان کی موت کا سبب سمجھا جائے تو ابرار پر بھی شبہ ہو سکتا ہے لیکن میری ذاتی رائے یہی ہے کہ کم از کم ابرار نے ایسا نہیں کیا ہوگا اس لیے کہ ذاتی بینک بیلنس ہونے کے باوجود آنٹی اور انکل ہر ماہ اسے جو جیب خرچ دیتے تھے وہ بھی اس کی ضرورت سے زیادہ ہی ہوتا تھا۔'' عنبرین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''امکانات کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو آنٹی بھی خارج از امکان نہیں رہتیں مگر یہ بھی اہم نکتہ ہے کہ انکل کی پُراسرار موت دوسری بیوی کو ڈائیورس دینے کے چھ ماہ بعد واقع ہوئی۔ اگر یہ حادثہ دوسری شادی کے فوری بعد پیش آتا تو دوسری بات تھی۔ ذاتی طور پر بھی میرا خیال ہے کہ آنٹی نے انتہائی قدم اٹھانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ ہوگا۔''

''اس کے علاوہ اور کس پر شبہ کیا جا سکتا ہے؟''

''صرف تم اور میں باقی رہ گئے ہیں۔'' عنبرین نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔ ''شادی کے مسئلے پر میں نے وقتی طور پر جھلا کر انکل کو جو جواب دیا تھا، وہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر ہے اس کے علاوہ میں نے تم کو یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دے کر بھی حماقت ہی کی تھی۔ ایس پی کے بعد تفتیشی انسپکٹر بھی بار بار اسی بات کو کرید رہا تھا۔''

''اس کے علاوہ ایک مشتبہ شخصیت اور بھی ہے جسے تم فراموش کر رہی ہو۔'' ساجد نے دل کا غبار ہلکا کرنے کی خاطر ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ ''برجیس ناز ..... اس کے

بارے میں تمہیں زیادہ تفصیل بتانے سے گریز کروں گا لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ تمہارے انکل کو اس سے شادی کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ طلاق کے بعد بہت ممکن ہے کہ اس نے کسی تجربے کار اجرتی قاتل کی خدمات حاصل کرکے تمہارے انکل کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دینے کی ٹھان لی ہو۔"

"میں نہیں سمجھ سکی کہ تم یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو؟ اگر ایسا فرض کرلیا جائے تو پھر ملازموں کے بیان کو تم کس خانے میں فٹ کروگے؟"

"کسی پیشہ ور اجرتی قاتل کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ ملازموں کی نظروں سے ہوکر گزرے۔ اپنے شکار تک پہنچنے کی خاطر ان کے پاس کچھ ایسے طریقے بھی ہوتے ہیں جو پولیس کو بھی دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔"

"لیکن ....."

"تم پریشان نہ ہو۔" ساجد نے اس کی بات کاٹ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔ "میں آگیا ہوں اس لیے اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔"

اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد ساجد نے خود ہی رابطہ منقطع کردیا۔ احتشام احمد کے قتل کی گتھی اتنی الجھ گئی تھی کہ وہ بھی اسے سلجھانے سے قاصر تھا۔ مختلف امکانی پہلوؤں پر خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا جب موبائل پر بھی سگنل ملا۔ اس کا خیال تھا کہ عنبرین ہی نے دوبارہ کال کی ہوگی لیکن خلاف توقع برجیس کے نمبر دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ کال ریسیو کیے بغیر رابطہ کاٹ دے لیکن پھر کسی خیال کے پیش نظر اس نے موبائل آن کیا۔ بے حد تلخ لہجے میں سوال کیا۔

"تمہارے ترکش میں اب کون سا تیر باقی رہ گیا ہے جو تم پھر میرے سکون کو برباد کرنا چاہتی ہو؟ کیا تمہیں احتشام احمد کے مرجانے کے بعد بھی سکون نہیں ملا؟"

"ساجد....." دوسری جانب سے برجیس... کی رندھی ہوئی کپکپاتی آواز ابھری۔ "میں اپنی زندگی میں تمہاری کمی کو بڑی شدت سے محسوس کررہی ہوں۔"

"اوہ..... سمجھا۔" ساجد نے زہریلے لہجے جواب دیا۔ "تمہیں ہر ماہ جو رقم مل رہی ہے، وہ شاید کم ہے۔ یہ بھی خدشہ ذہن سے نکال دو کہ میں تمہارے کاروبار پر قبضہ کیے بیٹھا ہوں۔ چاہوں تو اس کاروبار کو بھی کسی نئے چاہنے والے کے نام کردو۔ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔"

"تم..... تم مجھے اتنی گندی گالی مت دو ساجد کہ مجھے اپنے وجود سے بھی نفرت ہوجائے۔" برجیس نے تڑپ کر احتجاج کیا۔ "میرے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ تم بھی سکون سے نہیں رہ سکوگے۔"

"بکواس بند کرو اور ..... اور دوبارہ کبھی مجھے فون کرنے کی غلطی نہ کرنا۔" ساجد کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے موبائل آف کردیا پھر جھلا کر اسے زور سے دیوار پر مارا تو اس کے سارے جوڑ جوڑ بھی علیحدہ ہوکر بکھر گئے۔

☆☆☆

ایس پی اس وقت کسی سے فون پر گفتگو میں مصروف تھا اس لیے اس نے ہاتھ کے اشارے سے انسپکٹر سراج کو بیٹھنے کو کہا۔ کچھ دیر بعد فون سے فارغ ہوا تو اس نے انسپکٹر سے دریافت کیا۔

"احتشام احمد کی پُراسرار موت کے بارے میں کیا رپورٹ ہے، کوئی سراغ ملا؟"

"سر..... میں تمام متعلقہ افراد کو ایک ایک کرکے کرید چکا ہوں۔ ساجد بھی باہر سے آگیا ہے۔ اس کا بیان بھی لے لیا مگر ابھی تک کوئی ایسا کلیو نہیں ملا جو کسی کو ہتھکڑی لگائی جاسکے۔"

"پھر..... آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جائے وقوعہ سے ملنے والی تمام شہادتوں کی روشنی میں بظاہر یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہی نظر آتا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"پہلی نظر میں مجھے بھی یہی خیال آیا تھا۔ جو بیان میں نے لیے اس میں بھی کوئی جھول نظر نہیں آیا لیکن آپ ایک اہم بات فراموش کررہے ہیں۔"

"وہ کیا سر.....؟"

"زندگی انسان کو سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ مرحوم یا مقتول کے مالی حالات بھی ضرورت سے زیادہ ہی اطمینان بخش تھے۔ دوسری شادی کے بعد پہلی بیوی آمنہ بیگم نے بھی کوئی واویلا نہیں مچایا تھا۔ ایسی صورت میں خودکشی بھی محض تفریحاً نہیں کی گئی ہوگی۔" ایس پی نے بے حد سنجیدہ لہجے میں بات جاری رکھی۔ "عنبرین اور مرنے والے کے درمیان شادی کے معاملے میں جو بحث وتکرار ہوئی تھی، اس کی روشنی میں اگر دوربین نظروں سے دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں ایسا کوئی خلا ضرور رہ گیا ہے جو ابھی تک قانون کی نظروں میں نہیں آسکا۔ ہمیں بہرحال اپنی ذمے داری کو ایمان داری سے نبھانے کے لیے اس خلا کو بھی پُر کرنا ہوگا۔"

ایس پی نے ہونٹ چباتے ہوئے تھوڑے توقف سے کہا۔ ''سرسری چھان بین اور انفارمیشن کے اس طرح کی رپورٹ تحریر کر کے سردخانے میں ڈال دینا میرے اصول کے خلاف ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں سر۔'' انسپکٹر نے دبی زبان میں جواب دیا۔ ''اب تک کی گئی کوششوں کے بعد مجھے صرف بریمیں ناز کا کردار کچھ مشکوک نظر آ رہا ہے۔''

''کس اعتبار سے؟'' ایس پی نے وضاحت چاہی۔

''مسٹر ساجد کی ولدیت کے بارے میں اس نے یہی کہا ہے کہ دستاویز میں منظور احمد کا جو نام درج ہے، وہ فرضی ہے۔''

''پھر ساجد کیا اس کے گھر کے صحن میں آسمان سے ٹپکا تھا؟''

''یہی بات میں نے دوسرے انداز میں دریافت کی تھی جس کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ کسی شخص نے مرتے وقت بچہ اس کے حوالے کیا تھا۔ یہ بھی درخواست کی تھی کہ اس بچے کا راز کسی پر ظاہر نہ کیا جائے پھر .... پھر بریمیں ناز کے بیان کے مطابق وہ شخص دم توڑ گیا۔ اس خیال سے قانون کی گرفت کہیں بریمیں ناز کو مرنے والے کے سلسلے میں گرفتار نہ کرلے وہ بچے کو لے کر گھر آ گئی تھی۔'' انسپکٹر نے تھم تھم کر کہا۔ ''بچہ خوب صورت اور معصوم تھا اس لیے بریمیں ناز نے اسے اللہ کی دین سمجھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔''

''بعد میں کیا اس نے مرنے والے کے بارے میں چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھی تھی؟''

''جی نہیں .... اس کی وجہ بھی قانون کی گرفت کا خوف تھا۔'' انسپکٹر نے اپنی معلومات کی روشنی میں کہا۔ ''اس کے پہلے شوہر نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ پولیس تھانے کے چکروں میں نہ پڑے۔''

ایس پی کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے انسپکٹر کی فائل کے کچھ اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد کہا۔ ''میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ بریمیں ناز ایک ایسا کردار ہے جس کو پن پوائنٹ کیا جا سکتا ہے لیکن احتشام احمد کی پُراسرار موت کے الزام میں بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے گرفتار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور جائے وقوعہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بظاہر یہ خودکشی کا سیدھا سادہ کیس ہی نظر آتا ہے لیکن .... میری چھٹی حس بار بار یہی کہہ رہی ہے کہ احتشام احمد کی خودکشی یا قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی اہم بات ضرور ہے جو ابھی تک ہماری نگاہوں میں نہیں آئی۔''

''آپ حکم دیں سر میں اسی کی روشنی میں قدم اٹھانے کو تیار ہوں۔''

''بریمیں ناز۔'' ایس پی نے خلا میں گھورتے ہوئے حقارت سے اس نام کو دوبارہ دہراتے ہوئے کہا۔ ''آپ جبر و تشدد کے بغیر اس عورت کے گرد قانون کے دوسرے حربوں کا گھیرا تنگ کریں۔ مجھے یقین ہے اس کے اعصاب ایک بار ٹوٹ گئے تو اس کے فرشتے بھی سچ اگلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس نے ساجد کے سلسلے میں کسی مرنے والے اور اس کے بچے کی جو کہانی سنائی ہے، وہ بھی مجھے فرضی لگتی ہے۔''

''رائٹ سر۔'' انسپکٹر جانے کے لیے اٹھا تو ایس پی نے پوچھا۔

''بریمیں ناز کے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں آپ نے کیا معلومات حاصل کی ہیں؟''

''اب اس کا قریبی رشتے دار ایسا نہیں ہے جو قابلِ غور ہے۔ ایک بڑا بھائی تھا جو ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ وہی ان کو خرچ کی رقم بھیجتا تھا لیکن بریمیں ناز کی پہلی شادی کے کچھ مہینوں بعد وہ بھی کسی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔'' انسپکٹر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ساجد نے بریمیں کے مرحوم شوہر کا کاروبار سنبھال رکھا ہے جس کی آمدنی سے وہ ہر ماہ پابندی سے ایک اچھی خاصی معقول رقم دیتا رہتا ہے۔''

''کاروبار کس کے نام ہے؟'' ایس پی نے کچھ سوچ کر دریافت کیا۔

''پہلے صرف شوہر کے نام تھا جسے شادی کے بعد بریمیں ناز کا نام شامل کر کے قانونی طور پر دونوں کی مشترکہ حیثیت قرار دیا گیا۔ ساجد نے بریمیں ناز کے ایما پر ہی کاروبار سنبھالا تھا۔'' انسپکٹر نے کچھ توقف کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ ساجد اس کاروبار سے بھی دست بردار ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگائے گا۔''

''میں سمجھا نہیں .... کیا ساجد نے ایسا کوئی خیال ظاہر کیا تھا؟''

''جی نہیں لیکن بریمیں ناز کے بارے میں میرے کچھ سوالات کا جواب دیتے ہوئے اس نے ایسا ناگوار انداز اختیار کیا تھا جیسے اب کسی حوالے سے بھی وہ اس نام سے کوئی تعلق رکھنا گوارا نہیں کرتا۔'' انسپکٹر نے بات جاری رکھی۔ ''میرا ذاتی تجربہ بھی یہی نشاندہی کرتا ہے کہ ساجد صاف ستھرے اور بے داغ کردار کا مالک ہے مگر موجودہ

کیس کے حل ہونے تک میں نے اس پر قانونی ضابطوں کی پابندیاں عائد کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔"

"ایک اہم بات اور غور طلب ہے۔" ایس پی نے سر ہلاتے لہجے میں کہا۔ "مرحوم یا مقتول کا بریس ناز سے کیا تعلق ہے؟ جو شادی کے بعد بھی وہ اس کے گھر آتا جاتا تھا ایسی صورت میں کہ جب ان کے اسٹیٹس میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے؟"

"یہی ایک پوائنٹ سب سے اہم ہے سر۔" انسپکٹر نے دبی زبان میں جواب دیا۔ "ساجد اور بریس کے مابین بھی مرنے والی کی گفتگو سن لینے کے بعد ہی علیحدگی ہوئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ بلاخوف بریس کی زبان سے سچ اگلوانے کی کوشش کریں۔" ایس پی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"رائٹ سر۔" انسپکٹر نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کیا پھر قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆

"مکار عورت.... مکار عورت۔ تمہاری ترکش میں اب کون سا تیر باقی رہ گیا ہے جو پھر میرے سکون کو برباد کرنا چاہتی ہو۔ چاہو تو اپنے کاروبار کو بھی کسی نئے چاہنے والے کے نام کردو اور.... دوبارہ بھی مجھے فون کرنے کی غلطی نہ کرنا۔"

یہ ساجد کے فون پر کہے ہوئے الفاظ یا جملے نہیں تھے، دہکتی ہوئی آگ کے وہ لپکتے ہوئے شعلے تھے جو بریس ناز کے وجود کو کسی کل چین نہیں لینے نہیں دے رہے تھے جسے برداشت کرنا اب بریس ناز کے بس میں نہیں رہا تھا۔

نادیدہ جملوں کی بازگشت اس کے دل و دماغ میں گونجتی رہی پھر اس نے تڑپ کر ایک آخری فیصلہ کرلیا۔ ماضی کے چہرے سے ان گھناؤنے نقاب کو اتار پھینکنے کا فیصلہ۔ جو برسوں سے ایک کمزور اور مجبور عورت کے وجود کو دیمک کی طرح ریزہ ریزہ کرکے چاٹ رہے تھے۔

ساجد جس کی خاطر اس نے اپنے اندر کی سسکتی بلکتی عورت کو ایک ایسے خول میں بند کردیا تھا جس میں سانس لینے کی گنجائش بھی بہت کم تھی۔ وہ دنیا کے سرد و گرم کو ہنس ہنس کر برداشت کرتی رہی۔ طوفان کے تھپیڑوں میں اس کشتی کو کسی نہ کسی طور کنارے لگانے کی کوشش کرتی جس کا قسمت نے اس کے ہاتھوں سے چھین لیا تھا۔ خود اپنے زخموں کو ناسور کی شکل دیتی رہی۔ ان ناسوروں کی دکھن ناقابلِ برداشت ہوجاتی تو صرف اور صرف خدا کو یاد کرتی۔ درد کی شدتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ مانگتی۔

بریس.... ہاتھ اٹھائے خدا سے فریاد کرتی رہی۔ ان آنسوؤں کو بھی خود ہی اپنے دامن کی گہرائیوں میں جذب کرتی رہی جو اس کی پلکوں کی اوٹ سے بے اختیار امڈ رہے تھے۔ دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو اس نے موبائل کی سم تبدیل کی پھر رحمان بابا کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ رابطہ قائم ہوا تو رحمان بابا نے کہا۔

"پچھلی بار تم نے بہت عجلت میں رابطہ ختم کردیا تھا بیٹا۔ میں جب سے انتظار ہی کرتا رہا۔" دلہن بیگم بھی تم سے بات کرنا چاہتی تھیں۔"

"کون دلہن بیگم؟"

"احتشام صاحب کی بیوہ آمنہ بیگم کی بات کررہا ہوں۔"

"رحمان بابا۔ میں اس وقت آمنہ بیگم ہی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ میری بات کروادو تمہارا یہ احسان بھی ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

"کیا بات ہے بیٹا؟ تم کچھ پریشان معلوم ہوتی ہو؟"

"میرے پاس وقت کم ہے رحمان بابا کہیں لمبے سفر پر جانا ہے۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "دیر ہوگئی تو پھر وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"تم فون بند نہ کرنا۔" رحمان بابا کمرے سے نکل کر آمنہ بیگم کی طرف جانے کے لیے اٹھے۔ "میں تمہاری بات کرواتا ہوں۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو وہ بھی بتادو۔ تمہارے جانے کے بعد دھیان رکھوں گا۔ واپسی کب تک ہوگی؟ اپنا پتا بھی دلہن بیگم کو لکھوا دینا۔ تمہاری واپسی کے بعد ملنے کو آؤں گا ایک عرصہ ہوا تمہیں دیکھے۔"

وہ رحمان بابا کو باتوں میں ٹالتی رہی کچھ دیر بعد دوسری جانب سے آمنہ بیگم کی آواز سنی تو بڑی عاجزی سے بولی۔

"آمنہ بہن میں نے اس وقت ایک عورت کے رشتے سے آپ کو فون کیا ہے۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کو میرے نام سے بھی نفرت ہوگی۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو شاید میں آپ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔"

"میں رحمان بابا سے تمہاری کہانی سن چکی ہوں اس لیے تمہیں دوش بھی نہیں دوں گی۔" آمنہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت تم کچھ پریشان لگ رہی ہو، کیا بات ہے؟"

"بات بھی بتادوں گی لیکن ایک بہن ہونے کے ناتے سے وعدہ کریں کہ جو مانگوں گی آپ اس سے انکار

نہیں کریں گی؟"

"بات اگر میرے اختیار میں ہوئی تو میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔"

"اب سب کچھ آپ ہی کے اختیار میں ہے۔" برجیس نے بے حد دل شکستہ لہجے میں کہا۔ "رحمان بابا نے آپ کو مجھ بدنصیب کی کہانی سنادی ہے اس لیے اب میرے ذہن میں کچھ بوجھ ہلکا ہوگیا۔ میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ زندگی کے اس خطرناک تجربے سے دوچار ہونے کے بعد ہی اگر میں نے وہ فیصلہ کرلیا ہوتا جو آج کیا ہے تو آپ کو اس وقت تکلیف بھی نہ دیتی۔"

"تم.... تم کوئی حماقت نہ کرنا برجیس۔" آمنہ بیگم نے چونک کر کہا۔ "میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو..... تم نے کیا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"جو قدم اٹھانے کو ٹھان لیا، اس میں اب کسی تبدیلی کی گنجائش ہی نہیں رہی۔" برجیس.... نے ساجد سے اپنی آخری گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "جو گالی اس نے مجھے انجانے میں دی ہے وہ میری برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔ ہم آپ سے صرف ساجد کے حق میں ایک ماں کا پیار مانگتی ہوں۔ آپ اقرار کرلیں تو میرا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ شاید وہ خلش بھی کچھ کم ہوجائے جو مرنے کے بعد انسان کی بھٹکتی ہوئی روح کو بھی چین نہیں لینے دیتی۔ آپ ماں ہیں تو کسی ماں کے دل کا درد بھی سمجھتی ہوں گی۔"

"پریشان مت ہو۔" آمنہ بیگم نے خلوص سے جواب دیا۔ "میں نے ساجد کو ہمیشہ اچھا سمجھا ہے۔ آئندہ بھی سمجھتی رہوں گی۔ انجانے میں جو بات اس کی زبان سے نکل گئی، وہ بھی حالات کا ردِعمل ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ بھی ان پیچیدگیوں میں الجھ جاتا جو وقت اور حالات نے پیدا کردیے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ وہ معصوم ہے، بے قصور ہے لیکن میں.... میں بھی بے بس ہوں۔ ساجد کو باپ کا نام نہ دے سکی یہ بھی شاید ایک عورت کی بے بسی تھی۔ عورت جو ازل سے مجبوریوں کا شکار رہی ہے۔ آج وہی بزدل عورت آپ سے دامن پھیلا کر ایک ماں کے پیار کی بھیک مانگ رہی ہے۔ آپ نے ساجد کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو اس کا مستقبل سنور جائے گا ورنہ......"

"میں نے تم کو زبان دی ہے تو اس سے منہ بھی نہیں موڑوں گی لیکن جو گناہ کسی نے اپنی مردانگی کے بل پر کیا اس کی سزا تم اپنے آپ کو کیوں دے رہی ہو؟" آمنہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی پھر جھلا کر سوال کیا۔ "کیا احتشام احمد کو تم نے آئینہ دکھانے کی کوشش نہیں کی؟"

دوسری جانب سے کسی فوری جواب کے بجائے سسکنے اور بلکنے کی مدھم آوازیں ابھرتی رہیں پھر برجیس اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد کہا۔

"میں نے احتشام احمد کو بتادیا تھا کہ ساجد اس کے بھائی کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ اسی ایک نامعلوم راز کی آڑ میں وہ بھی میری بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ شادی بھی اسی مجبوری کا نتیجہ تھی ورنہ میں عورت ہوکر کسی دوسری عورت کے حق پر ڈاکا بھی نہ مارتی۔ ہوسکے تو میری اس غلطی کو بھی معاف کردیں۔"

"جس نے زیادتی کی جس نے اس سے بعد میں فائدہ اٹھایا وہ دونوں قدرت کی بے آواز لاٹھی کا شکار ہوکر اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔" آمنہ بیگم نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ احتشام احمد نے مرنے سے پیشتر عنبرین سے کیوں کہا تھا کہ اس کی اور ساجد کی شادی کسی قیمت پر کیوں نہیں ہوسکتی۔"

"ایک آخری درخواست اور کروں گی۔" برجیس نے بے حد دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ "ساجد حساس لڑکا ہے اس لیے آپ اس کی ولدیت کا راز حتی الامکان اپنی ذات تک محدود رکھیں تو بہتر ہے۔ میں نے ایک وصیت بھی لکھ دی ہے کہ میرے بعد میری زندگی کا تمام اثاثہ صرف اور صرف ساجد کے نام ہے۔"

"تم حماقت کی بات کررہی ہو برجیس۔" آمنہ بیگم نے اسے سمجھانے کی خاطر زور دے کر کہا۔ "میری مانو تو وقت کا انتظار کرو۔ ہوسکتا ہے کہ گزرتا وقت ہی تمہارے زخموں کے لیے تریاق ثابت ہو۔ تمہاری خاموشی کا راز معلوم ہوجانے کے بعد شاید ساجد کو بھی تمہاری بے گناہی کا یقین آجائے۔"

"آمنہ بہن..... آپ نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے، اسے بھولیے گا نہیں۔ جو تیر کمان سے نکل چکا، وہ اب واپس نہیں آسکتا۔"

دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔ آمنہ بیگم نے برجیس کو سمجھانے کی خاطر کئی بار اس کے نمبر پر کال کی لیکن دوسری جانب سے وہی ریکارڈڈ جواب ملا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔

"کیا ہوا دلہن بیگم؟" رحمان بابا نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''صبر کرو رحمان بابا۔'' آمنہ بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''کچھ رابطے ایسے ہوتے ہیں جو ٹوٹ جائیں تو دوبارہ کبھی قائم نہیں ہوتے۔ ایک بات کی درخواست اور کروں گی۔ آپ نے بریعیس کی جو کہانی مجھے سنائی تھی اب اسے بھی اپنے سینے میں دفن کرلیں۔''

رحمان بابا نے سوالیہ نظروں سے آمنہ بیگم کو دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن پھر گردن جھکا کر تھکے تھکے انداز میں کمرے سے باہر چلے گئے۔ آمنہ بیگم کے ذہن میں بریعیس کے کہے ہوئے آخری جملے گونجتے رہے۔

☆☆☆

ساجد اس وقت دفتر میں تھا اور بریعیس ناز کے کاروباری حساب کتاب کو آخری شکل دینے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ کھاتوں کو مکمل کرکے تمام کاروبار کو پہلی فرصت میں بریعیس ناز کو واپس کرکے یا تو ملازمت کرے گا یا چھوٹے موٹے پیمانے پر نیا کاروبار شروع کرے گا۔

بریعیس سے ہونے والی آخری تلخ گفتگو کے بعد سے وہ اپنے دل و دماغ پر کچھ ایسا بوجھ محسوس کررہا تھا جسے کوئی نام دینا مشکل تھا۔ ایک انجانی اضطرابی کیفیت تھی جو اسے اٹھتے بیٹھتے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ اس ذہنی دباؤ سے چھٹکارا پانے کی کوششوں میں مصروف تھا جب اسے انسپکٹر سراج کی کال ملی۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔

''پولیس نے ایک پُراسرار موت یا قتل کے واقعے سے جس تفتیش کا آغاز کیا تھا۔ آج وہ کسی کی پُراسرار خودکشی کی صورت میں ختم ہوگئی۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں سے آپ کی قریبی واقفیت تھی۔''

''آپ کس کی بات کررہے ہیں؟'' ساجد نے قدرے جھلا کر پوچھا۔

''بریعیس ناز کی۔'' انسپکٹر نے اس بار سپاٹ لہجہ اختیار کیا۔ ''اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہوچکا ہے جس کی رپورٹ کے علاوہ خود مرحومہ نے اپنے خودکشی کرنے کی ایک مختصر تحریر بھی ہماری آسانی کے لیے لکھ دی تھی۔''

ساجد کو اچانک بریعیس ناز کی خودکشی کی اطلاع ملی تو اس کے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ جو تعلق برسوں کے شب و روز سے وابستہ تھا اس کے پل بھر میں ٹوٹ جانے پر ذہن کو ایک معمولی سا جھٹکا لگنا بھی قدرتی بات تھی۔

''مجھے کس مقصد سے فون کیا ہے؟'' اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے سوال کیا۔

''صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ میت کی تجہیز و تکفین کا بندوبست کسی خیراتی ادارے سے کروایا جائے یا آپ کسی بھی انسانی رشتے سے اس کو اپنی ذمے داری سمجھیں گے؟''

''م۔۔۔ میں فوری آرہا ہوں، تدفین میں کرواؤں گا۔'' ساجد اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں ان گزرے برسوں کا تعلق اور اس سے وابستہ بھولی بسری یادیں ابھرنے لگیں۔ اس وابستگی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ساجد کم از کم مرنے والی کی تجہیز و تکفین کرکے اس قرض کے بوجھ کو کچھ ہلکا کرسکتا تھا جو مرنے والی نے اس کی پرورش کرکے کیا تھا۔

اس قرض کی ادائیگی کے بعد وہ قبرستان سے اپنے فلیٹ پر واپس آیا تو ذہن میں کسی ناسور کی سی تکلیف محسوس کررہا تھا۔ لباس تبدیل کیے بغیر وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد سے اب تک وہ خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتا رہا، پلکوں کو نم آلود ہونے سے روکتا رہا لیکن بستر پر لیٹتے ہی کسی جذبے کی شدت نے اس کے تمام حوصلے پست کردیے۔ آنسوؤں کا بہاؤ اس کے ضبط کے بند توڑ کر اتنی شدت سے ابلا کہ ساجد کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ احساس بھی اس کے ذہن کو کچوکے لگا رہا تھا کہ جو کبھی بڑے ناز سے اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن کی کشادگی میں جذب کرلیتی، ایک پھانس چبھنے کے خیال سے بھی کسی جذبے کے تحت تڑپ اٹھتی اب برسوں کا تعلق توڑ کر منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئی تھی۔ سارے تعلق ایک پل میں کسی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئے تھے۔ صرف یادیں باقی رہ گئی تھیں ان یادوں کے تعاقب میں کئی سوال بھی ساجد کے ذہن میں صدائے بازگشت بن کر بار بار ابھر رہے تھے۔

''بریعیس کی اچانک خودکشی کی وجہ کیا تھی؟ کیا بات تھی جس نے اس سے زندہ رہنے کی خواہش کو یکلخت چھین لیا تھا؟ وہ کون سا اہم موڑ تھا جس سے گزرتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا گئے تھے؟ خودکشی کا فیصلہ اس کا اپنا تھا یا کسی اور نے اسے ایسا قدم اٹھانے پر مجبور کردیا تھا؟ کون تھا وہ۔۔۔۔ کون تھا وہ؟''

ساجد بستر پر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح پڑا ان ہی خیالوں سے الجھ رہا تھا۔ اس پہلو پر بھی غور کررہا تھا کہ اس نے مرنے والی کے غم کو اتنی شدت سے خود پر کیوں طاری کرلیا ہے جب اچانک موبائل کی وائبریشن نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑ دیا۔ اس نے اسکرین پر آمنہ بیگم کے

نمبروں کو دیکھا تو سنبھل کر کال ریسیو کی۔

"مجھے برجیس کی خودکشی کی اطلاع پولیس کے ذریعے مل چکی ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

"اپنے فلیٹ پر۔" ساجد نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "کچھ دیر پہلے قبرستان سے واپس آیا ہوں۔"

"آخری بار تمہاری اس کی بات کب ہوئی تھی؟"

"دو روز قبل۔"

"اوہ ....." آمنہ بیگم نے کچھ توقف سے کہا۔ "مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر فرصت ہو تو ابھی آجاؤ۔"

"بہتر ہے۔" ساجد نے موبائل آف کر دیا۔ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کر اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، لباس تبدیل کیا پھر آمنہ بیگم کی طرف چل پڑا۔

راستے بھر متضاد خیالات اس کے ذہن کو کچوکے لگاتے رہے۔ اس کا ذہن پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا۔ سب سے زیادہ الجھن اس سوال سے ہو رہی تھی کہ اس کی ولدیت کا راز بھی مرنے والی کے وجود کے ساتھ دفن ہو گیا تھا۔ اب اس راز کی تہ تک کون اس کی رہنمائی کرے گا؟ کیا وہ تمام زندگی اندھیروں، اجالوں کے فریب میں مبتلا رہے گا؟

☆☆☆

آمنہ بیگم نے اپنی ملازمہ کلثوم کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ساجد کے آنے کے بعد کسی کو ان کمرے میں بغیر اجازت نہ آنے دیا جائے۔ ساجد کے آنے کے بعد وہ ایک عورت کی حقیقت سے اور برجیس ناز سے ہونے والی گفتگو کی روشنی میں گفتگو کرتی رہیں۔ ہر پہلو پر وہ بہت غور و خوض کے بعد ہی سنبھل سنبھل کر ساجد کے ذہن کو ٹٹولتی رہیں پھر انہوں نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد پہلو بدل کر دیدہ و دانستہ ایک شکوہ کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ تم نے مرنے والی سے کبھی میری ملاقات نہیں کروائی۔"

ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ ادب و احترام لاحق تھا جو اس کے دل میں آمنہ بیگم کے لیے موجود تھا۔

"دنیا میں ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا لیکن اب اگر میں تمہارے سر پر ماں کی حیثیت سے ہاتھ رکھوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟" آمنہ بیگم نے ساجد کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی تصور کروں گا۔" ساجد نے اپنے زخموں کو چھپاتے ہوئے خلوص سے جواب دیا۔

"پھر سوچ لو۔" آمنہ بیگم نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔ "اولاد کا حق ادا کرنے کی خاطر تمہیں میری ہر بات تسلیم کرنی ہوگی۔"

"آپ حکم دیں، میں انکار کی جرأت نہیں کروں گا۔"

آمنہ بیگم نے ساجد کو قریب بلا کر بٹھا لیا۔ تادیر بڑی اپنائیت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں پھر سرد آہ بھر کر بولیں۔

"مرنے والی نے اپنی کسی مجبوری کے سبب ولدیت کے لیے تمہیں منظور احمد کا جو فرضی نام دیا تھا، اسے اس کی بے بسی سمجھ کر قبول کر لو۔"

ولدیت کے بارے میں برجیس ناز کی کہی ہوئی بات آمنہ بیگم کی زبانی سن کر ساجد کے وجود کو پھر ایک دھچکا لگا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن جن نظروں سے آمنہ بیگم کو دیکھا اس میں ہر سوال واضح نظر آ رہا تھا۔

"دو روز قبل برجیس نے مجھے فون کیا تھا۔" آمنہ بیگم نے تمام تفصیلات آہستہ آہستہ دہرانے کے بعد اس کی وہ دونوں تحریریں بھی ساجد کے حوالے کر دیں جس میں جائیداد کا وارث قرار دینے کے علاوہ اس کہانی کو بھی مکمل کر بیان کیا تھا جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھی۔ جس کی خاطر اس نے ساجد کی تمام نفرت بھری باتوں کو برداشت کیا پھر جب برداشت جواب دے گئی تو اس نے ساجد کے مستقبل کو لوگوں کی نفرتوں کا شکار بنانے کے بجائے اپنی موت ہی کو ترجیح دی تھی۔

برجیس جیسی عورت کو جسے ساجد نے مکار ہونے کی گالی دی تھی، آج اسی کی تحریر پڑھنے کے بعد وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ آمنہ بیگم نے اسے رونے سے منع نہیں کیا۔ اس کے سر پر محبت سے زخموں پر مرہم رکھنے کے انداز میں ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ تھپکیاں دیتی رہیں۔

غبار کم ہوا تو آمنہ بیگم کی درخواست پر ساجد نے ماں کی اس تحریر کو بھی نذرِ آتش کر دیا جو اس کی قربانی اور عظمتوں کے مینار سے کم نہیں تھی۔ بعد میں آمنہ بیگم کے اصرار پر وہ اپنا مختصر سامان لے کر ان ہی کے پاس رہنے لگا پھر...

عنبرین اور ابرار کی شادی کا فریضہ بھی اسی نے انجام دیا۔ ہر چند کہ عنبرین کو ابرار کا رشتہ قبول نہیں تھا لیکن شاید وہ بھی لیو رنگ ایک ہونے کا سبب تھا جو اس نے ساجد کی بات ماننے سے انکار بھی نہیں کیا۔

سرورق کی دوسری کہانی

کاشف زبیر

خواب سراب

خواب اکثر عجیب ہوتے ہیں... کبھی موت کا خواب... کامیابی کا خواب... پہاڑوں کا سر کر لینے کا خواب... وہ نازک سی دلکش لڑکی نے بھی اپنی آنکھوں میں خوابوں کی تعبیر کے سہانے سپنے بُنے تھے... بعض اوقات خوابوں کی بڑی بھاری قیمت دینی پڑتی ہے... اور وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی۔ سر پر منڈلاتے عقاب اس کی نظروں سے اوجھل تھے... موت اور زیست کے دوراہے پر کھڑی لڑکی کا دردناک انجام...

اسرار و تحیر میں ڈوبی داستان کے دلچسپ و
عبرت ساماں واقعات کے تانے بانے...

گل کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور فرہاد اندر آیا۔ گل نے ناگواری سے اسے دیکھا تو وہ مسکرایا۔ ''تم جانتی ہو میں اجڈ آدمی ہوں اور ویسے بھی ہم کزن ہیں، میں تمہارے کمرے میں آسکتا ہوں۔''

''ہاں لیکن دستک دے کر۔'' گل نے سرد لہجے میں کہا اور دوبارہ بیگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے باقی چیزیں رکھیں اور زپ بند کردی۔

فرہاد اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تقریباً تیس سال کا

کھڑے اور کرخت نقوش اور بے ترتیب بالوں والا شخص تھا۔ مگر اسے بدصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ قد درمیانہ اور شانے چوڑے تھے۔ اس کے مضبوط ہاتھ پاؤں بتا رہے تھے کہ وہ محنت کا عادی تھا۔ وہ گھوڑے پالتا اور انہیں تربیت دیتا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟''

''یہ سب دیکھ کر بھی تم پوچھ رہے ہو؟'' گل کا لہجہ استہزائیہ ہو گیا۔

فرہاد کا چہرہ تن گیا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر گل کی نازک کلائی پکڑی اور سرد لہجے میں بولا۔ ''تم جانتی ہو کوئی مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کر سکتا۔''

''میں کوئی نہیں ہوں۔'' گل نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی اور بل کھا گئی۔ وہ فرہاد کے ہاتھ کو جنبش بھی نہیں دے سکی تھی۔ اس نے کراہ کر کہا۔ ''چھوڑو مجھے... وحشی۔''

فرہاد کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے گل کی کلائی چھوڑ دی۔ اس کی مرمریں کلائی پر انگلیوں کے نشانات چھپ گئے تھے۔ گل کی عمر بائیس سال کے آس پاس تھی۔ سرخی مائل گلابی رنگت، سرمئی بھورے بال اور اسی رنگ کی آنکھیں تھیں۔ ستواں نازک ناک تلے کسی قدر گداز لب اسے مزید دلکش بنا رہے تھے۔ اس کی بھویں قدرتی طور پر تراشی ہوئی تھیں مگر اس وقت وہ بالکل سادہ سے حلیے میں تھی، اس نے کاجل یا معمولی سی لپ اسٹک بھی نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنی کلائی سہلائی اور تلخ لہجے میں بولی۔ ''تم یہاں سے جاتے ہو یا پھر میں چلی جاؤں۔''

''تم جا رہی ہو لیکن تمہیں واپس آنا پڑے گا۔'' فرہاد نے کہا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''دوسری صورت میں تم بھی واپس نہیں آؤ گی۔ رتل کی طرح...''

گل نے کچھ کہنا چاہا مگر فرہاد جا چکا تھا۔ وہ اپنے نازک لب کاٹنے لگی۔ غصے اور اعصابی کشیدگی کا بدلہ وہ اپنے ہونٹوں سے لیتی تھی۔ بیگ تیار کر کے اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ ''ساجدہ۔''

''جی بی بی۔'' ایک ادھیڑ عمر عورت اندر آئی۔

''یہ سامان باہر پہنچا دو۔'' اس نے بیگ اور ایک درمیانے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ساجدہ کو حکم دے کر وہ باہر آئی اور اس کا رخ نچلی منزل کے ایک کمرے کی طرف تھا۔ وہ دستک دے کر اندر آئی تو کھڑکی کے سامنے راکنگ چیئر پر جھولتے بہت بوڑھے اور سفید بھوؤں والے شخص نے اسے دیکھا۔ ''گل، میری بچی۔''

''بابا میں جا رہی ہوں۔''

بوڑھا کبیر شاہ حویلی اور اس کے آس پاس موجود تقریباً ایک مربع زمین کا مالک تھا۔ اسے وراثت میں جو زمین ملی وہ چند ایکڑ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے اپنی محنت اور کوشش سے زمین کو یہاں تک بڑھایا تھا۔ اس نے خود غربت اور تنگی میں آنکھ کھولی تھی مگر اس کی اولاد نے سکھ اور آسائشیں دیکھیں اور یہی چیز شاید ان کے بگاڑ کا سبب بن گئی۔ کبیر شاہ کے دو بیٹے تھے۔ عرفان شاہ اور ریاض شاہ جوانی میں غلط راستوں پر چل نکلے اور عیاشی ان کی زندگی کا لازمی جزو بن گئی۔ کبیر شاہ نے انہیں سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اس کے بس کے نہیں تھے۔ پھر زمین اور آمدنی کے معاملات ان کے ہاتھ میں آئے تو انہوں نے مزید پر پرزے نکالے۔ کبیر شاہ نے کم عمری میں ان کی شادی کر دی کہ شاید وہ سنبھل جائیں مگر ان کی آوارگی جاری رہی تھی۔

عورتوں کے چکر میں انہوں نے دشمنیاں پال لیں اور زمین پر بھی آس پاس کے زمینداروں سے جھگڑے شروع کر دیے۔ کبیر شاہ اور پولیس آج تک نہیں جان سکی کہ ان کے اصل قاتل کون تھے۔ ایک مقدمے کی پیشی پر وہ شہر گئے تھے وہاں سے واپسی پر ان کی گاڑی پر فائرنگ کی گئی اور دونوں بھائی اپنے ڈرائیور اور گارڈ سمیت مارے گئے۔ قاتلوں کو کسی نے نہیں دیکھا۔ جن سے مقدمے بازی جاری تھی وہ تشدد پسند نہیں تھے۔ اصل قصور عرفان اور ریاض کا تھا۔ یہ بات کبیر شاہ بھی جانتا تھا اس لیے دو جوان بیٹوں کے لاشے دفنا کر اس نے ان کے خلاف کیس واپس لے لیا۔ وہ دشمنی کے سلسلے کو مزید دراز نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اب حویلی میں دو بیوائیں اور تین بچے تھے۔ عرفان کا ایک ہی بیٹا فرہاد تھا جبکہ ریاض کی دو بیٹیاں رتل اور گل تھیں۔ ریاض کی بیوہ ثوبیہ نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تو کبیر شاہ نے پوتیوں کو اپنے پاس رکھ لیا۔

لڑکیوں کی پرورش کی ذمے داری بھی عرفان کی بیوہ صفیہ کے سر آ گئی جس نے دوسری شادی نہ کرنے اور باقی عمر حویلی میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دوسری شادی کی خاطر اپنے بیٹے کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ البتہ اس نے رتل اور گل کو پالنے سے انکار کر دیا۔ اسے ان کی ماں سے نفرت تھی اور یہ نفرت اس کی اولاد سے بھی تھی۔ رتل اور گل کو کبیر شاہ نے براہ راست اپنی نگرانی میں لے لیا۔ ملازماؤں کی کمی نہیں تھی، اس لیے ان کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ کبیر شاہ نے

ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ انہوں نے بہترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور پھر رتن پڑھنے کے لیے شہر چلی گئی۔ وہ کالج کے گرلز ہوسٹل میں رہتی تھی۔ جس سال وہ واپس آئی اسی سال گل پڑھنے کے لیے شہر گئی اس لیے اسے زیادہ علم نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کیا ہوا؟

رتل اور صفیہ میں بالکل نہیں بنتی تھی، رتن نے خلافِ روایت اپنا کمرا نیچے منتقل کر لیا تھا۔ حویلی میں نیچے صرف مرد رہتے تھے۔ یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کوئی لڑکی نیچے آئی تھی۔ رتل اور گل کی فطرت میں فرق تھا۔ رتن مزاج کی تیز اور زود رنج تھی۔ اسے معمولی سی بات بھی لگ جاتی تھی۔ فطرتاً وہ ضدی اور اپنی من مانی کرنے والی لڑکی تھی۔ گل کی طرح اسے بھی کبیر شاہ سے محبت تھی مگر ساتھ ہی وہ اس سے شکایت رکھتی تھی کہ اس نے انہیں ماں سے کیوں محروم کیا۔ دوسری شادی کرنا کوئی ایسا گناہ تو نہیں تھا کہ انہیں ماں سے چھین لیا جاتا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی کہ ثوبیہ انہیں اپنی مرضی سے چھوڑ کر گئی تھی اس کے باوجود رتل کا شکوہ نہیں گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر کبیر شاہ یہ شرط نہ رکھتا تو ماں انہیں بھی ساتھ لے جاتی۔ ثوبیہ نے دوبارہ ان سے رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی بچیوں سے ملنے آئی تھی۔ رتل اس کا قصوروار بھی اپنے باپ کے خاندان کو سمجھتی تھی۔

رتل کے برعکس گل دھیمے مزاج کی لڑکی تھی۔ اس کے خیال میں اگر وہ ماں سے محروم ہوئے تو اس میں قصور دونوں طرف کا تھا۔ البتہ وہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ گھر والے ثوبیہ سے اتنی نفرت کیوں کرتے تھے کہ اس کا نام لیتے ہوئے ان کے لہجے بدل جاتے تھے۔ حد یہ کہ کبیر شاہ کے لہجے میں بھی ناپسندیدگی آجاتی تھی۔ جب بھی ماضی کا ذکر ہوتا ثوبیہ کا ذکر خراب الفاظ میں ہی کیا جاتا تھا۔ وہ ان کی ماں تھی اور انہیں برا لگتا تھا۔ خاص طور سے صفیہ تو کبھی کبھی حد سے گزر جاتی تھی۔ رتل یہ رویہ زیادہ عرصے برداشت نہ کر سکی اور اس نے شہر جانے کا اعلان کر دیا۔ کبیر شاہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ مانی۔

ان دنوں گل اپنا گریجویشن مکمل کر کے حویلی آئی تھی۔ رتن گھر سے نکلی اور ٹرین کے ذریعے شہر روانہ ہوئی لیکن اس کے بعد اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کبیر شاہ اور فرہاد نے پولیس کی مدد لی مگر ناکامی ہوئی۔ پولیس اتنا جان سکی کہ اس نے ٹرین سے شہر تک کا سفر کیا اور شہر پہنچ گئی۔ اس کے بعد وہ کہاں گئی اور اس کے ساتھ کیا ہوا اس کا سراغ نہیں لگ سکا تھا۔ اس بات کو چھ مہینے ہو گئے تھے اور پولیس نے کیس بند کر دیا تھا۔ اب گل بھی جا رہی تھی۔ بوڑھے کبیر شاہ نے کہا۔ ”تو رتل کا انجام بھول گئی ہے، وہ بھی گئی تھی اور واپس نہیں آئی۔“

”میں بھولی نہیں ہوں اسی لیے جا رہی ہوں۔“ گل نے آہستہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”بابا، رتن کے لیے حویلی والوں نے کچھ نہیں کیا۔ بس پولیس رپورٹ کرا دی اور پولیس نے بھی خانہ پری کی۔ رتل کو تلاش کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔“ گل کہتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔ ”میں اپنی بہن کو تلاش کروں گی۔“

”پتر ہم نے پوری کوشش کی۔“ کبیر شاہ نے کہا۔

”بابا آپ کمزور اور بیمار ہیں، اپنے کمرے میں ہوتے ہیں، باہر کے سارے معاملات فرہاد دیکھتا ہے اور مجھے یقین ہے اس نے خاص کوشش نہیں کی۔ وہ ویسے بھی رتن سے نفرت کرتا ہے۔“ گل کے لہجے میں یقین تھا۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ شاید فرہاد ہی رتل کی گمشدگی کے پیچھے ہے۔ مگر اس نے یہ بات کسی سے نہیں کہی۔

”یہ تیری غلط فہمی ہے پتر، فرہاد ایسا نہیں ہے۔“

گل جانتی تھی کہ فرہاد اپنے باپ اور چچا کے مقابلے میں بہتر تھا اس میں وہ خرابیاں نہیں تھیں جو ان دونوں میں تھیں۔ وہ محنتی تھا اور اس نے ساری زمین سنبھالی ہوئی تھی، اسے بچپن سے گھوڑوں کا شوق تھا اور اس نے ہارس فارم بنایا تھا۔ مگر ساتھ ہی گل یہ بھی جانتی تھی کہ فرہاد رتل اور اس سے نفرت کرتا ہے جیسے اس کی ماں صفیہ کرتی ہے۔ پھر اسے زمین اور جائداد کی فکر رہتی تھی۔ کبیر شاہ اس کے جانے کا سن کر فکر مند تھا اس نے گل سے کہا۔ ”تو اکیلی وہاں رتل کو کیسے تلاش کرے گی؟“

”بابا آپ جانتے ہیں میں رتل کی طرح جذباتی اور ناسمجھ نہیں ہوں، میں جو کرتی ہوں بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔ میں اپنی حفاظت کو اولیت دوں گی اور اس کے بعد رتل کو تلاش کروں گی۔“

”میں فرہاد سے بات کرتا ہوں۔“ کبیر شاہ نے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے اس نے کچھ کرنا ہوتا تو پہلے کر لیتا۔“ گل نے انکار کیا۔ اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور فرہاد اندر آیا۔ اسے دیکھ کر گل اٹھی اور کبیر شاہ کے سامنے جھک کر بولی۔ ”اب میں چلوں گی۔“

کبیر شاہ سچ مچ بوڑھا ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نئی نسل کو من مانی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس نے

اپنا کانپتا ہاتھ گل کے سر پر رکھ دیا۔ وہ باہر نکلی تو فرہاد نے کہا۔ ''بابا پہلے رل گئی تھی اور غائب ہوگئی۔ اب یہ حویلی سے جا رہی ہے۔ ان دونوں بہنوں نے ہمیں تماشا بنا دیا ہے۔''

''گل رل کی طرح نہیں ہے۔'' کبیر شاہ نے اس کا دفاع کیا۔ ''تم بے فکر رہو وہ کوئی غلط حرکت نہیں کرے گی۔ غلط رل نے بھی نہیں کیا اس کے ساتھ کچھ غلط ہوا ہے۔''

فرہاد کچھ دیر اپنے بوڑھے دادا کو دیکھتا رہا پھر تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ اچھی طرح جانتے ہیں، یہ کس عورت کی بیٹیاں ہیں اور اس نے اس خاندان کے ساتھ کیا کیا۔''

''یہ بچیاں ہمارا خون ہیں۔'' کبیر شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ماں کے کیے کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تعلق کیوں نہیں ہے، یہ اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔'' اس کے لہجے کی تلخی بڑھ گئی۔

''فرہاد...!'' کبیر شاہ کے لہجے میں سختی آ گئی۔ ''تم ایک طرف کی بات کر رہے ہو، بھول گئے ہو کہ تمہاری ماں کا ان کے ساتھ کیا سلوک تھا اور ہے۔ یہ ان کا جواب ہے مگر ان کا تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ اس خاندان کی بچیاں ہیں۔''

''کم سے کم آپ رل کے بارے میں یہ بات نہیں کہہ سکتے۔'' فرہاد نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر آ کر اس نے کسی کو کال کی اور رابطہ ہونے پر بولا۔ ''وہ شہر کے لیے نکل گئی ہے... ہاں ٹرین سے سفر کرے گی... اس کی کڑی نگرانی کرنی ہے... مجھے ایک ایک لمحے کی رپورٹ چاہیے۔''

☆☆☆

جوان العمر اور خوش شکل ٹیکسی ڈرائیور اپنی چمکتی دمکتی نئے ماڈل کی وائٹ کیب کے پاس کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا انداز پڑھے لکھے اور مہذب افراد کا سا تھا۔ اس نے صاف ستھری پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے سلیقے سے تراشے ہوئے بال اپنی جگہ جمے ہوئے تھے۔ اسٹیشن کے پارکنگ میں لائن سے بے شمار ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ البتہ وائٹ کیب چند ایک ہی تھیں۔ ٹرین سے اب زیادہ تر غریب لوگ ہی سفر کرتے ہیں جو وائٹ کیب کیا ٹیکسی رکشے کا کرایہ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اسٹیشن کے اندر ٹرینوں کی آمد و رفت جاری تھی اور اس کے ساتھ مسافر بھی آ جا رہے تھے۔ اسٹیشن سے جو مسافر باہر نکلے تھے، ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ اس کے ساتھ قلی نے ایک بیگ اور ایک درمیانہ سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا۔ لڑکی نے پارکنگ میں وائٹ کیب والی لائن کا رخ کیا اور کچھ دیر رک کر ان کا جائزہ لیا اور پھر اس کی نظر نوجوان کیب ڈرائیور پر رک گئی۔ چند لمحے بعد وہ اس کی طرف آئی تو اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ٹوٹا نیچے پھینک کر اسے جوتے سے بجھا دیا۔ لڑکی نے پاس آ کر پوچھا۔

''کیب خالی ہے؟''

''جی میم صاحب۔'' نوجوان مستعدی سے بولا۔ ''آپ کو کہاں جانا ہے؟''

''بتاتی ہوں۔'' لڑکی نے کہا۔ ''سامان رکھواؤ۔''

ڈرائیور نے اس کا بیگ اور سوٹ کیس ڈکی میں رکھا اور پھر اس کے لیے عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔ نوجوان ڈرائیونگ سیٹ پر آیا، کیب پارکنگ سے نکالی اور مین روڈ پر آتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے میم صاحب؟''

''ابھی تو ہوٹل جانا ہے۔'' لڑکی نے کہا اور اسے ایک ہوٹل کا بتایا۔

ڈرائیور نے کیب اس طرف موڑ دی۔ ہوٹل خاصے فاصلے پر تھا۔ اس نے چند منٹ بعد پوچھا۔ ''آپ پہلی بار یہاں آئی ہیں؟''

''نہیں پہلے بھی کئی بار آ چکی ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''آپ نے ہوٹل چلنے کو کہا تو میں سمجھا شاید پہلی بار آئی ہیں۔ کیا آپ ہوٹل سے کہیں اور بھی جائیں گی؟''

''نہیں ابھی تو ہوٹل میں رکوں گی مگر مجھے کسی مستقل رہائش کی ضرورت ہے۔''

لڑکی نے جدید فیشن کا نگین مناسب لباس پہنا ہوا تھا۔ آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ چہرے سے بڑا اعتماد اور اپر کلاس کی لگ رہی تھی۔ اس کی ہر چیز بہت اعلیٰ درجے کی اور مہنگی تھی۔ وہ یقیناً دولت مند تھی ورنہ کیب کیوں لیتی کسی ٹیکسی یا رکشے میں چلی جاتی۔ ڈرائیور نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میم صاحب میرا نام منصور ہے۔ اگر آپ کو یہاں رہتے ہوئے کیب کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر سکتی ہیں۔ ویسے تو کمپنی کا نمبر بھی ہے لیکن وہ اپنی مرضی سے آدمی بھیجتے ہیں۔ اگر مجھے کال کریں گی تو میں ہی آؤں گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' لڑکی خوش ہوگئی۔ ''اپنا نمبر مجھے دو۔''

منصور کا نمبر اس نے اپنے اسمارٹ فون میں محفوظ کر

لیا۔ جب وہ ہوٹل پہنچے تو منصور نے کیب روکتے ہوئے کہا۔

''میم صاحب مجھے کیسے پتا چلے گا کہ آپ کال کر رہی ہیں، بعض اوقات میں اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہیں کرتا ہوں۔''

''میں مس کال دیتی ہوں نمبر آجائے گا۔'' لڑکی نے کہا اور اسے مس کال دی۔

''میں اسے کس نام سے محفوظ کروں۔'' منصور نے پوچھا۔

لڑکی نے ذرا دیر بعد کہا۔ ''رشا کے نام سے محفوظ کر لو۔''

منصور نے رشا کے نام سے محفوظ کیا اور نیچے اتر کر سامان اتارنے لگا۔ لڑکی نے نیچے اتر کر اس سے کہا۔ ''مجھے صرف موبائل پر کال کرنا ہوٹل کے نمبر پر کال مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے میم صاحب۔''

''کرایہ کتنا ہوا؟''

''اتنی دور کے ہزار کے آس پاس لیتا ہوں آپ کی جو مرضی دے دیں۔''

لڑکی نے اپنے ہینڈ بیگ سے ہزار اور پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر اسے دیے۔ وہ خوش ہو گیا اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ لڑکی ہوٹل میں آئی مگر اس نے کمرا نہیں لیا۔ وہ کچھ دیر لاؤنج میں ضرور رکی اور اپنے لیے چائے کے ساتھ ریفرشمنٹ منگوائی۔ ایک گھنٹے بعد اس نے ویٹر کے توسط سے دوسری کیب منگوائی اور وہاں سے سامان سمیت روانہ ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے سے بنگلے کے سامنے رکی۔ بیل دینے پر اندر سے ایک عورت نے جھانکا اور اسے دیکھ کر خوشی سے بولی۔ ''گل بی بی۔''

دروازہ کھلا اور عورت باہر آئی۔ سلام دعا کے بعد گل نے اسے بیگ اور سوٹ کیس اندر لے جانے کو کہا اور کیب کے ڈرائیور کو کرایہ دے کر اندر آ گئی۔ لاؤنج میں عورت نے اس کا بیگ اور سوٹ کیس رکھ دیا اور اس کے لیے فریج سے جوس نکالنے لگی۔ گل نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''شہلا کہاں ہے؟''

''بی بی کچھ دیر پہلے دفتر سے آئی ہیں اور نہا رہی ہیں۔''

شہلا گل کی دوست تھی۔ وہ اس کالج میں ٹیچر تھی جہاں سے گل نے پڑھا تھا اور پھر وہ سول سروس کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت میں چلی گئی تھی۔ اکیلے رہتی تھی کیونکہ بہن بھائیوں سے بنتی نہیں تھی۔ ماں باپ گزر چکے تھے اور تیس برس کی ہونے کے باوجود اس کا شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ خوب صورت اور اسمارٹ تھی، پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ سب سے بڑھ کر مہذب اور پُرخلوص تھی۔ استاد شاگرد کا رشتہ ختم ہونے کے بعد ان میں دوستی ہو گئی تھی اور چھٹی کا دن گل عام طور سے اسی کے ساتھ گزارتی تھی۔ گل طے کر کے آئی تھی کہ اسے شہلا کے ساتھ ہی رکنا ہے۔ ہوٹل سے اس نے کبیر شاہ کو کال کر کے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع کر دی تھی مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ ابھی کہاں ہے اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہے؟

صائمہ نامی یہ عورت کئی سال سے شہلا کے پاس ملازم تھی۔ شہلا اس پر پورا اعتماد کرتی تھی اور تمام گھر اس کے سپرد کیا ہوا تھا۔ خرچ کا حساب بھی وہی رکھتی تھی۔ صائمہ بیوہ عورت تھی اور اس کی صرف ایک بیٹی تھی جسے اس نے بیاہ دیا تھا۔ اب وہ شہلا کے پاس ہی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ دو دن کی چھٹی لے کر بیٹی اور داماد کے پاس جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گل کو اورنج جوس پسند ہے وہ اس کے لیے اورنج جوس نکال کر لائی تھی۔ باہر گرمی تھی لیکن اندر اے سی کی خنکی تھی۔ صائمہ نے کہا۔ ''اس بار آپ بہت دن بعد آئیں۔''

''ہاں میں گاؤں چلی گئی تھی اور پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہوتا ہے اسی لیے آنے میں وقت لگا۔ مگر اب کچھ عرصے کے لیے آئی ہوں۔''

اسی دوران میں شہلا اندر سے نکلی، اس نے باتھ روب پہن رکھا تھا، وہ آ کر گل سے لپٹ گئی۔ ''کتنے عرصے بعد تمہاری شکل دیکھی ہے۔''

''میں بھی تم سے ملنے کے لیے بے تاب تھی مگر تم جانتی ہو کہ کتنی دور چلی گئی تھی۔''

شہلا نے صائمہ کو کھانے کا کہا اور اسے لے کر اپنے بیڈروم میں آ گئی۔ ''تم کیسی ہو، رل کا کوئی سراغ ملا؟''

''نہیں۔'' گل نے گہری سانس لی۔ ''میں اسی لیے یہاں آئی ہوں۔''

شہلا نے اسے حیرت سے.... دیکھا۔ ''کیا تم اسے تلاش کرو گی؟''

''ہاں کیونکہ وہ میری بہن ہے۔ میرا فرض بنتا ہے کہ اسے تلاش کروں، کم سے کم اپنی طرف سے پوری کوشش کروں۔''

''تم جانتی ہو پولیس نے پوری کوشش کی مگر وہ اسے تلاش نہیں کر سکی تو تم کیا کر لو گی؟''

''میں سمجھتی ہوں پولیس نے پوری کوشش نہیں کی اور دوسرے میں رُبا کے بارے میں جو جانتی ہوں وہ اس دنیا کا کوئی دوسرا فرد نہیں جان سکتا۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ شاید میں جان سکوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور وہ کہاں ہے؟''

شہلا ہچکچائی پھر اس نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، رُبا ابھی زندہ ہے؟''

گل نے گہری سانس لی۔ ''ہوسکتا ہے، لیکن سچی بات ہے میرا دل کہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے مگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''ہوسکتا ہے وہ کسی کی قید میں ہو۔''

''وہ قید اور مجبور ہو کر رہنے والی لڑکی نہیں ہے اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے اس کی زندگی کی امید نہیں ہے۔''

''تمہیں کسی پر شبہ ہے؟''

''نہیں۔''

''تمہارا کزن فرہاد؟'' شہلا نے جھجک کر پوچھا۔

''کیا وہ اس کا ذمے دار نہیں ہوسکتا؟''

گل سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''فرہاد بہت سخت مزاج اور اجڈ قسم کا شخص ہے، اسے زمین سے لگاؤ ہے اور وہ ہم دونوں بہنوں سے نفرت کرتا ہے۔ یہ نفرت اس کی ماں نے اس کے ذہن میں بٹھائی ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس حد تک جاسکتا ہے۔''

''کیا معلوم آدمی کب کس حد تک چلا جائے۔ آج کل کے دور میں قتل و غارت گری بڑھ رہی ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات پر اور چند روپے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں، یہ تو بہت بڑی زمین اور دولت کا معاملہ ہے۔''

''اگر رُبا کے ساتھ فرہاد نے کچھ کیا ہے تو وہ اسی شہر میں ہوا ہے۔ اس کا سراغ بھی یہیں ملے گا۔''

شہلا نے کہا۔ ''میں نے پولیس رپورٹ دیکھی ہے۔ پولیس نے بہت منظم انداز میں تفتیش کی ہے۔ رُبا یہاں آکر کسی ہوٹل میں نہیں رکی۔ حالانکہ یہاں اس کا جاننے والا کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس کے پاس وہ رک سکے۔''

''نہیں ایک ایسا فرد ہے مگر میں اس کے بارے میں نہیں جانتی۔''

شہلا چونکی۔ ''ایسا کون فرد ہے اور تم نے یہ بات پولیس کو بتائی؟''

''بتائی تھی۔ ممکنہ طور پر کوئی لڑکی ہے اور حویلی سے جانے کے بعد رُبا نے کئی بار اس کے بارے میں میسج کرکے بتایا۔ یہ اس کے غائب ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ اس کا موبائل اس کے ساتھ ہی غائب ہوا تھا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس نے اس کے موبائل سے کی جانے والی اور اس پر آنے والی تمام کالز کا ڈیٹا منگوالیا تھا۔ جو چند نمبرز اجنبی نکلے وہ بند پائے گئے اور غلط افراد کے این آئی سی پر تھے۔ لوکیشن بھی نکالی گئی تھی مگر اس سے بھی کچھ پتا نہیں چلا۔''

''ممکن ہے وہ جس لڑکی سے بات کرتی ہو اس کے پاس ان میں سے کوئی نمبر ہو؟''

''اگر ایسا ہے تب بھی اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہے۔''

''ایک نمبر ایسا ہے جو مسلسل اسی شہر سے استعمال ہوتا رہا ہے۔''

''صرف اس بنیاد پر تم کہہ رہی ہو کہ وہ یہیں غائب ہوئی ہے؟''

''نہیں پولیس نے یہ تو معلوم کیا ہے کہ وہ یہاں تک آئی تھی۔''

شہلا نے گہری سانس لی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ تم اس بارے میں کچھ کرسکو گی۔ بہرحال ابھی تم آئی ہو اس پر بعد میں بات کریں گے۔ جب تک صائمہ کھانا لگاتی ہے میں چینج کرلوں۔''

کچھ دیر بعد وہ کھانے کی میز پر تھے۔

☆☆☆

منصور ہوٹل سے آگے آیا پھر اس نے موبائل سے کسی کو کال کی۔ ''زویا کیا حال ہے... ہاں میں ٹھیک ہوں... تمہارے لیے ایک حیرت انگیز خبر ہے... رُبا کی بہن گل یہاں آگئی ہے اور اس نے رشنا کے نام سے ایک ہوٹل میں کمرا لیا ہے... تم ملنا چاہتی ہو... میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں... بارہ بجے آف ہوں گا تو تمہارے پاس آؤں گا۔'' کہتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ ''رات میں تمہارے پاس ہی رکوں گا۔ بہت دن ہوگئے تم سے ملے ہوئے۔''

زویا سے بات کرکے وہ مسرور نظر آنے لگا۔ بارہ بجے اس کی ڈیوٹی آف ہوئی تو اس نے کیب اسٹیشن پر دوسرے ڈرائیور کے حوالے کرکے وہاں سے اپنی بائیک لی اور روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ شہر کے متوسط علاقے میں واقع ایک عمارت کے سامنے رکا۔ اس چار منزلہ عمارت میں درمیانے سائز کے اپارٹمنٹس تھے اور اس عمارت کی شہرت اچھی نہیں تھی مگر اپنے ظاہری حلیے سے عمارت اچھی اور صاف ستھری

دکھائی دیتی تھی۔ گیٹ پر موجود چوکیدار منصور کو پہچانتا تھا، وہ اسے دیکھ کر نیاز مندانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”بہت دنوں بعد نظر آئے منصور صاحب۔“

”ہاں فرصت نہیں تھی۔“ اس نے ایک چھوٹا نوٹ چوکیدار کے ہاتھ میں تھمایا۔ ”اور سب خیر ہے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟“

”منصور بھائی کے ہوتے ہوئے کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔“ چوکیدار نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ منصور، پارکنگ میں بائیک کھڑی کر کے دوسرے فلور پر آیا۔ دائیں طرف کے فلیٹ کی کال بیل بجائی تو ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی زویا تھی۔ یہ تیکھے نقوش والی پُرکشش لڑکی تھی۔ رنگت میں ہلکا سا سانولا پن تھا۔ اس نے ٹائٹس کے ساتھ چھوٹی سی چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ منصور نے غور سے اسے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔

”زویا جی آج کیا کسی کے قتل کی تیاری ہے؟“

زویا نے بنا مسکرائے سر ہلایا۔ وہ بے چین لگ رہی تھی۔ ”تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ وہ رل کی بہن گل ہے؟“

”تم نے بتایا تھا کہ دونوں بہنوں کی صورت میں حیرت انگیز مشابہت ہے اور رل کو تم نے دیکھا ہوا ہے۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“

”تو وہ لڑکی بالکل رل کی دوسری کاپی ہے فرق صرف تاثر کا ہے، گل کے چہرے پر نرم تاثرات ہیں جبکہ رل کے تاثرات تیکھے ہوتے تھے۔ وہ خود بھی بہت تیکھی تھی۔“

وہ دونوں اندر آ گئے۔ زویا منصور کے لیے بیئر کا ٹن لے آئی۔ ”اس نے اپنا نام مرشہ کیوں بتایا؟“

”اسی سے تو میں چونکا۔“ منصور نے ٹن کھولتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین ہے وہ رل کی تلاش میں آئی ہے اور اپنی شناخت چھپانے کے لیے اس نے نام غلط بتایا ہے۔“

”تم سے چھپانے کے لیے؟“

”نہیں وہ سب کو یہی نام بتائے گی۔“

زویا سوچ میں گم تھی، اس نے کہا۔ ”اگر وہ ہم تک آ گئی؟“

”تب بھی کیا ہوگا، تم کہہ سکتی ہو کہ وہ کچھ عرصے تمہارے ساتھ رہی اس کے بعد کہاں گئی تم نہیں جانتیں۔“

زویا بے چین ہو گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس سے دوسرے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ تم جانتے ہو رل ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور صوبائی حکومت پر ان کا اثر بھی ہے۔ ہمیں کوئی بھی الزام لگا کر گرفتار کیا جا سکتا ہے اور پولیس کے تشدد پر کیا ہم اپنی زبان بند رکھ سکیں گے؟“

منصور نے غور سے اسے دیکھا۔ ”اتنی کمزور تو تم بھی نہیں ہو اور جب ہمارے خلاف کچھ ثابت کیا نہیں جا سکتا ہے تو تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو؟“

”ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“ زویا کسی قدر جھنجلا گئی۔ ”ہماری بہتری اسی میں ہے گل ہم تک نہ پہنچے۔“

”تو میں کب پہنچا رہا ہوں۔“ منصور نیم سنجیدہ انداز میں بولا۔ ”ابھی تو اطلاع دینے دوڑا آیا۔“

اس بار زویا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ”تم اطلاع دینے نہیں بلکہ کسی اور چکر میں آئے ہو۔“

منصور ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔ ”چلو کسی اور چکر میں سہی، میں رل کی بہن کا شکر گزار ہوں کہ اس بہانے تمہارا قرب تو ملے گا۔“

”اس کا بہانہ کرنے کی کیا ضرورت ہے، تم جب چاہو میرے پاس آ سکتے ہو۔“

منصور عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ”اگر جب دل چاہے آ سکتا تو شکوہ ہی کس بات کا تھا۔“

”رات بہت ہو گئی ہے اور صبح مجھے ایک شوٹ پر جانا ہے۔“ وہ بولی۔

”چلو تب دیر نہ کرو۔“ منصور نے کہا اور باقی ٹن ایک سانس میں خالی کر کے کھڑا ہو گیا اور دونوں بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔

زویا کی مالی حالت اچھی تھی۔ وہ یہاں زویا اعجاز کے نام سے مشہور تھی۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ ماڈل گرل ہے اور شوبزنس سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے گھر آنے والوں کی تعداد محدود تھی۔ اس عمارت میں رہنے والی زیادہ تر عورتوں اور لڑکیوں کا تعلق شوبزنس یا پھر غیر اخلاقی کاموں سے تھا۔ چند ایک شریف لوگ بھی تھے جو اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ زویا چند سال پہلے یہاں آئی تھی۔ پہلے اس نے ایک اپارٹمنٹ میں شیئر کیا۔ اس میں چھ لڑکیاں اور عورتیں پہلے سے رہ رہی تھیں۔

ایک سال بعد اس نے پورا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا اور مزید ایک سال بعد اسے خرید لیا۔ زویا دیکھنے میں چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی مگر وہ تیس برس کی تھی۔ اس کا تعلق ایک چھوٹے شہر سے تھا۔ وہ ایک عام سے گھر میں پیدا ہوئی۔ جہاں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ لوگوں میں جہالت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہاں لڑکیوں کو بھیڑ

ہمری سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور ان کی شادی کم عمری میں کر دی جاتی تھی۔ زویا کو بھی اٹھارہ سال کی عمر میں بیاہ دیا گیا۔ اس کا شوہر عادل اس سے خاصا بڑا لیکن ایک پڑھا لکھا اور شریف شخص تھا۔ وہ زویا کی خوب صورتی پر مرتا اور وہ جو کہتی عادل مانتا تھا۔

زویا نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ شادی کے بعد اس نے انٹر کیا اور پھر گریجویشن کیا۔ اس دوران میں وہ بہت تیزی سے بدلی تھی۔ گریجویشن کے پیپرز دینے کے لیے اسے صوبائی دارالحکومت جانا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا اس لیے عادل نے اسے ٹیکسی لگوا دی۔ وہ ٹیکسی میں پیپر دینے جاتی تھی اور اسی میں واپس آتی تھی۔ یہیں سے اس کی زندگی میں وہ موڑ آیا جس نے اسے خاتونِ خانہ سے شمعِ محفل بنا دیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور منصور تھا۔ کیونکہ دونوں آتے جاتے اکیلے ہوتے تھے۔ عادل کا اپنا میڈیکل اسٹور تھا اور وہ اسٹور چھوڑ کر اس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا اس لیے اس نے ٹیکسی لگوا دی۔ منصور اس کا جاننے والا تھا اور اس نے اس پر اعتماد کیا جس کا صلہ اسے یہ ملا کہ اس کی بیوی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

منصور خوش شکل ہی نہیں چرب زبان بھی تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ زویا کو تعریفی جملوں کے جال میں ایسا پھنسایا اور اس کے حسن کو یوں بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ وہ اس کی باتوں میں آگئی۔ عادل بڑی عمر کا ہونے کے ساتھ شکل صورت کا عام سا آدمی تھا! اگرچہ وہ پیسے والا تھا اور اس نے زویا کی ہر خواہش پوری کی تھی۔ مگر اب وہ اسے اپنے معیار کا نہیں لگ رہا تھا۔ منصور نے اسے سمجھایا کہ وہ شوبزنس میں کامیاب ہو سکتی ہے اور ایسے مقام پر پہنچ سکتی ہے جہاں سارا ملک اس سے واقف ہو۔ مگر وہ اس چھوٹے سے شہر کے ایک چھوٹے سے گھر میں ملازماؤں کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا کیونکہ اس نے عادل سے منوا لیا تھا کہ جب تک وہ پڑھ رہی ہے وہ بچے کے جھنجٹ میں نہیں پڑے گی۔ عادل کو بھی اولاد کا ایسا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ پیپرز کے بعد اس نے عادل سے کہا کہ وہ شوبزنس میں کام کرنا چاہتی ہے۔ عادل حیران ہوا تھا اس نے زویا کو سمجھایا کہ اسے شوبزنس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے، یہ دنیا بظاہر چمکتی دمکتی ہے لیکن یہاں بہت زیادہ گندگی ہے اور یہاں جانے والی کوئی عورت خود کو اس گندگی سے نہیں بچا سکتی۔ مگر زویا کی سمجھ یہ بات نہیں آئی یا آئی بھی تو وہ خوشی خوشی اس گندگی میں اترنے کو تیار تھی۔

زویا نے دوبارہ اصرار کیا تو عادل نے صاف منع کر دیا اور شادی کے بعد اس نے پہلی بار زویا پر ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات تھی اس نے آج تک زویا کو ڈانٹا تک نہیں تھا اس لیے جب اسے تھپڑ پڑا تو وہ ششدر رہ گئی اور پھر اس کے دل میں عادل کے لیے شدید نفرت آگئی۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اس کے ساتھ نہیں رہے گی۔ مگر وہ خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کرتی رہی۔ اس نے رقم جمع کرنی شروع کر دی۔ پہلے وہ ملنے والا جیب خرچ اور اضافی رقم بے دریغ شاپنگ میں اڑا دیتی تھی۔ اب اس نے شاپنگ بند کر دی اور زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے لگی۔ میکے سے اسے معمولی زیور ملا تھا مگر عادل نے اسے خاصا زیور بنا کر دیا تھا۔ اس کی مالیت بھی تین ساڑھے تین لاکھ تھی۔ اس نے یہ بھی رکھ لیا۔ دو سال میں اس نے دو لاکھ کے قریب رقم جمع کر لی۔ پھر ایک دن اسے موقع بھی مل گیا۔ عادل اسٹور کی کچھ ادائیگیوں کے لیے بینک سے لاکھ روپے لایا تھا۔ زویا نے وہ بھی اڑا لیے اور یوں ظاہر کیا کہ رات کسی وقت چور آئے تھے اور یہ رقم لے گئے۔ اس کا ہدف پورا ہو گیا تھا اس لیے ایک دن وہ خاموشی سے گھر سے نکل گئی۔ اس دوران میں اس کا منصور سے مسلسل رابطہ تھا اور وہ اس کے فرار کی اسکیم میں برابر کا شریک تھا۔

☆☆☆

شہلا نے آج چھٹی لے لی تھی۔ اس کی کچھ چھٹیاں تھیں ساتھ ہی دفتر میں کام بھی کم تھا ورنہ سرکاری ملازمین کو چھٹیاں کہاں ملتی ہیں۔ ناشتے کی میز پر اس نے گل سے کہا۔

"تو تم اس طرح سے رل کی تلاش شروع کرو گی؟"

"میرے پاس فی الحال یہی ایک راستہ ہے۔"

"فرض کرو اگر تم ان لوگوں تک پہنچ بھی جاتی ہو تو کیا وہ تمہیں دیکھ کر چونکیں گے نہیں؟"

"یہی تو میرا اصل پوائنٹ ہے۔ جو مجھے دیکھ کر چونکے گا اس کا رل سے کوئی نہ کوئی تعلق ہوگا۔"

"اس صورت میں تمہیں بھی وہی خطرہ لاحق ہو جائے گا جو رل کو تھا اور جس کی وجہ سے وہ غائب ہوئی ہے۔"

"میں جانتی ہوں اس کے باوجود میں چانس لوں گی۔" گل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ شہلا سمجھ گئی کہ وہ گل کو نہیں سمجھا سکے گی اس نے موضوع بدل دیا۔

"اچھا چھوڑو آج میں نے چھٹی کی ہے ہم تفریح کریں گے۔ آرٹس کونسل میں نمائش لگی ہے وہاں چلتے ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی آج میں بھی آرام اور تفریح ہی چاہتی ہوں۔"

وہ ناشتے کے بعد نکلیں۔ شہلا کے پاس سرکاری گاڑی تھی، اس نے ڈرائیور نہیں لیا تھا اور خود ڈرائیو کرتی تھی۔ وہ آرٹ کونسل آئے۔ یہاں کی نمائش دیکھتے رہے۔ دوپہر کے بعد وہ وہاں سے نکلے۔ ایک ریسٹوران میں لنچ کیا اور پھر واپس گھر آئے۔

گل نے انجوائے کیا تھا مگر وہ یہاں تفریح کرنے نہیں آئی تھی۔ شہلا کے پاس آنا اس کی مجبوری تھی۔ کیونکہ اس شہر میں وہی اس کی واحد واقف کار تھی جس پر وہ پورا اعتماد کرسکتی تھی اور کسی قسم کی مدد حاصل کرسکتی تھی۔ وہ سرکاری افسر تھی اور ایک اہم محکمے میں کام کررہی تھی۔ شہلا اس کی پشت پر ہوتی تو وہ خود کو زیادہ محفوظ سمجھتی۔ اگرچہ وہ پوری طرح شہلا پر انحصار نہیں کررہی تھی۔ وہ اپنی حفاظت خود بھی کرسکتی تھی۔ وہ سونے کے لیے تھکن کا بہانہ کرکے جلد کمرے میں آگئی اور منصور کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ "جی میم صاحب۔"

"مجھے کل صبح نو بجے کیب چاہیے۔"

"آپ اسی ہوٹل میں ہیں؟"

"ہاں، تم باہر آکر مجھے کال کرنا، میں نیچے آجاؤں گی۔" گل نے کہا اور کال کاٹ کر سونے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

منصور نو بجے سے پہلے ہی کیب لے کر ہوٹل کے باہر پہنچ گیا۔ اس نے ٹھیک نو بجے گل کو کال کی۔ "میم صاحب میں نیچے آگیا ہوں۔"

"میں آرہی ہوں۔"

چند منٹ بعد گل ہوٹل کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے جدید ترین فیشن کا لباس پہنا ہوا تھا اور بہت اچھا میک اپ کیا ہوا تھا۔ منصور نے کیب اس کے پاس روکی اور اتر کر پچھلا دروازہ کھولا۔ گل اندر بیٹھی تو وہ دروازہ بند کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر آیا اور کیب آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "حکم کریں میم صاحب۔"

"تم شوبزنس ایجنسیوں سے واقف ہو۔"

"بالکل، میں پہلے بھی بہت سے لوگوں کو جو شوبزنس میں کام کرتے ہیں لاتا لے جاتا رہا ہوں۔"

"دوسرے مجھے اسٹیٹ ایجنسی سے کام ہے۔"

"وہاں بھی لے جاؤں گا۔" منصور نے کہا۔ "لیکن دونوں جگہوں پر دفتر عام طور سے گیارہ بارہ بجے کھلتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں تب تک تم مجھے شہر گھماتے رہو۔" گل نے فرمائش کی۔ "میں یہاں کئی بار آچکی ہوں لیکن میں نے آج تک اس کا چھوٹا سا حصہ ہی دیکھا ہے۔"

"کیوں نہیں میم صاحب، لیکن اس صورت میں بکنگ ہوگی اور مجھے کمپنی کو اطلاع دینی ہوگی۔"

"تم آج شام چار پانچ بجے تک بک ہو۔"

"میں دو بجے تک کا کہہ دیتا ہوں۔ اس صورت میں آپ کو دو بجے تک کی ادائیگی کرنا پڑے گی۔ اگر ضرورت ہوئی تو بکنگ آگے بھی بڑھ سکتی ہے۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو۔"

منصور نے کیب آفس کال کرکے اطلاع کردی کہ وہ دو بجے تک بک ہے۔ کیب میں لگے چھوٹے سے پرنٹر سے واؤچر نکل آیا جس پر چارجز لکھے تھے۔ وہ منصور نے گل کو تھما دیا۔ اس نے پیشگی ادائیگی کردی۔ ساڑھے گیارہ بجے تک وہ گھومتے رہے اور پھر منصور اسے شوبزنس کمپنیوں کے دفاتر لے گیا۔ ہر جگہ گل چند منٹ کے لیے اندر گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اپنا تعارف کرارہی تھی اور اپنا کونٹیکٹ نمبر دے رہی تھی۔ دوپہر دو بجے تک وہ نصف درجن کمپنیوں میں گئی۔ اس کے بعد اس نے منصور کو کسی اچھے ریسٹوران چلنے کو کہا۔ وہ اسے ایک ریسٹوران لے آیا جہاں گل نے لنچ کیا۔ اس کے بعد وہ اس کے ساتھ مختلف اسٹیٹ ایجنسیوں میں گئی۔ پانچ بجے تک اس نے یہ کام نمٹالیا پھر منصور سے کہا۔ "مجھے واپس ہوٹل چھوڑ دو۔"

"میم صاحب ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں؟"

"پوچھو، تم اچھے آدمی ہو۔" گل نے کہا۔

"آپ شوبزنس کمپنیوں میں کیوں گئیں؟"

"میں شوبزنس کی فیلڈ میں آنا چاہتی ہوں۔" گل نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

"اور اسٹیٹ ایجنسی؟"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے کسی اچھی جگہ کی تلاش ہے۔ بے شک بڑی نہ ہو لیکن اچھے علاقے میں ہو۔"

منصور نے سوچا اور پھر بولا۔ "اگر آپ کہیں تو میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟" گل نے دلچسپی لینے والے انداز میں کہا۔

"میں ایک لڑکی سے واقف ہوں، وہ شوبزنس میں

ہی کام کرتی ہے اور اکثر میرے ساتھ آتی جاتی ہے۔ آپ کہیں تو میں اس سے بات کروں۔"

"ضرور کرو، مجھے کام چاہیے۔"

"میں جلد آپ کو بتاؤں گا۔" منصور نے خوش ہو کر کہا۔ "اگر آپ ایک بار شوبزنس میں آجائیں تو پھر کوئی آپ کو کامیاب ہونے سے نہیں روک سکے گا۔"

گل مسکرائی۔ "اور اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں فراموش نہیں کروں گی۔ تمہیں تمہاری محنت کا صلہ ملے گا۔"

جس وقت وہ اسے ہوٹل کے سامنے چھوڑ رہا تھا، اس وقت ایک چھوٹی کار میں ٹی شرٹ پہنے اور کانوں میں ہینڈ فری لگائے ایک نوجوان بہ ظاہر میوزک یا موبائل میں لگا ہوا تھا لیکن وہ درحقیقت سارا دن کیب کا پیچھا کرتا رہا تھا۔ اس کی سفید رنگ کی گاڑی عام سی تھی اور منصور یا گل کو ایک بار بھی شبہ نہیں ہوا کہ کیب کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ جب کیب وہاں سے روانہ ہوئی تب بھی وہ وہیں رکا رہا اور کچھ دیر بعد گل دوسری کیب میں وہاں سے روانہ ہوئی تو نوجوان اس کے پیچھے تھا۔ شہلا کے گھر کی گلی کے کونے پر رک کر اس نے گل کو اندر جاتے دیکھا اور موبائل سے کال ملائی۔ دوسری طرف سے فرہاد نے کال ریسیو کی۔ نوجوان نے اسے آج کی مکمل رپورٹ دی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ "اسی طرح نگرانی کرتے رہو اور اگر کوئی خاص بات دیکھو تو فوری بتاؤ۔ شام کا انتظار مت کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا سر۔" نوجوان نے کہا۔

"تم اچھا کام کر رہے ہو، مجھے تم پر بھروسا ہے۔"

"میں آپ کا تابعدار ہوں جناب۔"

"کل صبح اپنا بینک اکاؤنٹ چیک کر لینا۔" فرہاد نے بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔

"تھینک یو سر۔"

☆☆☆

زویا اچھل پڑی تھی۔ "تمہارا دماغ درست ہے، تم اسے یہاں تک لاؤ گے۔"

"کیونکہ اسی میں ہماری بچت ہے۔ وہ ہماری نظروں کے سامنے رہے گی اور ہم اس کے عزائم سے باخبر رہیں گے، اگر وہ بے خبری میں ہم تک آگئی تو ہم مارے بھی جا سکتے ہیں۔"

"میں کسی صورت اس کی حمایت نہیں کروں گی۔" زویا نے کہا۔ "یہ تو آ بیل مجھے مار والی بات ہے۔"

"دیکھو... تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ وہ شوبزنس ایجنسیوں کا چکر لگا رہی ہے اور کسی بھی وقت اسے کوئی ایسا بندہ ٹکرا سکتا ہے جس نے رنی کو بھی دیکھا ہوگا۔ تمہارے ساتھ بہت سے لوگوں نے رنی کو دیکھا ہے۔"

زویا پریشان ہو گئی۔ "یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"تب مجھ پر بھروسا کرو۔ اب تم ایک کامیاب شوبز سیلی بریٹی بننے جا رہی ہو۔ ایسے میں تمہارا اسکینڈل سامنے آگیا تو تمہاری اڑان یہیں رک جائے گی۔"

زویا نے ماتھا پکڑا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔"

"دیکھو تمہیں یہاں تک لانے میں، میں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے مجھے اس کا پورا صلہ بھی دیا ہے۔ مگر میں تمہارے ساتھ مخلص ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم کامیاب ہو۔ مزید آگے جاؤ۔"

"چلو ٹھیک ہے تم اسے یہاں لے آتے ہو اس کے بعد؟"

"اس کے بعد وہ ہمارے ہاتھوں میں ہوگی۔" منصور نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں نے کہا نا وہ ہمارے سامنے رہے گی تو ہم مار نہیں کھائیں گے، بے شک وہ کچھ بھی جان جائے لیکن اگر وہ ہماری بے خبری میں کچھ جان گئی تو پھر ہمارے لیے بہت زیادہ مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ اصل مسئلہ بھی تمہارے لیے ہوگا۔ میں معمولی سی نوکری کرتا ہوں اسے چھوڑ کر کہیں بھی روپوش ہو جاؤں گا، تم نہ بھاگ سکتی ہو اور نہ روپوش ہو سکتی ہو۔"

زویا نے نکتہ اٹھایا۔ "رنی بھی یہاں آچکی ہے اور یہاں لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔"

"جن لوگوں نے رنی کو دیکھا ہے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ غائب ہے۔ اگر وہ گل کو دیکھیں گے تو اسے رنی ہی سمجھیں گے۔"

"اور اگر کسی نے اس سے رنی سمجھ کر بات کی تو؟"

"خدا کے لیے..." منصور مسلسل بحث سے بیزار نظر آنے لگا۔ "یہاں کون کسی کے معاملے میں دخل دیتا ہے، کیا کسی نے آج تک تم سے بات کی ہے جو تمہارے گھر آنے والے کسی فرد سے بات کرے گا۔"

زویا کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ راضی نہیں ہے۔ منصور غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اگر تمہاری مرضی نہیں ہے تو ٹھیک ہے لیکن بعد میں مجھ سے شکایت مت کرنا، میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہے۔"

زویا کے تاثرات بدلے تھے، اس نے جلدی سے

منصور کا ہاتھ تھام لیا۔ ''پلیز میری بات کا غلط مطلب مت لو۔ میں انکار نہیں کر رہی ہوں۔ مگر میں اب تک مطمئن نہیں ہوئی ہوں۔ مجھے گل کو یہاں لانا بہت بڑا خطرہ لگ رہا ہے۔''

''خطرہ یہاں لانا نہیں ہوگا کیونکہ وہ پہلے ہی خطرہ بن کر یہاں آچکی ہے۔''

زویا نے معنی خیز انداز میں منصور کو دیکھا۔ ''کیا تم کچھ کر نہیں سکتے۔ تم ہر مسئلے کا حل نکال سکتے ہو جیسے پہلے نکالا تھا اسی طرح اب بھی نکال سکتے ہو۔''

''پہلے مسئلہ ہمارے ہاتھ میں تھا اور اس بار جب تک مسئلہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا تب تک ہم اسے اپنی مرضی سے اور اپنا ہاتھ بچا کر حل نہیں کر سکتے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟''

زویا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

منصور نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ''مت ڈرو، مجھ پر اعتماد کرو۔ میں سب دیکھ لوں گا بہ شرطیکہ تم میرے کہنے پر چلو۔''

زویا نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اگر تم ذمے داری لے رہے ہو۔''

منصور خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''بس اب تم فکر مت کرو اور دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر بعد اس کے اپارٹمنٹ سے نکلا تو بہت خوش تھا۔ اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''اب وقت آگیا ہے کہ میں سب حساب مع سود وصول کروں۔ پچھلی والی غلطی نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

گل نے شہلا کو بتایا کہ وہ آج کہاں کہاں گئی۔ شہلا سنتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''تم اپنے طور پر شاید ٹھیک کر رہی ہو لیکن معاف کرنا مجھے یہ بے کار کی مشق لگ رہی ہے۔''

''بعض اوقات بیکار چیزوں سے ہی کام کی چیز نکل آتی ہیں۔'' گل نے کہا۔ ''میرے بابا کہتے ہیں کہ کوئی کام کرنا بے کار نہیں ہوتا اس سے کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے۔''

''تمہارے دادا نے تمہیں آسانی سے آنے دیا؟''

''نہیں وہ اتنی آسانی سے اجازت نہ دیتے مگر وہ جانتے ہیں کہ حویلی میں میرے اور رنل کے ساتھ کیا سلوک ہوتا رہا ہے۔ ہم وارث اور خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی ہر معاملے سے لاتعلق کر دیے گئے۔ اسی لیے انہوں نے رنل کو بھی نہیں روکا تھا اور مجھے بھی نہیں روکا۔''

''تم مضبوط شخصیت کی اور مستقل مزاج لڑکی ہو، کیا رنل بھی ایسی تھی؟''

''نہیں، وہ مجھ سے بہت مختلف اور الگ شخصیت کی مالک تھی۔ وہ جذباتی اور لمحوں میں فیصلے کرنے اور بدل دینے والی لڑکی تھی۔ وہ لحاتی چمک دمک سے متاثر ہوتی تھی۔ یوں سمجھ لو کہ اس کا ذہنی لیول کسی نوعمر لڑکی جیسا تھا۔ وہ شوبزنس کا حصہ بننے کے لیے حویلی سے نکلی تھی اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے یوں شوبزنس کمپنیوں اور اسٹیٹ ایجنسیوں کے چکر لگانے سے تمہیں رنل کا سراغ مل جائے گا۔''

''شاید مل جائے اور شاید نہ ملے۔''

شہلا سنجیدہ ہو گئی۔ ''گل آج کی دنیا بہت خطرناک ہو گئی ہے خاص طور سے اکیلی لڑکی یا عورت کے لیے۔ اسے اپنے بچاؤ کے لیے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ پلیز تم یہ خیال ذہن سے نکال دو اور واپس حویلی چلی جاؤ۔ وہی تمہاری جائے پناہ ہے۔ رنل کے ساتھ اگر کچھ ہو چکا ہے تو تمہیں اس کے بارے میں جان کر صرف دکھ ہوگا۔''

''میں جانتی ہوں، ایک بار میں رنل کے بارے میں جان لوں پھر میں واپس جاؤں گی۔''

شہلا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ''تو تم نہیں مانو گی۔''

گل ہنسی۔ ''ابھی تم ہی نے مجھے مستقل مزاج اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والی قرار دیا تھا۔''

''او کے، میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔'' شہلا نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب سو جاؤ آج سارا دن گھوم کر تھک گئی ہو گی۔''

''خاص نہیں مگر اب لیٹوں گی۔ تمہیں بھی صبح دفتر جانا ہے۔''

''شاید مجھے ایک دن کے لیے دوسرے شہر جانا پڑے۔ اگر جانا ہوا تو کل رات تک واپسی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے پھر موبائل پر رابطہ رکھنا۔''

اس دن وہ جتنی شوبزنس کمپنیوں میں گئی وہاں اس نے رنل کی تصویر دکھا کر اس کے بارے میں پوچھا تھا اس طرح اسٹیٹ ایجنسی والوں سے بھی رنل کے بارے میں پوچھا تھا کہ کسی نے اسے دیکھا تو نہیں ہے لیکن کسی نے اقرار

نہیں کیا تھا اور نہ ہی کسی نے تصویر دیکھ کر کوئی ردِعمل دیا تھا۔ چندایک نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی بہن ہے اور گھر سے ناراض ہو کر شوبزنس میں کام کرنے کے لیے یہاں آئی ہے، وہ اسے تلاش کر رہی ہے۔ صبح ناشتے کے بعد اس نے کبیر شاہ کو کال کی۔ اس کی طبیعت کا پوچھا اور اپنی خیریت کا بتایا مگر کبیر شاہ کی تشویش کم نہیں ہوئی تھی، اس نے گل سے التجا کی کہ وہ واپس آ جائے۔ گل نے کہا۔

''بابا اس حویلی میں صرف آپ کی وجہ سے آتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے حویلی سے میرا تعلق آپ کی حد تک مشروط ہے۔''

''ایسا نہیں ہے میری بچی، یہاں تمہارا حصہ بھی ہے اور یہ تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''

''بات حصے کی نہیں، اپنے مقام کی ہے، مجھے معلوم ہے خدانخواستہ آپ کے بعد میرا اس حویلی میں کوئی مقام نہیں ہوگا۔''

کبیر شاہ خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ''میری بچی مقام کی بات الگ ہے لیکن جو تمہارا حصہ ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔''

''جو چیز ہم بہنوں نے چاہی وہ ہمیں ملی نہیں اور جس چیز کا ہمارے ذہنوں میں کوئی خیال نہیں ہے آپ اس کی بات کر رہے ہیں۔'' گل کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا اور اس نے کال کاٹ دی۔ یہ حقیقت تھی کہ بچپن سے جب وہ صرف دو سال اور رل چار سال کی تھی۔ انہوں نے اپنے ہی گھر میں اجنبیوں کی سی زندگی گزاری۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں سہولتوں میں کوئی کمی ہوئی ہو یا کسی چیز کے حوالے سے ان پر تنگی کی گئی مگر ان دونوں بہنوں کے لیے ماحول ایسا کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے ڈرتی تھیں حالانکہ وہ ماں والے حصے میں رہتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے الگ ملازمہ تھیں۔ اس کے باوجود وہ کبھی بھی وہ آزادی اور سکون محسوس نہیں کر سکیں جو بچہ اپنے گھر میں محسوس کرتا ہے۔ وہ اس کے لیے ترستی رہیں۔ شروع میں کبیر شاہ کا رویہ بھی ان سے بہت اچھا نہیں تھا۔

وہ محبت کرتا تھا اور ان سے بات بھی کرتا تھا مگر اس کے باوجود اس کے رویے میں ایک قسم کی دوری تھی۔ گل چھوٹی ہونے کے باوجود صبر کرتی تھی مگر رل جذباتی تھی۔ وہ روتی اور چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتی۔ کبھی کبھی وہ کبیر شاہ سے بھی بدتمیزی کر جاتی تھی۔ اسے خاص طور سے صفیہ سے چڑ تھی اور وہ جب بھی اس سے بدتمیزی کرتی تو فرہاد سے مار کھاتی

تھی۔ صفیہ کا رویہ انتہائی تحقیر آمیز اور نفرت سے بھرا ہوتا تھا۔ رل اسی کا ردِعمل دیتی تھی۔ گل نے کم عمری میں سیکھ لیا تھا کہ ردِعمل دینے میں اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس نے رفتہ رفتہ اس نے خود پر ایک خول چڑھا لیا تھا۔ اب اس کے ساتھ کچھ ہوتا تو وہ اپنا ردِعمل اس خول تلے رکھتی تھی۔ بہ ظاہر وہ سرد اور خاموش رہتی تھی مگر وہی جانتی تھی کہ اس کی خاموشی تلے کتنی ہلچل ہے۔

نہ جانے کیوں اسے صفیہ چچی کے طرزِعمل سے زیادہ فرہاد کے درشت رویے سے تکلیف ہوتی تھی۔ وہ بچپن سے ان دونوں بہنوں سے چڑتا تھا اور جہاں اسے موقع ملتا وہ انہیں مارنے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ پھر وہ بڑے ہوئے تو فرہاد کی دست درازی تو رک گئی مگر اس کی زبان میں ان کے لیے مزید کاٹ آ گئی تھی۔ کبھی کبھی گل کو لگتا کہ فرہاد میں صفیہ کا مردانہ روپ آ گیا ہے۔ وہی جملے، وہی طنز اور وہی نفرت جو صفیہ میں ان کے لیے ہوتی تھی۔ لازمی بات تھی کہ اس میں یہ نفرت صفیہ نے بھری تھی مگر گل کو خیال آتا کہ کیا فرہاد کی اپنی کوئی سوچ نہیں تھی۔ اسے خیال نہیں آتا ہوگا کہ گل اور رل اس کے چچا کی بیٹیاں ہیں اور اگر ان کی ماں نے کچھ کیا بھی تھا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا اس کے باوجود ان سے نفسیاتی حد تک نفرت کرنا اور پیچھے پڑے رہنا کہاں تک جائز تھا؟ مگر شاید فرہاد اسے بالکل درست سمجھتا تھا اور وہ اپنی ماں کی سو فیصد پیروی کر رہا تھا۔

کبیر شاہ سے بات کرتے اور اپنے ماضی کے بارے میں سوچتے ہوئے گل کے اندر ایک قسم کی مایوسی اور بیزاری سی آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ جو کر رہی ہے اس کا کیا فائدہ؟ اسے معلوم ہو بھی جائے کہ رل کے ساتھ کیا ہوا ہے تب بھی وہ واپس تو آنے سے رہی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ آج بھی جائے گی مگر اب اس نے ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ منصور نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے صرف ایک گھنٹے پہلے کال کر دے تو وہ کہیں بھی آ سکتا ہے۔ اس نے اس نے رات کو کال نہیں کی اور اچھا ہی ہوا ورنہ کال کر کے اسے منع کرنا پڑتا۔ لنچ میں اسے بھوک نہیں تھی اس لیے اس نے صرف شیک لیا اور اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی لیپ ٹاپ پر کچھ بے مقصد براؤزنگ کر رہی تھی کہ موبائل کی بیل بجی۔ منصور کا نام آ رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''یس؟''

''منصور بات کر رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

"کیسی خبر؟"

"شاید آپ کے دونوں مسئلے ایک ساتھ حل ہو جائیں۔ یعنی شوبزنس میں داخلے کا اور رہائش کا۔"

"وہ کیسے؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے بتایا تھا ایک ماڈل ہے جسے میں اکثر لاتا لے جاتا ہوں، میں نے اس سے بات کی تھی۔ اس نے آپ سے ملنے کو کہا ہے۔ وہ آپ کو کام بھی دلا سکتی ہے اور اس کے فلیٹ میں ایک کمرا خالی ہے۔ مطلب رہائش کے لحاظ سے خالی ہے۔ فرنیچر اور دوسری چیزیں مکمل ہیں۔ آپ کو صرف اپنا ذاتی سامان لے جانا ہوگا۔"

"وہ اتنی آسانی سے مان گئی؟" گل نے پوچھا۔

"جی میم صاحب جیسے آپ مجھ پر اعتبار کرلی ہیں اسی طرح وہ بھی کرتی ہے۔ وہ مجھے کئی سالوں سے جانتی ہے۔"

گل سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے کہا۔ "میں سوچ کر بتاؤں گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی میم صاحب۔" منصور نے خوش دلی سے کہا۔ گل سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ اسٹیشن سے باہر آئی تھی تو کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ یہ غور سے دیکھنے والا منصور تھا اور اس کے انداز میں وہ بات نہیں تھی جو کسی خوب صورت عورت یا لڑکی کو دیکھ کر مرد کے انداز میں ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ منصور کی طرف آئی تھی۔ اس کی چھٹی حس نے کہا تھا کہ یہ ڈرائیور اسے ایسے ہی غور سے نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ اسے گل میں کوئی خاص بات نظر آئی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر گل نے ایک چانس لیا تھا اور اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے شاید درست فیصلہ کیا تھا مگر وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہتی تھی۔ اگر منصور کا ماضی میں زن سے کوئی تعلق رہا ہے اور وہ خود اسی کی طرف آیا ہے تو یہ بات شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ خطرے کے ساتھ ساتھ یہ گل کی کامیابی بھی ہو سکتی تھی۔ آخر وہ اسی لیے تو یہاں آئی تھی کہ زن کے بارے میں جان سکے۔

شہلا آفس کی طرف سے دوسرے شہر چلی گئی۔ وہاں اسے کسی ضروری میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ اس نے رات گئے گل کو کال کی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ہاری ہوٹل پہنچی تھی اور سونے سے پہلے اس نے کال کرکے گل کو صرف اپنی خیریت کی اطلاع دی اور یہ بتایا کہ شاید کل بھی اس کی واپسی نہ ہو سکے اور ممکن ہے اسے بات کرنے کی فرصت بھی نہ ملے۔ گل مایوس ہوئی تھی کیونکہ وہ بے تاب تھی۔ وہ شہلا سے مشورہ کرکے جلد از جلد کوئی فیصلہ کرکے اس پر عمل کرنا چاہتی تھی۔ اب منصور نے خود اس سے رابطہ کرلیا تھا اور اسے جلد ہی کوئی ردعمل دینا تھا۔ زیادہ دیر اسے مشکوک کرسکتی تھی۔

☆☆☆

زویا ان عورتوں میں سے تھی جو بہرصورت اپنی مرضی کرتی ہیں اور کسی بھی انجام کی پروا نہیں کرتیں۔ جب وہ گھر سے نکلی اور نا ہور آئی تو کئی مہینے تک عادل کو اس کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے زویا کو تلاش کرنے کی ہرممکن کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ملی۔ جبکہ زویا یہاں منصور کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے پاس رقم تھی اور انہوں نے ایک چھوٹا فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ وہ دونوں خود کو میاں بیوی ظاہر کرکے کھلے عام گناہ کی زندگی بسر کررہے تھے۔ ان دنوں منصور نہ صرف اس کے خرچ پر گزارہ کررہا تھا بلکہ اس نے دل بھر کر اس کے حسن سے خوشہ چینی کی تھی اور جب زویا کو احساس ہوا کہ وہ اسے صرف اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کررہا ہے تو اس نے رفتہ رفتہ اس سے دور ہونے کی کوشش شروع کی اور سب سے پہلے اس نے اس عمارت میں فلیٹ میں شیئر کے ساتھ کمرا حاصل کرلیا جہاں اب وہ اپنے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔

یہ کام اس نے منصور سے پوچھے بنا اور اس سے چھپ کر کیا تھا۔ جب منصور کو پتا چلا اور اس نے وجہ پوچھی تو زویا نے چالاکی سے کہا کہ وہ نہیں چاہتی کہ کسی دن وہ دونوں ساتھ رہتے ہوئے پکڑے جائیں اور حدود کے تحت سزا پائیں اس لیے ان کا الگ رہنا ہی بہتر تھا۔ منصور کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ زویا سے جس حد تک مستفید ہو سکتا تھا ہو چکا تھا۔ اس نے بہ ظاہر خوش دلی سے اس کا یہ فیصلہ تسلیم کرلیا۔ وہ ٹیکسی چلاتا تھا اس نے یہاں یہ دھندا شروع کردیا۔ جان پہچان پہلے سے تھی۔ اس نے چند موٹی پارٹیاں پکڑ لیں جو اسے آنے جانے کے ساتھ ساتھ زبان بند رکھنے کا معاوضہ بھی دیتی تھیں۔ پھر اس نے ترقی کی اور کیب کمپنی میں نوکری کرلی۔ کیب چلانے کا یہ فائدہ تھا کہ اس میں آمدنی زیادہ تھی اور خرچ کچھ بھی نہیں تھا۔ بلکہ ٹپ اور خاموش رہنے کا معاوضہ بھی زیادہ ملتا تھا اور پولیس والوں سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔

منصور سے چھٹکارے کے بعد زویا نے شوبزنس میں کامیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ وہ خوب صورت اور بے باک تھی اس لیے اسے کام حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ مگر صرف خوب صورتی اور بے

لڑکی کے سہارے وہ ایک خاص حد سے زیادہ اوپر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کامیابی کے لیے صرف ماڈلنگ کافی نہیں ہے۔ اسے ٹی وی ڈراموں میں بھی کام حاصل کرنا تھا اور فیشن انڈسٹری سے بھی رابطے میں رہنا تھا۔ آنے والے چند سالوں میں اس نے خاصی حد تک ابتدائی مراحل طے کر لیے تھے۔ مگر عین اس وقت جب وہ کامیابی کے لیے پُراعتماد تھی، عادل نے اسے تلاش کر لیا۔ ایک رات وہ دیر سے اپارٹمنٹ میں آئی تو راہداری میں عادل اس کا منتظر تھا۔ زویا اسے دیکھ کر ڈر گئی۔ ''تم یہاں کیسے آئے اور کیوں آئے ہو؟''

عادل نے نرمی سے کہا۔ ''مجھے تم سے صرف بات کرنی ہے لیکن تم اگر چاہو تو ہنگامہ بھی کر سکتی ہو اور یہاں رہنے والوں کو پتا چل جائے گا کہ تمہارا ایک شوہر بھی ہے۔''

زویا نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے مگر تم اپنی بات کرو اور یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

وہ اسے اندر لے آئی مگر بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔ حال ہی میں زویا نے یہ فلیٹ خریدا تھا اور اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے اسے خود کو کئی بار فروخت کرنا پڑا تھا۔ عادل نے اندر آ کر فلیٹ دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اگر یہ تمہارا ہے تو یقیناً اس رقم میں تو کام چلا نہیں ہوگا جو تم گھر سے لے کر بھاگی تھیں۔''

''کام کی بات کرو۔'' زویا نے سخت لہجے میں کہا۔ ''بھول جاؤ کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔''

''تو کیا نہیں ہو؟''

''اگر ہوں بھی تو اب میں اس رشتے کو نہیں مانتی اور بہت جلد میں خلع لے لوں گی۔''

''اب تک کیوں نہیں لیا؟''

''کیونکہ میں ذرا مصروف تھی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے تم اتنی آسانی سے خلع لے سکو گی۔''

''عدالت میں آؤ تو پتا چل جائے گا۔'' زویا بولی۔ ''آج کل یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

عادل سنجیدہ ہو گیا۔ ''سنو زویا تم جس راستے پر جا رہی ہو اس کا خاتمہ بالآخر کسی گڑھے پر ہوتا ہے۔ اب بھی وقت ہے میرے ساتھ چلو اور اپنے گھر میں رہو۔ میں تم سے کوئی حساب طلب نہیں کروں گا نہ رقم کا اور نہ تمہارے شب و روز کا۔ اگر تم نے کوئی خطا کی ہے تو میں وہ بھی معاف کر دوں گا۔''

زویا نے حقارت سے اسے دیکھا۔ ''تم مجھے معاف کرو گے۔''

عادل نے کوشش کی کہ زویا اس کی بات سن اور سمجھ لے مگر وہ سننے اور سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی، اس نے بے عزت کر کے اسے گھر سے نکال دیا۔ پھر اس نے منصور سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ عادل نے اسے تلاش کر لیا ہے اور اب وہ اسے واپس لے جانا چاہتا ہے۔ جواب میں منصور نے رکھائی کا مظاہرہ کیا تھا مگر زویا جانتی تھی کہ اسے کس طرح منایا جا سکتا ہے اور اس نے اسے منا لیا۔ زویا صرف مردوں کی حد تک ذہین تھی مگر منصور کا ذہن سازشی تھا، اس نے زویا سے کہا۔ ''اگر تم عادل سے چھٹکارا چاہتی ہو تو اسے کسی لڑکی کے چکر میں ملوث کر دو اس طرح تمہیں آسانی سے خلع مل جائے گا۔''

''لڑکی کہاں سے آئے گی۔''

''تلاش کرو، شوبزنس کی دنیا میں زیادہ تر اکیلی لڑکیاں آتی ہیں اور ان سے کام لینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا ہے۔ تمہیں زیادہ بہتر پتا ہے کہ وہ کام حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔'' منصور کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

''اگر ہم کوئی لڑکی تلاش کر لیتے ہیں تو اس سے کام کیسے لیں گے؟''

''تم لڑکی تلاش کرو اور باقی معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

زویا نے لڑکی کی تلاش شروع کی۔ اس دن وہ ایک چھوٹے ایڈ کی شوٹنگ پر تھی۔ سیٹ پر کام کے دوران اس کی نظر ایک کونے میں بیٹھی رسالہ دیکھتی لڑکی پر گئی۔ وہ اچھی دلکش لڑکی تھی اور اس کا حلیہ بھی اچھا تھا۔ شوٹ کے بعد زویا اس کے پاس آئی اور اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کسی قدر اونچی آواز میں بولی۔ ''اف یہ شوبزنس بھی عذاب ہے۔ ایک معمولی سا شوٹ سارا دن کھا جاتا ہے۔''

''اس کے باوجود لڑکیاں اسے جوائن کرنا پسند کرتی ہیں۔'' لڑکی نے کہا تو زویا نے اسے یوں چونک کر دیکھا جیسے اس کی موجودگی سے پہلی بار واقف ہوئی ہو۔ اس نے بے تکلفی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ہائے! میں زویا ہوں۔''

''رُبی۔'' اس نے ہاتھ ملایا۔

''تم شوٹ پر ہو؟'' زویا نے پوچھا۔

''نہیں، میں دیکھ رہی ہوں کہ ماڈل کیسے کام کرتی ہیں اور تم اچھا کام کر رہی ہو۔''

''تھینک یو۔'' زویا ادا سے بولی۔ وہ کچھ ہی دیر میں رمل سے بے تکلف ہوگئی تھی اور اس نے اسے ساتھ لنچ کی دعوت دی۔ رمل مان گئی۔ زویا اسے لنچ کے لیے ایک ریستوران میں لائی۔ کھانے کے دوران رمل نے اسے بتایا کہ وہ شوبزنس میں کام کرنا چاہتی ہے مگر اس میدان میں بالکل نئی ہے۔ زویا نے اس سے کہا۔

''دیکھو یہاں کامیابی کے لیے دو ہی گر ہیں۔ ایک تم دوسروں کو خوب صورت لگو۔ یعنی تمہیں صرف خوب صورت ہونا ہی نہیں چاہیے بلکہ نظر بھی آنا چاہیے۔ دوسرے تمہیں ملنے والے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ چاہے تمہیں اس کے بدلے کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔''

''مجھے موقع مل سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں، تم خوب صورت ہو اور نظر بھی آتی ہو، تمہیں موقع ملے گا مگر اس موقع کو اپنی کامیابی میں تمہیں خود بدلنا ہوگا۔''

رمل اس کی باتوں سے متاثر ہوئی تھی۔ ''لگتا ہے تم شوبزنس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''کیونکہ میں کئی سال سے اس شعبے میں دھکے کھا رہی ہوں۔''

جیسے جیسے زویا اس سے بات کر رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ رمل اس کے کام کے لیے موزوں ترین لڑکی ہے۔ گفتگو کے دوران رمل نے بتایا کہ وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہے مگر اسے رہائش درکار ہے۔ زویا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس فلیٹ ہے اور اس میں ایک بیڈ روم خالی ہے۔ میں اکیلی رہتی ہوں، میرے لیے ایک بیڈ روم کافی ہے اگر تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔''

رمل نے حیرت سے کہا۔ ''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو اور مجھے اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دے رہی ہو۔''

''مجھے انسان کی پہچان ہے، اتنے عرصے اس شعبے میں دھکے کھا کر میں نے یہ فن تو سیکھ ہی لیا ہے۔''

رمل تیار نہیں تھی مگر زویا نے اصرار کر کے اسے آمادہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ ٹھہرے۔ اس نے رمل کو بتایا کہ وہ اکیلی رہتی ہے اور کسی سے ملتی جلتی نہیں ہے، کم سے کم کوئی اس سے ملنے اس کے گھر نہیں آتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاں پڑوسیوں کا آنا جانا ہے۔ وہ اس کے ساتھ سکون سے رہے گی۔ پھر وہ اس کے ساتھ رہے گی تو زویا اس کے لیے موقع تلاش کر سکے گی۔ زویا نے اپنا فائدہ یہ بتایا کہ اس کے کچھ اخراجات شیئر ہو جائیں گے۔ ان دنوں اس کے پاس زیادہ کام نہیں ہے اور وہ مالی لحاظ سے تنگ ہے۔ رمل مان گئی، اگلے دن وہ ہوٹل سے سامان لے کر زویا کے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ وہ اپارٹمنٹ دیکھ کر خوش ہوئی تھی کیونکہ وہ اپنے ساتھ جو رقم لائی تھی اسے کفایت شعاری سے استعمال کر رہی تھی، اس کے باوجود وہ جس ہوٹل میں رکی تھی وہاں اخراجات خاصے اور معیار بہت کم تھا۔ یہ اپارٹمنٹ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر تھا۔ رمل نے زویا سے کہا۔

''میں کرایہ دوں گی۔''

''نہیں بس تم بلوں اور یوٹیلٹی میں شیئر کر لینا۔'' زویا نے انکار کیا۔ ''میں نے تمہیں خود آفر کی تھی۔ تم نے تو نہیں کہا تھا۔''

''پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے اور میں کرایہ دے سکتی ہوں۔''

''ابھی تمہیں چانس حاصل کرنا ہے اور اس میں نہ جانے کتنا وقت لگ جائے۔ تم اپنی رقم بچا کر رکھو۔ ہاں اگر تم کمانے لگ جاؤ تو پھر میں تم سے کرایہ لوں گی مگر ابھی نہیں۔''

رمل اس کی بہت زیادہ شکر گزار تھی۔ اسے کالج کے زمانے سے شوبزنس میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ کالج میں بھی وہ آرٹ میں دلچسپی لیتی تھی اور خاص طور سے اس نے ڈرامے بہت کیے تھے۔ اس کی فرینڈز اس کی تعریف کرتی تھیں اور ان کا کہنا تھا کہ وہ اداکارہ بن سکتی ہے۔ رفتہ رفتہ بہت سی باتوں سے اس کا ذہن بن گیا۔ حویلی میں اسے ماں کے حوالے سے بہت سی باتیں سننے کو ملتی تھیں اور اس کے اندر غبار سا بھرتا رہا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ شوبزنس میں آئے گی۔ ماڈلنگ کرے گی اور ڈراموں میں کام کرے گی اور جب اس کا خاندان کے حوالے سے شہرہ ہوگا تو ان لوگوں کو مزہ آئے گا جو اپنی نام نہاد عزت لیے بیٹھے تھے۔ صفیہ اور فرہاد نے رمل اور گل کی تعلیم کی بھی شدید مخالفت کی تھی، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں حویلی میں قید کر دیں۔ اگر انہیں کبیر شاہ کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا۔ گریجویشن کے بعد وہ حویلی واپس آئی تو یہاں کے ماحول میں اس کا دم زیادہ گھٹنے لگا۔ بالآخر وہ حویلی سے نکل گئی۔ اس نے بہانہ ملازمت کا کیا تھا اور شہر آنے کے بعد اپنا موبائل فون بند کر دیا تھا بس کبھی کبھی موبائل کچھ دیر کے لیے آن کر کے گل کو ایس ایم ایس کر دیتی یا اس کے ایس ایم ایس دیکھ لیتی تھی۔ اب وہ زویا کے ساتھ تھی۔

زویا ہر تیسرے چوتھے دن اسے مختلف شوبزنس ایجنسیوں میں لے جاتی تھی مگر فی الحال اسے کام نہیں ملا تھا۔ اس کے دو مرتبہ اسکرین ٹیسٹ ہوئے تھے اور نتیجہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ مگر زویا اس کی ہمت بندھاتی رہتی تھی۔ رل نے محسوس کیا کہ ویسے تو زویا بہ ظاہر پُرسکون زندگی گزار رہی تھی لیکن اس کی زندگی میں کوئی ٹینشن تھی۔ کبھی کبھی وہ کھو سی جاتی تھی اور اس کا چہرہ بے تاثر ہو جاتا تھا۔ ایسے میں رل کو واضح محسوس ہوتا کہ ماضی میں اس کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔

اسے یہاں آئے ہوئے تیسرا ہفتہ تھا۔ ایک شام وہ ٹیرس میں بیٹھی تھیں کہ رل نے اچانک پوچھا۔ ''تم نے اپنے ماضی کے بارے میں نہیں بتایا۔''

وہ پھیکے انداز میں مسکرائی۔ ''میرے ماضی میں بتانے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''سوری اگر تمہیں برا لگا تو...''

''نہیں، نہیں۔'' زویا اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ اصل میں ماضی کے جس عذاب سے پیچھا چھڑا کر یہاں آئی اور اس دنیا میں شامل ہوئی اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، وہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہے۔''

''کون؟''

''میرا شوہر۔'' زویا نے گہری سانس لے کر کہا۔

رل حیران ہوئی۔ ''تم شادی شدہ ہو، تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''کیونکہ میری شادی خوشی کا سودا نہیں تھا۔'' زویا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہ میری زندگی کا بدصورت ترین حصہ ہے، کوئی اپنی بدصورتی کسی دوسرے کو دکھانا پسند نہیں کرتا۔''

''سوری، میں نے تمہیں سیڈ کر دیا۔'' رل نے ندامت سے کہا۔

''ارے نہیں۔'' زویا جلدی سے بولی۔ ''تم اپنے اوپر بوجھ مت لو۔ عادل سے میری شادی میری بدقسمتی ہی تھی۔''

''عادل؟''

''میرے شوہر کا نام ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے دس سال بڑا ہے لیکن بیس سال بڑا لگتا ہے۔ اس میں سوائے پیسے کے اور کوئی خوبی نہیں تھی۔ میرے گھر والے لڑکیوں کو بھیڑ بکریاں سمجھتے ہیں جس کھونٹے سے دل چاہا باندھ دیا۔ میں صرف اٹھارہ سال کی تھی جب مجھے اس گھٹیا شخص کے حوالے کر دیا تھا۔''

''وہ ظالم تھا؟''

''ایسا ویسا، آج بھی میری پشت پر اس کی مار کے نشان ہیں۔ میرا ہونٹ اتنی بار پھٹا کہ جب میں شوبزنس میں آئی تو مجھے اس کی سرجری کرانی پڑی۔ اسے میرے احساسات اور جذبات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ رات گئے آتا اور اپنا کام کر کے دوسری طرف منہ موڑ کر سو جاتا۔ مجھ لوں میں اس کی ملازمہ تھی۔ ہمارے درمیان پانچ سال تعلق رہا اور یہ پانچ سال میں نے جس اذیت میں گزارے اس سے میں ہی واقف ہوں۔'' زویا کہتے ہوئے یوں گہری سانسیں لے رہی تھی جیسے اپنے اندر کے ابال کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ اس کی اداکاری تھی ورنہ اس نے اب تک جو بولا تھا اس میں ننانوے فیصد جھوٹ تھا۔ رل نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے افسوس ہوا سن کر۔''

''اس بات کو کئی سال گزر چکے ہیں مگر اب وہ شخص دوبارہ میرے پیچھے آ رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے وہ کسی صورت مجھے نہیں چھوڑے گا اور اس کے بھیجے غنڈے آئے دن مجھے تنگ کرتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے خلاف خلع کا کیس نہ کروں۔''

رل چونکی۔ ''تم نے پہلے نہیں بتایا، کیا حال ہی میں کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟''

''ہاں، کل میں شوٹ سے آ رہی تھی تو ایک بائیک سوار میرے پیچھے لگ گیا اور ایک سگنل پر اس نے میرے پاس رک کر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے عادل کے خلاف کورٹ میں جانے کی کوشش کی تو میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم پولیس میں رپورٹ کرو۔''

''ہماری پولیس بھی مظلوم کا ساتھ دیتی ہے۔'' زویا نے تلخی سے کہا۔ ''بہر حال میں نے اس کے خلاف کورٹ میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں وہاں درخواست کروں گی کہ مجھے اس سے جان کا خطرہ ہے۔''

''سنو اگر میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی ہوں تو مجھے ضرور بتانا۔'' رل نے خلوص سے کہا۔ ''میرا تعلق ایک بارسوخ خاندان سے ہے اور میں اوپر سے پولیس پر دباؤ ڈلوا کر اسے سیدھا کر سکتی ہوں۔''

زویا نے چونک کر اسے دیکھا اور جلدی سے بولی۔

''نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بھی خاصی جان پہچان ہے مگر میں نہیں چاہتی کہ معاملے کی شہرت ہو اور بات میڈیا میں آئے۔ اس سے میری پروفیشنل لائف کو نقصان ہو

گا۔"

رِل سمجھ رہی تھی اسے بھی وہ اس سے متفق ہو گئی۔ اگلے دن وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی جا رہی تھیں کہ ایک بائیک تیزی سے ان کی گاڑی کے آگے آگئی اور اس سے سوار اتر کر تیزی سے ان کے پاس آیا۔ یہ جگہ سنسان تھی، اگر زویا بروقت بریک نہ مارتی تو گاڑی بائیک سے ٹکرا جاتی۔ رِل کو غصہ آگیا تھا مگر زویا کا سفید رنگ دیکھ کر وہ چونکی اور اس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"یہ وہی آدمی ہے۔" زویا نے کہا۔

آدمی پاس آیا اور اس نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے درشت لہجے میں زویا سے کہا۔ "لگتا ہے تجھے یوں سمجھ میں نہیں آئے گا۔ عادل کے پاس واپس چلی جا ورنہ کسی دن تیرے اس حسین چہرے پر تیزاب پڑے گا اور تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔"

رِل کا خیال تھا کہ زویا ڈر جائے گی مگر اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں نے پولیس کو درخواست دے دی ہے کہ اگر مجھے کوئی نقصان ہوا تو ذمے دار عادل ہوگا اور جلد اس سے کورٹ میں ملاقات ہوگی۔"

پولیس کا سن کر آدمی چونکا اور کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد تیزی سے بائیک پر سوار ہو کر اسے دوڑا لے گیا۔ یہ بھی ایک ڈراما تھا اور بائیک والا منصور تھا۔ ڈراما اسی کا تیار کیا ہوا تھا اور زویا اس پر عمل کر رہی تھی۔ رِل جو سہمی بیٹھی تھی اس نے سکون کا سانس لیا۔ زویا نے کہا۔ "تم نے دیکھا رِل، پولیس کا سن کر وہ ڈر گیا۔ عادل اور اس کے آدمی بزدل ہیں اگر میں ان کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاؤں تو یہ میرا سامنا نہیں کر سکیں گے۔"

"مگر یہ معاملہ خطرناک ہے، تم پولیس میں رپورٹ کر دو۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے عادل سے چھٹکارے کے لیے اس کے خلاف کسی ثبوت کی ضرورت ہے جو میں عدالت میں دوں تو مجھے بہ آسانی خلع مل جائے۔"

"کیسا ثبوت؟"

"یہی کہ عادل کا کسی اور عورت سے چکر ہے۔" رِل نے چونک کر زویا کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

عادل اپنے میڈیکل اسٹور پر تھا۔ چند سالوں میں اس نے خاصی ترقی کر لی تھی۔ پہلے اس کے پاس ایک دکان تھی اور ایک سیلز مین تھا۔ اب اس نے برابر والی دکان بھی لے لی تھی اور اس کے پاس صبح سے شام تک مختلف اوقات میں تین سیلز مین ہوتے تھے۔ زویا کی اچانک گمشدگی بلکہ فرار کے بعد وہ خاصا مضطرب رہا تھا مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ساتھ ہی وہ اسے تلاش بھی کر رہا تھا۔ اس کے رشتے داروں نے تو کہا تھا کہ وہ پولیس میں رپورٹ کرا دے مگر اس کا دل نہیں مانا پھر زویا کے گھر والے بھی اس کے سامنے رو رہے تھے کہ اس صورت میں پولیس انہیں تنگ کرے گی اور ان کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ وہ عادل کے ساتھ تھے اور انہوں نے بھی زویا کی تلاش میں خاصی سرگرمی دکھائی تھی، دور دراز کے رشتے داروں تک معلوم کر لیا مگر وہ نہیں ملی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بالکل تاریکی میں تھے اور انہیں قطعی علم نہیں تھا کہ زویا گھر سے کیوں نکلی اور کہاں گئی تھی؟

عادل نے اپنے ذرائع استعمال کیے اور پیسا بھی خرچ کیا۔ پولیس میں اس نے زویا کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ مایوس ہوتا گیا اور ایک وقت آیا کہ اس نے اپنی تلاش بند کر دی۔ وہ چاہتا تو دوسری شادی کر سکتا تھا۔ بے شک اس کی عمر زیادہ تھی مگر وہ صحت مند تھا اور اس کے پاس پیسا بھی تھا مگر اس نے شادی نہیں کی شاید اسے امید تھی کہ زویا واپس آجائے۔ پھر زویا اتفاق سے اسے نظر آگئی اور وہ سامنے نہیں آئی تھی بلکہ اس نے اسے ٹی وی کے ایک اشتہار میں دیکھا تھا۔ اشتہار معمولی سا تھا اور درحقیقت ٹی وی نہیں بلکہ کیبل پر چل رہا تھا۔ اس میں زویا نے خاصی بے باکی سے پروڈکٹ سے زیادہ اپنی نمائش کی تھی۔ عادل اسے دیکھ کر اچھل پڑا۔ اسے امید نہیں تھی کہ اس کی مفرور بیوی اسے ٹی وی پر نظر آئے گی۔ اس کے بعد اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔

اس کا پتا حاصل کر کے عادل جب اس سے ملنے پہنچا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ زویا اس دلدل میں بہت گہرائی تک اتر چکی ہے جسے شوبزنس کہتے ہیں۔ اسے دکھ ہوا تھا اور اپنے ساتھ کیا ہوا دھوکا بھی یاد آیا اس کے باوجود وہ زویا کو معاف کرنے اور ساتھ رکھنے کو تیار تھا۔ مگر جب زویا سے بات کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کسی صورت واپس جانے اور اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں تھی۔ عادل نے اس کے بعد بھی اس سے دو بار ملاقات کی اور ہر بار زویا نے اس سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ عادل کو احساس ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے تو اس نے زویا سے کہا۔ "تم بھول جاؤ کہ میں تمہیں طلاق دوں گا۔ اگر تمہیں خلع حاصل کرنا ہے تو تمہیں

کورٹ جانا ہوگا اور وہاں میں تمہارے وہ سارے کرتوت عدالت کے سامنے رکھوں گا جو مختلف چینلز پر آتے رہے ہیں۔"

بہ ظاہر ایسا لگا تھا کہ زویا اس کی دھمکی کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔ مگر اب تک اس نے خلع کا کیس بھی فائل نہیں کیا تھا۔ عادل دکان پر تھا کہ اسے ایک اجنبی نمبر سے کال آئی، اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف کوئی عورت تھی۔ اس نے پوچھا۔ "عادل صاحب۔"

"بات کر رہا ہوں۔"

"میرا نام فریحہ ناز ہے اور میں زویا کے ریفرنس سے بات کر رہی ہوں۔"

"زویا۔" عادل نے بدمزگی سے کہا۔ "اب وہ کیا چاہتی ہے؟"

"میں جانتی ہوں اس نے آپ کو چھوڑا ہے اور بہت بڑی غلطی کی ہے مگر اب وہ اس سے بڑی غلطی کرنے جارہی ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے مگر وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"تب میں کیا کرسکتا ہوں۔ بیوی بس وہ نام نہاد ہی ہے۔"

"تب آپ اسے طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"

"اگر آپ نے اسی لیے کال کی ہے تو...؟"

"نہیں پلیز، میری بات سنیں، میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میرے گھر آجائیں۔"

"نہیں اگر آپ شہر تک آسکیں تو بہتر ہوگا، ہم کسی ہوٹل یا ریستوران میں مل سکتے ہیں۔"

"آپ زویا کو کیسے جانتی ہیں؟"

"میں بھی شوبزنس کی فیلڈ میں ہوں اور ابھی ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔ اتفاق ہے کہ زویا سے دوستی ہوگئی ورنہ وہ کسی سے دوستی نہیں کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔"

"یہ میں ملاقات پر بتا سکوں گی۔"

"ٹھیک ہے آپ بتا دیں کہاں ملنا پسند کریں گی اور وقت بھی، میں آجاؤں گا۔"

وہ رش تھی جو فریحہ ناز بن کر اس سے بات کر رہی تھی۔ اس نے اسے وقت اور جگہ بتائی اور عادل مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا وہ رش کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ اس کی آواز خوب صورت تھی لیکن وہ خود اتنی حسین ہوگی عادل کو خیال نہیں آیا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ شوبزنس میں ہے اسے خوب صورت تو ہونا چاہیے۔ رش نے پہلے ہی ایک کونے والی میز حاصل کرلی تھی جہاں وہ زیادہ لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر بات کرسکتے تھے۔ وہ کسی قدر نروس تھی۔ اس نے رسمیات کے بعد کہا۔ "اگر زویا کو علم ہوگیا کہ میں اس وقت آپ کے ساتھ ہوں تو وہ پھر میری صورت بھی نہیں دیکھے گی۔"

عادل نے چائے اور اسنیکس کا آرڈر دیا اور اس سے پوچھا۔ "آپ نے کہا تھا کہ زویا کوئی بڑی غلطی کرنے جارہی ہے۔"

رش نے سر ہلایا۔ "زویا سے مجھے پتا چلا ہے کہ کوئی شخص اسے بہکا کر مڈل ایسٹ لے جانا چاہتا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ اس کا انٹرنیشنل کیریئر بن جائے گا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ شخص اسے اپنی مطلب برآری کے لیے استعمال کرے گا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں ...... عورتوں کا کیسے استحصال کیا جاتا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" عادل نے ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن یہ بات تو زویا کو سمجھنے والی ہے اور آپ کا کیا خیال ہے میں نے اسے سمجھایا نہیں ہوگا۔ میں تو آخری حد تک چلا گیا۔ اپنی انا اور خودداری سب اس کے سامنے ڈھیر کردی کہ وہ واپس آجائے میں سب بھول جاؤں گا۔ مگر وہ سمجھنے والی عورت ہوتی تو یوں مجھے دھوکا دے کر کیوں جاتی۔ میں نے اس کے لیے کیا نہیں کیا، اس کی ہر خواہش پوری کی۔ اسے بچے پسند نہیں تھے میں نے اس کی بات مان لی۔ اس نے جتنا مانگا اور جب مانگا میں نے دیا اور جواب میں اس نے مجھے کیا دیا؟" عادل کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

رش جو یہاں کچھ اور سوچ کر آئی تھی اس کے انداز پر چونک گئی۔ اسے عادل کے انداز میں سچائی اور درد نظر آیا تھا۔ گفتگو کا رخ مڑ گیا اور عادل اسے بتانے لگا کہ زویا نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ جب زویا ایک گھنٹے بعد وہاں سے اٹھی تو اسے لگا کہ زویا نے اسے بہت کچھ غلط بتایا ہے اور اسے استعمال کیا ہے۔ مگر اس نے کسی بھی موقع پر عادل کو احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی منصوبے کے تحت یہاں آئی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ زویا نے ان کی تصویریں لینے کا بندوبست کیا ہوا ہے تاکہ اسے عادل کے خلاف ثبوت ملے اور وہ اسے عدالت میں پیش کرکے خلع کا کیس جیت سکے۔ وہ واپس آئی اور اس نے زویا سے صاف گوئی سے کہا۔ "عادل تو کچھ اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔"

’’اسے تو کوئی اور کہانی ہی سنانی ہے، وہ تمہیں حقیقت تو بتانے سے رہا۔‘‘ زویا نے اطمینان سے کہا۔ ’’اس کی زبان میں ایسی ہی تاثیر ہے کہ عورتیں بہت جلد اس کی مظلومیت پر یقین کرلیتی ہیں لیکن یہ میں جانتی ہوں کہ اندر سے وہ کیا ہے۔‘‘

مگر رلی نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اس چکر سے خود کو دور کرلے گی، وہ بولی۔ ’’سنو، میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتی۔‘‘

زویا پریشان ہوگئی۔ ’’تم پیچھے ہٹ رہی ہو۔‘‘

’’ہاں کیونکہ مجھے پہلے جیسا اطمینان نہیں ہے۔ صرف تمہاری خاطر میں عدالت میں جانے کو بھی تیار ہوگئی تھی مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ میرا اس معاملے میں پڑنا مناسب نہیں ہے۔ دوسرے اگر یہ تصویریں میڈیا پر آگئیں تو اس سے میرے خاندان پر بُرا اثر پڑے گا۔‘‘

زویا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ’’ابھی تک تو تم خاندان کے خلاف تھیں اور اب تمہیں ان کا خیال آرہا ہے۔‘‘

’’ہاں کیونکہ گھر کی عزت آپ کی عزت ہوتی ہے اگر آپ اپنے گھر کو بے عزت کرو گے تو خود بے عزت ہو جاؤ گے۔‘‘

رلی کے اس یوٹرن نے زویا کو پریشان کر دیا تھا، اسے لگا کہ رلی اب نہیں مانے گی اور اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔ زویا نے التجا کی۔ ’’پلیز میرا ساتھ دو۔‘‘

’’میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں لیکن اس طرح سے نہیں۔‘‘ رلی نے واضح کیا۔ زویا اپنے کمرے میں آئی اور اس نے منصور کو کال کی۔

’’کیا ہوا؟‘‘ منصور نے پوچھا۔

’’وہ پیچھے ہٹ گئی ہے۔‘‘

☆☆☆

زویا اور منصور ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب سے رلی زویا کے پاس آئی تھی وہ باہر ہی ملتے تھے۔ زویا نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ منصور نے کہا۔ ’’اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’یہ میں تمہیں کل اسی ہوٹل میں بتاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے ایک بات بتاؤ اگر عادل مرجائے تو تمہیں کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟‘‘

’’میری بلا سے وہ کل کا مرتا آج مرجائے۔‘‘

’’اور اگر اس کی موت غیر طبعی ہو تو؟‘‘ منصور کا لہجہ سنسنی خیز ہوگیا۔

زویا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ’’قتل...؟‘‘

’’ہاں لیکن اس کا الزام تم پر یا مجھ پر نہیں آئے گا۔‘‘

زویا سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ’’کیا یہ ضروری ہے؟‘‘

’’نہیں مگر اس صورت میں عادل جلد یا بدیر تمہیں عدالت میں کھینچ لے گا اور تم جو بات میڈیا سے چھپانا چاہ رہی ہو وہ سامنے آجائے گی۔ اس سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ عادل زندہ نہ رہے۔‘‘

زویا کانپ گئی تھی۔ ’’قتل... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اگر پکڑے گئے تو سزائے موت ہوگی۔‘‘

’’اول تو کوئی ہمارا تعلق ثابت نہیں کر سکے گا۔ الزام رلی پر آئے گا۔‘‘

’’رلی پر... وہ کیسے؟‘‘

’’میں نے کہا نا سب مجھ پر چھوڑ دو اور جیسا میں کہوں ویسا کرتی جاؤ۔ پھر دیکھنا تم ان پر اچھے سے کیسے نکلتی ہو۔‘‘

زویا نے محسوس کیا کہ اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ مان گئی اور اگلے روز پھر منصور سے ملنے اسی ہوٹل میں پہنچی۔ منصور نے اسے ایک چھوٹی سی شیشی دی۔ ’’اس میں بہت زود اثر زہر ہے۔ بس چند قطرے اور آدمی دنیا سے پار۔ اس کا کوئی ذائقہ اور بو نہیں ہے، کسی بھی کھانے یا پینے کی چیز میں ڈال کر دیا جا سکتا ہے۔ بہت ہی مہنگا ہے اور بڑی مشکل سے ملا ہے۔‘‘

’’زہر مگر اسے استعمال...‘‘

’’رلی کرے گی۔‘‘ منصور نے کہا۔ ’’اب تم غور سے سنو کہ تم نے کیا کرنا ہے۔‘‘

منصور اسے بتانے لگا اور زویا غور سے سن رہی تھی۔ اسے چند ایک بار اختلاف ہوا مگر منصور نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ زویا ہوٹل سے نکلی تو زہر کی شیشی اس کے پرس میں تھی۔

☆☆☆

عادل اپنے گھر میں تھا اور بے چینی سے نشست گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ کال بیل بجی تو وہ تیزی سے دروازے تک آیا۔ دروازہ کھولا تو باہر رلی موجود تھی۔ اس نے عبایا نقاب سمیت پہنا ہوا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسز تھا، وہ تیزی سے اندر آئی اور عادل نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ ’’آپ نے گھر میں ملاقات کا کہہ کر مجھے مشکل

میں ڈال دیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میں اکیلا رہتا ہوں اور شریف آدمی ہوں۔ کسی نے آپ کو آتے یا جاتے دیکھ لیا تو اس سے میری ریپوٹیشن خراب ہوگی۔"

"میں سمجھتی ہوں مگر میں مجبور تھی۔" رل نے بے چینی سے کہا۔ "زویا کو مجھ پر شک ہو گیا ہے اور شاید وہ میری نگرانی بھی کرا رہی ہے۔"

"تب اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ یہاں میرے پاس آئی ہیں۔"

"نہیں راستہ طویل تھا اور میں نے خیال رکھا ہے کہ کوئی پیچھے نہ آ رہا ہو۔ میں ایک ٹیکسی میں آئی تھی اسے یہاں کے مین بازار میں چھوڑ دیا اور وہاں سے رکشا لے کر یہاں تک آئی ہوں۔ رکشا بھی میں نے گلی کے سرے پر چھوڑ دیا تھا اور آپ کے گھر کی کال بیل بجانے سے پہلے اطمینان کر لیا تھا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے۔ اگر آس پاس کے گھر سے کوئی نکل آتا تو میں اندر آنے کے بجائے یہاں سے چل دیتی۔"

عادل نے سکون کا سانس لیا اور اسے اندر لے آیا۔

"یہ آپ نے اچھا کیا۔"

رل نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا اور سن گلاسز بھی اتار دیے باہر گرمی تھی اور اسے پسینا آ رہا تھا۔ عادل نے اے سی چلا دیا تو کمرا خنک ہونے لگا۔ مگر رل کو اس خنکی سے سکون نہیں ملا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے شدید مضطرب ہے۔ عادل اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ پریشان لگ رہی ہیں؟"

"اسی لیے تو میں یہاں تک آئی ہوں۔" وہ بولی۔ "عادل صاحب میری آپ سے التجا ہے کہ آپ زویا کو طلاق دے دیں۔"

عادل کا چہرہ تن گیا۔ "آپ اس کی وکیل بن کر آئی ہیں؟"

"نہیں، نہیں، بدقسمتی سے میں خود اس چکر میں آ گئی ہوں، یہ دیکھیں۔" رل نے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر دیا۔ عادل نے لفافہ کھولا تو اس میں چند تصاویر تھیں۔ ان میں رل اور عادل ہوٹل میں موجود تھے اور تمام تصویروں میں ان کے چہرے نمایاں تھے۔ اس نے تصاویر دیکھ کر سوالیہ نظروں سے رل کو دیکھا۔ وہ بولی۔ "پتا نہیں کیسے یہ تصاویر لی گئیں اور زویا نے مجھے دی ہیں۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے اسے طلاق نہیں دی تو وہ ان تصاویر کو کورٹ میں استعمال کرے گی۔"

"ان میں کیا ہے جو وہ انہیں کورٹ میں استعمال کر سکتی ہے۔"

"کچھ نہیں ہے لیکن اگر یہ میڈیا پر آ گئیں تو میرا خاندان بدنام ہوگا۔"

"آپ فکر مت کریں، وہ آپ کو دھمکا رہی ہے اور آپ پریشان ہو کر یہاں دوڑی آ گئیں۔ ان تصویروں میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو میڈیا کے لیے کشش کا باعث ہو۔"

"پلیز عادل صاحب۔" رل روہانسی ہونے لگی۔ "آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کتنی مشکل میں ہوں۔"

"آپ زیادہ ہی پریشان ہیں۔" عادل نے کہا۔ "میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد عادل دو گلاسوں میں کولڈ ڈرنک لے آیا اس نے ایک گلاس رل کے سامنے رکھا۔ "پلیز یہ لیں اس سے آپ کی طبیعت بہتر ہوگی۔"

"شکریہ۔" وہ بولی پھر ہچکچا کر کہا۔ "کیا ایک گلاس پانی مل سکتا ہے۔"

"میں لاتا ہوں۔" عادل نے کہا اور کمرے سے نکل گیا اس کے جاتے ہی رل نے تیزی سے پرس سے وہی شیشی نکالی جو منصور نے زویا کو دی تھی اور جس میں مہلک زہر تھا۔ اس نے سوچا پھر آگے بڑھ کر عادل کے گلاس میں چند قطرے ٹپکا دیے۔ جس وقت وہ شیشی پرس میں واپس رکھ رہی تھی عادل پانی کا گلاس لے کر آ گیا۔ اس نے شکریہ کہہ کر پانی کا گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ عادل اس کے سامنے والے صوفے پر آ گیا اور اپنا کولڈ ڈرنک کا گلاس اٹھایا مگر کولڈ ڈرنک پینے کے بجائے اس نے رل سے کہا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں۔ ان تصویروں سے آپ کو یا آپ کے خاندان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ایک بار یہ عورت کورٹ میں آ جائے تو میں اس کی اصلیت کھول سکوں گا۔"

"شاید اسے ان باتوں سے کوئی فرق نہ پڑے کیونکہ وہ عزت و بے عزتی کی حدوں سے دور جا چکی ہے۔ اس کے نزدیک صرف اس کا مفاد ہی سب کچھ ہے۔"

"یہ اب نہیں ہے شروع سے تھا جب وہ میری بیوی تھی۔" عادل نے تلخی سے کہا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆☆☆

کل کیب سے اترنے لگی تو منصور نے کہا۔ "سیکنڈ فلور پر کونے کا دائیں طرف والا آخری فلیٹ ہے۔ نمبر تین سو تین ہے۔"

"تم نہیں آؤ گے۔"

"نہیں یہ میرا کیا کام ہے اور میں نے زویا بی بی کو بتا دیا تھا۔ اب آپ جا کر ان سے مل لیں۔ اگر کہیں تو میں رک جاتا ہوں یا آپ بعد میں مجھے کال کر سکتی ہیں۔"

گل نے سوچا اور بولی۔ "نہیں تم جاؤ اگر ضرورت ہوئی تو میں تمہیں کال کر لوں گی۔"

گل سیڑھیوں سے اوپر آئی۔ دوسرے فلور پر آ کر اس نے مطلوبہ اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔ اس کے پاس صرف ایک پرس تھا اور اس کا سامان بدستور شہلا کے گھر تھا مگر اس نے منصور پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ ہوٹل میں مقیم ہے۔ کال بیل کے جواب میں زویا نے دروازہ کھولا اور ایک لمحے کو وہ چونک گئی۔ اسے لگا کہ رملہ اس کے سامنے آ گئی ہو۔ دونوں بہنوں میں بہت زیادہ مشابہت تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور گل اس کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس نے چونک کر کہا۔

"سوری، میرا نام زویا ہے اور تم یقیناً..."

"رمشا۔" گل نے اپنا وہی نام بتایا جو اس نے منصور کو بتایا تھا۔

"آؤ اندر آؤ۔" زویا نے پیچھے ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ گل اندر آئی اور اس نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ داخلی دروازہ لاؤنج میں تھا، اس کے ایک طرف اوپن امریکن کچن تھا۔ دوسری طرف ڈرائنگ روم اور اس کے مخالف سمت دو عدد بیڈ روم تھے۔ فرنیچر اور آرائشی اشیا قیمتی اور اچھے ذوق کی تھیں۔

"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔" گل نے تعریف کی۔

زویا خوش ہو گئی۔ "میں نے خود سب چیزیں لی ہیں اور اپنا اپارٹمنٹ ڈیکوریٹ کیا ہے۔"

"تمہارا ذوق بھی اچھا ہے۔"

زویا اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ "منصور بتا رہا تھا کہ تم شوبز میں آنا چاہتی ہو اور تمہیں مستقل رہائش کی ضرورت بھی ہے؟"

"ہاں ہوٹل میں رہنے میں مسئلہ تو نہیں ہے مگر وہاں گھر کا سکون اور پرائیویسی نہیں ہوتی ہے اور اکیلی لڑکی ایک حد سے زیادہ ہوٹل میں رہ بھی نہیں سکتی۔"

"میں سمجھتی ہوں جب میں یہاں آئی اور شوبز میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تو میں نے بھی کسی کی پراہلم فیس کی تھیں۔" زویا نے کہا۔ "اسی لیے جب منصور نے تمہارا ذکر کیا تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ تمہارے کام آؤں جیسی تک بھی ممکن ہو۔"

"آئی ایم ویری تھینک فل ٹو یو۔ لیکن میں جو سہولت لوں گی اس کا معاوضہ ادا کروں گی۔ میری مراد رہائش سے ہے۔"

"مجھے ضرورت نہیں ہے۔" زویا نے انکار کیا۔ "ہاں تم چاہو تو بلوں اور دوسرے اخراجات میں شیئر کر لینا۔ کھانا بنانے کے لیے کچن اور سارا سامان ہے۔ تم جو کھانا چاہو اس کا سامان لے آؤ یا باہر سے پسند ہو تو منگوا لیا کرو۔"

"تم نے پہلے بھی کسی کو ساتھ رکھا ہے؟" گل نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"میں اکیلی رہتی ہوں اور میری کوئی دوست یا واقف کار بھی نہیں ہے۔ بس کام کے لیے جاتی ہوں اور اس کے بعد گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے کسی لڑکی کو رکھنے کا سوچا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا کہ آج انسان اوپر سے کچھ ہوتا ہے اور اندر سے وہ کچھ اور نکلتا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کہا لیکن پھر مجھے بغیر جانے رکھنے پر کیوں راضی ہو گئیں؟"

"میں نے اصل میں منصور پر اعتماد کیا ہے، میں اسے کئی سال سے جانتی ہوں اور اس کے ساتھ آتی جاتی رہی ہوں، اسے میں نے ہمیشہ اچھا اور پُرخلوص شخص پایا ہے۔"

گل اس کے پاس تقریباً ایک گھنٹا رکی۔ زویا نے اسے کولڈ ڈرنک کے ساتھ کچھ پیک ریفریشمنٹ پیش کی تھیں۔ کچن کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے شاذ ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ دونوں بیڈ رومز کے دروازے بند تھے اس لیے گل ان میں نہیں دیکھ سکی تھی البتہ جانے سے پہلے زویا نے اسے وہ بیڈ روم دکھایا جو اس نے پہلے رملہ کو بھی دیا تھا۔ بیڈ روم گل کو پسند آیا تھا مگر اس نے زویا سے کہا کہ وہ اسے سوچ کر جواب دے گی۔ اس نے کال کر کے منصور کو بلایا اور اس نے اسے ہوٹل چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ دوسری ٹیکسی میں شہلا کے گھر تک گئی۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اس نے گل کو بتایا تھا کہ شاید آج رات تک اس کی واپسی ہو۔ گل بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ صائمہ نے اس سے ڈنر کا پوچھا مگر اس کا موڈ نہیں تھا۔ اس نے شہلا کو کال کی تو وہ ائرپورٹ سے روانہ ہو چکی تھی اور راستے میں تھی۔ اس نے گل سے کہا۔

"میں دو گھنٹے بعد تمہارے پاس ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں صائمہ سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ تمہ

بلکہ پہلا کھانا ہم ساتھ ڈنر کریں گے۔''

''مجھے گیارہ بج سکتے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، لیٹ سہی۔''

شہلا پونے گیارہ تک آگئی تھی۔ صائمہ نے ان کے لیے چکن میکرونی تیار کی تھی۔ ان دونوں کو میکرونی پسند تھی۔ وہ اپنے باؤل لے کر لاؤنج میں صوفے پر آگئیں اور کھانے کے دوران گل نے شہلا کو اپنی کارگزاری سے آگاہ کیا۔ وہ متفکر ہوگئی۔ ''تمہیں یقین ہے رش کا ان دونوں سے کوئی تعلق رہا ہے؟''

''لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔ منصور کا بلاوجہ میری مدد پر آمادہ ہونا اور اس کے کہنے پر زویا کا اس ماڈل گرل کا مجھے ساتھ رکھنے اور شوبز میں مدد دینے پر آمادہ ہونا مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔''

''ضروری نہیں ہے معاملہ رش کا ہی ہو، انہیں تم سے کوئی اور مفاد بھی ہو سکتا ہے۔''

''اس کا تو اسی صورت میں پتا چلے گا جب میں وہاں جا کر رہوں گی۔''

شہلا نے گہری سانس لی۔ ''یعنی تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔''

''ہاں میں ایک چانس تو لوں گی۔''

''تو کب اس کے گھر شفٹ ہو رہی ہو، کیا نام بتایا تم نے ماڈل گرل کا؟''

''زویا نام ہے۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ تحقیق کی ہے۔ یہ تیسرے درجے کی ماڈل گرل ہے جو عام طور سے سیکنڈ ٹی وی کے اشتہارات میں کام کرتی ہے۔''

''نجی زندگی کیسی ہے؟''

''بہ ظاہر تو سلجھی ہوئی نظر آتی ہے مگر خود اسی کا کہنا ہے کہ آدمی خود پر خول چڑھا کر رکھتا ہے۔''

''اپنی حفاظت کا تم نے کیا سوچا ہے؟''

''تم جانتی ہو کہ میں کیسی ہوں اور میرا مقصد کیا ہے۔ اور میں نے سوچا ہے کہ ایک چھوٹا اور سادہ موبائل فون لے جاؤں گی اور اسے وہاں کہیں چھپا دوں گی تاکہ اگر میرے ساتھ کوئی سازش کی جائے اور مجھ سے موبائل چھین لیا جائے تب بھی میں رابطہ کر سکوں۔''

''میرا خیال ہے تمہیں کوئی ہتھیار ساتھ رکھنا چاہیے۔''

''میرے پاس پستول ہے لیکن میں رکھوں گی نہیں، تمہارے پاس چھوڑ کر جاؤں گی۔'' گل نے کہا۔ ''اگر کسی نے میرے پاس ہتھیار دیکھ لیا تو وہ چوکنا ہو سکتے ہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ مگر تم چوبیس گھنٹے میں لازمی دو بار مجھ سے فون یا ایس ایم ایس پر رابطہ کرو گی ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم خیریت سے نہیں ہو۔''

''او کے، میں دو بار لازمی رابطہ کروں گی۔'' گل نے اس سے وعدہ کیا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے کل اسے اپنی آمادگی سے آگاہ کر دوں گی اور پھر کل ہی اس کے گھر شفٹ ہو جاؤں گی۔''

''تم نے رش کے حوالے سے شوبزنس کا ہی کیوں سوچا؟ ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی اور حادثہ پیش آیا ہو؟''

''حویلی میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ رش شوبز میں دلچسپی رکھتی ہے اور وہ یہاں کام کرنا چاہتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بابا اسے کبھی اجازت نہیں دیں گے اس لیے وہ وہاں سے جھوٹ بول کر نکلی تھی مگر میں جانتی تھی کہ وہ کیوں جا رہی ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس کی تلاش شوبزنس سے متعلق لوگوں سے کی۔ اب تک مجھے کامیابی نہیں ملی ہے اور ہو سکتا ہے کہ کامیابی نہ ملے مگر میں کوشش ضرور کروں گی۔''

''تب میں دعا کروں گی کہ تمہیں ناکامی نصیب ہو کیونکہ کامیابی کی صورت میں خود تم خطرے میں پڑ جاؤ گی۔'' شہلا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم کسی مسئلے میں پڑیں تو میں اپنے طور پر جو ہو سکا ضرور کروں گی لیکن کوئی ایسا کام جو تم مجھ سے کروانا چاہو۔''

گل نے سر ہلایا۔ ''اگر میں بھی رش کی طرح غائب ہو جاؤں اور نہ ملوں تو تم حویلی کال کرکے بابا کو سب بتا دینا۔''

''میں بتا دوں گی۔''

''اب تم آرام کرو مسلسل کام اور سفر کرکے تھک گئی ہو گی۔''

☆☆☆

''میں نے بیڈ روم صاف کرا دیا ہے۔'' زویا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''مگر تمہیں کوئی کمی محسوس ہو تو بتا دینا۔''

''کوئی مسئلہ نہیں اگر ہوا تو میں خود صاف کر لوں گی۔''

''یہ الماری ہے اور اس کی چابیاں اس میں لگی ہیں۔ یہ کمرے کے لاک کی چابی ہے۔'' زویا نے خوب صورت کی چین میں لگی چابی اسے تھمائی۔ پھر واش روم دکھایا۔ گل کا سامان منصور اوپر تک پہنچا کر چلا گیا تھا۔ کمرا اور واش روم

دیکھ کر وہ سامان لے کر اندر آئی۔ جب وہ سامان رکھنے لگی تو زویا کمرے سے چلی گئی۔ گل نے اپنا سامان الماری میں سیٹ کیا۔ جب وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوئی تو اسے عجیب سا احساس ہوا جیسے یہاں اس کے لیے کچھ ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں جان سکی کہ اس کے لیے یہاں کچھ اچھا تھا یا اسے کوئی خطرہ لاحق تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ یہاں تک تو آگئی تھی۔ اب اسے معلوم کرنا تھا کہ منصور اور زویا ہی رمل کی گم شدگی کے ذمے دار تھے اور اگر ایسا ہی تھا تو انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟

گل کے ذہن میں ابھی کچھ واضح نہیں تھا کہ اسے یہاں کیا کرنا ہے۔ اس کے خیال میں انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی ہی بہتر تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے شہلا کو پہلا ایس ایم ایس کر دیا کہ وہ یہاں پہنچ گئی ہے۔ اس نے جس موبائل سے میسج کیا تھا، یہ چھوٹا سا اور استعمال میں آسان تھا۔ اس کی بیٹری بھی دیر تک چلتی تھی۔ مگر اس نے میسج کرکے موبائل آف کر دیا اس طرح بیٹری بہت زیادہ عرصے تک چل سکتی تھی۔ گل نے اسے الماری کے پیچھے موجود چھوٹے سے خلا میں ڈال دیا۔ اب کوئی آسانی سے اسے یہاں تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی، پھر زویا...... چائے لیے اندر آئی اور اسے مگ تھمایا۔ "تم چائے پیتی ہو؟ ویسے میں شام کی چائے پسند کرتی ہوں۔"

"ہاں باقاعدگی سے نہیں لیکن کبھی کبھی اور اگر اچھی بنی ہو۔"

"تم شوبز میں کیا کرنا چاہتی ہو؟" زویا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

گل نے شانے اچکائے۔ "ویری تھنگ، تم جانتی ہو یہاں آنے والی ہر لڑکی ٹاپ ماڈل بننا چاہتی ہے اور شہرت کی سیڑھی ٹی وی ہے۔"

زویا نے سر ہلایا۔ "تم یہ بھی جانتی ہوگی کہ اس شعبے میں کامیابی کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے، خاص طور سے ایک لڑکی کو۔"

زویا نے "بہت کچھ" اور "ایک لڑکی" پر بہت زور دیا تھا۔ گل نے سادگی سے کہا۔ "ظاہر ہے جب میں یہاں کام کرنے آئی ہوں تو مجھے معلوم ہے کہ یہاں کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔"

"بہت سی ایسی روایات اور چیزیں جنہیں ہم اہمیت دیتے ہیں، ان کی یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"میں سب سمجھتی ہوں اور تم فکر مت کرو میں کامیابی کے لیے سب کر گزرنے کو تیار ہوں۔" گل نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تمہاری فیملی میں پہلے کسی نے شوبز میں کام کیا ہے؟" زویا نے اچانک ہی پوچھا تو گل نے چونک کر اسے دیکھا اور کسی قدر رنجیدہ انداز میں بولی۔

"نہیں میں پہلی لڑکی ہوں جو اس فیلڈ میں آئی ہے ورنہ ہمارے خاندان میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

زویا کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ "اس ملک کی ٹاپ کلی بریٹیز عام طور سے ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو نام نہاد عزت رکھتے ہیں اور وہاں تصور بھی نہیں کیا جاتا ہے کہ ان کے گھر کی کوئی عورت شوبز کا رخ کرے گی۔"

گل نے سر ہلایا۔ "یہ ہماری معاشرتی منافقت کا منطقی نتیجہ ہے۔"

زویا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم مجھ سے متفق ہو؟"

"بالکل اس میں نہ ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم ٹی وی اسکرین پر دوسری لڑکیوں اور عورتوں کو بہت شوق سے دیکھتے ہیں مگر اپنی عورتوں کے لیے ہم پسند نہیں کرتے کہ وہ ٹی وی پر آئیں۔"

"اوہ، تو اسی وجہ سے شوبز میں آنا چاہتی ہو؟"

"نہیں مجھے شوق ہے اور مجھ میں ٹیلنٹ ہے۔" گل نے جواب دیا۔

"اپنے خاندان والوں کی مرضی سے آئی ہو؟"

گل مسکرانے لگی۔ "اگر خاندان والوں کی مرضی سے آئی ہوتی تو مجھے رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنی پڑتی۔ اسی شہر میں ذاتی بنگلا لے کر رہ سکتی تھی۔"

چائے کے بعد زویا نے رات کے کھانے پر اسے دعوت دی۔ "تم میرے گھر آئی ہو، آج میری مہمان ہو، ہم باہر ڈنر کریں گے۔"

گل مان گئی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ زویا نے اس سے کہا۔ "تم سات بجے تک تیار ہو جاؤ۔ میں شاور لینے جا رہی ہوں۔"

وہ سات بجے گھر سے نکلیں۔ زویا کے پاس ایک چھوٹی اور چند سال پرانی کار تھی مگر یہ خاصی اچھی حالت میں تھی۔ وہ نزدیک آنے جانے کے لیے ہی کار استعمال کرتی تھی۔ انہوں نے ایک اچھے ریستوران میں ڈنر کیا اور اس دوران میں دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے پس منظر کے

بارے میں بتایا۔ لیکن اس میں نصف سے زیادہ جھوٹ تھا کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے اپنا پس منظر چھپانا چاہتی تھیں۔ خاص طور سے گل نے سرے سے رٹل کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ ہی اپنے خاندان کے بارے میں مکمل کر بتایا۔ وہ بس مبہم انداز میں بتاتی رہی کہ اس کا تعلق ایک امیر اور دولت مند جاگیردار گھرانے سے ہے۔ اسی طرح زویا نے اپنے پس منظر سے شادی کا ذکر غائب کر دیا۔ البتہ اس نے ڈھکے چھپے انداز میں اعتراف کیا کہ اسے اوپر آنے اور پیسا کمانے کے لیے کچھ ایسے کام کرنے پڑے جو معاشرے اور مذہب میں معیوب اور گناہ سمجھے جاتے ہیں مگر یہ شوبز کا ایک لازمی حصہ ہیں۔

گل کو لگا کہ وہ اسے خبردار کر رہی ہے کہ اگر اسے اوپر جانا ہے تو اسے بھی یہ سب کرنا پڑے گا۔ جواب میں گل نے بھی جیسے اسے اطمینان دلایا کہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی ہے اور اسے کچھ کر گزرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہو گی۔ وہ چاہتی تھی کہ زویا اس کے سامنے کھل جائے۔ اس لیے اپنے مزاج کے برخلاف باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ گل اس کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو ان میں خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ دونوں تھک گئی تھیں۔ گل نے صبح سے خاصا سفر کیا تھا اور زویا بھی آج ایک شوٹ کرا کے آئی تھی۔ سونے سے پہلے دونوں نے چائے پی اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ گل نے شہلا کو مختصراً آج کی روداد سنائی پھر سونے کے لیے لیٹی تو اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے کا لاک کلک کی آواز کے ساتھ کھلا اور زویا کے ساتھ منصور اندر آیا تھا۔ گل بے خبر سو رہی تھی کیونکہ اس نے جو چائے پی تھی اس میں خواب آور دوا ملی ہوئی تھی۔ منصور نے ایک نظر محو خرام گل کو حسرت سے دیکھا۔ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد منصور ایک طرف دیوار پر لگے شوکیس کی طرف بڑھا۔ یہ بادبانی کشتی کا ماڈل تھا۔ منصور نے اسے اتارا اور اس کے اندر موجود چھوٹا سا اسپائی کیمرا نکال کر اسے کیبل کی مدد سے اپنے ٹیب سے منسلک کیا اور پھر اس کی وڈیو چلا کر دیکھنے لگا۔ یہ جدید ترین اسپائی کیمرا تھا جو یو ایس بی سے نہ صرف ڈیٹا لیتا اور دیتا تھا بلکہ یہ اسی کی مدد سے اپنی بیٹری بھی چارج کر لیتا تھا۔

چند منٹ میں وہ وڈیو میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں گل الماری کے پیچھے موبائل چھپا رہی تھی۔ زویا نے اس جگہ سے موبائل برآمد کیا اور اسے آن کر کے کال اور ایس ایم ایس کا ریکارڈ چیک کیا۔ مگر گل نے جو ایس ایم ایس کیے تھے وہ اس نے ڈیلیٹ کر دیے تھے اسی طرح شہلا نے اسے جوابی ایس ایم ایس کیے تھے اس نے وہ بھی ڈیلیٹ کر دیے تھے۔ موبائل کی فون بک بھی خالی تھی۔ انہیں مایوسی ہوئی۔ زویا نے کہا۔ "یہ تو کچھ نہیں ہوا۔"

"اس کا دوسرا موبائل دیکھو۔" منصور نے کہا تو زویا نے سرہانے سائیڈ دراز پر رکھا گل کا اسمارٹ فون اٹھایا اور اسے آن کرنا چاہا تو اس پر سیکورٹی کوڈ لگا ہوا تھا۔ زویا نے منصور کو دکھایا تو اس نے سر ہلایا۔ "یہ نارمل بات ہے لیکن اس کا یوں ایک اور موبائل چھپانا بتاتا ہے کہ دال میں کالا ہے اور یہ ہماری جاسوسی کے لیے آئی ہے۔"

زویا پریشان ہو گئی۔ "تب کیا کریں۔"

"ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے اور پریشان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔" منصور نے کہا۔ "موبائل بالکل اسی طرح واپس رکھ دو اور اسے آف کر دو۔"

زویا نے ایسا ہی کیا اس دوران میں منصور نے کیمرا ٹیب میں لگے رہنے دیا تاکہ اس کی کمزور ہونے والی بیٹری پھر سے چارج ہو جائے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے کیمرا واپس کشتی میں فٹ کیا اور اسے دیوار پر لگا دیا۔ وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح واپس چلے گئے۔ گل کو ان کی آمد کا ذرا بھی پتا نہیں چلا تھا۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی اور اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ یہ خواب آور دوا کی وجہ سے تھا۔ اس نے اٹھ کر شاور لیا تو اسے اپنی حالت بہتر محسوس ہوئی۔ سب ویسا ہی تھا جیسا رات اس نے سوتے وقت چھوڑا تھا اس لیے اسے شک نہیں ہوا کہ کوئی رات کو اندر آیا تھا۔ اس نے موبائل آن کیا تو اس میں شہلا کا ایس ایم ایس موجود تھا۔ جس وقت زویا موبائل کا بٹن دبا کر اسے آف کر رہی تھی اسی وقت ایس ایم ایس آیا تھا اور وہ دیکھ نہیں سکی۔ ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ کس سے رابطے میں ہے۔ اس نے شہلا کو ایس ایم ایس کیا تو اس کا فوری جواب آیا اور پھر اس نے پوچھا۔ "تم نے رات کو موبائل آن کیا تھا؟"

"نہیں، بس تمہیں ایس ایم ایس کیا اور اسے آف کر کے سو گئی تھی، مجھے بہت نیند آ رہی تھی۔"

"جب میں نے جواب دیا تو فوری ڈیلیوری رپورٹ نہیں آئی تھی مگر ایک گھنٹے بعد ڈیلیوری رپورٹ آ گئی۔ جبکہ موبائل آن نہیں تھا تو رپورٹ کیسے آ گئی۔"

گل سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے ایس ایم ایس کیا۔ "کل رات میں بہت تھک گئی تھی مگر مجھے ایک اجنبی جگہ اتی

آسانی سے نیند نہیں آنی چاہیے تھی۔ میں بس بستر پر لیٹی اور منٹ سے بھی پہلے سو گئی تھی اور صبح تک میری آنکھ ذرا بھی نہیں کھلی۔ اٹھنے کے بعد سر بھاری تھا۔"

"رات سونے سے پہلے تم نے کچھ کھایا پیا تھا؟"

"چائے پی تھی جو زویا نے بنائی تھی۔"

شہلا نے فکر مند چہرے کا سائن بنا کر لکھا۔ "گل مجھے فکر ہو رہی ہے، کہیں ان لوگوں کو شک نہ ہو گیا ہو۔"

"میں کمرا لاک کرکے سوئی تھی۔"

"اس کے پاس اضافی چابی ہوگی۔"

"بالکل ہو سکتی ہے اور اندر کوئی چٹخنی بھی نہیں ہے۔"

اب شہلا زیادہ فکر مند ہو گئی۔ "پلیز گل وہاں سے نکل آؤ خود کو یوں خطرے میں مت ڈالو۔"

"میں نے خود کو خطرے میں ڈال لیا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم ہوشیار رہنا اب میں ہر چند گھنٹے بعد ایس ایم ایس کروں گی۔"

اس نے موبائل میں موجود تمام ڈیٹا ڈیلیٹ کیا اور اسے آف کرکے دوسری جگہ چھپایا۔ وہ باہر آئی۔ زویا لاؤنج میں موجود تھی اور اس نے نائٹ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے گل سے کہا۔ "فریج میں انڈے ڈبل روٹی اور مارجرین ہے۔ تم ناشتا بنا لو۔"

"نہیں میں صرف چائے لوں گی، سر بھاری ہو رہا ہے۔"

"رات شاید ٹھیک سے نیند نہیں آئی ہوگی۔"

"نہیں سوئی تو بے خبر تھی کہ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔" گل نے کیتلی میں پانی رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر رات کوئی کمرے میں آ جاتا تب بھی مجھے علم نہ ہوتا۔"

زویا نے چونک کر اسے دیکھا مگر وہ بے نیازی سے چائے بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "تم چائے پیو گی؟"

"نہیں میں نے ناشتا کر لیا ہے۔"

گل چائے بنا کر اس کے سامنے آ بیٹھی۔ "ابھی باہر آتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میرے کمرے میں اندر کی طرف کوئی چٹخنی نہیں ہے صرف ہینڈل لاک ہے۔"

"تم خود کو غیر محفوظ سمجھ رہی ہو؟"

گل نے شانے اچکائے۔ "نہیں ایک اجنبی جگہ آئی ہوں تو قدرتی طور پر خیال آتا ہے، کیا تمہارے کمرے میں بھی اندر چٹخنی نہیں ہے؟"

"میرے کمرے میں ہے اور دوسرے دروازوں پر بھی ہے۔ اس پر بھی تھی لیکن شاید پھر خراب ہوئی یا کوئی مسئلہ ہوا تھا تو نکال دی تھی اور دوبارہ لگائی نہیں۔ ویسے بھی یہاں کوئی رہتا نہیں۔"

"کوئی بات نہیں، میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔ تم ٹینشن مت لو۔"

"میں ہر بات کی ٹینشن لیتی بھی نہیں ہوں۔" زویا نے سرد لہجے میں کہا۔ گل خاموش ہو کر چائے پینے لگی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

"شاید تمہاری کوئی جاننے والی اس کمرے میں رہتی رہی ہے۔"

"شاید مہینوں گزر گئے یہاں کوئی نہیں آیا مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ڈریسنگ ٹیبل پر کچھ بال پڑے تھے۔ لائٹ گرے اور لمبے بال تھے۔"

"یہ ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ اس دوران میں اس کمرے کی کئی بار صفائی ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے اپنے بال ہوں گے۔ تمہارے بال بھی تو اسی رنگ کے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے مگر میں نے برش نہیں کیا تھا اس لیے مجھے لگا کہ یہ میرے بال نہیں ہیں۔" گل نے سوچتے ہوئے کہا۔ زویا کے بے ساختہ جواب پر اس نے سوچا کہ کس کے بعد کمرے کی کئی بار صفائی ہو چکی ہے؟ "اچھی وے، یہ بتاؤ کہ مجھے کیا شیئر کرنا ہوگا؟"

"یوٹیلٹی بلز اور یونین چارجز میں شیئر کرنا ہوگا۔ کھانے کا میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ تم چاہو تو اپنی چیزیں لا لے آؤ یا پھر باہر سے کال کرکے بھی منگوا سکتی ہے۔ یہاں سب ملتا ہے۔"

گل نے دیکھ لیا تھا کہ کچن میں سب کچھ ہے مگر اس کا ارادہ اتنے لمبے عرصے رہنے کا نہیں تھا اس لیے اس نے باہر سے منگوانے والا آپشن اختیار کیا۔ اس نے زویا سے کہا۔ "میں باہر سے منگواؤں گی اور تمہارے پاس صفائی کرنے کا سامان ہے، میں اپنے کمرے کی صفائی کرنا چاہتی ہوں۔"

"بالکل ہے۔"

جب تک گل نے چائے کے برتن دھو کر رکھے زویا صفائی کا سامان لے آئی۔ اس سے بات کرتے ہوئے جب گل نے جان بوجھ کر بالوں کا ذکر کیا تو اسے خیال آیا کہ اسے صفائی کرکے دیکھنا چاہیے۔ ممکن ہے اسے رئل کے حوالے سے کوئی سراغ ملے۔ ایک کمرے میں رہنے والے کی درجنوں ذاتی چیزیں سامان میں غائب ہو جاتی ہیں۔

کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور صفائی کرنے لگی۔ وہ ایسی جگہوں کی صفائی بھی کر رہی تھی جو بہ ظاہر چھپی ہوئی تھیں۔ جیسے الماری کا نچلا حصہ جس میں خلا تھا۔ اسی طرح بیڈ کی سائڈ درازوں کے نیچے بھی صفائی کی۔ پہلی دراز کے نیچے سے کچھ نہیں نکلا مگر جب دوسری دراز کے نیچے برش مار رہی تھی تو اسے لگا کہ اس کے نیچے کچھ ہے۔

اس نے اس چیز کو نکالنے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے نیچے سے لکڑی کا بنا ہوا سیاہ موتی برآمد کیا۔ موتی دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں رہ گئی کیونکہ لکڑی سے بنی سیاہ موتیوں کی یہ مالا خود اس نے رمل کو سالگرہ پر گفٹ کی تھی۔ اب شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ رمل یہاں ٹھہری تھی۔ گل نے موتی احتیاط سے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اب اسے معلوم کرنا تھا کہ اس کی بہن کے ساتھ کیا ہوا، اگر وہ زندہ تھی تو کہاں تھی اور مر چکی تھی تو اس کی لاش کہاں تھی اور اس کی موت کن حالات میں واقع ہوئی، اس کا ذمے دار کون تھا؟ اس نے محسوس کیا کہ صرف ایس ایم ایس سے کام نہیں چلے گا اسے خود جا کر شہلا سے مشورہ لینا چاہیے۔ وہ تیار ہو کر باہر آئی تو زویا نے پوچھا۔

''کہیں جا رہی ہو؟''

''ہاں مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔'' گل نے بہانہ بنایا۔

''منصور کو بلایا ہے؟''

''نہیں، میں خود چلی جاؤں گی۔'' گل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اوکے بائے۔''

جیسے ہی وہ گھر سے نکلی زویا نے موبائل اٹھایا اور منصور کو کال کی۔ ''وہ اچانک کہیں گئی ہے۔ شاپنگ کا کہہ رہی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے کچھ اور چکر ہے۔''

''میں آ رہا ہوں۔'' منصور نے کہا اور کال کاٹ دی۔ وہ بیس منٹ بعد اپارٹمنٹ میں تھا اور اس نے آتے ہی گملے میں چھپا ہوا کیمرا نکال کر اسے اپنے موبائل سے منسلک کیا اور جب ویڈیو اس حصے تک پہنچی جہاں گل نے صفائی کرتے ہوئے دراز کے نیچے سے سیاہ موتی نکالا تو وہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ زویا نے منصور کی طرف دیکھا۔

''وہ جان گئی ہے۔ اس کی سیاہ مالا میرے سامنے ٹوٹی تھی اور وہ افسوس کر رہی تھی کہ یہ اس کی بہن کا تحفہ تھا اس نے موتی سمیٹ لیے تھے۔''

''صرف ایک موتی سے وہ جان جائے گی؟''

زویا نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''ذرا اس کے تاثرات دیکھو اور اس کا انداز دیکھو۔ یہ دیکھو وہ موتی اپنے پرس میں رکھ رہی ہے، آخر کیوں؟'' کہتے ہوئے زویا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''منصور وہ جان گئی ہے کہ رمل یہاں آئی تھی۔ اب کیا ہوگا؟''

منصور کے چہرے پر سفاک تاثرات نمودار ہوئے۔

''وہی جو ہم چاہیں گے۔''

زویا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ کسی کے رابطے میں ہے یعنی کوئی جانتا ہے کہ وہ یہاں ہے۔''

''تم صرف ایک موبائل کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو؟''

''ہاں ہم نے خود دیکھا کہ وہ کسی کو میسج کر رہی تھی اور پھر اس کے موبائل میں میسج فولڈرز خالی پائے گئے۔ اسے کیا ضرورت تھی یوں موبائل چھپا کر رکھنے اور میسجز ڈیلیٹ کرنے کی۔''

وہ دونوں جیسے جیسے بحث کر رہے تھے۔ ان کے شبہات بڑھ رہے تھے کہ گل سب جان گئی ہے۔ اب اسے مزید چھوٹ دینا ان کے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ زویا رونے والی ہو رہی تھی، اس نے الزام دینے کے انداز میں کہا۔ ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' منصور نے اسے جھڑکا۔ ''یہ اسی وجہ سے معلوم ہوا کہ ہم اسے یہاں لے آئے۔''

''اور اس نے یہاں آ کر اپنی بہن کی مالا کا موتی تلاش کر لیا۔'' زویا کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

''یہ بھی تمہاری حماقت تھی۔ کمرے کی مکمل صفائی کرنی چاہیے تھی۔ صرف سامنے سے صاف کر دینا کافی نہیں تھا۔''

کچھ دیر وہ دونوں جھگڑتے رہے پھر زویا نے کہا۔ ''خدا کے لیے اس مسئلے کا حل تلاش کرو۔''

''حل میں نے بتا دیا ہے۔'' منصور کا لہجہ سرد تھا۔

''اس کے بعد اس کی تلاش میں کوئی اور آئے گا۔ تم جانتے ہو یہ کتنا دولت مند اور طاقتور خاندان ہے۔ اس کے اشارے پر ہم پولیس اسٹیشن میں ہوں گے اور وہاں چند گھنٹوں میں سب اگل چکے ہوں گے۔''

''اگر ہم نے کچھ نہ کیا تب بھی یہی ہوگا۔'' منصور نے اسے خبردار کیا۔ ''اس لیے بہتر ہے جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو اور اسی میں ہماری نجات ہے۔''

کسی قدر بحث کے بعد وہ ایک لائحہ عمل پر متفق ہو گئے۔ زویا کی حالت بری تھی مگر وہ منصور کا ساتھ دینے پر

مجبور تھی۔ اس نے پوچھا۔ "ہم اسے تلاش کیسے کریں گے؟"
"بہت آسانی سے۔" منصور نے کہا۔ "تم میرے ساتھ رہو اور دیکھتی جاؤ۔"

☆☆☆

گل باہر آئی اور ایک ٹیکسی روکی اور اسے شہلا کے گھر کا پتا بتایا۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ شہلا تو اس وقت آفس میں ہوگی۔ اس نے ٹیکسی والے کو اس کے دفتر کا پتا بتا کر اس طرف چلنے کو کہا۔ راستے میں گل نے شہلا کو کال کی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ پھر اس کا میسج آیا کہ وہ میٹنگ میں ہے۔ گل نے جوابی میسج میں بتایا کہ وہ ایمرجنسی میں اس سے ملنے دفتر آ رہی ہے۔ شہلا نے کہا کہ وہ اس کے دفتر میں انتظار کرے وہ اس وقت دفتر میں نہیں ہے بلکہ ایک اور سرکاری دفتر میں ہونے والی میٹنگ میں شریک ہے۔ گل اس کے دفتر پہنچی اور وہاں ویٹنگ روم میں انتظار کرنے لگی۔
وہ سوچ رہی تھی کہ کیا صرف ایک موبائل کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اس پر زویا اور منصور کے خلاف کوئی کارروائی ہو سکتی ہے۔
وہ قانون کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی اسی لیے اسے شہلا سے مشورے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے انتظار کرتے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو گئے تھے۔ شہلا کا میسج آیا کہ اسے دیر ہو سکتی ہے۔ اگر وہ انتظار کر سکتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ بعد میں ملے گی۔ گل نے اسے میسج کیا کہ وہ انتظار کر رہی ہے۔ اس نے صبح ناشتا نہیں کیا تھا اور پھر تھوڑا بہت کام بھی کیا تھا تو اسے بھوک لگنے لگی تھی۔ اس نے سوچا کہ شہلا کے آنے میں دیر ہے کیوں نہ وہ آس پاس کہیں لنچ کر لے۔ ایک بجنے میں دس منٹ تھے اور لنچ کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ یہ سرکاری اور نجی دفاتر والا علاقہ تھا اور یہاں پر کئی اچھے ریستوران اور ہوٹل تھے۔ وہ باہر آئی اور سڑک کراس کر کے ایک ریستوران کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک وائٹ کیب آ کر اس کے پاس رکی، اس کا عقبی دروازہ کھلا اور زویا نے اتر کر کوئی چیز اس کے پہلو سے لگا دی۔
"چلو اندر بیٹھو۔"
یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ ساکت کھڑی تھی کہ منصور بھی اتر کر آ گیا۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "اندر بیٹھو ورنہ ماری جاؤ گی۔"
"یہ ایسے نہیں مانے گی۔" زویا نے دروازہ کھولا۔ "اسے اندر دھکا دو۔"
اس وقت سڑک پر زیادہ رش نہیں تھا اور خاص طور سے پیدل چلنے والے بہت کم تھے اس لیے کسی نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی تو نظرانداز کر دیا۔ آج کل کے حالات میں کوئی پرائے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑاتا ہے۔ منصور جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ وہ خود گاڑی میں آ گئی۔ منصور نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ گل نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا ہے، تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"
"خاموش بیٹھو۔" زویا نے اب پستول نکال لیا تھا جو اس نے دوپٹے تلے چھپا رکھا تھا۔
"تم لوگ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" گل نے انجان بننے کی کوشش کی۔ "کیا مجھے لوٹنا چاہتے ہو؟"
"اتنی بھولی مت بنو۔" منصور نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"تم جان گئی ہو کہ رزل ہمارے ہاں آئی تھی۔" زویا نے مکمل کر کیا۔ "ہمیں معلوم ہو گیا ہے تم اس کی بہن گل ہو۔"
"یہ غلط ہے۔" گل بولی تو منصور ہنسا۔
"ذرا اس کا پرس دیکھنا۔ اس میں اس کی دستاویزات ہوں گی۔"
گل نے ہتھیار ڈال دیے۔ "اوکے میں مانتی ہوں کہ میں گل ہوں اور رزل میری بہن ہے۔"
"اس کا پرس لے لو اور اس کی تلاشی لو، اس نے کوئی اور موبائل نہ چھپا رکھا ہو۔"
زویا نے اس کا پرس قبضے میں لے لیا اور اس کا جسم ٹٹول کر اس کی تلاشی لی۔ "اس کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"
"تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" گل نے پوچھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کیب شہر سے باہر کی طرف جا رہی تھی۔
"اپنی بہن سے نہیں ملو گی۔" منصور نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔
"رزل۔" گل بے چین ہو گئی۔ "وہ کہاں ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"
"وہ بالکل ٹھیک ہے اور تم بھی ٹھیک رہو گی۔" منصور نے کہا تو گل کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ نہ جانے کیوں اسے لگا کہ منصور کے الفاظ کا بظاہر وہ مطلب نہیں تھا جو اس نے کہے تھے۔ کیب اب شہر سے باہر دریا کی طرف جا رہی تھی۔ اس سڑک پر آبادی اور ٹریفک دونوں بہت کم تھے۔ جیسے جیسے وہ ویرانے کی طرف جا رہے تھے گل کا دل ڈوبتا جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ نہ بچ سکے۔ بالآخر

قریب دریا کے ڈھلان سے ذرا اوپر ایک ہٹ کے سامنے رکی۔ منصور نیچے اترا اور عقبی دروازہ کھول کر گل کو کھینچ کر نیچے اتارا۔ گل نے اپنا بازو چھڑا لیا۔

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔"

منصور نے حسرت سے اسے دیکھا۔ "کاش کہ ہمارے پاس کچھ وقت ہوتا تو تمہارے ساتھ اچھا وقت گزرتا۔"

گل کا چہرہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر سرخ ہو گیا۔ اس نے دل ہی دل میں اس شخص کو بے نقط سنائیں۔ زویا اسے پستول سے کور کیے کھڑی تھی اور منصور نے ہٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ اسے اندر لائے۔ ہٹ بڑا نہیں تھا، یہ ایک کمرے اور ایک لاؤنج پر مشتمل تھا اور اندر سے یوں صاف ستھرا تھا جیسے اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال ہوتی رہی ہو۔ منصور اصل میں یہیں رہتا تھا۔ یہ اس کے ایک واقف کار کا ہٹ تھا جو خود بیرون ملک تھا اور اس نے ہٹ منصور کے حوالے کیا ہوا تھا۔ لاؤنج میں جست کا ایک کسی قدر بڑا ٹرنک رکھا تھا۔ یہ تین فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور ڈیڑھ فٹ اونچا تھا۔ زویا نے گل کو ٹوٹے ہوئے صوفے پر بٹھا دیا۔ اس نے پستول منصور کے حوالے کیا اور خود فریج سے بوتل نکال کر گلاس میں پانی ڈالا اور پی لی۔ وہ بوتل رکھ رہی تھی کہ منصور نے کہا۔ "اسے بھی پانی دو، اسے ضرورت ہے۔"

زویا نے ہاتھ بڑھا کر بوتل اٹھائی لیکن اس بار اس نے دوسری بوتل اٹھائی اور اس سے گلاس میں پانی ڈال کر گل کے پاس لائی۔ سچ گل کا گلا خشک ہو رہا تھا اس لیے اس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ منصور ایک طرف کرسی پر الٹا ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ زویا اس کے پاس میز پر ٹک گئی۔ منصور نے کہا۔ "تو مس گل تمہارے پاس اب چند منٹ ہیں کیونکہ تم نے ایک مہلک زہر پی لیا ہے اور تمہارے بچنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس سے پہلے تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہارے بہن کے ساتھ کیا ہوا۔"

☆☆☆

رنم عادل کے گھر سے نکلی تو اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ نقاب سے یہ زردی کسی کو نظر نہیں آئی مگر اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ واضح تھی۔ وہ گلی کے سرے تک آئی جہاں زویا عبایا اور نقاب میں منصور کی گاڑی میں موجود تھی۔ رنم بھی گاڑی میں آئی اور منصور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ زویا نے پوچھا۔ "کام ہو گیا نا؟"

"نہیں۔" رنم نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میری ہمت نہیں ہوئی۔"

منصور اور زویا اچھل پڑے۔ زویا نے بے ساختہ کہا۔

"تم نے اسے زہر نہیں دیا۔"

اب بار رنم اچھل پڑی۔ "وہ زہر تھا۔ خدا کا شکر ہے میں نے ہاتھ مار کر اس کی کولڈ ڈرنک گرا دی۔ مگر تم نے تو کہا تھا اس میں ایسی دوا ہے جو وقتی طور پر انسان کو پاگل بنا دیتی ہے۔"

زویا نے رنم سے جھوٹ بولا تھا کہ اگر وہ چاہتی ہے کہ اس کی اور عادل کی تصویر عدالت اور میڈیا میں نہ پیش کی جائے تو وہ اس کا ساتھ دے اور عادل کو ایک دوا دے جس سے اس کا دماغی توازن عارضی طور پر خراب ہو جائے گا اور یوں زویا کے پاس جواز ہوگا کہ وہ اس سے خلع لے سکے۔ رنم کو معاملہ مشکوک لگ رہا تھا مگر وہ مروت میں پہلے ہی زویا کا ساتھ دے کر پھنس چکی تھی۔ زویا نے ڈھکے چھپے انداز میں اسے جتا دیا تھا کہ اگر اس نے ساتھ نہ دیا تو وہ عادل کے ساتھ اسے ملوث کر کے ایسے افسانے بھی بنا سکتی اور میڈیا میں پیش کر سکتی ہے جس کے بعد رنم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ رنم تیار ہو گئی مگر اس کی چھٹی حس اشارہ کر رہی تھی کہ اسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے عین اس وقت جب عادل کولڈ ڈرنک کا گلاس منہ سے لگانے والا تھا ہاتھ مار کر گلاس نیچے گرا دیا۔ کولڈ ڈرنک قالین میں جذب ہو گئی۔ عادل نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"یہ کیا...؟"

"وہ آپ کے گلاس میں کیڑا تیر رہا تھا۔ میں نے بروقت دیکھ لیا۔" گل بولی۔ "ورنہ آپ پی جاتے۔"

عادل کو یقین نہیں آیا تھا مگر اس نے اخلاقاً کچھ کہنے سے گریز کیا اور پھر رنم وہاں سے نکل آئی۔ اب وہ زویا اور منصور کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہی تھی۔ زویا نے نفرت سے کہا۔ "کتیا، میرا منصوبہ ناکام بنا کر سمجھتی ہے کہ تو بچ جائے گی۔"

منصور نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا اور اب تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔"

"کیسا نتیجہ؟" رنم تیز لہجے میں بولی۔ "گاڑی روکو اور مجھے اتار دو، اب میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہارا جو دل چاہے کرتے رہو۔"

"ضرور۔" منصور نے گاڑی بائی وے سے نیچے میں اتار لی۔ یہ جگہ ویران تھی اور آس پاس کوئی انسان یا آبادی نہیں تھی۔

"یہاں کیوں رکے ہو؟" زویا نے پوچھا۔

"آتا ہوں۔" منصور نے کہا اور اتر کر پچھلی دروازہ کھولا اور اندر آتے ہوئے رِنل کو دبوچ کر سیٹ پر گرا دیا۔ وہ چلانے اور مزاحمت کرنے لگی۔ منصور نے اسے قابو کرتے ہوئے زویا کو حکم دیا۔ "اس کے پرس سے زہر کی شیشی نکال کر اس کے منہ میں ڈال دو۔"

یہ سنتے ہی رِنل نے منہ بند کر لیا مگر منصور نے زبردستی اس کا منہ کھولا اور زویا نے کانپتے ہاتھوں سے زہر کی شیشی اس کے منہ میں خالی کر دی۔ رِنل نے پوری کوشش کی کہ زہر اس کے منہ میں نہ جائے مگر وہ ان لوگوں کو روک نہ سکی۔ جیسے ہی زویا نے شیشی خالی کی، منصور نے رِنل کا منہ ہاتھ سے دبا کر بند کیا اور پھر اس کی ناک پکڑ لی۔ ایک منٹ میں منہ میں موجود تمام زہر رِنل کے پیٹ میں اتر چکا تھا اور اس کا فوری ردعمل سامنے آنے لگا۔ اس کا جسم شدت کرب سے بل کھا رہا تھا۔ زویا نیچے اتر گئی۔ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ اس نے اترتے ہی قے کر دی۔ منصور اندر اس وقت تک رِنل کو دبوچ کر بیٹھا رہا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہو گئی۔ منصور نے رِنل کو اسی حالت میں اٹھا کر گاڑی کی ڈکی میں ڈالا۔ جب وہ روانہ ہوئے تو زویا نے کہا۔ "یہ مر جائے گی؟"

"بالکل، یہ بہت زود اثر زہر ہے۔"

"مگر تم نے ایسا کیوں کیا، اسے جانے دیتے۔"

"تاکہ وہ بعد میں سب کو بتاتی پھرتی کہ تم نے اسے اپنے شوہر کو زہر دینے کے لیے بھیجا تھا۔" منصور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم نے بے احتیاطی سے بات کر کے اس کی موت کے پروانے پر دستخط کیے ہیں۔ اصل ذمے دار تم ہو۔"

زویا کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اس نے پوچھا۔ "اس کی لاش کا کیا کرنا ہے؟"

"مجھے سوچنے دو۔" منصور بولا۔ وہ واپس شہر تک پہنچے۔ خوش قسمتی سے راستے میں کہیں چیکنگ نہیں ہو رہی تھی ورنہ وہ... پھنس جاتے۔ شہر پہنچ کر منصور نے ایک پرانی اشیا کی مارکیٹ کا رخ کیا اور وہاں سے استعمال کیا ہوا مگر ایک بڑا اور مضبوط سوٹ کیس لیا۔ پھر وہ ایک ویران جگہ آ گئے۔ یہاں انہوں نے رِنل کی لاش ڈکی سے نکالی۔ اس کے تمام کپڑے اتارے اور پھر لاش کو سوٹ کیس میں ٹھونس دیا۔ منصور نے سوٹ کیس بند کر کے اسے لاک لگایا اور زویا سے کہا۔ "اسے نے جا کر ٹرین میں بک کرانا ہوگا۔"

وہ اچھل پڑی۔ ”ٹرین بلٹی اور وہاں کسی نے کھول لیا تو؟“

”کوئی نہیں کھولے گا۔“

زویا تیار نہیں تھی۔ مگر منصور اسے لے گیا۔ اس نے زویا سے کہا۔ ”یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے اور ہم دونوں کو اس سے نمٹنا ہے۔“

مجبوراً زویا اس کے ساتھ اسٹیشن گئی۔ وہاں منصور نے ایک نجی کارگو کمپنی میں فرضی نام سے سوٹ کیس بک کرایا۔ رقم ادا کر کے اس نے سوٹ کیس کمپنی کے حوالے کیا اور وہاں سے نکل آیا۔ راستے میں اس نے زویا سے کہا۔ ”اب یہ سوٹ کیس منزل پر پہنچ کر کھلے گا اور تب تک لاش گل سڑ کر نا قابلِ شناخت ہو جائے گی اور اسے کبھی رش شاہ کی حیثیت سے شناخت نہیں کیا جا سکے گا۔ اس لیے کسی کا خیال ہماری طرف بھی نہیں جائے گا۔“

زویا منصور کی ذہانت کی قائل ہو گئی۔ تقریباً دس دن بعد رش کی لاش ایک دور دراز شہر میں برآمد ہوئی۔ جہاں کے لیے منصور نے سوٹ کیس بلٹی کرایا تھا۔ کمپنی کی غلطی سے سوٹ کیس کا اسٹیکر غائب ہو گیا اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسے کس شہر سے بھیجا گیا تھا۔ کچھ دن بعد پولیس کی جانب سے لاش کو لاوارث قرار دے کر دفنا دیا گیا اور اخبارات یا میڈیا میں بھی اس کا زیادہ چرچا نہیں ہوا تھا۔ اس نے معاملہ ان کی توقع سے زیادہ آسانی سے ختم ہو گیا۔ مگر اس کے بعد زویا منصور سے کترانے لگی تھی۔ وہ کئی بار کہتا تو اس سے ایک بار ملتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جلد دونوں کی راہیں الگ ہوں گی۔ پھر گل آ گئی اور اس کی وجہ سے زویا دوبارہ منصور پر انحصار پر مجبور ہوئی تھی۔ منصور نے زویا سے کہا کہ گل کے ساتھ وہی کرنا ہے جو اس کی بہن کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے پاس اس زہر کی کچھ مقدار بچی ہوئی تھی اور وہ اس نے لا کر زویا کو دی۔ زویا نے پہلے سے پانی میں زہر ملا کر رکھا ہوا تھا اور جب گل ان کے ساتھ بحث میں آ گئی تو اسے اسی بوتل سے پانی دیا۔

☆☆☆

گل کی نظریں دھندلا رہی تھیں اور اسے لگ رہا تھا کہ کوئی چیز اس کے اندر کاٹ رہی ہے۔ یہ زہر کا اثر تھا جو اسے دیا جا چکا تھا۔ منصور اور زویا نے دیدہ دلیری سے اس کے سامنے اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ”تم بچو گے نہیں، کچھ لوگ جانتے ہیں کہ میں کہاں ہوں؟“

”بے شک جانتے ہوں گے لیکن وہ ثابت نہیں کر سکیں گے کہ تم زویا کے فلیٹ میں رہائش پذیر تھیں۔ زویا بتائے گی کہ تم ایک دن بعد ہی اپنا سامان لے کر کہیں چلی گئی تھیں۔“ منصور نے کہا۔

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ گل بولی اور پھر بے ہوش ہو کر صوفے پر لڑھک گئی۔ زویا نے فکرمندی سے کہا۔

”اس نے نہ جانے کن لوگوں کو اور کیا کیا بتایا ہوا ہے؟“

”دیکھا جائے گا۔“ منصور سخت لہجے میں بولا۔ ”پہلے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔“

”کیا اسے بھی بلٹی کراؤ گے؟“

”ہاں۔“ منصور ٹرنک کھینچ کر لے آیا۔ ”مگر اس بار ٹرین سے نہیں بلکہ دریا سے بلٹی کرانی ہے۔ شاید اس کی لاش سمندر میں جا کر نکلے۔“

زویا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”اس وقت دریا میں پانی زوروں پر ہے اور ہم یہ ٹرنک لے جا کر دریا میں بہا دیں تو یہ نہ جانے کتنی دور جا کر نکلے یا پھر ہمیشہ کے لیے دریا کی تہ میں بیٹھ جائے۔“

منصور نے گل کو اٹھا کر ٹرنک میں ڈالا۔ ٹرنک خاصا بڑا تھا، وہ آرام سے اس میں آ گئی۔ اس کا ڈھکن بند کر کے منصور نے اس پر تالا لگایا اور پھر زویا سے کہا۔ ”اسے میرے ساتھ اٹھاؤ۔“

”دریا تک۔“ وہ بدکی۔ ”اتنی دور کیسے لے جائیں گے؟“

”دریا تک نہیں اسے گاڑی تک لے جانا ہے۔“ منصور نے کہا۔ اس نے زویا کے ساتھ مل کر ٹرنک اٹھایا اور اسے کیب تک لایا۔ اس کی ڈکی سامان رکھنے کے لیے خاص طور سے کشادہ بنائی گئی تھی جس میں ٹرنک آسانی سے آ گیا۔ پکی سڑک خاصی پیچھے رہ گئی تھی لیکن یہاں کچے میں جگہ جگہ دریا کی طرف جانے والے راستے تھے۔ منصور ایسے ہی ایک راستے سے کیب کو دریا تک لے جانے لگا۔ اس نے دریا کے ممکن حد تک قریب لے جا کر کیب روکی اور نیچے اترتے ہوئے زویا سے کہا۔ ”میری مدد کرو اسے دریا تک لے جانے میں۔“

☆☆☆

زہر کا انکشاف ہونے کے بعد گل کو لگا کہ اس کے اندر کچھ کٹ رہا ہے اور تکلیف ہو رہی تھی۔ پھر وہ صوفے پر لڑھک گئی مگر وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم بے حس ہو رہا تھا اور ذہن جاگ رہا تھا۔ وہ منصور اور زویا کی باتیں

سُن رہی تھی اور یہ انکشاف سن کر اس کی روح کانپ اٹھی کہ وہ اسے دریا برد کرنے لے جا رہے تھے۔ یہ ظلم در ظلم تھا۔ انہوں نے پہلے اسے زہر دیا اور اب اس کی لاش یا زندہ ہی دریا میں پھینکنے کی بات کر رہے تھے۔ رل کی طرح اس کا نام و نشان بھی مٹ جاتا اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ اپنی بہن کی طرح کہاں گئی؟ منصور نے اسے اٹھا کر ٹرنک میں ڈالا۔ گل نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ زہر نے اسے سُن کر دیا تھا۔ ٹرنک میں ڈال کر اسے بند کر دیا اور پھر تالا بھی لگا دیا تھا۔ گل کو یہاں گھٹن محسوس ہوئی تھی مگر وہ سانس لے رہی تھی۔

ٹرنک میں ہوا کی خاصی مقدار تھی اور کیونکہ ٹرنک پرانا تھا اس لیے اس کا ڈھکن بھی پوری طرح بند ہو کر سیل نہیں ہوا تھا۔ اس کے معمولی رخنوں سے بھی کچھ ہوا اندر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ٹرنک اٹھا کر کیب کی ڈکی میں رکھا گیا۔ اب تک گل کا جسم سن ہوا تھا مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد ذہن بھی سُن ہونے لگا۔ وہ اس کیفیت سے لڑنے لگی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بار بے ہوش ہو گئی تو پھر کبھی ہوش میں نہیں آ سکے گی اور اس کی یہ بے ہوشی موت میں بدل جائے گی۔ کیب بچے راستے پر دھچکے لیتی جا رہی تھی۔ ٹرنک اپنی جگہ جما ہوا تھا اور وہ اس میں ڈھلک رہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر کیب چلتی رہی اور پھر ایک جگہ رکی۔ ایک منٹ بعد ڈکی کھلی اور ٹرنک ڈکی سے نکال کر بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا گیا۔ جھٹکے سے گل کے ذہن پر غشی چھانے لگی۔ اسے لگا وہ بے ہوش ہو رہی ہے۔ پھر اس نے منصور کی آواز سنی۔ ”میری مدد کرو، اسے دریا تک لے جانے میں۔“

☆☆☆

گل کا ذہن جاگا تو اسے لگا کہ وہ سکون کی کیفیت میں ہے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے دم گھٹنے اور اندر سے جو کاٹنے والی تکلیف تھی اب اس کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے پہلا خیال یہی آیا کہ وہ مر چکی ہے اور اب دنیا کی کوئی تکلیف باقی نہیں رہی ہے۔ مگر وہ سانس لے رہی تھی اور کوئی چیز اس کی ناک سے لگی تھی۔ گل نے چونک کر آنکھ کھولی تو وہ ایک سفید دیواروں والے کمرے میں تھی اور سفید رنگ کے بستر پر نیلے کپڑوں میں ملبوس لیٹی تھی۔ یہ اسپتال کا مخصوص لباس تھا۔ سائڈ میں رکھے اسٹینڈ سے ڈرپ کی بوتل لٹک رہی تھی اور قطرہ قطرہ ڈرپ اس کے ہاتھ سے لگے کینولا سے گزر کر اس کے جسم میں جا رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ اسے یہ جان کر تعجب ہوا تھا۔ اسے زہر دیا گیا تھا اور پھر اسے دریا میں ڈبونے کے لیے لے جایا گیا تھا۔ آخری بات یہی تھی کہ وہ دریا کے کنارے ٹرنک میں بند پڑی تھی۔ پھر اسے کیسے بچایا گیا؟ نزدیک ہی ایک سرخ بٹن لگا ہوا تھا۔ گل نے اسے دبایا تو کچھ ہی دیر بعد ایک نرس اندر آئی۔ اس نے گل کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

”شکر ہے آپ ہوش میں آ گئیں، اب کیسا فیل کر رہی ہیں۔“

”بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“

”کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں لیکن پہلے آپ کو ڈاکٹر صاحب دیکھیں گے۔“

نرس نے کہا اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے گل کا جسمانی معائنہ کیا اور پھر اس کے ہوش و حواس جانچنے کے لیے کچھ سوالات کیے۔ اس نے گل کو بتایا کہ جب اسے اسپتال لایا گیا تو اس کی حالت اچھی نہیں تھی اور اگر اسے کچھ دیر اور ہو جاتی تو اس کا بچنا محال تھا۔ ڈاکٹروں نے فوری طبی امداد دے کر اسے بچایا تھا۔ اس کے جسم سے زہر کا اثر زائل کر دیا تھا اور اب اس کی جان کو خطرہ نہیں تھا البتہ ابھی اسے اسپتال میں رہنا تھا تاکہ زہر کے بچے کچھے اثرات بھی ختم کیے جا سکیں اور اس کے ٹیسٹ ہوں کہ زہر نے جگر کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اسے دیا جانے والا زہر شاید خراب ہو گیا تھا اس وجہ سے تیزی سے اثر نہیں ہوا۔ اسی لیے وہ بچ گئی۔ ”مجھے یقین ہے آپ پوری طرح صحت یاب ہو کر یہاں سے جائیں گی۔“

اب وہ منتظر تھی کہ خود کو بچانے والی شخصیت سے ملے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور فرہاد اندر آیا۔ گل سوچ رہی تھی کہ شاید شہلا نے اس کی مدد کی تھی اور بروقت پہنچ کر اسے ان سفاک لوگوں سے بچایا تھا مگر اس نے فرہاد کا نہیں سوچا تھا۔ اس نے تعجب سے کہا۔ ”تم نے مجھے بچایا ہے؟“

فرہاد نے حسب معمول کھردرے لہجے میں کہا۔ ”وہ میرا آدمی تھا۔ بہرحال اب تم کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ گل بولی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فرہاد اسے اس مشکل سے نکال سکتا ہے۔ ”تمہارا آدمی کہاں سے آ گیا؟“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی رل کی طرح غائب ہو جاؤ اور کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ تم دونوں بہنوں کی گمشدگی کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ میں نے تمہاری نگرانی کے

ہے جس آدمی کو لگایا تھا اسی نے تمہیں بچایا اور مجھے خبردار کیا۔“

”اوہ۔“ گل نے گہری سانس لی۔ ”لیکن تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟“

”جلدی نہیں آیا، تمہیں پورے بارہ گھنٹے بعد ہوش آیا ہے۔ جیسے ہی میرے آدمی نے بتایا میں وہاں سے چل پڑا اور سارے راستے اس سے رابطے میں رہا، وہ مجھے تمہارے بارے میں پل پل کی رپورٹ دیتا رہا تھا۔“

”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”ظاہر ہے پولیس کے پاس ہیں اور پولیس جلد تمہارا بیان بھی لے گی۔“

”انہوں نے رمل کے بارے میں بتا دیا۔“ گل کی آواز بھیگنے لگی۔

فرہاد نے سر ہلایا۔ ”میرے آدمی نے تمہیں بچاتے ہوئے ان کو گولی مار زخمی کیا تھا کیونکہ منصور مقابلے پر آمادہ تھا اور مسلح بھی تھا۔ وہ عین اس وقت پہنچا جب وہ تمہیں ٹرنک میں بند کر کے دریا میں پھینکنے جا رہے تھے۔ زویا نے اقرار کر لیا ہے کہ انہوں نے ہی رمل کو قتل کیا اور عادل کو اس کی مدد سے قتل کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام رہے تھے اور اسی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے رمل کو زہر دے کر مارا۔“ فرہاد پہلی بار دکھی نظر آیا۔ ”میری پولیس سے بات ہو گئی ہے، میں کچھ دیر میں جا رہا ہوں۔ اس کی لاش لے کر حویلی جاؤں گا۔“

گل رونے لگی۔ ”اس کی موت کے ذمے دار تم لوگ بھی ہو۔ کیوں تمہیں اتنی نفرت دی کہ حویلی میں اس کا دم گھٹنے لگا؟ وہ صرف اس ماحول سے نکلنے کے لیے حویلی چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔“

فرہاد سر جھکائے کھڑا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے مگر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو آدمی لوٹا نہیں سکتا۔ ان کے لیے افسوس کے الفاظ بے معنی ہوتے ہیں۔“

گل نے آنسو صاف کیے۔ ”ٹھیک کہا تم نے، کسی وقت الفاظ بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بابا کو معلوم ہے۔“

”وہ آ گئے ہیں۔“ فرہاد نے بتایا۔ ”کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

گل بابا کی آمد کا سن کر بے تاب ہو گئی۔ ”بابا آئے ہیں۔“

”میری یہاں آنے سے پہلے بات ہوئی تھی وہ شہر پہنچ گئے ہیں، بس کچھ دیر میں یہاں ہوں گے۔“

گل خاموش ہو گئی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی فرہاد کی وجہ سے بچی ہے۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں...“

”اس کی ضرورت نہیں ہے، میں نے کہا نا... میں نے یہ کام اپنے لیے کیا ہے اگر تمہارے سے کیا ہوتا تو تم شکریہ ادا کرتیں۔“ فرہاد نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بابا میں نے بابا کو صرف تمہارے بارے میں بتایا ہے ابھی رمل کا نہیں بتایا ہے۔ تم مناسب انداز میں ان کو بتا دینا۔“

”میں بتا دوں گی۔“

فرہاد جانے لگا اور پھر دروازے کے پاس رک کر بولا۔ ”حویلی سے متعلق ایک خبر ہے مگر وہ بابا تمہیں سنائیں تو بہتر رہے گا۔“

فرہاد چلا گیا، اس کے جانے کے چند منٹ بعد کبیر شاہ اندر آئے۔ وہ جیسے اڑ کر گل تک آیا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ”میری بچی... کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہوں بابا۔“ اس کے آنسو بہنے لگے۔

”نہ رو نہ رو، اب تو ٹھیک ہے بس جیسے ہی ڈاکٹر تجھے چھٹی دیں گے میں تجھے حویلی لے جاؤں گا۔“

کبیر شاہ کی بے تابی کم ہوئی تو وہ اس کے سامنے کرسی رکھ کر بیٹھ گیا۔ ”تو حویلی سے کیوں نکلی تھی؟“

”رمل کو تلاش کرنے۔“ گل نے جواب دیا۔

”اسے تو پولیس تلاش نہیں کر سکی تو کہاں سے تلاش کرتی۔“

”میں نے اسے تلاش کر لیا ہے بابا۔“ گل آہستہ سے بولی۔ ”فرہاد اسے لینے گیا ہے۔“

کبیر شاہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ ”تلاش کر لیا ہے... فرہاد اسے لینے گیا ہے؟... پر وہ کہاں ہے؟“

”بابا وہ مل گئی ہے لیکن مجھے اس کے نہیں ملی۔“ گل رفتہ رفتہ اسے اس صدمے کے لیے تیار کرنے لگی۔ کبیر شاہ اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”تو کیا کہنا چاہ رہی ہے گل، رمل ملی ہے اور نہیں ملی۔“

”بابا وہ مل گئی ہے لیکن اس دنیا میں نہیں ہے۔“ گل نے ہمت کر کے کہہ دیا۔ ”بابا اس کے ساتھ بہت برا ہوا۔ وہ جو خواب لے کر حویلی سے نکلی تھی اس کی تعبیر اسے بہت بھیانک ملی۔“

پھر گل نے شروع سے لے کر آخر تک سب بتایا کہ رمل کے ساتھ کیا ہوا تھا اور اس کے قاتلوں نے اس کی لاش کے ساتھ کیا کیا تھا۔ کبیر شاہ سنتا رہا اور اس کی آنکھوں سے

آنسو بہتے رہے۔ پھر گل نے خود پر گزرنے والی سنائی۔ اس نے گل کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہ اوپر والے کا احسان ہے کہ اس نے ایک امانت واپس لی تو ایک کو اپنی امان میں لے لیا۔“

”بابا! فرہاد نے مجھے بچایا ہے، میں نہیں سمجھتی تھی کہ وہ ایسا کرے گا۔ اگر وہ آدمی میری نگرانی پر نہ لگاتا تو شاید آج میری لاش...“

”نہ پتر! ایسا نہ کہہ۔“ کبیر شاہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”فرہاد اچھا لڑکا ہے۔ بس اپنی ماں کی باتوں میں آ گیا تھا۔“

گل بہت عرصے سے سوچ رہی تھی کہ کبھی پوچھے کہ صفیہ کو ان کی ماں اور ان دونوں بہنوں سے کیا پرخاش تھی۔ وہ کیوں ان سے اتنی نفرت کرتی تھی۔ مگر وہ آج تک کبیر شاہ سے پوچھنے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ اسے فرہاد کی بات یاد آ گئی اور اس نے پوچھا۔ ”فرہاد کہہ رہا تھا حویلی سے متعلق کوئی خبر ہے؟“

کبیر شاہ نے سر ہلایا۔ ”ساری خرابی اس کی سوچ کی تھی اور یہی سوچ دماغ کا کینسر بن گئی۔“

گل کا دل دہل گیا۔ ”بابا... فرہاد؟“

”نہ پتر، اس کی ماں، صفیہ کے دماغ میں کینسر ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب دیر ہو گئی ہے۔“

”میرے خدا...!“ گل اٹھ بیٹھی۔ ”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں کہ صفیہ کے پاس بس چھ مہینے ہیں وہ بھی اگر دوائیں مستقل کھائے ورنہ شاید اس سے پہلے...“ کبیر شاہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا مگر بات مکمل تھی۔ گل دکھی ہو گئی۔ حالانکہ اس عورت نے انہیں ساری عمر سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں دیا تھا اس کے باوجود وہ اس کے لیے دکھی ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

”بابا چاچی ہم سے کیوں نفرت کرتی تھی۔ ہم سے ہماری ماں سے؟“

کبیر شاہ نے گہری سانس لی۔ ”پتر وہ سمجھتی تھی اور میں بھی بہت عرصے یہی سمجھتا رہا کہ تیرے باپ اور چاچے کی موت میں تیری ماں کا ہاتھ ہے۔“

گل تڑپ گئی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا، امی کیسی ہی سہی لیکن اپنا سہاگ کون اجاڑتا ہے۔“

”پتر بات یہ ہے کہ تیری ماں کی شادی اس کے گھر والوں نے جبر کر کے کرائی۔ وہ اس رشتے پر راضی نہیں تھی۔ وہ راضی بھی ہو جاتی مگر یہی بات ہے تیرے باپ کی جو حرکتیں تھیں اس کے ساتھ کوئی عورت خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ کون عورت پسند کرے گی کہ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا پھرے۔ دو بچوں کے باوجود اس کی تیرے باپ سے نہیں بنی۔ پھر ان دونوں کا قتل... ہو گیا۔“ کبیر شاہ بولتے بولتے رکا۔ شاید اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دکھ یاد آ گیا۔ ”قاتلوں کا آج تک پتا نہیں چلا۔ مگر شبہ تمہاری ماں کی طرف گیا۔ اس نے اپنے موجودہ شوہر کی مدد سے تمہارے باپ اور چاچے کو قتل کرایا اور بعد میں اس سے شادی کر لی۔“

”یہ غلط ہے۔“

”ہاں بعد میں ثابت ہوا کہ یہ غلط ہے کیونکہ ثوبیہ کا موجودہ شوہر اس وقت لندن میں تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے گھر سے تھا اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر صفیہ نے اس خیال کو یقین بنا لیا۔ اس نے سب کا دماغ خراب کیا تھا اور سب سے زیادہ اپنے بیٹے کا دماغ خراب کیا۔ مگر جب اسے موت سامنے نظر آنے لگی تو اس نے اعتراف کیا کہ اس نے غلط سمجھا اور جھوٹ کہا تھا۔ اس سارے معاملے میں ثوبیہ اور اس کا موجودہ شوہر بے قصور ہیں۔“

”اب انہیں خیال آیا ہے۔“ گل نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”جب رمل نہیں رہی اور...“

”پتر سب بھول جاؤ۔“ کبیر شاہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اللہ سب سے بہتر حساب لینے والا ہے۔ فرہاد بھی شرمندہ ہے۔ مگر وہ تم سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے بہت زیادتی کی ہے۔ پتر وہ دل کا برا نہیں ہے، اپنی ماں کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔“

”بابا میں اسے سمجھتی ہوں جبھی اس کی زیادتیوں پر بھی خاموش رہتی تھی۔ رمل یہ بات نہیں سمجھتی تھی اور وہ گھر سے نکل گئی۔“

”کاش کہ وہ بھی تیری طرح سمجھدار ہوتی۔“ کبیر شاہ نے سرد آہ بھری۔ گل نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اسے رونا آ رہا تھا۔

”ہاں کچھ لوگوں کے لیے نہ زندگی آسان ہوتی ہے اور نہ موت۔“

کبیر شاہ اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اس کا سر تھپتھپانے لگا۔